بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد (۲۴) | ماہ جنوری سنہ ۳۵ء | نمبر (۱)

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

اسلام اور عورت

اگرچہ "اسلام اور عورت" ایک ایسا بحث ہے جو آج کل بہت پامال اور فرسودہ ہو چکا ہے۔ انیسویں
عیسوی کے آخری ربع سے لے کر اس وقت تک اس پر سینکڑوں مقالات اور بیسیوں رسالے شائع
ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تحقیق صحیح کی روشنی میں خالص قرآن و حدیث
ہمارے اس مسئلہ پر ابھی تک اس حیثیت سے کوئی تفصیلی نظر نہیں ڈالی گئی ہے کہ اسلام نے
اور اجتماعاً عورت کو کیا حیثیت دی ہے۔۔ بہشتی زیور کی قسم کے رسائل اور مصری مصنفین کی
تابیں اس موضوع پر پیش کی جا سکتی ہیں لیکن ان میں قرآن و حدیث سے اس درجہ سطحی بحث کی
ہے کہ جو تحقیق کے نقطۂ نظر سے قابل اعتنا قرار نہیں پا سکتی۔ پھر اس قسم کی کتابیں چونکہ ان حاملانِ علمِ شریعت
طرف سے شائع ہوئی ہیں جو خود اپنے قول کو کسی سند سے کم بلند نہیں سمجھتے اس لئے ان میں حوالوں سے
وسناک طریقہ پر بے توجہی برتی گئی ہے۔ پھر نفس موضوع پر بھی جو کچھ بحث کی گئی ہے اس میں اس قسم
مناظرانہ شان پائی جاتی ہے جس کے بعد مقالہ نگار اس تصور کو پیش نظر رکھ کر قلم اٹھاتا ہے کہ وہ حریف
ہر رطب و یابس ادعا کو باطل قرار دے گا۔ اور اس لئے اس قسم کی تصانیف میں دلائل سے زیادہ مذہبی
ار، اپنی معلومات اور اپنے انہماک علمی کا اظہار، حریف کی علوم دینیہ سے بے خبری، تہذیب جدیدہ پر
ک الزامات اور سب سے بڑھ کر ناملائم سخر و استہزا اس کثرت سے پایا جاتا ہے کہ اس کی موٹی
ں میں اصل حقیقت سمٹ سمٹا کر ناقابل التفات ہو جاتی ہے۔ پھر نئے انگریزی داں نوجوانوں نے اس
ث پر جو دماغی کاوشیں پیش کی ہیں ان میں بھی خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ سے اسی قسم کی بے اعتدالیاں
جاتی ہیں۔ علماء کے کیرکٹر جائز یا ناجائز حملوں، قدامت پرستانہ ذہنیت کی برائیوں اور رسم و رواج
باہ کاریوں پر جذباتی اعتبار سے جتنا زورِ قلم صرف کیا گیا ہے اس کا عشر عشیر بھی بے لوث تحقیق کی نذر
ں کیا گیا۔ بلکہ اکثر اوقات تو نصوص و سنن بھی اس قدر جذباتی رنگ میں پیش کی جاتی ہیں کہ اطمینان بخش

نہیں کہا جاسکتا ۔ اور اس لئے اس بظاہر بوسیدہ عنوان میں ابھی بہت سی جدتیں ایسی پنہاں ہ
آشکار کرنا میرے اس مقالہ کا مطمح نگاہ ہے۔

میں اس میں پردہ، تعلیم نسواں، آزادی نسواں یا طلاق و خلع کے مسائل پر کوئی خصوص
کروں گا ۔ بلکہ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ نصوصِ صریحہ اور شہاداتِ نبویہ کی رہبری سے یہ بتلا
نے عورت کو کیا سمجھا ہے ۔"

پھر مجھے افسوس ہے کہ اس چیز کو پیش کرنے میں شاید میں اُن دلدادگانِ تقلید کی نظر م
ہو جاؤں جو اسلام کو صرف فقہا کے اقوال اور صوفیہ کے طرزِ عمل کی عینک سے دیکھنا چاہتے ہیں
کہ اس کے بالکل خلاف میرے استدلال کی ساری بنیاد پر صرف قرآن کریم کی آیات اور نبی
اقوال و اعمال پر قائم ہوں گی ۔

ہمارے فقہا اور علما کا جو نظریہ عورت کے متعلق ہے اُس کے اعتبار سے عورت
کا ایک ایسا جزو قرار پاتی ہے جو انفراداً کور دماغ پیدا ہوتی ہے، منزلاً غلام ہوتی ہے، ا
کچھ نہیں ہوتی ۔ پھر بد قسمتی سے اس کے ثبوت میں قرآن و حدیث کے بعض اقوال اس در
کساتھ پیش کئے جاتے ہیں کہ آج ایک بچہ بھی "هُنَّ نَاقِصَاتُ الْعَقْلِ" کے مرعوب کن الفا
کر کے عورت کی انفرادی شخصیت کو غیر وقیع سمجھتا ہے ۔ اسی طرح " الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَا
کا جو مفہوم سمجھا گیا ہے اس کے ماتحت منزلی اور ملی زندگی میں عورت کی تمام آزادیاں سل
ہیں ۔ اور اس لئے آج کل حالت یہ ہے کہ اگر علما اور فقہا کے اقوال نقل کر کے ایک جوا
کیا جائے تو اس کا ماحصل یہ ہو گا کہ " عورت سوسائٹی کی غلام بن کر پیدا ہوئی ہے اور ا
شادی سے پہلے باپ یا ولی اس کی قسمت کا مالک ہے، شادی کے بعد شوہر اس کے
لینے کے سبب سے اس پر حاکمانہ تسلط رکھتا ہے، انفرادی اعتبار سے اس کو خود ا
کم اختیارات ہیں، معاشرتی زندگی میں اس کی آواز ناقابل التفات ہے ۔ قومی اور
تو اس کا ذکر بھی مضحکہ خیز ہے ۔"

یہ ہے عورت کا وہ منظر جو خالص اسلامی منظر بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، اور یہ حقیقۃً موجودہ تحقیقات کے اعتبار سے قابل تسلیم بھی ہے۔

پھر میں اگر یہ ظاہر کروں کہ اسلامی نقطۂ نظر اس کے خلاف ہے تو اس کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ میں خدانخواستہ گذشتہ صدیوں کے ائمہ کبار، فقہائے عظام یا محدثین کرام کی نیتوں پر شبہ کر رہا ہوں یا ان کی مذہبی معلومات سے انکار کرنا چاہتا ہوں۔ ان کی عظمت ہر اس قلب میں ہونا چاہئے جو علمی تحقیقات کی کاوشوں سے بے خبر نہیں ہے حقیقۃً انھوں نے جو کچھ کہا وہ حسنِ ضمیر کے ساتھ صداقت سمجھ کر کہا۔ اور اس لئے مجھے جو کچھ شکایت ہے وہ اِن تقویٰ پرست علما سے نہیں ہے بلکہ اُس مسموم سوسائٹی سے ہے جس نے خلافتِ راشدہ کے بعد اموی بادشاہوں کے جھنڈوں کے نیچے پرورش پائی۔ اُس افسوسناک بدعت سے ہے جس کی بنیادیں حضرت معاویہ نے شام میں استوار کر کے اسلامی تعلیمات کے رُخ کو بالکل منقلب کر کے رکھ دیا۔ اور جس کے بعد سے وہ پودا جس کو دنیا کی بلند ترین شخصیت نے اپنے قول و عمل کی مبارک طاقتوں سے لگایا تھا۔ اور جس کو صحابہ نے اپنی صداقت اور راستبازی کے خون سے سینچا تھا آج تک صحیح معنٰی میں برگ و بار نہ لا سکا۔

خیر سوسائٹی کی اس بادِ صرصر نے عورت کے مسئلہ پر جو کچھ اثر کیا اُس سے تو ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں۔ ہمیں اس وقت یہ دیکھنا ہے کہ قرآن و حدیث کے اعتبار سے عورت کی کیا قدر و قیمت سمجھ میں آتی ہے۔

دنیا میں انسانی زندگی کے تین پہلو ہوتے ہیں۔ عورت کی زندگی پر بھی ہم انھیں تین پہلوؤں کے اعتبار سے نظر ڈال سکتے ہیں:-

(۱) انفرادی زندگی

(۲) منزلی زندگی

(۳) سیاسی اور ملی زندگی

عورت کی انفرادی زندگی

انفرادی زندگی میں اسلامی نقطۂ نظر سے عورت کو جو حیثیت حاصل ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ جگہ یہ بتلایا گیا ہے کہ عورت و مرد کو اعمال کا اجر مساوی ملے گا اور اخلاقی اعتبار سے کوئی معصیت ایسی نہیں ہے جس سے عورت کو مرد کے مقابلہ میں زیادہ احتراز ضرورت ہو۔

البتہ بعض مقامات پر عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ فو ایسی ہی پیدا ہوتی ہے۔ یعنی اس کو ناقص العقل کہنا اس کی جبلّت اور خلقت کے اعتبار سے نہیں ہے ایک ایسی کیفیتِ عارضہ کی بنا پر ہے جو زائل ہو سکتی ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ جس طرح ہر رنگین کو سرخ، سبز، نیلا، پیلا کہہ سکتے ہیں اور یہ کہنا ہر حیثیت سے صحیح بھی ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سرخ کپڑے کی تخلیق میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہمیشہ سرخ رہے اسی طرح ہزاروں برس کی بے انصا کی بنا پر عورت کی دماغی صلاحیتوں پر جو زنگ آگیا تھا اس کی وجہ سے اس کو ناقص العقل کہا گیا ہے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ "نقصانِ عقل" اس کی فطرتِ اصلیہ کا جزو ہے۔ یا اس میں فطرتاً وہ استعد مفقود ہے جو مرد میں پائی جاتی ہے۔

بہر حال احادیث نبوی میں جہاں جہاں عورت کو ناقص العقل کہا گیا ہے وہ اسی کیفیت کی بنا پر ہے۔ اس لئے ایک عرصے سے عورت کو سوسائٹی نے جو پست درجہ دے رکھا تھا اس کی نقصانِ عقل اس کی ذات میں طبیعت ثانیہ کی طرح راسخ ہو گیا تھا۔ اسلام نے عورت کو بلند کرنا چا دفعتہ اس کو اُس سطح پر نہیں لایا جا سکتا تھا جس پر مرد کھڑا تھا اس لئے اس کے تحفظ کے لئے کچھ ا کا نظام بنایا کہ اگر اس کے مطابق انسانی معاشرت اپنا لائحہ عمل مرتب کرتی تو آج "اسلامی کی جو پوزیشن دنیا میں ہوتی وہ یورپ کی ذہنیت کے مقابلہ میں ہزار درجہ بلند نظر آتی۔

پھر جس طرح کسی کو تعلیم پانے سے پہلے جاہل کہنا اس کی "صلاحیتِ علمی" کو فنا نہیں کرتا

اسی طرح عورت کو ناقص العقل کہنے کے معنے صرف یہ ہیں کہ اس وقت کی سوسائٹی میں عورت کی حالت حقیقۃً ایک ایسی ہستی سے کچھ بلند نہ تھی جس کی عقل میں فتور آچکا ہو۔

بہرحال اسلام کے خلاف یہ ایک شرمناک بہتان ہوگا اگر ناقص العقل سے یہ مراد لی جائے کہ عورت فطری اعتبار سے فاتر العقل پیدا ہوتی ہے۔

اس امر کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات داحادیث پر غور کیجئے:

"ایک مرتبہ حضرت ام سلمہ نے نبی کریم سے فرمایا کہ مہاجرین کے فضائل میں مردوں ہی مردوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ عورتوں کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی" ۵۱

"بیشک میں کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع نہیں کرتا، خواہ مرد ہو یا عورت،

تم آخر ایک دوسرے کی جنس ہی سے تو ہو" (پارہ ۴ سورۂ آل عمران، رکوع ۲۰ آیت ۱۹۴)

اس آیت کی تفسیر میں شیخ زادہ محاشیہ بیضاوی میں لکھا ہے:-

"جس طرح مرد و عورت انسانیت کے اعتبار سے ایک ہی اصلیت رکھتے ہیں اور پھر آپس میں ایک دوسرے سے پیدا ہوتے ہیں اسی طرح اعمال کے اجر کے اعتبار سے بھی وہ یکساں ہیں جس طرح مرد کو اس کے اعمال کا اجر دیا جائے گا اسی طرح عورت کو اس کے اعمال کا بدلہ ملے گا" ۵۲

یہاں قرآن مجید نے جس اصول کو پیش کیا ہے وہ اس قدر واضح اور غیر مبہم ہے کہ اس کے بعد یہ کسی حیثیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ عورت فطرتاً مرد کے مقابلہ میں عقلی اعتبار سے ناقص ہے۔ اس لئے کہ "بعضکم من بعض" (تم آخر ایک دوسرے کی جنس ہی سے تو ہو) کا ایک مستحکم اصول پیش کرنے کے بعد گویا یہ بتلایا گیا ہے کہ عورتوں کو مردوں سے جدا کوئی ایسی جنس نہ سمجھو جن کے احکامات میں بنیادی اختلاف ہو۔ پھر اگر آپ اس آیت کو ذرا غور سے دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ اس کی اسپرٹ یہ ہے کہ

---

۵۱ رواہ الترمذی

۵۲ جلد سوم صفحہ ۱۹۷

حضرت ام سلمہؓ کے جواب میں عورتوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ "تم خواہ مخواہ ایسے سوالات کیوں کرتی ہو جو بے ضرورت ہیں۔ بھلا خدا کسی عورت کے اعمال کو ضائع کر سکتا ہے درآنحالیکہ مرد و عورت دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہیں۔"

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مجھ کو دنیا میں صرف تین چیزیں پسند ہیں، خوشبو عورتیں اور نماز کا سکون۔"

اس پر صاحب عنایہ لکھتے ہیں۔

"معاذ اللہ یہاں عورتوں سے محبت کا سبب جسمانی تلذذ اور مادی انتفاع ہرگز نہیں ہے جیسا کہ ایک دفعہ کسی منہ پھٹ نے یہ کہہ دیا کہ خواہشات نفسانی سے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ بچ سکے اور اپنی جہالت کی بنا پر اس کی تائید میں یہ حدیث نقل کر دی۔ اس کو سن کر ایک بزرگ نے اس کو برا بھلا کہا اور اس پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ مگر ذات مبارک کے خلاف اس رکیک الزام کو سننے سے سخت فکر میں مبتلا ہو گئے۔ اتفاقاً خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے دیکھا! "اس نے ہم پر تہمت رکھی تھی۔ اس لئے ہم نے اس کو قتل کر دیا۔" چنانچہ اس خواب کے تھوڑے ہی دنوں بعد کسی ڈاکو نے اس کو قتل کر ڈالا" [۹۷]

اس حدیث سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ عورت سے بے لوث دوستانہ رابطہ پیدا کرنا "تلذذ جسمانی" کے رابطہ سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ اس لئے کہ جب "جنسی انتفاع" کو علیحدہ کر لیا جائے تو عورت سے محبت کرنے کی حیثیت وہی ہو سکتی ہے جو ہم کو اپنے کلاس فیلو، اپنے پروفیسر، اپنے بھائی، باپ، چچا اور پڑوسی سے ہوتی ہے۔

اس حدیث کی روشنی میں عورت کی انفرادی پوزیشن جس درجہ رفیع ہو جاتی ہے وہ محتاج تشریح نہیں ہے۔

---

[۹۷] جلد ثالث صفحہ ۳۹

"ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ" (پارہ ۲، سورہ بقرہ رکوع ۲۳، آیت ۱۸۷) کی تفسیر میں علامہ ابن جریر نے قتادہ، سدی اور حضرت ابن عباسؓ وغیرہ کے اقوال بسند نقل کرکے لکھا ہے کہ یہاں "لباس" کے معنے "سکن" (یعنی سکون و آرام کا سبب") ہیں [۱] اور اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا:۔

"عورتیں مردوں کے لئے سکون و آرام کا سبب ہیں اور اسی طرح مرد عورتوں کے لئے"۔

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اگر عورت کی انفرادی حیثیت مرد کے مقابلہ میں قابل وقعت نہ ہوتی تو صرف عورتوں کو مردوں کے لئے باعث آرام کہہ دیا جاتا۔ لیکن دونوں کو ایک حیثیت سے پیش کرنا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی سطح گو سوسائٹی نے پست کر رکھی ہو لیکن حقیقۃً وہ دونوں باہم مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ کے اثنا میں فرمایا، "اے مردو! تم عورتوں کے سلوک میں، خدا سے ڈرتے ہوئے، بہت احتیاط برتا کرو اس لئے کہ وہ خدا کی امانت ہیں جو تمہارے پاس ہیں"۔

یہ خطبہ چونکہ رسول کریم کی زندگی کا آخری خطبہ تھا اس لئے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتا ہے۔ گویا اس کا ہر ہر لفظ ایک مستقل وصیت نامہ ہے جو آنحضرت نے اپنی اُمت کو عطا فرمایا ہے۔

عورتیں ایک عرصہ سے پامال چلی آرہی تھیں۔ سوسائٹی کی اس طویل پامالی نے ان کے عقل و دماغ تک کو متاثر بنا دیا تھا۔ جہل اور بدخلقی ان کی طبیعت میں مرکوز ہو چکی تھی۔ عوام کی ذہنیت یہ ہوگئی تھی کہ عورت سے لذتِ جنسی کے علاوہ اور کسی قسم کے تعلق کا امکان ہی باقی نہ رہا تھا۔ پھر دنیا کے تمام مذاہب بھی متفقہ طور پر عورت کی اس بدحالی پر شدید ضربیں لگاتے رہتے تھے۔ عیسائیت کی زندگی میں منزلی مودت و محبت کا نام نہ تھا [۲] بدھ مذہب کا بلند معیار یہ تھا کہ مرد کو چاہئے کہ عورت کو ایک گناونی

---

[۱] جلد ثانی صفحہ ۹۱۔ [۲] انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا جلد ہفتم صفحہ ۶۷۱

رہے۔ حتیٰ کہ وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ مردوں کی طرح عورتوں کے لئے بھی ایک جداگانہ عبادت گاہ بنوائی جائے [۹۱] خود عرب میں عورتوں کی جو کچھ دُرگت تھی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد سوتیلی ماں جائداد کی طرح بیٹے کے قبضہ میں ورثہ کے طور پر منتقل ہو جاتی تھی۔

یہ تھی عورت کے مسئلے میں دنیا کی حالت جب رسول کریم نے عورت کے ساتھ انصاف کرنا چاہا۔ لیکن ہزاروں برس کی پامال شدہ ہستی کو دفعتہً خاک سے اُٹھا لینا ناممکن تھا۔ اس لئے تدریجی طور پر لوگوں کی ذہنیت بدلنا شروع کی اس لئے کہ خود عورتوں کی حالت اس قابل نہ رہی تھی کہ وہ کسی بلند اصلاح کو اپنے اندر جذب کر لیتیں۔ اسی بنا پر ایک طرف تو عورتوں کو اخلاقی رفعتوں کی جانب اُبھارا، اُن پر حصول علم کو فرض قرار دیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان کے معائب بھی ان پر ظاہر کئے۔ اور دوسری طرف مردوں کو حسن سلوک کی ترغیب دی۔ اور ان پر اپنے گھر کی عورتوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دینا واجب بتلایا [۹۲]

حیاتِ مسعود کے آخری سال حجۃ الوداع کے خطبہ میں جو جملے عورت کے متعلق فرمائے گئے ہیں وہ حقیقتہً اپنے اندر معانی کا ایک دریا پنہاں رکھتے ہیں جس چیز کو آپ نے دو جملوں میں ادا فرما دیا ہے میں کوشش کے بعد بھی اس کو کئی صفحات میں کما حقہٗ ادا نہیں کر سکتا۔ بہر حال اجمالی حیثیت سے اس حدیث کا ماحصل یہ ہے، مردوں کو چاہئے کہ عورتوں کے مسئلہ میں بہت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم رکھیں۔ اور اپنی ذاتی رائے سے یا رسم ورواج کے ماتحت کوئی کام نہ کریں بلکہ ہر وقت خدا سے ڈرتے رہیں اور سوسائٹی کے مرعوب کن فیصلوں کے خلاف ان تمام احکام قرآنی کی پابندی کریں جن سے عورت کو علم وعقل کی بلندی حاصل ہو سکے گی۔ مردوں کو چاہئے کہ عورتوں کو بالکل خدا کی امانت سمجھیں اور اس لئے اپنے نفع نقصان کے ڈر سے اُن کے نشوونما ارتقاء کے راستہ میں پہلے کی طرح کوئی چیز حائل نہ کریں۔

---

۹۱ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد ۴ صفحہ ۴۳۰

۹۲ ملاحظہ ہو بخاری ومسلم کتاب العلم

یہ ہے اس وصیت نبوی کی مختصر سی تفصیل جو نبی کریم نے اپنی زندگی کے آخری سال مکہ معظمہ کے منبر پر کھڑے ہو کر عورت کے مسئلہ میں ارشاد فرمائی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ رسم و رواج کے جس بُت کو اس گرز سے ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا اس نے رسول کریم کی وفات کے کچھ دن بعد پھر لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ پالیا۔ پھر گو عورت کی مظلومیوں میں بہت کچھ کمی آگئی لیکن جس بلند معیار کی طرف نبی کریم نے رہبری فرمائی تھی وہ بر روئے کار نہ آسکا۔

اس قدر بحث کے بعد عورت کی انفرادی پوزیشن بہت کچھ واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن مزید تحقیق کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر بھی غور کر لیجئے:۔

۱۔ سورۂ بقرہ میں طلاق کے مسائل کا ذکر کر کے کہا گیا ہے:۔

"یہ قوانین خدا نے مقرر کئے ہیں۔ تم ان کے خلاف ہرگز کچھ نہ کرنا۔ اور جو کوئی بھی خدا کے قوانین کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنے لئے دوزخ مول لے گا۔" (رکوع ۲۹، آیت ۲۲۹)

اصولی نقطۂ نظر سے طلاق کے قوانین بتلا دینے کے بعد قرآن کو خاموش ہو جانا چاہئے تھا لیکن قرآن ایک ٹھوس قانون ہی نہیں ہے بلکہ لوگوں کی اصلاح کے لئے ایک مستقل ہدایت نامہ بھی ہے اس لئے ضرورت تھی کہ طلاق کے مسئلہ میں عورت کے جس عزت و وقار کو قرآن نے ملحوظ رکھا تھا اس پر مرد کو سختی کے ساتھ عمل کرانے کے لئے خاص طور پر تنبیہ کی جاتی۔ کیوں کہ جو ذہنیتیں ہزارہا سال سے بگڑی ہوئی تھیں ان کی اصلاح کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اسی وجہ سے آپ دیکھیں گے کہ قرآن نے عورت کے مسائل کا ذکر کرنے میں جگہ جگہ تنبیہی جملے استعمال کئے ہیں۔ مثلاً "اتقوا اللہ" "حدود اللہ" "سمیع علیم" "عزیز حکیم" "بصیر خبیر" "ھم الظالمون" "فقد ظلم نفسہ"۔ وغیرہ وغیرہ

۲۔ ایک جگہ ہے:۔

"اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دیدو اور ان کی عدت پوری ہو جائے تو یا تو تم قاعدہ کے مطابق (تجدید نکاح کر کے) ان کو اپنے گھر میں رہنے دو اور یا ان کو خندہ پیشانی کے ساتھ گھر سے جانے کی اجازت دیدو لیکن ان کو تکلیف پہنچانے

کی نیت سے یا ان پر زیادتیاں کرنے کے ارادہ سے اُن کو نہ روکو۔ اور جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ خود اپنے لئے دوزخ مول لیتا ہے۔ اور دیکھو! خدا کے احکامات کو بے وقعت سمجھ کر ہنسی میں نہ اُڑانا۔" (پارہ ۲، سورہ بقرہ، رکوع ۲۹، آیت ۲۳۱)

اس آیت کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے مسئلہ میں عوام کی ذہنیتیں کس قدر زہر آلود ہو چکی تھیں۔ ورنہ خدا کو یہ کہنے کی ضرورت پیش نہ آتی:۔

"اور دیکھو! خدا کے احکامات کو بے وقعت سمجھ کر اُن کو ہنسی میں نہ اُڑانا۔"

ایک جگہ ہے:۔

"جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دیدو اور وہ اپنی عدت کا زمانہ بھی پورا کر چکیں اور پھر وہ باہمی رضامندی سے قاعدہ کے مطابق کسی شخص کے ساتھ نکاح کرنا چاہیں تو تم کو کوئی حق نہیں ہے کہ تم ان کو اس نکاح سے منع کرو۔ اس مضمون سے اُس شخص کو نصیحت کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ پر ایمان لایا ہے۔ اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔ اس نصیحت کا قبول کرنا تمھارے لئے زیادہ صفائی اور زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

(پارہ ۲، سورۂ بقرہ، رکوع ۳۰، آیت ۲۳۲)

اس آیت میں کس درجہ وضاحت کے ساتھ مردوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عورتوں کی نئ آزادی میں دخیل نہ ہوں۔ پھر یہ کہہ کر کہ "اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے" رسم و رواج کے اس دیرینہ بت کو توڑا گیا ہے جس کی وجہ سے مردوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ عورتوں کے ساتھ بھی اِ کی طرح سلوک کرنا اُن کا فرض ہے۔

ایک جگہ ہے:۔

"جن عورتوں کو تم طلاق دیدو (اُن سے بالکل بے تعلق ہو کر نہ بیٹھ رہو بلکہ) اُن کو قاعدے کے مطابق فائدہ پہنچاتے رہو۔ اس لئے کہ اللہ سے ڈرنے والوں

خدا کی طرف سے یہ چیز مقرر کردی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے فائدہ کے لئے احکام بیان کرتا ہے (اس توقع پر) کہ شاید تم میں عقل آجائے اور تم سمجھ سکو۔"

(پارہ ۲۔ سورہ بقرہ، رکوع ۳۱، آیت ۲۴۱ و ۲۴۲)

اس آیت کے آخری حصہ پر غور کیجئے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس چیز کو خوب سمجھتا تھا کہ سوسائٹی کے فیصلوں کے مطابق عورت کو بہت بے وقعت سمجھا جاتا ہے۔ اور اس لئے جب اس نے یہ حکم دیا کہ "طلاق کے بعد بھی ان کو فائدہ پہنچاتے رہو" تو فوراً اس نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ سوسائٹی اس حکم کو ایک مضحکہ خیز حکم سمجھے گی۔ چنانچہ اسی بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آیت کے آخری حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مقصود زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ ہے:۔ "تم نے عورت کے مسئلہ میں بہت غیر منصفانہ فیصلے کر رکھے ہیں اور اسی وجہ سے تم کو اس قسم کی جزئی اور معمولی باتیں اس امید پر بتلائی جاتی ہیں کہ شاید تم میں عقل آجائے اور تم ان کے مسئلہ میں صحیح طور پر غور کر کے ان کے ساتھ مناسب سلوک کر سکو۔"

عورت کی منزلی زندگی

عورت کی منزلی زندگی کے دو شعبے کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) ازدواج سے پہلے۔ اور

(۲) ازدواج کے بعد۔

ازدواج سے پہلے عورت کی پوزیشن

تعجب ہے کہ اسلامی قوانین کے مطابق ازدواج سے پہلے یعنی باپ کے گھر میں عورت کو جو بلند حیثیت عطا کی گئی ہے وہ آج مغربی ممالک میں تہذیب و تمدن کی اس گرم بازاری کے باوجود مفقود ہے۔

دنیا کی ہر قوم کے نزدیک ایک گھر میں لڑکی کا پیدا ہونا باعث مسرت نہیں سمجھا جاتا۔ اب بھی تہذیب و حضارت کی عام ترقیوں کے باوجود دنیا میں ایسے افراد بکثرت پائے جاتے ہیں جو لڑکی کے وجود کو اپنے لئے لعنت سمجھتے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ اس مسئلہ میں یہ ہے۔

"اور جب اس کو بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غم و غصہ سے کالا پڑ جاتا ہے۔ وہ اس خبر کو شرم کے مارے اپنی قوم سے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ آیا اس ذلت کو برداشت کرلے یا اس لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دے، یاد رکھو! ان لوگوں کے یہ فیصلے بہت ہی برے ہیں۔"

(پارہ ۱۴ سورہ نحل رکوع ۷، آیت ۵۸ و ۵۹)

اس آیت میں وضاحت کے ساتھ اس بات کی ہدایت کی گئی ہے کہ نہ تو لڑکیوں کو لڑکوں کے مقابلہ میں فروتر سمجھنا چاہیئے۔ اور نہ محبت و شفقت میں بیٹوں اور بیٹیوں کے درمیان کوئی امتیاز روا رکھنا چاہیئے۔

ملکیت اور وراثت کے مسئلہ میں لڑکیاں بالعموم بے حق سمجھی جاتی ہیں حتیٰ کہ آج کل بھی آئین و اصول کی ان تمام تابناکیوں کے باوجود عام رسم و رواج کے ماتحت عملاً لڑکیاں اپنے آپ کو محروم سمجھتی ہیں۔ قرآن کی ہدایت اس کے متعلق یہ ہے:۔

"ماں، باپ اور قریب کے اعزا مرنے کے بعد جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے مردوں کے لئے بھی حصہ ہے اور اسی طرح ماں یا باپ اور قریب کے اعزا مرنے کے بعد جو کچھ چھوڑ جائیں اس میں سے عورتوں کے لئے بھی ایک حصہ ہے۔ ایک مقررہ حصہ"

(پارہ ۴ سورہ نسا، رکوع ۱ آیت)

لیکن میراث میں مرد کے مقابلہ میں عورت کا "مقررہ حصہ" کچھ کم رکھا گیا ہے اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرد کا درجہ کسی نوعیت سے عورت سے بلند ہے۔ قرآن اس چیز کی توضیح کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"مرد عورتوں کے سرپرست ہیں[1]، اول تو اس لئے کہ اللہ تعالےٰ نے بعض مردوں

---

[1] یہاں اصل لفظ "قوام" ہے جس کا ترجمہ بالعموم "حاکم" کیا گیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ "قوام" [illegible] کفالت

کو بعض عورتوں پر فضیلت دی ہے^[۵۱] اور دوسرے اس لئے کہ مرد اپنا مال عورتوں پر
خرچ کرتے ہیں۔" (پارہ ۵، سورہ نساء، رکوع ۶، آیت ۳۴)
علامہ اسمٰعیل قنوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔
"اس سے قبل کی آیات میں میراث کا ذکر ہے جس میں عورت کا حصہ مرد کے مقابلہ میں ایک تہائی^[۵۲] بتلایا گیا ہے۔ چونکہ میراث کی اس تفریق سے عورتوں کے دماغ میں فطرتاً یہ خیال پیدا ہونا چاہئے تھا کہ ان کے ساتھ بے انصافی کی گئی ہے۔ اس لئے اس آیت کے ذریعہ سے میراث کی زیادتی میں مرد کے استحقاق کا سبب تبلایا گیا ہے۔"^[۵۳]

اس آیت میں مرد کے حق وراثت کی زیادتی کا سبب مرد کی سرپرستانہ فضیلت کو قرار دیا ہے۔
اور اس فضیلت کے دو سبب تبلاتے ہیں۔ ایک سبب اتفاقی اور دوسرا سبب واقعی۔

سبب اتفاقی | (۱) " اللہ نے بعض مردوں کو بعض عورتوں پر فضیلت دی ہے۔
یعنی اگرچہ عام مرد عام عورتوں کے مقابلہ میں کوئی خاص فرق و امتیاز نہیں رکھتے۔ اور فطری نقطۂ نظر

پرورش کا مفہوم پنہاں ہے۔ یعنی "قوّام" اُس شخص کو کہا جا سکتا ہے جس کی برتری کا واحد سبب "سرپرستانہ کفالت" ہو۔ اور اس لئے گو "سرپرست" کے لفظ سے بھی "قوّام" کا صحیح مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا مگر تاہم "حاکم" کے مقابلے میں ذہن کو اصل مفہوم کے زیادہ قریب پہنچا دیتا ہے۔

۵۱ قرآن کی اصل عبارت یہ ہے:۔ "بما فضّل اللہ بعضھم علیٰ بعضٍ" یہاں "بعضھم" میں "ھُم" کی ضمیر "رجال" کی طرف راجع ہے۔ اور دوسرے "بعضٍ" کے بعد "ھنّ" کی ضمیر محذوف ہے۔ اگر ان مضمرات کی جگہ اسم ظاہر رکھ دیا جائے تو عبارت یوں ہو جائے گی:۔ "بعض الرِّجالِ علیٰ بعضِ النساء"

۵۳ قنوی شرح بیضاوی جلد ثالث صفحہ ۲۱۵

۵۲ عورتوں کا حصہ وراثت میں بمقابلہ مرد کے ایک تہائی نہیں بلکہ نصف ہے۔ اور دو صورتوں میں برابر ہے ایک کلالہ سے وراثت لینے میں اور دوسرے باپ اور ماں جب اولاد کے ساتھ ہوں برابر برابر حصہ پاتے ہیں یعنی ایک ایک سدس۔ جامعہ۔

سے دونوں ایک ہی سطح پر کھڑے نظر آتے ہیں لیکن خاص مردوں کا مقابلہ اگر خاص عورتوں سے کیا جائے تو مردوں کو شرف و برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ زیادہ واضح الفاظ میں یوں سمجھئے کہ مردوں میں بعض ایسے مکمل ترین انسان پائے گئے ہیں جن کے مقابلہ میں کوئی عورت پیش نہیں کی جا سکتی۔ یا بعض مردوں نے انسانیت کے جس اعلیٰ معیار کو حاصل کر لیا ہے اس تک کوئی عورت نہیں پہنچ سکی ہے۔ اور اس لئے مردوں کی فضیلت کے لئے یہ فخر کچھ کم نہیں ہے کہ ان کی صف میں ایسے ایسے شجاع، غیور اور عادل افراد پیدا ہوئے کہ کوئی عورت بھی ان کی نظیر میں پیش نہیں ہو سکتی۔ تمام انبیائے کرام اور اکثر اولیائے عظام مرد تھے اور اس لئے مرد اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے عورتوں سے زیادہ باشرف ہے۔

لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس فضیلت کا ذکر کر دینے سے قرآن کا مطلب یہ نہیں کہ مردوں کی یہ فضیلت عورتوں کے کسی فطری نقص کی بنا پر ہے۔ یعنی اگر عورتوں میں مردوں کے بالمقابل کوئی بلند ترین ہستی پیدا نہیں ہوئی تو اس کے یہ معنی نہ سمجھنا چاہئیں کہ اس کی وجہ ان کی طبعی نااہلی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، اس کا واحد سبب یہ ہے کہ بدقسمتی سے ہماری سوسائٹی ہمیشہ سے عورت پر کچھ اس درجہ مہربان رہی ہے کہ اس نے کبھی اس کو اتنا دم لینے ہی نہ دیا، وہ سر اٹھا کر اپنے دماغ سے کچھ سوچ سکے یا کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کر سکے جس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ بعد نسل عورتوں کے اخلاق میں پستی اور ان کے اعمال و افعال میں بے اعتدالی پیدا ہوتی رہی۔ اور اس لئے قرآن نے اس آیت میں مرد کی فضیلت کا جو ذکر کیا ہے وہ صرف اس اعتبار سے ہے کہ "واقعہ یہ ہے" نہ اس لحاظ سے کہ "فطرت ہی یہی ہے"۔

میں نے اس سبب کو "سبب اتفاقی" اسی لئے کہا ہے کہ بلا واسطہ میراث کے مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ضمناً مرد کی ایک خصوصی فضیلت کا ذکر کر دیا گیا ہے۔

سبب ذاتی | (۲) "مرد اپنا مال عورتوں پر خرچ کرتے ہیں"۔

یہاں فضیلت کا سبب یہ بتلایا گیا ہے کہ چونکہ مرد پر مہر اور نفقہ وغیرہ بھی فرض ہے اس لئے ان حقوق کی ادائیگی کے اعتبار سے عورت کے مقابلہ میں مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔

حقیقۃً استحقاقِ وراثت میں مرد کی فضیلت کا واحد سبب صرف یہی ہے۔ اسی وجہ سے امام شافعیؒ اور امام مالکؒ اور دیگر ائمہ کبار نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر مرد میں عورت کو نان نفقہ دینے کی صلاحیت باقی نہ رہے یا وہ دانستہ اس کے دینے سے اعراض کرے تو قاضی کو چاہیئے کہ اس کا نکاح فسخ کرا دے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے :-

"اور مرد کو عورت پر فضیلت اس وجہ سے ہے کہ وہ اس کو نان نفقہ دیتا ہے۔ اور طلب معاش کی مساعی میں دن رات منہمک رہتا ہے۔"[۹۱]

علامہ رازی فرماتے ہیں :-

"اور اگرچہ معاشرتی اور مادی انتفاع کے لحاظ سے ازدواج کے بعد مرد و عورت دونوں ایک حیثیت سے منتفع ہوتے ہیں لیکن پھر بھی خدا نے مردوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ عورتوں کو مہر ادا کریں اور ان کے خورد و نوش وغیرہ کے کفیل ہوں۔ اور اس لئے عورت کے حقوق کی اس زیادتی کے بعد میراث کے مسئلہ میں مرد کے مقابلہ میں جو کمی تھی وہ پوری ہو جاتی ہے۔ اور مرد کی کوئی فضیلت باقی نہیں رہتی۔"[۹۲]

بہر حال اس آیت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو یہ بتلایا جائے کہ اگر میراث میں اُن کا حصہ مرد کے مقابلہ میں ایک تہائی رکھا گیا ہے تو یہ مرد کی کسی امتیازی خصوصیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اصولاً ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا کیونکہ عورتیں مہر اور نان و نفقہ وغیرہ کی بھی حقدار ہوتی ہیں۔ اور اس لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو مجموعی حیثیت سے اُن کا حصہ مرد کے برابر ہی ہو جاتا ہے۔

الغرض قرآن کی ان تصریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ازدواج سے پہلے منزل زندگی میں عورت کا مرتبہ کسی حیثیت سے مرد کے مقابلہ میں گرا ہوا نہیں ہے۔

ازدواج کے بعد عورت کی پوزیشن | ازدواج کے بعد یعنی شوہر کے گھر میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے

---

۹۱ جلد ثالث صفحہ ۸۳

۹۲ تفسیر کبیر جلد ثالث صفحہ ۲۱۶

عورت کی پوزیشن جو کچھ ہو سکتی ہے اس کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے۔

سورہ بقرہ میں ہے :-

"(۱) اور مردوں پر بھی عورتوں کے لئے وہ تمام باتیں واجب ہیں جو عورتوں پر مردوں کے لئے ہیں۔

(۲) البتہ مردوں کا درجہ کچھ بڑھا ہوا ہے " (پارہ ۲، سورہ بقرہ، رکوع ۲۸ آیت ۲۲۸)

اس آیت کے دو جزو ہیں۔ پہلے جزو کی تفسیر میں حضرت ابن عباس فرماتے ہیں :۔

"مردوں کے اوپر بھی اپنی بیویوں کے حقوق کی بجا آوری اور ان کی حرمت و عزت کا خیال اسی طرح واجب ہے جس طرح عورتوں کو "

دوسرے جزو کی تفسیر میں تمام مفسرین کی جو رائے ہے وہ بیضاوی کے ان الفاظ سے زیادہ اچھی طرح ظاہر ہو سکتی ہے :۔

"یعنی مردوں کے حقوق میں کچھ زیادتی ہے۔ اس لئے کہ عورتوں پر جو حقوق ہیں وہ تو صرف ان کی ذات سے متعلق ہیں۔ لیکن اس کے خلاف مردوں کے حقوق ان کی جان و مال دونوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ مہر اور ادائے نفقہ وغیرہ مرد ہی پر فرض ہے "

اس تفسیر کے بعد یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں مرد کی جس فضیلت کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف حقوق بہ مہر و کفالت وغیرہ کی بنا پر ہے۔

اب پہلے جزو کی تفسیر پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حضرت ابن عباسؓ کے قول کے بموجب زن و شوہر پر باہم دو چیزیں واجب ہیں۔ ایک تو آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرنا۔ اور دوسرے حقوق کی بجا آوری۔ چونکہ تمام مفسرین کے قول کے مطابق آیت کے دوسرے جزو میں مرد کو جو فضیلت دی گئی ہے اس کا تعلق صرف "حقوق" سے ہے اس لئے ظاہر ہے کہ "حرمت و عزت" میں مرد و عورت دونوں برابر ہوگئے۔ یعنی اب آیت کا مفہوم یہ ہوگیا :۔ "مردوں اور عورتوں پر فرض ہے کہ وہ آپس میں ایک حیثیت سے ایک دوسرے کا احترام کریں۔ اور اپنے اُن حقوق کو جو دونوں پر برابر ہیں اچھی طرح ادا کرتے رہیں۔ البتہ

نان و نفقہ اور مہر وغیرہ کی وجہ سے مردوں پر عورتوں کے حقوق زیادہ ہیں۔"

تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے: "جس طرح میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ میری بیوی میری وجہ سے بناؤ سنگار کرے اسی طرح میں یہ بھی اچھا سمجھتا ہوں کہ میں خود بھی اس کی خاطر بنا سنورا رہوں۔ اس لئے کہ خدا نے کہا ہے "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ"[91]

ایک مرتبہ کسی صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "ہماری بیویوں کے ہم پر کیا حقوق ہیں؟" آپ نے اس کے جواب میں فرمایا: "یہی کہ جب تم کھاؤ تو اس کو بھی کھلاؤ، جب خود پہنو تو اس کو بھی پہناؤ، اس کے چہرہ پر کوئی ضرب نہ لگاؤ۔ اُسے بُرا بھلا مت کہو۔ اور خواب گاہ کے علاوہ کبھی اس کو اکیلا نہ چھوڑو (یعنی اگر تم کسی بات پر اس سے بے حد ناراض ہو جاؤ تو زیادہ سے زیادہ یہ کرو کہ بیوی کے ساتھ "اختلاط" نہ کرو۔ لیکن اس کے علاوہ ایسا نہ کرو کہ اس کو اکیلا چھوڑ کر کہیں اور چلدو[92])"

سورۂ نساء میں ہے:۔

> "اور اپنی بیویوں کے ساتھ حسن وخوبی سے زندگی بسر کرو۔ پھر اگر وہ تم کو ناپسند ہو تو محض اس بنا پر اُن کے ساتھ بدسلوکی سے پیش نہ آؤ (اس لئے کہ) بہت ممکن ہے کہ جس چیز کو تم بُرا سمجھ رہے ہو خدا اسی میں تمہارے لئے کوئی بڑے نفع کی بات رکھ دے"۔ (پارہ ۴ سورۂ نساء، رکوع ۳، آیت ۱۹)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر سدی کی سند سے لکھتے ہیں کہ "مردوں کو چاہیئے کہ عورتوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آئیں۔ اور اُن کے ساتھ دوستانہ حیثیت سے زندگی گذاریں[93]"

سورۂ بقر میں ہے:۔

---

[91] جلد اوّل صفحہ ۲۷۶۔

[92] ابن کثیر جلد اول صفحہ ۲۷۶

[93] جلد ۴ صفحہ ۲۰۰

"لہذا آپس میں ایک دوسرے پر مہربانی کرنا نہ بھولو، بیشک اللہ اُن تمام چیزوں
کو دیکھتا سنتا ہے جو تم کرتے ہو" (رکوع ۳۱، آیت ۲۳۷)

یہ آیت کس قدر جامع ہے۔ پہلے تو آپس میں لطف و مودت سے رہنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن چونکہ سوسائٹی کا مذاق بگڑا ہوا تھا، عورتوں کو ذلیل سمجھا جا رہا تھا اس لئے شدید تنبیہ کے طور پر مردوں کو مخاطب کرکے کہا گیا:۔ "دیکھو تم اپنے برتاؤ میں کچھ زیادتی نہ کرنا، یاد رکھو تمھاری ہر ہر حرکت کو خدا دیکھ رہا ہے۔"

چونکہ عورت کے ساتھ جو بدسلوکیاں کی جارہی تھیں اُن کو برداشت کرنا رسم و رواج کے ماتحت عورتیں اپنا فرض سمجھتی تھیں اس لئے مرد کے لئے یہ بہت اچھا موقع تھا کہ وہ گھر کی چہار دیواری میں عورت کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔ کیونکہ نہ تو وہاں اُس کو کوئی دیکھنے والا ہوگا اور نہ عورت کسی کے آگے بیٹھ کر اپنا دُکھ روئے گی۔

غور کیجئے کہ اس بے انصافی کے دور کرنے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہو سکتا تھا کہ خدا پکار کر یہ کہہ دے کہ "دیکھو تم اس خیال میں نہ رہنا کہ تمھاری باتیں کوئی دیکھتا سنتا نہیں، بیشک خدا سب کچھ دیکھ رہا ہے"

سورہ روم میں ہے:۔

"(اور خدا کی حقانیت کے دلائل میں سے) ایک یہ ہے کہ اُس نے تمھاری ہی جنس
کی بیویاں بنائیں تاکہ تم اُن کی طرف مائل ہو اور اُن سے محبت کرو[۵] اور تمھارے
درمیان محبت اور ہمدردی پیدا کی" (رکوع ۳، آیت ۲۱)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ بیضاوی لکھتے ہیں:۔

"مرد و عورت میں محبت و ہمدردی کی ضرورت اس لئے ہے تاکہ انسانی معاشرت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے جس کا انحصار باہمی امداد اور تعاون پر ہے۔ اور اس امداد و تعاون کے لئے ضروری ہے کہ

---

[۵] "لتمیلوا الیھا وتألفوا بھا" بیضاوی

مرد و عورت دونوں آپس میں لطف و مراعات کے ساتھ زندگی بسر کریں "

اس کے علاوہ اور بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن کریم نے متعدد بار مختلف پیرایوں سے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ عورت و مرد دونوں فطری اعتبار سے ایک سطح پر کھڑے ہیں لیکن چونکہ عورت کو ہزاروں برس کے تمدن نے پیس رکھا تھا اس لئے زندگی کی بعض ذمہ داریوں کا کفیل مرد کو قرار دیا ہے۔ لیکن جگہ جگہ مردوں کو مناسب ہدایتیں کردیں تاکہ جیسے جیسے عورتوں میں صلاحیت پیدا ہوتی رہے وہ "ہوم رول" کے درجہ سے گذر کر "مکمل آزادی" کے مراتب حاصل کرتی رہیں۔

لیکن منزلی زندگی میں عورت کو جو کچھ پوزیشن حاصل ہے وہ پوری طرح واضح نہ ہوگی اگر یہاں "تعدد ازدواج" پر کسی قدر تفصیلی بحث نہ کرلی جائے اس لئے کہ اس مسئلہ سے عورت کی منزلی زندگی کا بہت گہرا تعلق ہے۔

یہ مسئلہ بھی آج کل بہت دلچسپ بن گیا ہے جس پر عجیب عجیب انداز سے بحثیں کی گئی ہیں، تقشف پرست علما اس کے شدت سے حامی ہیں۔ بعض نو تعلیم یافتہ اس کو بادلِ ناخواستہ مانتے ہیں، بعض نے اسلام کے اس حکم کو وحشت و بربریت پر محمول کیا ہے۔ بہر حال ہم یہاں جذباتی اعتبار سے کوئی اظہارِ خیال نہیں کرسکتے۔ ہمیں سکونِ قلب کے ساتھ یہ دیکھنا ہے کہ اسلام کا صحیح مسلک اس کے متعلق کیا ہے۔

تعدد ازدواج کی آیت کے متعلق حضرت ابن عباسؓ لکھتے ہیں:-

"پہلے یتیموں کے تحفظ کے لئے یہ آیت نازل ہوئی:- "یتیموں کو اُن کا مال دیدیا کرو۔ اور ان کے مال میں ناجائز خورد برد کرکے پاک چیز کے عوض میں پلید چیز مت خریدو۔ اور نہ اُن یتیموں کے مال کو اپنے مال میں خلط ملط کرو۔ بیشک یہ بہت بڑا گناہ ہے" اس آیت میں یتیموں کے مال میں بے احتیاطی برتنے پر جو شدید تنبیہہ کی گئی تھی اس کی وجہ سے بنی غطفان کے کسی آدمی نے معصیت سے بچنے کے لئے یہ ارادہ کیا کہ وہ ان یتیموں کو اپنے سے علیحدہ کردے جو اس کی سرپرستی میں تھے اور جن کے کثیر مال کا وہ متولی تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:-

"اور اگر تم اس بات سے ڈرتے ہو کہ تم یتیموں کے مسئلہ میں انصاف نہ کرسکو گے تو

دو یا تین یا چار عورتوں تک سے نکاح کر لو۔ لیکن اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ تم اُن کے درمیان
مساوات قائم نہ رکھ سکو گے تو پھر ایک ہی رہنے دو یا اپنی لونڈی پر اکتفا کرو۔ اور یہ
زیادہ مناسب ہے تاکہ تم کسی پر زیادتی کرنے کے مجرم نہ ہو۔"

(پارہ ۴، سورہ نساء، رکوع ۱ آیت ۴)

اس شانِ نزول کے ساتھ یہ تاریخی صورتِ حالات اور ذہن میں رکھ لیجئے کہ یہ آیت ہجرت رسول کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے۔ اور تخمینی اعتبار سے اس کا سنہ نزول ۳ھ اور ۴ھ کے درمیان میں ہے۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی کا بیشتر زمانہ مکہ کے کفار یا مدینہ کے یہود کے ساتھ مسلسل جنگوں میں گذرا۔ چنانچہ اگر اس آیت کا سنہ نزول ۳ھ ہی مان لیا جائے تو اس وقت تک جو جنگیں ہو چکی تھیں اُن کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ پہلی جنگ (سریہ) عبداللہ بن جحش کی سرکردگی میں
۲۔ غزوۂ بدر
۳۔ غزوۂ بنی قینقاع
۴۔ زید ابن حارث کی سرکردگی میں مضافات نجد کی طرف (سریہ)
۵۔ غزوۂ احد

ان جنگوں میں مسلمانوں کے بہت سے آدمی شہید ہو گئے اور وہی نتیجہ ہوا جو جنگ عظیم کے بعد آج یورپ میں نظر آ رہا ہے۔ یعنی عورتوں کی تعداد میں مردوں کی نسبت سے بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ بے لاوارث بیوہ عورتیں اور یتیم بچے فطرتاً دوسرے اعزا یا اور لوگوں کی کفالت میں پرورش پانے لگے۔ اب قدرتاً ایک طرف تو یتیموں کے مال میں ناجائز دستبرد ہونا شروع ہوئی اور دوسری طرف نوجوان بیوائیں اور نوعمر یتیم لڑکیاں اپنے کفیلوں کے لئے مستقل "دعوتِ معصیت" بن گئیں۔ قرآن نے اسی خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے مذکورہ بالا آیت کے ذریعہ سے یتیموں کے مال میں ناجائز تصرف کرنے کے خلاف سخت تنبیہ کر دی۔ لیکن نوجوان لڑکیوں اور بیواؤں کے درمیان میں رہ کر "ترغیباتِ معصیت" سے محفوظ رہنا انسانی فطرت سے بہت بعید تھا۔

اس لئے صحابۂ کرام نے اس آیت کے نزول کے بعد معصیت سے بچنے کی خاطر یتیموں کی کفالت ہی کو اعراض کرنا چاہا۔ اب صورتِ حالات بہت پیچیدہ ہو گئی۔ ایک طرف نوجوان بیواؤں اور لاوارث نوعمر یتیم لڑکیوں کی اخلاقی حالت خطرہ میں تھی، دوسری طرف صحابہ قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی تنبیہ سے ڈر کر یتیموں اور بیواؤں کی کفالت سے دستبردار ہونا چاہتے تھے۔ تیسرے عرب میں یتیم اور بیوہ عورتیں بہت غیر دقیع سمجھی جاتی تھیں اور اُن سے نکاح کرنا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ ایسے نازک حالات میں عورتوں اور مردوں دونوں کو معصیت کے پھندوں سے بچانے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی چارۂ کار ممکن نہ تھا کہ مردوں کو ایک محدود تعداد میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دیدی جائے۔

چنانچہ تعدد ازدواج کے متعلق اس حکم کے نازل ہونے کے بعد جب صحابہ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کے متعلق بعض باتیں دریافت کیں تو ارشاد ہوا:۔

"اور یہ لوگ آپ سے عورتوں کے متعلق احکامات دریافت کرتے ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ خدا تم کو اُن کے متعلق احکامات بتلاتا ہے۔ لیکن وہ آیات بھی یاد رکھو جو تم کو یتیم عورتوں کے متعلق سنائی گئی ہیں۔ جن کو تم اُن کے واجبی حقوق نہیں دیتے اور اُن کے ساتھ نکاح کرنے سے نفرت کرتے ہو۔"

(پارہ ۵ سورہ نساء رکوع ۱۹ آیت ۱۲۷)

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لاوارث یتیم عورتوں کے مسئلہ میں عربوں کی ذہنیت کیا تھی۔ اب اگر اس آیت کو مذکورہ بالا حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ "اسلام نے تعدد ازدواج کا حکم ایک ایسے اُلجھے ہوئے موقعہ پر دیا ہے جب اس کے سوا کوئی اور نجات کا راستہ ممکن ہی نہ تھا۔

پھر یہ ہو سکتا تھا کہ جب صورتِ حالات بہتر ہو جاتی تو یہ حکم منسوخ کر دیا جاتا۔ لیکن چونکہ انسانی زندگی میں اس قسم کے مواقع آئندہ بھی پیش آنا ناگزیر تھے اس لئے اس حکم کو ناقابلِ عمل قرار دینا کسی حیثیت سے قرینِ مصلحت نہ ہوتا۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان تمام حالات کے ماتحت بھی تعدد ازدواج کے جواز کی اجازت غیر مشروط طور پر نہیں دی گئی ہے۔ بلکہ جواز کا حکم دینے کے فوراً بعد تنبیہاً یہ کہا گیا ہے:۔

"لیکن اگر تم کو یہ خوف ہو کہ تم اپنی بیویوں کے درمیان مساوات کو قائم نہ رکھ سکو گے
تو پھر ایک سے زیادہ شادی نہ کرو۔ اور یہی زیادہ مناسب ہے تاکہ تم کسی پر زیادتی
نہ کر سکو۔" (پارہ ۴ سورۂ نساء، رکوع ۱ آیت ۳)

اس آیت میں تعدد ازدواج کے لئے "مساوات" کو ضروری قرار دیا ہے جس کے بعد کل آیت کا مطلب یہ ہو جاتا ہے:۔ "تعدد ازدواج اس وقت جائز ہے جبکہ مرد کو اپنی اس قوت پر پورا اعتماد ہو کہ وہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کے بعد اپنی بیویوں میں مساوات قائم رکھ سکے گا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کے لئے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا مناسب نہیں ہے۔"

علامہ ابن جریر نے اس آیت کا جو مطلب لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ:۔ "جس طرح اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ تم یتیموں کے مسئلہ میں انصاف نہ کر سکو گے اسی طرح گو ہم نے تم کو چار بیویوں تک نکاح میں لانے کی اجازت دے دی ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ کھٹکا لگا ہوا ہے کہ تم ایک سے زیادہ بیویوں کی صورت میں میلانِ طبعی، تعلقاتِ جنسی اور دیگر حقوق وغیرہ میں ان کے درمیان مساوات قائم نہ رکھ سکو گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ تم ایک بیوی پر قناعت کرو۔ تاکہ تم اپنی بیویوں میں بے انصافی کرنے کے جرم سے بچے رہو۔ چونکہ زمانہ جاہلیت میں دس دس عورتوں سے بیک وقت نکاح کر لیا کرتے تھے اس لئے اس آیت میں عورتوں کے حقوق کو جتلاتے ہوئے ان کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دی گئی ہے۔"[۵]

بہرحال تعدد ازدواج کی ساری عمارت "مساوات" کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے۔ لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ مساوات قائم رکھنے کا امکان ہمارے اندر کس حد تک ہے۔

۵؎ جلد ۴ صفحہ ۱۴۴ تا ۱۴۸

قرآن میں ہے :۔

"اور تم اپنی بیویوں کے درمیان مساوات قائم نہیں رکھ سکتے اگرچہ تم اس بات کی خواہش کرو۔ اس لئے تم کو چاہئے کہ کسی ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ۔ اس طرح کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو"

(پارہ ۵ سورہ نساء، رکوع ۱۹ آیت ۱۲۹)

یہاں "مساوات" کے متعلق جو فلسفہ بیان کیا گیا ہے وہ اتنا مکمل ہے کہ اس پر ایک لفظ کا اضافہ ممکن نہیں ہے۔ حقیقتہً کئی بیویوں کے درمیان صحیح طور پر مساوات قائم رکھنا قریب قریب ناممکن ہے۔ پھر اگر اس مساوات کو قائم رکھنے کی کوشش کی بھی جائے تو "گھر کی مسرتیں" Domestic Pleasures مفقود سی ہو جاتی ہیں۔ اور زندگی ایک مستقل عذاب بن کر رہ جاتی ہے۔

حضرت معاذؓ کے متعلق مروی ہے کہ "آپ کی دو بیویاں تھیں۔ جب ایک کے گھر میں رہنے کی باری ہوتی تھی تو دوسری کے گھر میں وضو بھی نہ کرتے تھے۔ پھر یہ دونوں طاعون میں مر گئیں۔ آپ نے ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا"[۹۱]

حضرت معاذؓ کے اس طرز عمل سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے لئے گھر کی زندگی میں وہ بے تکلفی اور سکون قلبی باقی نہ رہا تھا جو بالعموم گھر میں حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ اس کے برعکس گھر کی چہار دیواری میں بھی آپ ایک تعجب انگیز نظم و نسق کے ماتحت کام کرنے پر مجبور تھے۔

علامہ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں پندرہ بیس صحابہ کے اقوال بسند نقل کئے ہیں جن میں سب اس پر متفق ہیں کہ "کوشش کے بعد اور تمام باتوں میں تو مساوات ہو سکتی ہے لیکن محبت اور "اختلاط" میں مساوات قریب قریب ناممکن ہے"[۹۲]

---

۹۱ کشاف جلد اول صفحہ ۲۹۰

۹۲ جلد ۵ صفحہ ۱۸۶

حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر فرمایا کرتے تھے ۔" اے خدا اپنے دل پر تو مجھے قابو نہیں ہے۔ لیکن اس کے سوا اور تمام باتوں میں مجھے امید ہے کہ میں "مساوات" کر سکتا ہوں[۵۱] یعنی یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکتا کہ میں خلوص و محبت میں بھی اپنی تمام بیویوں سے "مساوات" برت سکوں۔ لیکن اس کے علاوہ بقیہ دوسرے حقوق کے متعلق میرا خیال ہے کہ غالباً میں اپنی بیویوں کے درمیان "مساوات" قائم رکھ سکوں گا۔

مولنا اشرف علی تھانوی نے اپنی تفسیر "بیان القرآن" میں اس آیت کے ذیل میں تعدد ازدواج کی غیر مشروط حمایت کرتے ہوئے لکھا ہے ۔" یہاں عدل (مساوات) سے عدل فی المحبۃ مراد ہے۔ اور وہ عادتاً قدرت میں نہیں ہے۔ اس لئے اس کی نفی فرمائی۔ پس اس ہوا پرست کے دعویٰ سے اس کو اصلاً مس نہیں[۵۲] ("ہوا پرست" سے مولنا نے یہاں ان لوگوں کو مراد لیا ہے جو چار بیویوں کے بجائے صرف ایک بیوی پر اکتفا کرنے کے قائل ہیں "فتدبّر")

گویا مولنا کے خیال کے مطابق اس آیت میں صرف "عدل فی المحبۃ" کے امکان کو دشوار بتلایا گیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں سمجھ لیا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے ۔

" اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے درمیان تمام باتوں میں پوری پوری طرح مساوات قائم نہیں کی جا سکتی۔ پھر اگر ظاہری مساوات اس طرح حاصل بھی ہو جائے کہ مرد ایک ایک رات ہر ایک کے یہاں رہنے لگے تو محبت، میلان طبعی اور "اختلاط جنسی" وغیرہ میں تو مساوات قریب قریب محال ہے"[۵۳]

علامہ زمخشری لکھتے ہیں ۔

"عورتوں کے درمیان مساوات قائم رکھنا اتنا مشکل کام ہے کہ بعض اوقات اس کے محال

---

[۵۱] کشاف جلد ۵ صفحہ ۱۸۶

[۵۲] جلد ثانی صفحہ ۹۲

[۵۳] جلد ثالث صفحہ ۲۱۰

ہونے کا شبہ گزرنے لگتا ہے اس لئے کہ واجب تو یہ ہے کہ ان کے درمیان ہر چیز میں مساوات ہو مثلاً نان نفقہ خبر گیری، ملاقات، توجہ، ہمدردی، محبت، دلچسپی اور اس کے علاوہ وہ تمام باتیں جو شمار میں بھی نہیں آسکتیں۔

اس لئے یہ کہہ کر کہ "پس تم کو چاہئے کہ کسی ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ" خدا کی طرف سے ایک قسم کی عتاب آمیز تنبیہہ کی گئی ہے۔[۵]

ان ائمہ نے اس آیت کی جو تفسیر کی ہے اس سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ تمام باتوں میں مساوات قائم رکھنا مشکل ہے۔ لیکن محبت اور طبعی میلان میں تو قریب قریب ناممکن ہی ہے۔ مگر مولانا اشرف علی کے مذکورہ بالا استدلال کا مطلب بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ "طبعی میلان" اور محبت میں مساوات قائم رکھنا عادتاً محال ہے اس لئے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ باقی باتوں میں مساوات رکھنا کافی ہے۔

یہ استدلال منطقی اعتبار سے زیادہ بعید از عقل نہیں ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ قرآن و حدیث سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے یا نہیں۔

قرآن کی عبارت یہ ہے:- "فلا تمیلوا کل المیل" (تم کو چاہئے کہ کسی ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ اس طرح کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو) اس آیت میں وضاحت کے ساتھ "میل" کا لفظ ذکر کیا گیا ہے جس کے معنی "میلان طبعی" کے سوا اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر اگر اس کے ساتھ علامہ زمخشری کا یہ قول بھی شامل کر لیا جائے کہ "اس آیت میں (ایک سے زیادہ شادی کرنے والوں کو) خدا کی طرف سے ایک قسم کی عتاب آمیز تنبیہہ کی گئی ہے" تو یہ کہنا کسی صورت سے صحیح قرار نہیں پا سکتا کہ طبعی میلان یا محبت میں مساوات قائم رکھنا ضروری نہیں ہے۔

علاوہ ازیں جس آیت میں تعدد ازدواج کے جواز کا حکم ہے وہاں یہ کہا گیا ہے:- "اور زیادہ مناسب تو یہی ہے (کہ تم ایک سے زیادہ شادی نہ کرو) تاکہ تم کسی پر زیادتی کرنے کے مجرم نہ ہو" گویا قرآن اس خطرہ کو

---

[۵] کشاف جلد اول، صفحہ ۳۸۹ و ۳۹۰

اچھی طرح محسوس کر رہا تھا کہ ایک سے زیادہ بیویوں کے درمیان پوری پوری "مساوات" محال ہے۔ اس لئے حالات کی پیچیدگی کی بنا پر اجازت تو سلب نہیں کی لیکن تنبیہاً اس بات کو واضح کر دیا کہ جہاں تک ہو سکے اس سے مجتنب ہی رہو۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کی کئی بیویاں ہوں اور اس کا طبعی میلان کسی ایک کی طرف زیادہ ہو تو قیامت کے روز اُس کا ایک شانہ دوسرے شانہ کے مقابلہ میں دبا ہوا ہوگا۔[۵۱]

رسول کریم نے اس حدیث کے ذریعہ سے جو وعید فرمائی ہے اُس میں وضاحت کے ساتھ "میلان" کا لفظ ذکر کیا گیا ہے۔

پھر اگر میلان طبعی یا محبت میں مساوات قائم رکھنا غیر ضروری ہوتا تو نبی کریم اس چیز کو وضاحت سے ظاہر فرما دیتے۔ لیکن اس کے برعکس خود آپ کی یہ حالت تھی کہ ہر وقت اس چیز سے ڈرتے رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام بیویوں کے درمیان ہر چیز کو برابر برابر تقسیم فرما دیتے تھے اور مساوات کو قائم رکھتے تھے۔ لیکن پھر بھی فرمایا کرتے تھے کہ "اے اللہ مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں نے کر دیا۔ اب رہا "طبعی میلان" سو اس پر مجھے قابو نہیں۔ مجھے اس میں قابل الزام نہ سمجھ"[۵۲]

غور کیجئے کہ اگر مذکورہ بالا آیت سے "طبعی میلان" کا جواز ثابت ہوتا تو پھر رسول کریم کو "مجھے اس میں قابل الزام نہ سمجھ" کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

علاوہ ازیں اگر "مساوات" کے مفہوم سے "میلان طبعی" اور تعلقات جنسی کو خارج کر دیا جائے تو آیت کا یہ جزو بے معنیٰ سا ہو جاتا ہے کہ "تم کو چاہئے کہ ایک بیوی کی طرف پوری طرح مائل نہ ہو جاؤ اس طرح کہ دوسری کو ادھر میں لٹکتا چھوڑ دو"۔

---

۵۱ ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۲۱۱

۵۲ ایضاً صفحہ ۲۱۰

زن و شوہر کے تعلقات کی ساری بنیاد ہی میلان جنسی پر قائم ہوتی ہے، نان نفقہ کو مناکحت کی اصل غرض قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اسی لئے فقہ میں مہر کو "منافع بضع" کی قیمت کہا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں "ادھر میں لٹکتا چھوڑ دینے" کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک پر تو میلان جنسی کی بارش ہو اور دوسری غریب کی بات بھی نہ پوچھی جائے یا وہ صرف روٹی کپڑے پر جئے۔

پھر چونکہ رسول کریم کے اقوال اور نصوص صریحہ کی ہدایات کے ہوتے ہوئے آپ کا ذاتی عمل قابل استناد نہیں ہے اس لئے ان تمام آیات و احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے تعدد ازدواج کے جواز کے متعلق مندرجہ ذیل فقہی مسائل مستنبط ہو سکتے ہیں۔

(اوّل) ۱۔ اگر مرد کے پاس اتنی دولت ہو کہ وہ ایک سے زیادہ بیویوں کو اور اس کے بعد ہر ایک بیوی کی متوقعہ اولاد کو مساوی طور پر اس حیثیت کا نان نفقہ دے سکے جس حیثیت کے معاشرتی حلقہ میں اس کی نشست برخاست ہے۔ اور

۲۔ اگر طبی نقطۂ نظر سے اس کے جسمانی قویٰ میں اتنی طاقت ہو کہ وہ عمر کے آخری حصہ تک ہر بیوی کے ساتھ ایک حیثیت سے "ترغیبات جنسی" کے بموجب زندگی گذار سکے۔ اور

۳۔ اگر چند ثقہ لوگوں کی رائے میں یا قاضی کے ذاتی استدلال کی بنا پر اس کے روزمرہ کو معاملات اور طبعی افتاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی ذات سے اس بات کی توقع ہو کہ وہ اپنی بیویوں میں "مساوات" قائم رکھ سکے گا۔ تو

اس کے لئے حسب منشا ایک سے لے کر چار بیویوں تک سے بیک وقت نکاح کرنا جائز ہے۔

(دوم) اگر کسی ملک میں لڑکوں اور لڑکیوں کا تناسب برابر ہو۔ یا لڑکیاں لڑکوں سے کم ہوں۔ اور عام معاشرت کی بنا پر ہر لڑکی کے لئے مناسب لڑکا ملنا آسان ہو۔ اور ایک سے زیادہ بیویاں کرنے سے دوسرے نوجوانوں کا حق سلب ہوتا ہو تو حاکم وقت کو چاہئے کہ تعدد ازدواج پر حسب اقتضائے مصلحت شدید پابندیاں عائد کر دے۔

(سوم) ان تمام شرائط کے پائے جانے کے باوجود بھی ایک سے زیادہ بیویاں کرنا مکروہ ہے۔

ان شرائط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر آپ تعددِ ازدواج کے مسئلہ میں امعانِ نظر سے کام لیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورتوں کی دماغی اور ذہنی ترقی اور ان کی معاشرتی حالت کی بلندی کے لئے اس سے بہتر اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ گذشتہ صفحات میں اس حقیقت پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ عورت ہزاروں برس سے شکستہ حال چلی آرہی تھی جس کی بنا پر امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کی دماغی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں میں خطرناک حد تک نقص پیدا ہو گیا تھا۔ اسلام نے اس بے انصافی کو جو عورت کے ساتھ کی جا رہی تھی پوری طرح محسوس کیا اور اس کو دور کرنے کے لئے جو ممکن تدابیر اختیار کی جا سکتی تھیں ان کو پوری قوت کے ساتھ رائج کیا۔ چنانچہ مردوں کے قلوب میں پہلے تو یہ بات راسخ کی کہ وہ عورتوں کے مسئلہ میں بہت احتیاط برتیں، اُن کو برا بھلا نہ کہیں، اُن کو اپنی طرح پڑھائیں لکھائیں، ورثہ اور ملکیت میں اُن کو برابر کا شریک سمجھیں۔ لیکن عورت میں اُس وقت اس امر کی صلاحیت نہ تھی کہ دفعتہً سوسائٹی میں مرد کے دوش بدوش لائی جا سکے یا معاشرتی ذمہ داریوں کی بذاتِ خود کفیل ہو سکے۔ اس امر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسلام نے تعددِ ازدواج کے توسط سے ذی استطاعت مردوں کی سرکردگی میں عورتوں کو پوری پوری آزادی کے ساتھ اپنی اصلاح کرنے کا موقعہ دیا۔ گویا یہ ایک ٹیوٹوریل سسٹم (Tutorial System) ہے جو عورت کی دماغی اور اخلاقی ترقیوں کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

پھر عورت کو نکاح کے مسئلہ میں کامل اختیار ہے۔ مردوں کو صراحتہً ہدایت کر دی گئی ہے کہ:-

"کہ وہ جبراً عورتوں کے مالک نہ بنیں" (سورہ نساء، رکوع ۳، آیت ۱۹)

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ کوئی عورت کسی شادی شدہ مرد کی دوسری یا تیسری بیوی بننے پر اسی وقت راضی ہو سکتی ہے جبکہ سوسائٹی کی حالت خراب ہو، مناسب مردوں کی کمی ہو، یا عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہو جائے۔ لیکن اگر یہ صورتیں نہ ہوں۔ یا عورت اپنی گذراوقات کے لئے مرد کی ضرورت محسوس نہ کرے تو دنیا کی کوئی طاقت اُس کو شادی کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

بہرحال تعددِ ازدواج عورتوں کے لئے ایک تحفظ (Safeguard) ہے جب تک عورتوں کو اس کی ضرورت ہے اس وقت تک وہ اس کو استعمال کرنے کا پورا پورا حق رکھتی ہیں۔ جس دن وہ اس چیز کو

غیر ضروری سمجھیں گی اسی دن وہ بلا کسی زحمت کے اس سے علیحدہ ہو سکیں گی۔ اور اس طرح گو شرعی اعتبار سے اس کا جواز باقی رہے گا لیکن عملاً یہ چیز مفقود ہو جائے گی۔

غرض اس تمام بحث کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تعدد ازدواج سے عورت کی منزلی زندگی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔

جس طرح تعدد ازدواج عورت کی معاشرتی اصلاح کے لئے ایک مفید ترین حکم ہے اسی طرح عورت کی افسوسناک اخلاقی حالت کو دیکھتے ہوئے قرآن نے مرد کو بعض ایسے اختیارات بھی دئے ہیں جو اسکول میں ایک ہوشیار معلم کو اس لئے عطا کئے جاتے ہیں تاکہ طلباء میں علم و عمل کی صحیح اسپرٹ پیدا ہو۔ اور ان میں مستقبل کے بہترین نوجوان بننے کی صلاحیت مفقود نہونے پائے۔

سورہ نساء میں ہے :-

"جو عورتیں ایسی ہوں کہ تمہیں اُن کی بد دماغی کا خوف ہو تو تم اُن کو سمجھاؤ۔ (اور اگر سمجھانے سے باز نہ آئیں تو) اُن کی خوابگاہوں میں اُنھیں تنہا چھوڑ دو۔ (اور اگر یہ ترکیب بھی بے سود ثابت ہو تو) اُن کو مارو۔ لیکن اگر وہ تمھارا کہنا مان لیں تو پھر خواہ مخواہ اُن کے خلاف کوئی حیلہ مت تراشو، بیشک خدا کی ذات بہت بلند اور ذی عظمت ہے" (رکوع ۶، آیت ۳۴)

اس آیت کے شانِ نزول میں علامہ رازی نے لکھا ہے :-

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ ہم یعنی قبیلۂ قریش کے لوگ اپنی عورتوں پر خاصا اثر رکھتے تھے لیکن جب ہم مدینہ میں آئے تو ہم نے دیکھا کہ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ پھر جب ہماری عورتوں کا ربط ضبط ان عورتوں سے زیادہ بڑھا تو وہ ہم سے ہر بات پر لڑنے جھگڑنے لگیں۔ یہ حالت دیکھ کر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور میں نے کہا کہ ہماری عورتیں ہمارے ساتھ دریدہ دہنی سے پیش آتی ہیں۔ اس پر ہمیں ان کو مارنے کی اجازت دیدی گئی۔ پھر وہ عورتیں جمع کی گئیں جو اپنے شوہروں کی شاکی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی شکایات سُن کر ان کے شوہروں کو قابل الزام قرار دیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ

بیویوں کو مارتے ہیں، وہ ان لوگوں کے مقابلہ میں اچھے نہیں کہے جا سکتے جو مارنے سے اجتناب کرتے ہیں۔
چنانچہ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نہ مارنا زیادہ اچھا ہے۔[۵۷]

دیگر مفسرین نے اس آیت کے شانِ نزول میں اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

ایک مرتبہ سعد ابن ربیع کی بیوی سے اور اُن سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، جس پر سعد ابن ربیع نے اپنی بیوی کے ایک طمانچہ مار دیا۔ بیوی کو یہ بات ناگوار ہوئی چنانچہ وہ اپنے والد کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر گئیں۔ آپ نے فرمایا کہ تم بھی طمانچہ کے عوض میں اس کے ایک طمانچہ مار دو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

شانِ نزول کے متعلق ان احادیث کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد اس امر کی صداقت میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ آیت عورتوں کی ان غیر معقول بد دماغیوں اور مجرمانہ بدخلقیوں کی اصلاح کے لئے نازل ہوئی تھیں جو سائٹی کے زہر آلود ماحول کے اثرات سے اُن میں سرایت کر چکی تھیں۔ چنانچہ اگر آپ قرآن کے ان الفاظ کو قانونی عبارت کی خشکی اور کرختگی میں تبدیل کر دیں تو بالکل یہ معلوم ہوگا کہ وزیر تعلیمات نے اسکول کے مدرسین کے نام تمام طلبار کی تہذیب و تادیب کے لئے ہدایات جاری کی ہیں۔

اس آیت میں عورتوں کی تادیب کے تین طریقے ذکر کئے گئے ہیں۔

۱۔ زبانی سمجھانا

۲۔ ناراض ہو کر ان سے "اختلاطِ جنسی" ترک کر دینا

۳۔ ان کو مارنا

پہلی دو صورتیں تو ایسی ہیں جو ہمارے عزیز ترین دوستوں اور قریب ترین اعزا میں بھی عام طور پر

---

[۵۷] تفسیر کبیر جلد ثالث صفحہ ۳۱۸

زیرِ عمل آتی رہتی ہیں۔ دوست سے ناراض ہوکر اس سے شکایت کرنا، کسی بات پر اس کو سمجھانا، زیادہ ناخوش ہونے کی صورت میں اس کے یہاں آنا جانا ترک کر دینا ہماری زندگی کے معمولات ہیں۔ اور اسی لئے بیوی کے مسئلہ میں ان دونوں ہدایات سے زن و شوہر کے اُن مساویانہ تعلقات پر کوئی ضرب نہیں پہنچتی جیسے قرآن نے مختلف مقامات پر خاص اہمیت دی ہے۔

اب اس آیت میں جو چیز قابلِ غور رہ جاتی ہے وہ صرف خدا کا یہ حکم ہے کہ اگر زبانی سمجھانے اور "روٹھنے" کی دونوں ترکیبیں ناکام ثابت ہوں تو پھر "مار" سے کام لو۔ اس کے متعلق یہ سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ اوّل تو قرآن کا یہ فیصلہ بالکل اُس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار باقی ہی نہ رہے۔ پھر اس کے باوجود بھی اولیٰ یہ ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس سے اجتناب کیا جائے۔ جیسا کہ شانِ نزول کے متعلق جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے اس میں بوضاحت مذکور ہے۔ اسی بنا پر تمام ائمۂ کبار کا اس پر اتفاق ہے کہ اگرچہ عورت کو مارنا بعض ناگزیر صورتوں میں جائز تبلایا گیا ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ حتی الامکان مارنے سے مجتنب رہے۔

نبی کریم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے متعلق جو ہدایات فرمائی تھیں ان کو اس آیت کی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ اس میں یہ ہے:-

"عورتوں کا فرض ہے کہ وہ تمہارے گھر میں کسی ایسے شخص کو قدم نہ رکھنے دیں جس سے تم نفرت کرتے ہو۔ پھر اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ہلکی سی مار مارو"[۵۱]

اس حدیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے مارنے کا حکم اس شدید غیظ و غضب کی حالت میں دیا ہے جبکہ اشتعالِ طبع کے ماتحت دنیا کے فوجداری قوانین میں قتل تک قابلِ معافی ہو جاتا ہے۔ پھر ایسی صورت میں بھی "ہلکی سی مار" کا حکم ہے۔ یعنی ایسی مار جس کا کوئی نشان بدن پر باقی نہ رہے۔

حضرت معاویہ بن حیدۃ القشیری اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[۵۱] ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۸۴

نے فرمایا کہ مرد کو چاہئے کہ عورت کے چہرہ پر نہ مارے اور نہ اس کو برا بھلا کہے۔ ۹۱
تفسیر کبیر میں ہے کہ کوڑے یا ڈنڈے سے مارنا جائز نہیں ہے۔ اگر چاہے تو رومال کو بل دیکر اس سے مارے۔ لیکن ضربات کی تعداد بہت ہونے کی صورت میں بھی بیس تک نہ پہنچنا چاہئے ۹۲
حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مسواک سے مار دے۔
غرض مارنے کی جو تشریح نبی کریم نے بیان فرمائی ہے اس پر اگر غور کیا جائے تو اس کو مارنا بمشکل کہا جا سکتا ہے۔ بلکہ ایک ہلکا سا "ٹھونکا دینا" ہوگا جو بعض اوقات ہم اپنے بے تکلف دوستوں میں بھی روا رکھتے ہیں۔
لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہے جبکہ عورتیں جاہل ہوں اور جاہلانہ حیثیت سے کسی بات پر اڑ جائیں۔ سمجھانے سے بھی باز نہ آئیں اور "روٹھنا" بھی بے کار ثابت ہو۔ اور اس طرح کی "ہلکی سی مار" سے اُن کی اصلاح بھی ممکن ہو۔ لیکن اگر عورت غیور ہو اور مار کی توہین کو برداشت نہ کر سکے، یا اس کی حیثیت عرفی مرد کے مقابلہ میں اتنی پست نہ ہو کہ مرد اس پر ہاتھ اٹھا سکے۔ یا اس کے دلائل جاہلانہ نہ ہوں یا مارنے سے اس کی اصلاح ممکن نہ ہو تو مرد کو مارنے کا اختیار نہیں ہے۔ بلکہ اس وقت کے لئے حکم ہے کہ۔

"اگر تم کو باہمی مخالفت کا ڈر ہو تو پھر ایک حَکَمْ مرد کے کنبہ سے لو اور ایک حَکَمْ اپنے کنبہ سے، اگر تم دونوں کو سچ مچ جھگڑا مٹانے کا خیال ہوگا تو یقیناً خدا تمھارے درمیان محبت پیدا کرے گا۔" (سورہ نساء رکوع ۶ آیت ۴۴)

غرض ان تمام امور کو سامنے رکھنے کے بعد یہ امر غیر مشتبہ طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن میں عورت کو مارنے کا حکم خود عورت کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے بعض ایسی خاص صورتوں میں دیا گیا ہے جب اس کے سوا کوئی اور علاج باقی ہی نہ رہے۔ اور طلاق سے علیحدگی حاصل کر لینا عورت کی معاشرتی بربادی کا باعث

---

۹۱ ابن کثیر جلد ثالث صفحہ ۸۳
۹۲ جلد ثالث صفحہ ۳۱۸

ہوتا ہو۔ پھر مارنے کا حکم مرد کے ذاتی جذبات کے مشتعل ہونے کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس وقت ہے جبکہ عورت کی بد دماغی اس درجہ مستقل صورت اختیار کرلے کہ گھر کا امن وسکون اس کی وجہ سے تلخ ہوگیا ہو۔ یا وہ بعض ایسی غیر معقول حرکات شروع کردے جو شرعاً اور اخلاقاً کسی حیثیت سے قابل معافی نہ ہوں۔ لیکن اگر ایسی صورت نہ ہو تو پھر قرآن کہتا ہے:۔

"لیکن اگر وہ تمھارا کہنا مان لیں تو پھر خواہ مخواہ ان کے خلاف کوئی حیلہ مت تراشو

بیشک خدا کی ذات بہت بلند اور ذی عظمت ہے" (۴ : ۳۴)

اس آیت کے آخری حصہ میں خدا کی ذات کو "بلند اور ذی عظمت" کہا گیا ہے۔ بہ ظاہر بیاں خدا کی اس صفت کا ذکر بے محل سا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر آپ قرآن کی اس اسپرٹ پر گہری نظر ڈالیں گے جو عورت کے متعلق تمام متذکرہ مسائل میں شروع سے لے کر آخر تک پائی جاتی ہے اور جس کا اجمالی بیان اس سے قبل کے صفحات میں گذر چکا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس آیت کو "عَلِیًّا کَبِیْرًا" (خدا کی ذات بہت بلند اور ذی عظمت ہے) کے جملے سے ختم کرنا اپنے اندر معانی کا ایک دریا پنہاں رکھتا ہے۔ اس جملے کے مفہوم کو اگر ذرا پھیلا کر بیان کیا جائے تو یہ ہوگا:۔ "خدا نے مردوں کو اس بات کی اجازت دیدی ہے کہ اگر بعض ناگزیر صورتوں میں طلاق دینے کے بجائے "معمولی سی مار" سے عورتوں کی اصلاح ممکن ہو تو تادیباً ان پر ہاتھ سے یا اسی قسم کی کسی اور نرم سی چیز سے دو تین ایسی ہلکی ضربیں لگا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جس سے نہ تو عورت کے بدن پر کوئی نشان پڑے اور نہ مستقل طور پر اس کے اندرونی اعضا میں کوئی اور تکلیف کھڑی ہو جائے۔ لیکن یاد رکھو کہ اس اجازت کا مقصد صرف عورتوں کی اصلاح ہے اس سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ خدا اس طرح مردوں کی عظمت و وقار کا سکہ عورتوں پر بٹھلانا چاہتا ہے۔ اس لئے کہ تم دونوں فطری اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہو۔ بیشک برتری اور عظمت صرف خدا ہی کی شان ہوسکتی ہے جس کے سامنے مرد و عورت دونوں ایک حیثیت رکھتے ہیں"

زن و شوہر کے تعلقات پر اس اجمالی تبصرہ کے بعد اب یہ دیکھئے کہ تقسیم عمل کے اعتبار سے اسلام نے شوہر کے گھر میں عورت کو کیا خدمات سپرد کی ہیں۔

درمختار میں ہے :-

" اگر عورت گھر کا کام کاج کرنے اور روٹی پکانے سے انکار کر دے خواہ کسی خاص سبب کی بنا پر اور خواہ اس وجہ سے کہ وہ کسی امیر گھرانے سے تعلق رکھتی ہو اور کام کاج کی عادی نہ ہو تو ایسی صورت میں مرد پر واجب ہوگا کہ وہ اس کے لئے پکا پکایا کھانا فراہم کرے ۔ لیکن اگر وہ میکے میں گھر کا معمولی کاروبار کرتی ہو اور پھر بلا سبب شوہر کے گھر میں کام کرنے سے انکار کرے تو شوہر پر اس کے لئے تیار کھانا منگوانا ضروری نہیں ہے اس لئے کہ ایسی حالت میں عورت کا اخلاقی فرض یہ ہونا چاہیئے کہ وہ شوہر کی امداد کرے "۵۱

اس کی توضیح میں علامہ شامی لکھتے ہیں :-

" لیکن ایسی صورت میں بھی عورت کو کام کاج کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا "۵۲

اسی طرح بچہ کو دودھ پلانا بھی عورت پر فرض نہیں ہے ۔ اگر عورت کسی وجہ سے بچہ کو دودھ پلانے سے انکار کر دے تو مرد پر واجب ہوگا کہ وہ اس غرض کے لئے کسی انّا کو ملازم رکھے "۵۳

ان احکامات کی روشنی میں عورت کی ازدواجی زندگی بالکل واضح ہو جاتی ہے ۔ گویا اسلام نے عورت کو شوہر کے گھر میں جو پوزیشن عطا کی ہے اگر اس کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے تو یوں کہہ سکتے ہیں :-

" عورت صحیح معنے میں مرد کی رفیق زندگی بن کر اس کے گھر میں قدم رکھتی ہے ۔ مرد پر لازم ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اس کے خورد و نوش کا انتظام کرے اور اس کی اخلاقی اور تعلیمی اصلاح سے کسی وقت غافل نہ ہو ۔ عورت اگر چاہے تو مرد کے گھر کا کاروبار کر سکتی ہے ۔ لیکن اگر وہ نہ چاہے تو مرد اس کو مجبور نہیں کر سکتا ۔ مرد پر واجب ہے کہ وہ اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئے اور کبھی اس کے ساتھ بدکلامی نہ کرے "

---

۵۱ جلد دوم باب النفقہ صفحہ ۷۰۴

۵۲ "

۵۳ ردمختار باب النفقہ صفحہ ۷۳۲

عورت کی سیاسی اور ملی زندگی

اسلام نے سیاسی اور ملی زندگی میں عورت پر زیادہ ذمہ داریاں عائد نہیں کی ہیں۔ کیونکہ "قانونِ اشتراکِ عمل" کے لحاظ سے فطرتاً اس کے فرائض کو زیادہ تر گھر کی اندرونی زندگی سے متعلق کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں کے واسطے یہ دروازہ بالکل بند ہے۔ قرآن نے عورت کو تمام شرعی مسائل میں اجتہاد کا حق دیا ہے۔ معاشرت کے تمام شعبوں میں اس کی شہادت کو مرد کے دوش بدوش قابلِ وقعت سمجھا گیا ہے [۵] میدانِ جنگ میں اس کو اپنی خدمات پیش کرنے کا موقعہ عطا کیا گیا ہے۔ بہرحال دنیا کے تمام اجتماعی اور سیاسی شعبوں میں اس کے وجود کو خاصی اہمیت دی گئی ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت ام ہانی آپ کے پاس تشریف لائیں اور کہنے لگیں کہ "علی ایک ایسے شخص کو قتل کرنا چاہتے ہیں جس کو میں امان دے چکی ہوں" آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ

"ام ہانی جس کو آپ نے امان دی اس کو ہم نے امان دی۔"

جنگ کے حریفوں کو امان دینا بڑے سیاسی تدبر کا کام سمجھا جاتا ہے جو اس حدیث کی رو سے عورت کو حاصل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے عورت کی سیاسی اہلیت کو ناقابلِ التفات نہیں سمجھا ہے۔

اس کے علاوہ تمام معاشرتی اور سیاسی مجلسوں میں عورت کو شرکت کی عام اجازت دی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت ام عطیہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نوجوان لڑکیاں، خانہ نشین خواتین حتیٰ کہ حائضہ عورتیں بھی "خیر و برکت کی مجلسوں" میں شرکت کے لئے علانیہ باہر نکلتی تھیں۔ اور مسلمانوں کے عام جلسوں میں شریک ہوتی تھیں، اس پر حضرت حفصہؓ نے تعجب سے پوچھا! "کیا حائضہ عورتیں بھی جاتی تھیں؟" اس پر آپ نے ان کو یہ جواب دیا کہ "کیوں، اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، کیا

---

[۵] عینی جلد دوم صفحہ ۱۳۶

حائضہ عورتیں میدانِ عرفات، مزدلفہ، منا اور اسی قسم کی بیسیوں متبرک مجلسوں میں شریک نہیں ہوتیں؟"[۵۱]
"خیر و برکت کی مجلس" سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی باقاعدہ مذہبی جلسہ ہی ہو بلکہ امام عینی کی تصریح کے بموجب[۵۲] اس میں احادیث کو سننا، بیماری کی عیادت کے لئے جانا اور اسی قسم کے تمام معاشرتی اور اخلاقی فرائض داخل ہیں۔

ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی عورت نے پوچھا کہ "اگر ہم میں سے کسی کے پاس اوڑھنے کو چادر نہ ہو تو کیا اس میں کچھ حرج ہے کہ ہم ایسی صورت میں باہر نہ نکلیں۔ آپ نے اس کے جواب میں کہا "ایسی عورت کو چاہئے کہ وہ اپنی ہمجولی کی چادر اوڑھ لے اس طرح کہ وہ اور اس کی ہمجولی دونوں ایک چادر میں ہو جائیں۔ لیکن خیر و برکت کی مجلس میں ضرور آئے اور مسلمانوں کے عام جلسوں میں شریک ہو"[۵۳]

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ "اس حدیث میں عورتوں کے باہر نکلنے پر اصرار کیا گیا ہے۔ یعنی ان کو چاہئے کہ ضرور نکلیں۔ چاہے ایک ایک چادر میں دو دو ہی کیوں نہ ہوں"[۵۴]

یہاں چادر کے لئے حدیث میں "جلباب" کا لفظ آیا ہے جو "ایسی چادر کو کہتے ہیں جس سے عورت کی پُشت اور اس کا سینہ چھپ جائے"[۵۵] اس کے اوڑھنے کے بعد منہ اور ہاتھ وغیرہ کھلے رہتے ہیں جن کا کھلا رہنا اسلامی نقطۂ نگاہ سے قابلِ اعتراض نہیں ہے۔

یہاں پردہ کا مسئلہ درپیش ہو جاتا ہے لیکن میں طوالتِ مضمون کے خوف سے اس پر کوئی تفصیلی بحث نہ کروں گا۔ صرف یہ کہہ دینا غالباً کافی ہوگا کہ امام نووی نے اس قسم کی احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ

---

۵۱ صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۴۷

۵۲ جلد دوم صفحہ ۱۳۵

۵۳ صحیح بخاری جلد اوّل صفحہ ۴۷

۵۴ جلد دوم صفحہ ۱۳۵

۵۵ عینی، جلد ۲، صفحہ ۱۳۵

"عیدین وغیرہ میں عورتوں کا نکلنا مستحب ہے۔" امام ترمذی نے ابن مبارک کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "آج کل اخلاقی بداعمالی کے خوف سے عورتوں کا باہر نکلنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ لیکن اگر عورت اصرار کرے تو چادر اوڑھ کر بلا زینت باہر جانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔"

بہرحال نبی کریم کے زمانہ میں جو عمل تھا اس کو دیکھتے ہوئے نیز آپ کے ارشادات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تمام محدثین اور فقہا اس امر کا صراحتہً اقرار کرتے ہیں کہ عورت کا گھر سے باہر نکلنا، عام جلسوں میں شرکت کرنا اور مریض کی عیادت وغیرہ کے لئے باہر جانا نہ صرف جائز ہے بلکہ استحبابی درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ لیکن آج کل اجتہاداً محض اخلاقی بداعمالی کے احتمال سے اس کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس وقت میرا موضوع سخن صرف یہ ہے کہ "قرآن و حدیث نے عورت کو کیا پوزیشن دی ہے" اس لئے ائمہ کا اجتہاد میری بحث کے دائرے سے خود بخود خارج ہو جاتا ہے۔ جہاں تک اسلامی احکامات کا تعلق ہے عورتوں کے باہر نکلنے پر کوئی بندش عائد نہیں کی گئی ہے اور نہ عام لوگوں کے سامنے ان کے منہ اور ہاتھ پیر وغیرہ کا کھولنا ناجائز قرار دیا گیا ہے۔ البتہ آج کل کی مغربی دوشیزہ کی طرح زیب و زینت کی تھرکتی ہوئی تیلی بن کر مستقل "دعوت معصیت" بن جانا نہ اسلام کا مقصد ہو سکتا تھا اور نہ کسی اصلاحی نظام کا مقصد یہ ہونا چاہئے۔

اب اس مقالہ کو اس آیت کے نقل کر دینے کے بعد ختم کرتا ہوں جس میں قرآن نے نہایت غیر مشتبہ الفاظ میں یہ تبلایا ہے کہ دنیا کی معاشرت کا شیرازہ مرد و عورت کے باہمی مساویانہ اتحاد و موانست پر قائم ہے اور اس لئے دونوں کو چاہئے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں ایک دوسرے کے معین و مددگار بنے رہیں۔

> "اور خدا کی حقانیت کے دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے
> انسان بنا کر عورتوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان کی طرف مائل ہو سکو اور پھر مرد و عورت کے
> درمیان محبت و ہمدردی پیدا کی (تاکہ انسانی معاشرت کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے
> جس کا انحصار باہمی امداد و تعاون پر ہے اور اس امداد و تعاون کے لئے ضروری

ہے کہ مرد و عورت دونوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مساویانہ خلوص و محبت ہو)[۱۹]
اور بیشک ان تمام باتوں میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بہت سے دلائل
پنہاں ہیں" (پارہ ۲۱، سورہ روم رکوع ۳، آیت ۲۱)

سید ابوسعید بزمی بھوپالی،
بی۔ اے،

اسلامی جمہوریت اور اشتراکیت[۵]

سوشلزم کی تین بنیادی خصوصیات ہیں، آزادی، مساوات اور اخوت، یہ تمام خصوصیات محمد صلعم نے اسلامی اداروں اور سوسائٹی کو عطا کئے۔

ہر مسلمان کو اصولاً مکمل آزادی حاصل ہے۔ وہ خدا کے سوا کسی اور سے خائف نہیں، اور نہ خدا کے سوا کسی کے حکم کا بندہ ہے۔ لَاحولَ وَلَا قُوّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ یعنی خدا کے سوا کسی دوسرے کا نہ سہارا ہے نہ مدد۔ ایک مسلمان سرِ تسلیم خدا کے سوا کسی دوسرے کے آگے خم نہیں کرتا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِین (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب عرب کے صحرائی اور ریگستانی باشندے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ عجم و روم کے حشمت مآب حکمرانوں کے پاس بھیجے گئے تو ان ملکوں کی رسم کے مطابق ان بادشاہوں کے سامنے نہ جھکے، ان کے ہیبت ناک جلال اور رتبے ان کو مرعوب نہ کرسکے اور وہ مرعوب کیوں ہوسکتے تھے، انھیں اپنے ضمیر اور ایمان کے سوا کسی اور کا خیال کیوں ہوتا؟ وہ خدا کے سوا بھلا کسی اور سے کیوں ڈرنے والے تھے، وہ ہوا کی طرح آزاد اور بے باک تھے، ان کی پرورش مذہب کے اس گہوارے میں ہوئی تھی جس نے آزادی کا سبق مکمل طور پر پڑھایا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر "اللہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں" اور "اللہ کے سوا ان کا کوئی حمایتی اور سفارشی نہ ہوگا" (پارہ ۷۔ انعام ۶) اور جب "اللہ اپنے آدمیوں کے لئے اپنی رحمت کھولتا ہے تو اسے کوئی روک نہیں سکتا اور اپنی رحمت کو روک لیتا ہے تو پھر اس کے بعد کوئی اسے جاری نہیں کرسکتا۔ وہ غالب حکمت والا ہے" (ملائکہ ۳۵۔ پارہ ۲۲)

---

[۵] اس مضمون کی تیاری میں جہاں کہیں مواد لے لیا گیا ہے۔ چنانچہ ملک کے ایک ممتاز اہلِ قلم کے انگریزی مقالے "اسلام اینڈ سوشلزم" سے بڑی حد تک مدد لی گئی ہے۔

جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تمام مسلمان خواہ ایشیا کے ہوں یا یورپ کے یا افریقہ کے، خواہ سیاہ ہوں یا بھورے، سب آپس میں بھائی ہیں، ساتھ ہی ساتھ امیر ہوں یا غریب، بادشاہ ہوں یا رعایا، سرمایہ دار ہوں یا ادنیٰ مزدور، سب مساوی حقوق رکھتے ہیں، اسلام کے زرین اصول لاثانی ہیں اور جب رسول صلعم نے یہ قائم کئے تو یکایک صدیوں کی خانہ جنگیاں دور ہوئیں، اجنبی دوست ہوئے، دوست رشتہ داروں سے بڑھ کر ہو گئے، اور ان اصولوں کی کامیابی دیکھو کہ جب آں حضرت کا وصال ہوا تو خلافت کا طرۂ امتیاز رسول کے محبوب ترین عزیز کے سر نہیں بلکہ ان کے ایک صحابی کے سر رہا۔ چنانچہ عرب کے تمام مسلمان مساوی درجہ ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ بالکل ایک تھے، کسی قسم کی کوئی تفریق نہ تھی، سوسائٹی میں کوئی امتیاز نہ تھا اور نہ مسلمان کبھی امتیازی خصوصیات کو مروج کرنے کے لئے تیار ہو سکتے تھے، رنگ و ملت کی تفریق اس طرح جاتی رہی کہ حبش کے اکثر غلام مسلمانوں کے مقتدر رہنما اور اسلام کے تین برگزیدہ صحابی حسن، بلال، اور صہیب تین مختلف جگہوں یعنی بصرہ، حبش اور روم کے باشندے تھے مسلمان صہیب، و بلال سب کے سب غلام رہ چکے تھے لیکن رسول کی بارگاہ میں روسائے قریش سے کم نہ تھے۔ یہ غلام تھے لیکن ایک بار آں حضرت نے ابوبکرؓ سے کہا کہ اگر تم نے ان لوگوں کو ناراض کیا تو خدا کو ناراض کیا۔ اسی طرح عطار و ابن رباح، مجاہد بن جبیرؒ نافع مولیٰ ابن عمر اور موسیٰ بن عقبہ بزرگ ترین تابعین میں سمجھے جاتے ہیں جن کے سامنے بڑے بڑے جلیل القدر لوگ زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے، غلاموں نے اسلامی لشکروں کی سپہ سالاری کی اور عرب کے معزز قبیلوں کے فرزند ان کی معیت میں محض معمولی سپاہی بن کر رہے، رسول اللہ نے خود اپنے غلام زید بن حارث اور ان کے لڑکے اسامہ بن زید کو جنگی مہموں میں امیر مقرر فرمایا اور جلیل القدر صحابیوں کو ان کے ماتحت رکھا۔ غلاموں اور معزز خاندانوں کے مابین شادیاں ہوئیں اور ان کی اولاد عزت و احترام کی نظر سے دیکھی گئی، رسول صلعم نے اپنی حقیقی پھوپھی کی لڑکی زینب بنت جحش کو اپنے غلام زید بن حارث سے بیاہا۔ گو آں حضرت غلامی کی بیخ کنی نہ کر سکے لیکن غلاموں کو قعر ذلت اور حقارت سے نکال کر آزادوں کی صف میں لا کر کھڑا کیا اور اپنے پیروؤں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے غلاموں کو وہی کھلائیں جو خود کھائیں اور وہی کپڑے پہنائیں جو خود پہنیں، ان سے شادیاں کرنا جائز قرار دیا

اور نسبت جو اولاد ہو ان کو حقوق کی لحاظ سے دوسروں کو برابر رکھا۔ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے ۔

تم میں جسے مومنہ سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہو تو وہ ان مسلمان لونڈیوں سے نکاح کرے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے، تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، ان کی آقاؤں کی اجازت سے تم ان سے نکاح کرو۔ اور شرعی طور پر تم ان کی مہر ادا کرو بشرطیکہ وہ پاک دامن ہوں۔

(پارہ ۵ نساء ۴)

اسلام نے جو منصفانہ تعلیم غلاموں کے متعلق دی ہے اس کی نظیر کوئی قوم کسی زمانے میں پیش نہیں کر سکتی، اور اس تاریخی شہادت کو بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ غلاموں نے ہندوستان پر چھیاسی برس تک مسلسل حکومت کی، آٹھ بادشاہوں نے نہایت جاہ و جلال، و بدبہ و حشمت کے ساتھ حکمرانی کی جن میں ایک خاتون سریر آرائے سلطنت رہی، ان میں بعض بہت ہی مہتم بالشان شخصیت والے تھے اور بعض اپنی علمی فضیلت کے لحاظ سے اب تک مشہور ہیں، دہلی کا قطب مینار جس کو ہندوستان کے پہلے غلام بادشاہ نے بنایا آج بھی اپنی خاموش زبان سے متعصب یورپ کے اسلامی غلامی کے متعلق زہر افشاں پروپگنڈا پر صدائے احتجاج بلند کر رہا ہے، اسلام نے جو غلاموں کو عزت، دستار، حشمت اور رتبے دئے، اس کی یادگار میں یہ مینار اب تک استادہ ہے،

گبن کا بیان ہے:۔

ایشیا اور افریقہ میں سینکڑوں اور لاکھوں کی تعداد میں جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے وہ ہرگز دباؤ اور جبر سے نہیں بلکہ بطیب خاطر ایک خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے، ایک جملے کے کہہ دینے سے مفتوح ہو یا غلام، قیدی ہو یا مجرم، یکایک فاتح اور آزاد مسلم کے پہلو بہ پہلو آکھڑا ہوتا اور انہیں حقوق کا مستحق ہوتا جو تمام مسلمانوں کو حاصل تھے، اس کے تمام گناہ معاف ہو جاتے، وہ تمام پابندیوں سے بری ہو جاتا، وہ دائمی تجرد کے عہدوں سے آزاد ہو جاتا اور اس کے تمام جذبات جو خانقاہوں میں پڑے رہنے کی باعث مردہ ہو چکے ہوتے مسلمانوں کے جنگی جبل سے پھر زندہ ہو جاتے اور وہ اپنے نئے ماحول میں اپنی ہمت و لیاقت کے لحاظ سے لامحدود طریقہ پر ترقی پذیر ہو سکتا تھا۔ اس مساوات کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام

مسلمان قوم ایک ہی روح اور ایک ہی قالب سمجھی جاتی تھی، شیخ سری سقطی نے جو صوفیائے کرام میں بہت ہی ممتاز درجہ رکھتے ہیں ایک بار فرمایا کہ میں مسلسل تیس برس سے ایک شکریہ کے نامناسب طور پر ادا کرنے کے گناہ سے توبہ مانگ رہا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ "آخر وہ کون سا گناہ ہے" فرمایا کہ ایک دن بغداد کے بازار میں آگ لگ گئی، ایک شخص دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور بولا کہ تمھاری دوکان آگ کی نظر ہو گئی، میں بول اٹھا "الحمد للہ" اب مجھے کسی چیز کی فکر دامن گیر نہ ہو گی" بعدہٗ میں بڑا پشیمان ہوا، میری اس خواہش کے یہ معنی تھے کہ میں دنیاوی جھگڑوں سے آزاد ہو کر اپنے دوسرے برادران ملت سے بہتر حالت میں رہنا چاہتا تھا، تیس برس سے مجھے یہ خوف ہے کہ محض اس خیال کی سزا میں میری بخشش نہ روک دی جائے، میں برابر نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ توبہ کرتا ہوں"

مساوات کے تخیل کو آں حضرت صلعم نے ان الفاظ میں پیش کیا۔

"تمام مسلمان قوم ایک جسم ہے، اگر سر میں درد ہو تو تمام جسم میں درد محسوس ہوتا ہے، اسی طرح اگر آنکھ میں درد محسوس ہو تو تمام جسم درد کرتا ہے"

"مسلمان اس تعمیر کے مشابہ ہیں جس کو تمام حصوں سے تقویت اور سہارا پہنچ رہا ہے"

مسلمانوں نے غیر مسلمانوں کو بھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ انسانوں میں کسی قسم کی تفریق رکھیں اور جب کبھی انھوں نے عیسائی حکمرانوں کے سفیروں کو اپنے یہاں باریابی کا موقع دیا تو انھوں نے اپنے حضور میں ان کو اپنے رسم کے مطابق سجدہ کرنے سے یہ کہہ کر منع کیا کہ ہم تم ایک ہی خالق کے مخلوق ہیں!

مسلمانوں کی اخوت نہایت حیرت انگیز تھی، ان میں آپس کی برادرانہ محبت بالکل سگے بھائیوں کی سی تھی، قرآن میں واضح طور پر ذکر ہے کہ اللہ تعالے نے مسلمانوں کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی، ارشاد ہوتا ہے

"اور (خدا نے) ان کے دلوں میں محبت ڈال دی، اے محمدؐ! اگر تو ساری دنیا کا مال بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دلوں میں محبت پیدا نہیں کر سکتا تھا، لیکن اللہ نے آپس میں محبت پیدا کر دی"

(سورۃ انفال)

محمد صلعم کے ارشادات اس کے متعلق حسب ذیل ہیں:۔

"تمام مسلمان آپس میں بھائی ہیں، ان کو ایک دوسرے پر ظلم نہ کرنا چاہئے، اور نہ انھیں ایک دوسرے کی مدد سے پرہیز کرنا چاہئے اور نہ ایک دوسرے کو نفرت کی نظروں سے دیکھنا چاہئے۔"

"نیکی کی جگہ دل ہے اور جس دل میں نیکی ہو وہ ایک مسلمان کو نفرت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک مسلمان کا خون، مال اور آبرو دوسروں کے لئے حلال نہیں ہو سکتا۔"

اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، لوگوں نے کہا "ظالم کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے" فرمایا ظالم کو ظلم سے منع کرنا اس کی مدد کرنا ہے۔"

"جو شخص خدا کی مخلوقات اور اس کے بندے سے محبت نہیں کرتا اللہ اس سے محبت نہیں کرتا۔" اللہ کی نظر میں وہی سب سے اچھا ہے جو اپنے دوستوں میں سب سے اچھا ہے اور اللہ کی نظر میں وہی ہمسایہ مقبول ہے جو اپنے ہمسایوں میں مقبول ہے۔"

"اس شخص کا ایمان پختہ نہیں جو اپنے لئے ایک چیز پسند کرتا ہے لیکن اپنے بھائیوں کے لئے نہیں۔"

جو شخص مخلوقات پر مہربان ہے اللہ اس پر مہربان ہے، اس لئے روئے زمین کے تمام بنی نوع انسان پر خواہ وہ اچھے ہوں یا برے مہربان رہو، بروں پر مہربان ہونا شر سے بچنا ہے۔"

مسٹر حامد اسنو ام۔ اے۔ نہایت فخر کے ساتھ کہتے ہیں:۔

"اسلام کی سب سے بڑی خوبی اخوت اور مساوات کی تعلیم ہے، اسلام کے دروازے پر پہنچتے ہی قومی نخوت اور معاشرتی افتخار باہر ہی چھوٹ جاتے ہیں، دوسرے مذاہب کی خشک، روکھے پھیکے اور ظاہری نمائشوں میں ہزاروں قسم کے امتیازات ہیں لیکن اسلام میں ادنیٰ اور غریب طبقے کے لوگ سوسائٹی میں ایک ہی قسم کے حقوق رکھتے ہیں، ایک شخص ملازم ہونے کے باوجود اپنے سرمایہ دار آقا کے پہلو بہ پہلو بیٹھ سکتا ہے، برخلاف اس کے دوسرے مذاہب میں تھوڑی سی فاضل سالانہ آمدنی، تھوڑی سی علمی لیاقت یا تھوڑی سی فوقیت ایک حد فاصل آپس میں قائم کرنے کے لئے کافی ہے جو معاشرت

کے لحاظ سے تکلیف دہ اور روح فرسا ہے، ہم تمام لوگ ایک ہی خدا کے پیدا کئے ہوئے بندے ہیں، انسانیت کی واحد جماعت کے مختلف افراد ہیں، ہم میں تفریق کیسی؟ عیسائی مذہب کے پیشوا اپنے منبروں سے تلقین و وعظ کچھ کرتے ہیں لیکن ان کے نظام معاشرت میں نظر کچھ اور آتا ہے، مگر اسلام نے محض برادرانہ پیام وسلام کی جو تعلیم دی ہے صرف اسی کے ذریعہ اسلام دنیا کے لئے باعث نجات اور فلاح ہو سکتا ہے۔ اسلام کوئی نئی پابندیاں عاید نہیں کرتا، کوئی نئے انکشافات نہیں کرتا، کوئی مذہبی حکومت جاری نہیں کرتا، اور نہ مذہبی پیشواؤں کا تسلط قائم کرتا بلکہ بکھرے ہوئے قوانین کو یکجا کر دیتا ہے، بگڑے ہوئے نظام معاشرت کو سدھار دیتا ہے اور حکومت کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کر دیتا ہے جن میں صرف بے لوثی اور بے غرضی پائی جاتی ہے، اگر دنیا کے مقتدر سیاست داں، ماہران سائنس اور فلسفی ایک ساتھ بیٹھ کر عقل سلیم، فلسفہ، سائنس اور جذبات کے مطابق کوئی نیا مذہب قائم کرنا چاہیں تو ان کے مذہب کے تمام اصول اسلام کے اصولوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔"

آنحضرتؐ کے قبل عربوں کی حالت

اسلام نے اشتراکیت کے اصولوں کو کس طرح پھیلایا اور ان میں کہاں تک ترقی دی، ان باتوں کو جاننے کے لئے قدیم عربوں کی معاشرتی اور سیاسی حالت سے واقف ہونا ضروری ہے، آنحضرتؐ کی بعثت ہونے کے قبل جمہوری حکومتوں پر اٹلی اور یونان میں تجربے کئے جا چکے تھے، لیکن عملی سوشلزم پر اب تک کہیں کوئی تجربہ نہ ہوا تھا، عرب میں بدترین قسم کی شخصی حکومت قائم تھی، ہر قبیلہ ایک غیر ذمہ دار سردار کے ماتحت تھا، انفرادیت کا سیلاب ہر طرف نظر آتا تھا، ایسی حالت میں جمہوریت اور اشتراکیت قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا، عربوں کے قبیلے کی جنگ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بے مثل تھی، اگر قبیلہ کا کوئی ایک فرد دوسرے قبیلہ والوں کے ہاتھوں مارا جاتا تو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے پشت ہا پشت تک رہتے، ایک جان کے بدلے سینکڑوں معصوم جانیں لے کر بھی مطمئن نہ ہوتے، کینہ، عداوت، اور بغض کی آگ قرنوں تک نہ بجھتی جس کا لازمی نتیجہ تھا کہ انفرادیت کی لا انتہا ہی قوتیں نہایت ہی خطرناک ہو گئی

تھیں، جوا کھیلنا، شراب پینا اور زنا کرنا عام چیزیں تھیں، کسی قسم کی اخلاقی اور مذہبی پابندیاں نہ تھیں، شادی کے لئے نہ کوئی قانون تھا اور نہ طلاق کے لئے کوئی دباؤ۔ بیٹا باپ کی بیویوں کو وراثت میں حاصل کرتا، ایک شخص ایک یتیم لڑکی سے شادی محض اس کی دولت کی خاطر کرتا اور جب دولت حاصل کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتا، مطلقہ عورت کو دوسری شادی کرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ یہ بات اس کے پہلے شوہر کے لئے باعث ننگ سمجھی جاتی تھی، بغض اور کینہ عورتوں میں اس درجہ ہوتا کہ اس وقت تک بخشت نہ بیٹھتیں جب تک کہ اپنے دشمنوں کے کلیجے کو دانت سے نہ چبا لیتیں یا ان کے خون سے اپنے دوپٹے نہ رنگ لیتیں، غلام جانوروں کی طرح تمام دن کام کرتے اور ان کے ساتھ ہمارے موجودہ قلیوں اور مزدوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا، نوزائیدہ لڑکیوں کو زندہ زمین میں دفن کر دیتے، انسانوں کی قربانی کرنا کوئی اہم بات نہ تھی، خودکشی ایک معمولی چیز تھی، روزمرہ بات بات پر جھگڑا کر کے قتل و خون کرنا ایک کھیل تھا۔

آنحضرت نے جس حالت میں عربوں کی معاشرتی زندگی پائی اس کی تصویر گبن اس طرح کھینچتا ہے :-

"ایک ایسی قوم کی فطرت جو بنی نوع انسان کے خلاف ہمیشہ برسر پیکار ہو کینہ، عداوت، قتل اور خون ریزی سے اور بھی بے پناہ ہوتی گئی، یورپ کے دستور اساسی میں صلح اور جنگ کا اختیار ایک چھوٹے سے گروہ کے حوالہ کر دیا جاتا ہے لیکن عربوں میں سے ہر فرد اپنے ہم وطن کے سینے میں خنجر پیوست کر دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا تھا اس قوم کی یکسانی محض ان کی زبانوں کی دھندلی سی مشابہت اور ان کے رسم و رواج میں پائی جاتی تھی، ہر قبیلہ میں قاضی کا حکم ایک بے معنی سی چیز سمجھی جاتی تھی، ایام جاہلیت میں محمدؐ کے قبل سترہ سو لڑائیاں لڑی جا چکی تھیں۔ عداوت کے شعلے باہم خانہ جنگیوں سے ہمیشہ بھڑکتے رہتے تھے، گذشتہ عداوتوں اور جنگوں کی یاد قصیدوں اور نظموں کے ذریعہ کی جاتی، خانگی زندگی میں ہر شخص خود مختار تھا، اس کی عزت پر ذرا سی آنچ اگر آجاتی تو اپنے مخالفوں سے بدترین قسم کا بدلہ لینے کے لئے ہمہ تن تیار ہو جاتا، اپنی رشتے کی بے آبروئی کی خاطر جان گنوانا اور لینا وہ ضروری سمجھتا، توہین انگیز نعرے اور ملامت آمیز حرکتوں کے لئے خون ریزیاں کرنا فرض سمجھتا، مہینوں اور برسوں اس بات کا

منظور ہوتا کہ اپنی توہین اور بے آبروئی کا خون پکاں بدلہ فریق سے لے، بدلے کی نوعیت بھی عجیب تھی جو اس زمانہ کے غیر متمدن قوم کے رواج سے بالکل جداگانہ تھی۔ قتل کا بدلہ یہ ضروری نہ تھا کہ قاتل ہی کا سر ہوتا بلکہ مقتول کے عزیز واقارب، قاتل کے خاندان کے کسی معصوم کی جان بدلے میں لے لیتے تھے، یا قاتل کے قبیلہ کے معزز ترین شخص کی۔ بدلہ لینے کی کوشش میں اگر ناکامی ہوتی تو انتقامی جذبہ وراثت میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا چلا جاتا۔"

مسٹر گورہم اپنی (Ethics of Great Religions) میں کہتے ہیں۔

عرب میں محمد (صلعم) کی پیدائش کے وقت (۵۷۰ء) مذہبی اور سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی، اس کے آوارہ گرد باشندے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی نسل میں سے سمجھے جاتے تھے، بتوں کو پوجتے، ستاروں، پتھروں اور درختوں کو اپنا معبود سمجھتے، وہاں یہودیوں کی بھی کچھ نئی آبادیاں ہوگئی تھیں، جو یروشلم کی تباہی کے بعد یہاں آکر پناہ گزیں ہوئی تھیں، عیسائیوں نے بھی یہاں آکر ملکی باشندوں پر تھوڑا بہت اپنا اثر ڈالا تھا، ان میں مشہور فرقے Nestorians. Marianetas، Euty-chians، Sabellians اور Arians کے تھے، وہاں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا مذہبی اعتقاد کچھ نہ تھا بلکہ انفرادی اور راہبانہ سیرت کی زندگی بسر کرتے اور وحدانیت کی تعلیم دیتے جو Essenism. اور عیسائی مذہب کے عناصر سے ملے جلے ہوتے، عربوں کی فطرتی قدامت پسندی کی بنا پر مذہبیت کے اجزا بالکل بکھرنے نہ پائے تھے لیکن اخلاقی پستی اور مذلت ناقابل بیان تھی، اور ہر شخص کی آنکھیں ایک مسیحا کی منتظر تھیں، معاشرتی اور مذہبی انقلاب کے لئے وقت نہایت ہی موزوں تھا، اور اسی حالت میں محمدؐ رسول بن کر نمودار ہوئے۔"

وقت کا اقتضاء واقعی تھا کیونکہ عربوں کے اخلاقی، معاشرتی، مذہبی اور سیاسی حالات قعر مذلت میں گرے ہوئے تھے، بتوں کے لئے انسانی قربانیاں کرنا، بچیوں کو زندہ دفن کرنا، نابالغ لڑکیوں سے زبردستی شادی کرنا، یتیموں کے مال کو غصب کر لینا، لاتعداد بیویاں اور کنیزیں رکھنا، انتقام کی خاطر قرنوں خوں ریزیاں کرنا، ظلم ناروا کے ساتھ حکومت کرنا۔ انفرادی نخوت، قبائلی تکبر، قومی غرور وغیرہ

سینکڑوں بدترین قسم کے ایسے گناہ تھے جن کو دور کرکے دنیا کی فضا کو پاک اور صاف کرنے کی بے حد ضرورت
تھی، چنانچہ اسی حالت میں رب العالمین نے رحمتہ اللعالمین کو بھیجا جن کا نام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تھا
اور جنھوں نے اپنے معجزہ نما سوشلزم کے اصولوں سے عرب کی تمام سوسائٹی میں ایک حیرت انگیز
انقلاب پیدا کر دیا۔ دنیا کی تاریک فضا روشن ہوئی، ایک ہمہ گیر اصولوں کے مجموعہ سے انسانیت میں
نئی روح پیدا ہوئی، اگر عرب کی نئی اور پرشکوہ زندگی سوشلزم کے ذریعہ ہوئی تو تمام دنیا کی زندگی اسلام
کے ذریعہ اور سوشلزم اور اسلام کی جس نے تکمیل کی وہ اس کی مسیحائی کا نتیجہ تھا جس نے نہ صرف ایک یا دو
جذامیوں کو صحت بخشی بلکہ تمام جذامی سوسائٹی کو، جس نے نہ صرف چند مردوں کو زندگی عطا کی بلکہ تمام
مردہ قوم کو ایک نئی اور روح پرور زندگی عنایت کی، جس نے نہ صرف مافوق الفطرت معجزے دکھائے
بلکہ دنیا میں ایسی عجیب و غریب چیزیں پیش کیں جن کے نشانات اب تک موجود ہیں اور جب تک دنیا آباد
ہے موجود رہیں گے، اور جس نے عرب کے ریگستانی صحراؤں ہی پر عارضی طور سے حکومت نہ کی بلکہ اس
حکومت اس روز افزوں آبادی کے دلوں پر ہے جو اس کا ترانہ اب تک اسی تار پر گاتے ہیں جس سے تمام
انسانیت کو اس نے ایک ساتھ منسلک کر دیا ہے؛

آنحضرت رحمت بن کر آئے، اللہ تعالےٰ نے فرمایا "وَمَا اَرسَلنٰکَ اِلَّا رَحمَۃً لِّلعَالَمِین" ہم
تجھ کو اے محمدؐ دنیا کے لئے صرف رحمت بنا کر بھیجا ہے، چنانچہ محمد صلعم کا مشن شروع سے وحدانیت کا
تخیل پیش کرنا اور انسانیت کو ایک سلک میں منسلک کرنا تھا، وہ ایک عالمگیر اخوت قائم کرنا چاہتے تھے۔
چنانچہ اپنے دشمنوں کو فتح مکہ پر جو معنیگنا کارٹا "عطا کیا اس کے الفاظ یہ تھے :۔

"میں تم سے اسی طرح گفتگو کروں گا جس طرح یوسف نے اپنے بھائیوں سے کی، میں تم کو لعنت
ملامت نہ کروں گا، خدا تمھاری خطائیں معاف کر دے گا وہ بڑا ہی رحیم و کریم ہے، جاؤ تم آزاد ہو"
اس چارٹر کی نمایاں خصوصیت اخوت اور مکمل آزادی ہے۔

محمد صلعم نے آخری بار اپنے ہم وطنوں کے سامنے تقریر کی، وہ یہ تھی :۔
"لوگو! میری باتیں سنو، شاید کہ اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت نہ آئے"

"عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے۔"

"ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔"

"جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیے گئے۔"

"عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو، تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔"

"مجرم اپنے جرم کا آپ ذمہ دار ہے، باپ کے جرم کا ذمہ دار بیٹا نہیں اور بیٹے کے جرم کا جواب دہ باپ نہیں۔"

"اگر کوئی حبشی بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تم کو خدا کی کتاب کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔"

"مذہب میں غلو اور مبالغہ سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی میں برباد ہوئیں۔"

"تمہارے غلام! تمہارے غلام!! جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ، جو خود پہنو وہی ان کو پہناؤ۔"

"میں تم میں ایک چیز چھوڑ جاتا ہوں، اگر تم نے اس کو مضبوط پکڑ لیا تو گمراہ نہ ہوگے وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ"

"خبردار، ظلم اور بے انصافی نہ کرو۔"

آنحضرت نے تقریر ختم کرنے کے بعد جب مجمع سے یہ کہا "کیوں، میں نے پیغام خداوندی سنا دیا"؟ ہزاروں آوازیں بلند ہوئیں "بے شک" رسولِ خدا نے کہا "اے اللہ تو گواہ رہنا۔"

نہایت حیرت انگیز اور عبرت خیز منظر یہ تھا کہ شاہنشاہ عالم جس وقت لاکھوں آدمیوں کے مجمع میں فرض نبوت ادا کر رہے تھے تو ان کے تختِ شاہنشاہی کا مسند تکیہ (کجاوہ اور عرق گیر) ایک روپیہ سے زیادہ قیمت کا نہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ آنحضرت کے قبل کئی مصلحین اور پیغمبر گزر چکے تھے لیکن علمیت کی وہ صفتیں

ان میں ودیعت نہ ہوئی تھیں جو خاص طور پر آنحضرت کے حصے میں آئیں، آنحضرت کے قبل کسی سوشلسٹ مفکر نے ایسے قوانین نہیں بنائے جو اسلامی قوانین کی طرح خالص جمہوری ہوں اور نہ کسی مصلح نے خواہ وہ مہاتما گوتم بدھ ہوں یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اخوت اور مساوات کی تعلیم دینے کے ساتھ اپنے آپ کو معمولی انسان کے بجائے فوق البشر ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔ یہ آنحضرت ہی کی خوبی تھی جنھوں نے اپنے پیروؤں پر یہ اچھی طرح واضح کیا کہ اِنَّمَا انا بشر مثلکم، میں تمھاری ہی طرح ایک انسان ہوں، آنحضرت چاہتے تو اپنے کو خدا نہیں تو خدا کا بیٹا تسلیم کرا سکتے تھے لیکن ان کمزوریوں سے وہ بالاتر تھے، جب محمد صلعم کے اکلوتے اور چہیتے صاحبزادے ابراہیم کا انتقال ہوا تو آفتاب میں گرہن نظر آیا، عاشقان رسول کیا بلکہ ملک کے تمام لوگوں نے یہی سمجھا کہ آفتاب محمدؐ کے لڑکے کی موت کے غم میں سوگوار ہو رہا ہے، لیکن محمدؐ خود آگے بڑھے اور اعلان کیا کہ ابراہیم کی موت اور سورج گرہن میں کوئی تعلق نہیں۔

آنحضرت جب کسی سے کچھ کرنے کے لئے وعدہ کرتے تو معمولی انسانوں کی طرح انشاء اللہ (اگر اللہ کو منظور ہو) کا فقرہ ضرور کہتے، ایک لمحہ کے لئے دنیا کے سب سے بڑے سوشلسٹ نے اپنے پیروؤں کو اس کا موقع نہ دیا کہ وہ ان کو معمولی انسان سے بالاتر درجہ دیں، تمام عرب کے "آقا" اپنے لوگوں میں معزز ترین اور محبوب ترین رہنما ہونے کی حیثیت سے بھی وہ محض ایک "جمہوری واعظ" بن کر رہے، ایک بار ایک شخص نے ان الفاظ میں آپ کو خطاب کیا، "اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند، اے ہم میں سب سے بہتر کے فرزند" آپ نے فرمایا لوگو، پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان تمھیں گرا نہ دے۔ میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں، خدا کا بندہ اور اس کا رسول۔ میں پسند نہیں کرتا تم مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔ ایک دفعہ آپ سے ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوت کا اس قدر رعب ہوا کہ کانپنے لگا، آپ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں فرشتہ نہیں، ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی، چنانچہ محمد صلعم بار بار کہتے کہ میں امتیاز پسند نہیں کرتا اور نہ تشخص پسندی مجھے محبوب ہے، جب آنحضرت سیاسی قوت کے اعلیٰ مدارج پر تھے اس وقت کی حالت گبن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"محمدؐ کی بلند خیالی دیکھو کہ وہ شاہی شان شوکت کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے اور پیغمبر خدا

ہونے کے باوجود گھر کے تمام کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے، وہ آگ خود جلاتے، جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، اپنے ٹوٹے ہوئے جوتوں کو خود درست کرتے، پھٹے ہوئے کپڑوں کو سیتے، گو راہبوں کو جو تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں وہ پسند نہیں کرتے تھے لیکن خود بلا چون وچرا روکھے پھیکے کھانے کھاتے جو ایک معمولی عرب یا سپاہی کو میسر آسکتے۔ اکثر موقعوں پر صحابیوں کی دعوت نہایت کشادہ پیشانی اور فیاضی سے کرتے مگر ہفتے، ایسے گذر جاتے جب کہ پیغمبر خدا کے یہاں آگ مطلق روشن نہ ہوتی۔"

یہ سادہ زندگی کس نے بسر کی؟ یہ تمام ادنیٰ کام کس نے اپنے ہاتھوں انجام دیا، اس نے جو تمام عرب کیا بلکہ آج تک دنیا میں معزز ترین اور شریف ترین انسان سمجھا جاتا ہے، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ محمد صلعم کے جمہوری پند و نصائح نے اپنا اثر دکھایا اور ہر شخص اپنی انفرادیت کو اشتراکیت پر قربان کرنے کے لئے پیش پیش تھا۔

محمد صلعم سے قبل دو بڑے زبردست مصلح پیدا ہوئے ہیں، جن میں ایک نے ہندوستان کی ذات پات کی سنگلاخ زمین میں جنم لیا اور دوسرے بنی اسرائیل کے درمیان ظہور پذیر ہوئے، ان کے تیار کردہ قوانین، اور ان کی مخلص اور بے غرض زندگیاں آج کل کی اشتراکیت کے لئے بہترین بنیادی اصول ہو سکتی تھیں بشرطیکہ وہ تجرد کی زندگی بسر نہ کرتے، جس کی وجہ سے سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت کا پتہ نہیں چلتا بلکہ ان کی حیثیت گری معلوم ہوتی ہے، دوسرے ان کی انتہائی خلوت پسندی اور سوسائٹی سے قطعی علیحدگی نے ان پیرووں میں رہبانیت کی کھلم کھلا ترغیب دی۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں کی زندگی امارت پسندی اور انفرادیت کے خلاف جہاد تھی لیکن اشتراکیت کی عملی دلیل نہ تھی، مگر محمدؐ کی زندگی صریحاً انسانی اور سوشل تھی، جو آج تک تمام لوگوں کے لئے قابل عمل ہے، آپ نے اپنے غلام زید کو متبنیٰ فرمایا، اور جب ان کا انتقال ہوا تو اس قدر متاثر ہوئے کہ لوگوں نے پوچھا کہ آپ کیوں اس قدر غمگین ہو رہے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ "ایک دوست اپنے بہترین وفادار دوست کا غم کر رہا ہے"۔ آپ نے اپنے اسی غلام کی مطلقہ بیوی سے شادی کرنا کوئی عیب نہ سمجھا، آپ کو اپنی بیوی خدیجہؓ سے اس قدر سچی اور پرخلوص محبت تھی کہ ارنلڈ نے صحیح کہا ہے کہ انسانی تاریخ میں کل شادی شدہ زندگی کی حسین ترین تصویروں میں سے ایک

تصویب ہے، ساتھ ہی ساتھ آپ کو اپنے والدین اور خصوصاً اپنی ماں سے بے حد محبت تھی آپ کا یہ قول ہے کہ
ماؤں کے قدموں کے نیچے جنت ہے' اور سب سے بالاتر بات یہ تھی کہ تمام لوگوں اور اصحاب سے ان کی
یکساں ہمدردی اور اخوت تھی جو موجودہ اشتراکیت کے لئے شمع ہدایت کا کام دے سکتی ہیں' یہ تمام باتیں
عربوں کے لئے زندہ مثالیں تھیں اور آج بھی تمام دنیا کے لئے مسلمانوں کے لئے ہیں۔

اسلام کے مذہبی قوانین کی بنیاد بھی دنیا کے بزرگ ترین مصلح محمد مصطفےٰ صلعم نے ایک طرف تو اجتماعیت
پر اور دوسری طرف اخوت اور مساوات پر رکھی جو جمہوریت کے زرین اصول ہیں' چنانچہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ
دن میں پانچ وقت اور ہفتہ میں ایک روز ضرور تمام مسلمان امیر و غریب بلا تفریق رنگ و ملت اور جاہ و مرتبہ ایک
ہی بارگاہ میں ایک ہی منتخب کردہ شخص کی اقتدا میں سر نیاز خم کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں' پھر سال میں دو موقع
(عیدین) ایسے فراہم کئے گئے ہیں جب شہر کے تمام پیروان اسلام ایک واحد مقام پر جمع ہو کر اور گلے مل کر اپنی
برادرانہ شفقت اور خلوص کا اظہار کرتے ہیں اور پھر زندگی میں کم سے کم ایک بار ہر مسلمان پر فرض عائد کیا گیا ہے
کہ دنیا کے تمام مسلمانوں کے اجتماع میں ضرور شریک ہو' مکہ معظمہ کا یہ عظیم الشان اجتماع جہاں ایک مرکزی مقام
پر دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ شاہ ہوں یا گدا' ایک ہی لباس میں ایک ہی وضع قطع میں نظر آتے ہیں گویا اسلامی
سوشلزم کا سالانہ مظاہرہ ہے جو اخوت و مساوات کا عملی نمونہ ہے۔ اس اجتماع میں امیر و غریب' شاہ
گدا کا کوئی امتیاز نہیں' چنانچہ ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ تمام نبی نوع انسان ایک ہیں اور ہر شخص
پر لازم ہے کہ سب لوگوں سے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے مساویانہ برتاؤ رکھے' یہ سالانہ اجتماع محض ظاہری یکسانی
اور انسانی مساوات ہی کی بین دلیل نہیں بلکہ انسانیت کی یک جہتی اور مقصد کی یکسانی کو بھی ظاہر کرتا ہے'
ہزاروں مرد و عورت' ضعیف و جوان' ہر قسم کی مصیبتیں برداشت کر کے جان و مال کو معرض خطر میں ڈال کر
اس مقام پر صرف ایک ہی مقصد' ایک ہی نیت کی تکمیل کے لئے آتے ہیں تاکہ وہ ایک واحد مرکز میں' ایک واحد
اجتماع میں اکٹھے ہو کر اپنے واحد معبود رب العالمین کی عبادت میں ایک ساتھ سر نیاز خم کریں' چنانچہ لاتعداد
انسانوں کا یہ مجمع جب ایک ساتھ دست بدعا ہوتا ہے تو ہر شخص کے دل میں صرف واحد برادرانہ لگاؤ اور روحانی
رشتہ کا جذبہ ہی سینے میں موجزن نہیں ہوتا بلکہ خدا کی ربوبیت اور انسان کی اخوت کا خیال بھی طرح دل نشین ہو جاتا ہے

کسی اور مذہب نے انسانی اخوت کے تخیل کو اس واضح طور پر پیش نہیں کیا ہے جتنا کہ اسلام نے کیا۔
ہندو مذہب کی طرح اس میں ذات پات کا بکھیڑا مطلق نہ تھا، مغربی عیسائیوں کی طرح دولت اور عہدہ کی پیدائشی تفریق اس میں نہیں پائی جاتی، پادریوں اور مذہبی پیشواؤں کا کوئی علیحدہ طبقہ نہیں، اور نہ ان کے کوئی خاص حقوق اور اختیارات ہیں، اور خوبی دیکھو کہ محمد صلعم نے تمام بنی نوع انسان کو آخرت میں نجات کی امید دلائی، کلام مجید میں بار بار ذکر آیا ہے کہ " خواہ وہ ایمان والے ہوں یا یہود یا نصاریٰ یا آتش پرست جو اللہ اور آخرت پر یقین کرے گا اور عمل صالح کرے گا اس کو اللہ کی طرف سے ضرور بخشائش ہوگی، اسے نہ خوف کرنا چاہئے اور نہ افسردہ ہونا چاہئے" (سورۂ مائدہ) پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

"اے محمدؐ! تو میری طرف سے ان لوگوں سے کہہ اے میرے بندو! گناہ کرکے اپنے آپ پر زیادتیاں کرنے والو! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا۔ اللہ سب گناہ بخش دے گا، وہ بخشنے والا مہربان ہے" (زمر ۳۹ پارہ ۲۴)

اس نئی اور عجیب مذہبی سوشلزم پر مشہور مورخ گبن اپنی رائے یوں ظاہر کرتا ہے۔

"محمدؐ کے بدترین دشمنوں نے ان کو برا بھلا اس وجہ سے کہا کہ نجات کی اُمید انھوں نے انھیں یہ کہہ کر دلائی کہ تمام لوگ جو اللہ پر ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے، آخرت کے روز عمدہ صلہ پائیں گے، ایسی عقلیت پسندانہ بے نیازی ایک راسخ العقیدہ شخص کے لئے غیرموزوں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ ایک آسمانی پیغمبر اپنے الہامات کی قدر قیمت کو اتنا ارزاں کردے"۔

آنحضرت کے اس عظیم الشان کارنامے اور ان کے ارفع ترین سوشلزم کی قدر جس کے لحاظ سے تمام بنی نوع انسان دنیا اور آخرت میں اپنے اعمال کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے ہیں، افسوس ہے کہ مسلمانوں نے نہ کی، مسلمانوں نے اپنے رسول کی تعلیم کے ایک ہی جز یعنی وحدانیت کو ذہن نشین کیا، وہ اپنی قوت اور ذہانت کا کثیر حصہ بحث و تکرار میں صرف کرتے رہے لیکن اپنے پیغمبر کی ان تعلیمات پر زیادہ غور و خوض نہ کیا جس نے انسان اور انسان کے درمیان ساری تفریقیں نیست و نابود کردی تھیں، عرب کے بزرگ ترین سوشلسٹ نے رنگ، ملک، ملت یہاں تک کے اعتقادات کی بھی تفریق مٹادی تھی، اور اشتراکیت کا

پہلو ہر شعبہ مثلاً سیاست، معاشیات، حکومت اور یہاں تک کہ مذہب میں بھی نمایاں کر دیا تھا۔ مسلمان اگرچہ والہانہ حد تک اپنے اعتقادات کے علمبردار رہے مگر قرآن تعلیم یعنی تمام انسانیت کی قطعی وحدت، کو دل سے بالکل محو کر دیا۔ قرآن نے عیسائیوں اور یہودیوں کو اس خیال پر لعنت کی ہے کہ وہ اپنے کو نجات کے تنہا اجارہ دار سمجھتے ہیں لیکن مسلمان اسے بھول گئے۔ قرآن شریف میں ہے :۔ وَقَالُوا لَن يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَن كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ۔ (بقرہ) یہی وطیرہ مسلمانوں نے بھی اختیار کر لیا ہے۔

(باقی)

سوانگ

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا۔ اور نہ نام کے پیچھے 'سنگھ' کی دُم لگا دینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجیندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانہ میں راجپوت تھے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن اِدھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کے کوئی علامت نہ تھی گجیندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی رجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ پدر بزرگوار نے کپڑے کی دوکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی۔ اور گجیندر سنگھ نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ قدوقامت میں بھی فرق آتا گیا۔ بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا۔ نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا۔ لیکن گجیندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پُھلکے، گورے چٹے، عینک باز، نازک بدن، فیشنیبل بابو تھے۔ انہیں علمی مشاغل سے خاص دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو، اُس کی شادی تو راجپوت خاندان ہی میں ہو گی۔ گجیندر کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی اُس میں راجپوتی جوہر بالکل فنا نہ ہوا تھا۔ اُن کے خسر پنشنر صوبہ دار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز۔ شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آسکا تھا۔ امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی، ملازمت کی تلاش تھی۔ اس لئے اب کی ہولی کے موقع، پر سسرال سے بُلاوا آیا تو اس نے کوئی حیلہ حجت نہ کی۔ صوبے دار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی۔ فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں یہ اسے خوب معلوم تھا۔ سمجھا ممکن ہے صوبہ دار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیلداری میں نام زد ہو جائے۔ اِدھر شیام دُلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک نشانہ سے دو شکار ہو رہے تھے۔ نیا ریشمی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہونچا۔ اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچہ سا معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانہ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ فٹ بال میں کس طرح ایک دیو قامت گورے کو شکست دی۔ ہاکی میچ میں کس طرح تنہا گول کر لیا کہ صوبہ دار صاحب دیو کی طرح آکر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے۔ ارے سنو، تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ انہیں لے جا کر ذرا جنگل کی سیر کرا لاؤ۔ کچھ شکار وکار کھلاؤ۔ یہاں ٹیٹھر و ٹیٹھر تو ہے نہیں۔ ان کا جی گھبراتا ہوگا۔ وقت بھی اچھا ہے۔ شام تک لوٹ آؤ گے۔

شکار کا نام سنتے ہی گجندر سنگھ کی نانی مر گئی۔ بیچارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ یہ دیہاتی اُجڈ لونڈے اسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے۔ کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے۔ کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے۔ ہرن بھی تو راہ فرار نہ پا کر کبھی کبھی پلٹ پڑتا ہے۔ کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام ہی تمام کر دے۔ بولے۔ میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہت تھک گیا ہوں۔

صوبہ دار صاحب نے فرمایا۔ تم گھوڑے پر سوار ہو لینا۔ یہی تو دیہات کی بہار ہے۔ چنّو، جا کر بندوق لا۔ میں بھی چلوں گا۔ کئی دن سے باہر نہیں نکلا۔ میرا رائفل بھی لیتے آنا۔

چنّو اور منّو خوش خوش بندوق لینے دوڑے۔ ادھر گجندر کی جان سوکھنے لگی۔ پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ جانتا کہ یہ بلا سر پر آنے والی ہے تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑ رہتا۔ اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری دیہاتی گھوڑے یونہی تھان پر بندھے بندھے ترّے ہو جاتے ہیں۔ اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آ پہنچے۔ گھوڑا بھی کھنچ کر آ گیا۔ صوبہ دار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اب گجندر کے لئے کوئی حیلہ نہ رہا۔ اس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا، ہنہناتا تھا۔ اٹھی ہوئی گردن، لال لال آنکھیں، کنوتیاں کھڑی۔ بوٹی بوٹی

پھڑک رہی تھی۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ گجندر دل میں سہم اُٹھا۔ مگر بہادری دکھانے کے لئے گھوڑے کے پاس جاکر اُس کی گردن پر اس طرح تھپکیاں دیں گویا پکا شہسوار ہے۔ اور بولا۔ جانور تو جاندار ہے۔ مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں۔ ایسا کچھ بہت تھکا نہیں ہوں۔ میں بھی پیدل ہی چلوں گا۔ اس کی مجھے مشق ہے۔

صوبہ دار نے کہا۔ بیٹا جنگل دور ہے۔ تھک جاؤ گے۔ بڑا سیدھا جانور ہے۔ بچہ بھی سوار ہو سکتا ہے۔

گجندر نے کہا۔ جی نہیں۔ مجھے بھی یونہی چلنے دیجئے۔ گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں گے۔ سواری میں وہ لطف کہاں۔ آپ بزرگ ہیں۔ سوار ہو جائیں۔

چاروں آدمی پیادہ چلے۔ لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا۔ تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں۔ اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دور کے بعد پتھریلا راستہ ملا۔ ایک طرف ہرا بھرا میدان، دوسری طرف پہاڑ کا سلسلہ دونوں ہی طرف ببول، کریل، کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے۔ صوبے دار صاحب اپنی فوجی زندگی کے پامال قصے کہتے چلے آتے تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بار بار پچھڑ جاتا تھا۔ اور اسے دو چار قدم دوڑ کر اُن کے برابر ہونا پڑتا تھا۔ پسینے سے تر، ہانپتا ہوا، اپنی حماقت پر پچھتاتا، چلا جاتا تھا۔ یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ شیام دُلاری مہینے دو مہینے میں جاتی ہی۔ مجھے اس وقت کتوں کی طرح دوڑے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ابھی سے یہ حال ہے۔ شکار نظر آگیا تو نہ معلوم کیا آفت آئے گی میل دو میل کی دوڑ تو ان کے لئے معمولی بات ہے۔ مگر یہاں تو کچھ مر نکل جائے گا۔ شاید بیہوش ہو کر گر پڑوں پیر ابھی سے من من بھر کے ہو رہے ہیں۔

یکایک راستے میں سیمل کا ایک درخت نظر آیا۔ نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے۔ اوپر سارا درخت گلنار ہو رہا تھا۔ گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چُنّو نے پوچھا۔ کیا ہے جیجا جی۔ رُک کیسے گئے؟

گجندر سنگھ نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا۔ کچھ نہیں، اس درخت کا حسن دلاویز دیکھکر دل باغ باغ ہوا جا رہا ہے۔ اہا ! کیا بہار ہے، کیا رونق ہے، کیا شان ہے، گویا جنگل کی دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لئے زعفرانی جوڑا زیب تن کیا ہو، یا رشیوں کی پاک روحیں سفر جاوداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں، یا قدرت کا نغمہ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیے مجھے اس آب حیات سے شادکام ہونے دیجئے۔

دونوں نوجوان فرط حیرت سے گجندر کا منھ تاکنے لگے۔ اُن کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ حضرت کہہ کیا رہے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے، جنگلوں میں گھومنے والے، سیل ان کے لئے کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ اسے روز دیکھتے تھے، کتنی ہی بار اس پر چڑھے تھے۔ اس کے نیچے دوڑے تھے۔ اس کے پھولوں کے گیند بنا کر کھیلے تھے۔ ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی۔ حسن پرستی وہ کیا جانیں!

صوبہ دار صاحب آگے بڑھ گئے تھے۔ ان لوگوں کو ٹھہرا ہوا دیکھکر لوٹ آئے اور بولے۔ کیوں بیٹا، ٹھہر کیوں گئے۔

گجندر نے دست بستہ گذارش کی۔ آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں شکار کھیلنے نہ جا سکوں گا۔ اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میری روح نغمہ جنت کا مزہ لے رہی ہے۔ آہا ! یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے، مجھ میں بھی وہی سرخی ہے، وہی حسن ہے، وہی لطافت ہے، میرے دل پر صرف اگیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں ! جنگل کے معصوم جانوروں کا ! ہمیں تو جانور ہیں، ہمیں تو پرند ہیں۔ یہ ہمارے ہی تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالم اجسام کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ کیا اپنا ہی خون کریں ! نہیں۔ آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں۔ مجھے اس مستی و بہار میں محو ہونے دیں۔ بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ آپ بھی شکار سے باز آئیں۔ زندگی مسرت کا خزانہ ہے۔ اس کا خون نہ کیجئے۔ نظارہ ہائے قدرت سے چشم باطن کو مسرور کیجئے۔ قدرت کے ایک ایک ذرے میں، ایک ایک پھول میں، ایک ایک پتی میں مسرت کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔ خوں ریزیوں سے مسرت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجئے۔

اس تصوف آمیز تقریر نے سبھی کو متاثر کر دیا۔ صوبہ دار صاحب نے چنّو سے آہستہ سے کہا۔ عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے۔ چنّو نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے۔ شکار کھیلنا ہے بُرا۔

صوبہ دار نے عارفانہ انداز سے کہا۔ ہاں بُرا تو ہے۔ چلو لوٹ چلیں۔ جب ہر ایک چیز میں اُسی کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون۔ اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا۔

پھر وہ گجندر سے بولے۔ بھیّا تمھارے اُپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے۔

گجندر پر مستانہ کیفیت طاری تھی۔ اُسی سرور کے عالم میں بولے۔ ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی۔ مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کر سکتا۔ اَنگنت جنگلی سور، ہرن، تیندوے، نیل گائیں، مگر ہلاک کئے ہوں گے۔ ایک بار ایک چیتے کو مار ڈالا تھا۔ مگر آج مئے عرفان کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہ رہا۔

(۲)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی۔ آٹھ ہی بجے سے گانوں کے عورت مرد، بوڑھے بچے، گاتے بجاتے کبیریں اُڑاتے ہولی کی طرف چلے۔ صوبہ دار صاحب بھی بال بچوں کو لئے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گانوں کی ہولی نہ دیکھی تھی۔ اُس کے شہر میں تو ہر محلّے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کندے جلا دئے جاتے تھے جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے۔ یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا، آتشبازی چھوٹنے لگی۔ چھوٹے بڑے سبھی پٹاخے، چھچھوندریں، ہوائیاں، چھوڑنے لگے۔ گجندر کے سر پر سے کئی چھچھوندریں سنناتی ہوئی نکل گئیں۔ ہر ایک پٹاخے پر بے چارہ دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اُجڈ دیہاتیوں کو بد دعائیں دیتا تھا۔

یہ کیا بیہودگی ہے ! بارود کہیں کپڑے میں لگ جائے، کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے۔ روز ہی تو ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ان دہقانیوں کو کیا خبر۔ یہاں تو دادانے جو کچھ کیا وہی کریں گے چاہے اس میں کچھ تُک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آئی۔ گویا بجلی کڑکی ہو۔ گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فیٹ اونچے اُچھل گئے۔ اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی اتنا نہ کودے تھے۔ دِل دھک دھک کرنے لگا، گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں۔ فوراً دونوں کان انگلیوں سے بند کر لئے اور دس قدم اور پیچھے ہٹ گئے۔

چُنّو نے کہا۔ جیجاجی۔ آپ کیا چھوڑیں گے۔ کیا لاؤں ؟

منو بولا۔ ہوائیاں چھوڑیئے جیجا جی۔ بہت اچھی ہیں۔ آسمان میں نکل جاتی ہیں۔

چُنّو۔ ہوائیاں بچّے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے۔ آپ بم گولہ چھوڑیئے بھائی صاحب۔

گجندر۔ بھئی مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں۔ مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی سے آتشبازیاں چھڑا رہے ہیں۔

منّو۔ دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیئے۔

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں۔ اُن کی سُرخ، سبز، سنہری چمک کے سامنے، ان کے گورے چہرے اور خوبصورت بالوں اور ریشمی کرتے کی دلفریبی کتنی بڑھ جائے گی۔ کوئی خطرے کی بات بھی نہیں۔ مزے سے ہاتھ میں لئے کھڑے ہیں۔ گُل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے، اور سب کی نگاہیں اُن کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ اُن کا فلسفی دماغ بھی خود نمائی کے شوق سے خالی نہ تھا۔ فوراً ماہتابی لے لی گو ایک شان بے نیازی کے ساتھ۔ مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولا چھوٹا۔ آسمان کانپ اٹھا۔ گجندر کو ایسا معلوم ہوا گویا کان کے پردے پھٹ گئے۔ یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا۔ ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی، اور سینے میں اختلاج ہونے لگا۔ ابھی اس دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ دوسرا دھماکا ہوا جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو۔ ساری فضا متلاطم ہو گئی۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل شور مچاتی ہوئی بھاگ گئیں

چالوستیاں تڑا تڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پاؤں کھ کر بھاگے۔ سرپٹ۔ اور سیدھے گھر پر آکر دم لیا۔ چنتو اور منتو دونوں گھبرا گئے۔ صوبہ دار صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ تینوں آدمی بگٹٹ دوڑتے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے۔ دوسروں نے جو انہیں بھاگتے دیکھا تو سمجھے کوئی شدید واردات ہو گئی۔ سب کے سب اُن کے پیچھے ہو لئے۔ گانوں میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ مہمان کو ہو کیا گیا؟ ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں۔

ایک لمحہ میں سینکڑوں آدمی صوبہ دار صاحب کے دروازے پر پرسش حال کے لئے جمع ہو گئے۔ گانوں کا داماد کم رو ہونے پر بھی قابل زیارت اور بدحال ہوتے ہوئے بھی منظور نظر ہوتا ہے۔

صوبہ دار نے سہمی ہوئی آواز سے پوچھا۔ تم وہاں سے کیوں بھاگ آئے بھیا؟

گجندر کو کیا معلوم تھا کہ اُس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا۔ اور جواب بھی ایسا کہ گانوں والوں پر اس کی ضماری کا سکہ بٹھا دے۔

بولا۔ کوئی خاص بات نہ تھی۔ دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہئے۔

"۔ نہیں کوئی بات ضرور تھی"

"۔ آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ ۔ میں اُسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"۔ جب تک بتلا نہ دو گے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہوگی۔ سارا گانوں گھبرایا ہوا ہے"

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا۔ آنکھیں بند کر لیں، جمہائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے۔

بات یہ ہے کہ جوں ہی میں نے مہتابی ہاتھ میں لی، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ میں نے کبھی آتشبازیاں نہیں چھوڑیں۔ ہمیشہ اس کی مذمت کرتا رہا ہوں۔ آج میں نے وہ فعل کیا جو میرے ضمیر کے خلاف تھا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری روح مجھ پر نفرین کر رہی ہے۔ شرم سے میری گردن خم ہو گئی۔ اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا۔ اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں آپ کے جشن میں نہ شریک ہو سکوں گا۔

صوبہ دار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا داں کوئی اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا۔ اُن کی آنکھیں کہہ رہی تھیں، " آتی ہیں تم لوگوں کی سمجھ میں یہ باتیں۔ تم بھلا کیا سمجھو گے۔ ہم بھی کچھ کچھ ہی سمجھتے ہیں۔"

ہولی تو وقت معینہ پر جلائی گئی، مگر آتشبازیاں دریا میں ڈال دی گئیں۔ شریر لڑکوں نے کچھ اس لئے چھپا کر رکھ لیں کہ گجندر چلے جائیں گے تو مزے سے چھڑائیں گے۔

شیام دلاری نے تخلیہ میں کہا۔ تم تو وہاں سے خوب بھاگے۔

گجندر اکڑ کر بولے۔ بھاگتا کیوں، بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔

"۔ میری تو جان نکل گئی کہ نہیں معلوم کیا ہو گیا۔ تمھارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی۔ ڈکری بھر آتشبازیاں پانی میں پھینک دی گئیں۔"

"۔ یہ تو روپیہ کو آگ میں پھونکنا ہے۔"

"۔ ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں۔ تیوہار اسی لئے تو آتے ہیں۔

"۔ تیوہار میں گاؤ بجاؤ۔ اچھی اچھی چیزیں پکاؤ کھاؤ۔ خیرات کرو۔ عزیزوں سے ملو۔ سب سے محبت سے پیش آؤ۔ بارود اُڑانے کا نام تیوہار نہیں ہے۔"

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ کسی نے دروازہ پر دھکا مارا۔

گجندر نے چونک کر پوچھا۔ یہ دھکا کس نے مارا؟

شیاما نے لاپروائی سے کہا۔ بلّی ولّی ہو گی۔

کئی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کیواڑ پر دھکا پڑا۔ گجندر کو لرزہ آگیا۔ لالٹین لے کر درازے سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ چار پانچ آدمی کرتے پہنے، پگڑیاں باندھے، ڈاڑھیاں لگائے، شانے پر بندوق رکھے کیواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے۔ گجندر کان لگا کر اُن کی باتیں سننے لگا۔

"۔ دونوں سو گئے ہیں۔ کواڑ سے توڑ ڈالو۔ مال الماری میں ہے۔"

"اور اگر وہ دونوں جاگ گئے؟"

"عورت کیا کر سکتی ہے۔ مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے۔"

"سنتے ہیں گجندر سنگھ کوئی بڑا پہلوان ہے۔"

"کیسا ہی پہلوان ہو۔ چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے۔"

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شیام دلاری سے بولے۔ یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ اب کیا ہوگا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔

"چور چور پکارو۔ جاگ ہو جائے گی۔ آپ بھاگ جائیں گے۔ نہیں میں چلاتی ہوں۔ چور کا دل آدھا۔"

"نانا، کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ گانوں میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ گھر کے آدمی کیا ہوئے؟"

"بھیّا اور منو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں۔ کاکا دروازے پر پڑے ہوں گے۔ اُن کے کانوں پر توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے۔"

"اس کمرہ میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہونچے۔ مکان ہے یا قید خانے۔"

"میں تو چلاتی ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی کیوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چپ سادھ کر لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کرلیں۔ بدمعاشوں کو جو کچھ لے جانا ہو لے جائیں۔ جان تو بچے۔ دیکھو کواڑ ہل رہے ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ یا ایشور، کہاں جاؤں۔ اس مصیبت میں تمہارا ہی بھروسا ہے۔ کیا جانتا تھا کہ یہ آفت آنے والی ہے، نہیں آتا ہی کیوں۔ بس چپّی سادھ لو۔ اگر ہلائیں و لائیں تو بھی سانس مت لینا۔"

"مجھ سے تو چپّی سادھ کر پڑے نہ رہا جائے گا۔"

"زیور اُتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں۔ شیطان زیور ہی تو لیں گے۔"

"زیور تو نہ اُتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

"کیوں جان دینے پر تُلی ہوئی ہو؟"

"خوشی سے تو زیور نہ اتاروں گی۔ زبردستی کی اور بات ہے۔"

"خاموش۔ سنو سب کیا باتیں کر رہے ہیں۔"

باہر سے آواز آئی۔ کواڑ کھول دو۔ نہیں ہم کواڑ توڑ کر اندر آجائیں گے تو ......

گجندر نے شیام دلاری کی منت کی۔ میری بات مانو شیاما۔ زیور اتار کر رکھ دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے زیور بنوا دوں گا۔

باہر سے آواز آئی۔ کیوں شامتیں آئی ہیں۔ بس ایک منٹ کی مہلت اور دیتے ہیں۔ اگر کواڑ نہ کھولے تو خیریت نہیں۔

گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا۔ کھول دوں؟

"ہاں بلا لو۔ تمہارے بھائی بند ہیں نہ۔ وہ دروازے کو باہر سے ڈھکیلتے ہیں۔ تم اندر سے باہر کو ٹھیلو۔"

"اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے؟ پانچ پانچ جوان ہیں۔"

"وہ کونے میں لاٹھی رکھی ہے۔ لے کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو۔"

"چنّو دادا ہوتے تو پانچوں کو گراتے۔"

"میں لٹھ باز نہیں ہوں۔"

"تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ۔ میں ان سبھوں سے سمجھ لوں گی۔"

"تمہیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے۔ ماتھے میرے جائے گی۔"

"میں تو چلاتی ہوں۔"

"تم میری جان لے کر چھوڑو گی۔"

"مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔ میں کواڑ کھولے دیتی ہوں۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ پانچوں چور کمرے میں بھر بھرا کر گھس آئے۔

ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں۔ تم عورت کے سارے گہنے

دوسرا بولا۔ اس نے تو آنکھیں بند کرلیں۔ ارے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی۔

تیسرا۔ یار عورت تو حسین ہے۔

چوتھا۔ سنتی ہے او مہریا۔ زیور دے دے نہیں گلا گھونٹ دوں گا۔

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ یہ چڑیل زیور کیوں نہیں اُتار دیتی۔

شیام دلاری نے کہا۔ گلا گھونٹ دو چاہے گولی مار دو۔ زیور نہ اُتاروں گی۔

پہلا۔ اسے اٹھائے چلو۔ یوں نہ مانے گی۔ مندر خالی ہے۔

دوسرا۔ بس یہی مناسب ہے۔ کیوں رے چھوکری۔ ہمارے ساتھ چلے گی؟"

شیام دلاری۔ تمھارے منہ میں کالکھ لگا دوں گی۔

تیسرا۔ نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جاکر بیچ ڈالیں گے۔

شیام۔ ایک ایک کے ہتھکڑی ڈلوا دوں گی۔

چوتھا۔ کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی۔ ذرا ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی۔ کیا ہم اس لونڈے سے بھی گئے گذرے ہیں۔ کیا رہ جائے گا اگر ہم تجھے زبردستی اٹھائے جائیں گے۔ یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو۔ تم جیسی ماہرو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

پانچواں۔ یا تو سارے زیور اُتار کر دیدے۔ یا ہمارے ساتھ چل۔

شیام دلاری۔ کاکا آجائیں گے تو ایک ایک کی کھال اُدھیڑ ڈالیں گے۔

پہلا۔ یہ یوں نہ مانے گی۔ اس لونڈے کو اُٹھائے چلو۔ تب آپ ہی پیروں پڑے گی۔

دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ گجندر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ سانس تک نہ آتی تھی۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے۔ ہائے! کتنی بے وفا عورت ہے۔ زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مار ڈالیں۔ اچھا زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا۔ بات تک تو پوچھوں نہیں۔

جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اٹھالیا اور لے کر آنگن میں جا پہونچے تو شیام دلاری دروازے پر کھڑی ہوکر بولی۔ انھیں چھوڑ دو تو میں تمھارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔

پہلا۔ پہلے ہی کیوں نہ راضی ہوگئی تھی۔ چلے گی نہ ؟

شیام دلاری۔ چلوں گی، کہتی تو ہوں۔

تیسرا۔ اچھا تو چل۔ ہم اسے چھوڑے دیتے ہیں۔

دونوں چوروں نے گجندر کو لاکر چارپائی پر لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی نہ نظر آیا۔ اٹھ کر دروازے سے جھانکا صحن میں بھی کوئی نہ تھا۔ تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے۔ لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ صوبہ دار صاحب کو جگائیں۔ منھ سے آواز نہ نکلی۔

اسی وقت قہقہے کی آواز آئی۔ پانچ عورتیں چہل کرتی ہوئی شیام دلاری کے کمرے میں آئیں۔ گجندر کا وہاں پتہ نہ تھا۔

ایک۔ کہاں چلے گئے ؟

شیام دلاری۔ باہر چلے گئے ہوں گے،

دوسری۔ بہت شرمندہ ہوں گے۔

تیسری۔ مارے خوف کے ان کی سانس تک بند ہوگئی تھی۔

گجندر نے بول چال سنی تو جان میں جان آئی سمجھے شاید گھر میں جاگ ہوگئی۔ لپک کر کمرے کے دروازے پر آئے اور بولے۔

ذرا دیکھئے شیاما کہاں ہے۔ میری تو نیند ہی نہ کھلی۔ جلد کسی کو دوڑائیے۔

یکایک انھیں عورتوں کے بیچ میں شیاما کو کھڑے ہنستے دیکھ کر حیرت میں آگئے۔

پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیا۔

ایک نے کہا۔ واہ جیجا جی۔ دیکھ لی آپ کی بہادری۔

نیام دکاری ۔ تم سب کی سب شیطان ہو۔

تیسری بیوی تو چہدوں کے ساتھ چلی گئی اور آپ نے سانس تک نہ لی۔

گجندر سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا۔ مگر زبان کے شیر تھے۔ فوراً بگڑی بات بنالی۔ بولے۔ تو کیا کرتا تماشا سوانگ بگاڑ دیتا۔ میں بھی اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اگر سبھوں کو پکڑ کر موچھیں اکھاڑ لیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں۔ میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔

سب کی سب گجندر کا منھ دیکھتی رہ گئیں۔

گرجک

میرداد خاں تیرہ چودہ برس کی عمر سے بریلی کی چھاؤنی میں ایک رسالدار صاحب کے یہاں نوکر تھا۔ اس کے ماں باپ اس کی ہوش سے پہلے اس دنیا میں اسے تنہا چھوڑ کر سفر آخرت پر چلے گئے تھے۔ رسالدار صاحب کی پرورش اور مہربانی سے یہ جواں ہونے پر رسالے میں ملازم ہو گیا۔

کوئی چالیس بیالیس برس کی عمر میں میرداد خاں سوار چین کی لڑائی سے بہادری کے دو تمغے، بارہ روپیہ مہینہ کی پنشن اور عمر بھر کی کمائی گیارہ سو روپیہ لے کر پھر بریلی واپس پہنچا۔ لیکن بریلی میں نہ کوئی رشتہ دار نہ عزیز اس کا دل نہ لگا۔ اور آخر کار یہ اپنے آبائی مسکن و مولد کھیڑے کو چل کھڑا ہوا۔ اپنے گاؤں پہنچ کر ایک غریب مسلمان کی بکتی ہوئی چالیس بگہہ زمین خریدی۔ چھوٹا سا گھر بنایا۔ اور گھر کو آباد کرنے کے لئے شادی کر لی۔

میرداد خاں کا دل اپنے گھر بار اور کسانی میں ایسا لگا کہ اسے سوائے اپنے اکلوتے بیٹے ولی داد کے لاڈ پیار اور اپنی زمین جوتنے اور بونے کے کسی سے کوئی غرض اور سروکار ہی نہ رہا۔

میرداد خاں کی عمر ساٹھ سے اوپر اور ولی داد کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی کہ میرداد کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔ میرداد متدین تو ہمیشہ سے تھا ہی اب بڑھاپے میں رفیق زندگی کی جدائی سے اس کا دل اور بھی ٹوٹ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ جلد سے جلد ولی داد کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہو کر گھر بار اور اسی بگہہ زمین اسے سونپ دے اور خود اللہ کی عبادت میں مصروف رہے۔

جمعدار فتح نصیب خاں کی یتیم بھانجی سے ولی داد خاں کی منگنی ٹھہری۔ دو ماہ بعد عید کے چاند شادی بھی ہو گئی۔ میرداد خاں زندگی کی جھک جھک سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ مسجد میں نماز کے لئے تو جاتے تھے مگر ان پانچ وقت کے علاوہ گھر سے باہر پاؤں نہ نکالتے۔ گھر کے سائبان میں چھپر کے نیچے۔ بھوسے کی کوٹھی کے پاس بیٹھے اللہ اللہ کرتے رہتے اور اپنے پوتے کو خدا کے نام۔ روزہ نماز کے احکامات۔ اور قرآن شریف

پڑھایا کرتے۔ ولی داد دن بھر کام کاج میں لگا رہتا۔ پھر شام ہوتے گھر واپس آتا۔ بہو اور پوتا۔ بوڑھے میر داد خاں کی رفاقت ہی میں دن گذارتے۔ میر داد خاں کو اپنی بہو اور پوتے سے بے حد محبت تھی۔ دل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔ ان کی بہو اور پوتا بھی انھیں بے حد ہی چاہتے تھے۔ یہ محبت کی برکتوں سے مالا مال زندگی خوب تھی۔ صبح۔ شام ہوتی رہی۔ مہینے اور سال گذرتے رہے۔ اور یہ محبت بڑھتی گئی۔ لیکن اس چار آدمیوں کے مختصر خاندان میں ولی داد اس نعمت سے محروم تھا۔ اسے ننانوے کے پھیر میں اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ بوڑھے باپ کی شفقتوں کا شکریہ ادا کرتا۔ اپنی نیک بخت بیوی کی جانفشانیوں کی قدر کرتا یا اپنے ذہین اور تندرست بیٹے کے کھیلوں میں شریک ہو سکتا۔ اس کی زندگی خشک تھی اور تلخ۔ اسے اپنا بوڑھا باپ ایک بوجھ معلوم ہوتا۔ اسے اپنی بیوی۔ ایک مصیبت نظر آتی۔ اسے اپنا بچہ ازدواجی زندگی کا ناگزیر تتمہ معلوم ہوتا۔

بوڑھے میر داد کی عمر ستر برس سے اوپر ہو گئی۔ ان کے پوتے کی عمر بھی اب آٹھ نو سال کی تھی۔ پیر سال اور خورد سال۔ جواں سال کی کرختگی کو محسوس کرتے لیکن محبت اس کی تلخی کو مٹا دیتی۔

ایک دن ولی داد کی بیوی کو بخار آ گیا۔ ولی داد ایک جوڑی بیل خریدنے کے لئے میلے میں گیا ہوا تھا۔ گھر میں روٹی نہ پک سکی۔ دادا اور پوتے نے دودھ پر گذارا کیا۔

رات کو دس بجے ساون کے منہ میں بھیگتا بھاگتا ولی داد گھر واپس آیا۔ خرید میں ناکامی۔ سفر کی تکان۔ بارش کی تکلیف سے مزاج معمول سے زیادہ خراب ہو رہا تھا۔ کریلے کی تلخی نیم چڑھنے سے اور بڑھ گئی تھی۔ گھر میں گھسا تو گویا طوفان کی طرح در آیا۔ آتے ہی کھانا مانگا۔ بیوی کو سر پیر کا ہوش نہ تھا۔ بوڑھا باپ نظر کی کمزوری اور بڑھاپے کی ناتوانی کے باعث چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ بیٹا بچہ تھا۔ کھانے کا بندوبست کون کرتا۔ بھوکے شیر کے آگے پکی پکائی کون لا رکھتا۔

بھوک میں شیر بپھر گیا۔ بخار میں بے ہوش بیوی کو مارنا شروع کیا۔ ضعیف باپ یہ نہ دیکھ سکا۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولا۔ ولی داد اس بے چاری کو کیوں مارے ڈالتا ہے۔ اس کی دوا دارو کی فکر تو ہوئی نہیں

اپنے پیٹ کی تنگی سے بے حال ہو گیا۔ بہو اسی حال میں آٹہ گھڑی ہوئی۔ بولی ابّا۔ میں روٹی ڈالتی ہوں ان کا غصہ بھی سچا ہے۔

بیوی کی اطاعت شعاری سے اس کی طرف سے تو غصہ ٹھنڈا ہو گیا لیکن ناتواں باپ کی مداخلت بُری معلوم ہوئی۔ ولی داد بولا۔ بڈھے چین سے بیٹھا ہے اسی لئے زبان چلتی ہے۔

باپ نے کہا۔ کیا مفت بیٹھا ہوں۔ عمر بھر تلوار چلائی محنت کی یوں بیٹھا ہوں۔

بیٹے نے کہا۔ اچھا عمر بھر تلوار چلائی۔ اب زبان چلاتا ہے۔ نکل میرے گھر سے۔ دیکھوں۔ تیرا زبان چلانا۔

جواں بیٹے نے جوانی کی ترنگ میں بڈھے باپ کی چارپائی اُلٹ دی۔ اور سر پر کھڑا ہو گیا۔ نکل میرے گھر سے۔ نکل میرے گھر سے چیخنے لگا۔ بہو دوڑی ہوئی آئی۔ اپنے شوہر کے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ بڈھا باپ لڑکھڑاتا۔ دھواں دھار برستے مینہہ میں بھیگتا۔ دروازہ کی طرف چل کھڑا ہوا۔ مگر ولی داد نے ایک نہ سنی۔ اور یہی کہتا رہا کہ بڈھے کو زبان چلانے کا مزا اب معلوم ہوگا۔

بیوی کی خوشامد درآمد سے ولی داد اس بات پر تیار ہو گیا کہ گھوڑی پر باندھنے کا پرانا کمبل بڈھے باپ کو بارش کی اذیت سے بچنے کے لئے دیدے۔ اس نے اپنے بیٹے مہرداد کو آواز دی اور کہا۔ دیکھ کوٹھری میں جو کمبل پڑا ہے وہ اپنے دادا کو دے آ۔

سپوت مہرداد اُٹھا۔ کوٹھری میں سے کمبل نکال لایا اور دالان میں کھڑا ہو کر اسے ٹھیک بیچ سے پھاڑنے لگا۔

ولی داد نے کہا۔ کیا کرتا ہے بے۔ باہر دے کیوں نہیں آتا؟ خورد سال مہرداد نے کہا۔ اس کمبل کے برابر کے دو ٹکڑے کر رہا ہوں۔ کہ جب میں تمہاری برابر ہو جاؤں۔ اور تم دادا کی برابر ہو جاؤ۔ اور میں تمہیں گھر سے نکالوں تو یہ باقی آدھا کمبل تمہارے کام آئے۔ ولی داد یہ سن کر غصے میں آگے بڑھا۔ لیکن خدا جانے دل پر کیا گذری کہ فوراً ہی روتا ہوا باہر نکل گیا۔ اپنے بوڑھے باپ کو گود میں اُٹھا کر گھر میں لے آیا۔ اور اس کے قدموں میں سر رکھ کر بہت دیر تک زار و قطار روتا رہا۔

تنقید و تبصرہ

اقامۃ الشہود فی رد الیہود | یہ کتاب ایک علمی تحفہ ہے جو عالی جناب حکیم محمد احمد خاں صاحب اپنے سفر عراق کر امسال ہمارے واسطے لائے۔ انھوں نے اپنی علم دوستی سے حضرت مسیح الملک مرحوم کی سنت کو تازہ کر دیا کیونکہ وہ بھی جب سفر عراق و مصر سے واپس آئے تھے تو ایک کتاب " الفلاکۃ والمفلوکون " لائے تھے جس کا خلاصہ اسی زمانہ میں رسالہ جامعہ میں شائع کیا گیا تھا۔

اقامۃ الشہود مرزا محمد رضا نومسلم طہرانی کی تصنیف ہے جو علماء یہود میں ممتاز بلکہ فرید عصر تھے۔ اور بیت المقدس تک کے احبار ان کی علمی فضیلت کا اعتراف کرتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں۔

"کمترین حقیر فقیر از سلسلۂ علماء بنی اسرائیل و در میان ایشاں از افاضل و اعیان بودم۔ و ہمگی علماء بیت المقدس و ارباب فہم آں طائفہ بفضل و تتبع من معترف بودند۔ و در تمام ایام عمر مشغول بہ تحصیل علوم و مطالعہ کتب سماوی و در مقام متابعت رسوم انبیاء سلف و علماء خلف بودم۔ و دراں تجسس و طلب بجز از تمیز میان حق و باطل ادیان، و وصول بطریق حق و ایقان مطلبے و مقصودے نداشتم۔ و پیوستہ ظہور راہ صواب را از مفتح الابواب سائل، و استجابت دعا را از جناب رب الارباب آرزو مند و مائل بودم۔ تا آنکہ توفیق ربانی شامل حال و تائید سبحانی کافل احوال و آمال ایں سعادت مآل گردیدہ بہ تشریف شریف دین حنیف محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سرفراز و بایں عطیۂ عظمیٰ از ہمگی اماثل و اقران خود ممتاز گردید۔"

مسلمان ہو جانے کے بعد فاضل موصوف نے علماء یہود کے سامنے دین اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے خود صحائف بنی اسرائیل سے سنہ ۱۲۳۶ھ میں بعہد فتح علی شاہ قاچار یہ کتاب تالیف کی۔ جو دلائل اس میں لکھے ہیں وہ اس قدر مسکت ہیں کہ یہودی علماء سے آج تک ان کے جوابات نہ بن پڑے۔

چونکہ یہ کتاب عبرانی زبان میں لکھی گئی تھی جس سے مسلمان اہل علم بالعموم ناواقف ہیں اس لئے علامہ سید علی بن حسین حسنی طہرانی نے جو زبان مذکور میں مہارت نامہ رکھتے تھے ناصر الدین شاہ قاچار کے عہد میں اس کا فارسی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا۔ اسی زمانہ کا ایک مطبوعہ نسخہ حکیم صاحب موصوف کے ہاتھ لگا جس کو اپنے ساتھ ہندوستان لائے۔ اس میں جو بحثیں ہیں ان کے مخاطب علمار یہود ہیں اور انھیں کی دینی اور علمی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ علمار اسلام میں سے جن کو یہود کے ساتھ بحث ومباحثہ کا سابقہ پڑے ان کو یہ کتاب ضرور پیش نظر رکھنی چاہیئے۔

کتاب الصلوٰۃ | حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے نماز کے متعلق یہ کتاب لکھی تھی جو ائمہ وعلمار اسلام میں آج تک برابر مقبول چلی آتی ہے۔ شیخ علی جواد صاحب۔ بی اے لکچرر مسلم یونیورسٹی انٹرمیڈیٹ کالج علی گڑھ نے نہایت عمدگی کے ساتھ اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اور چھوٹی تقطیع پر خوشنما کتابت کے ساتھ اعلیٰ قسم کے کاغذ پر طبع کرایا ہے۔ شروع میں امام موصوف کی مختصر سوانح عمری بھی لکھ دی ہے۔ کتاب نہایت مفید اور عمدہ ہے۔ قیمت درج نہیں۔

سیرۃ محمدی | علامہ شیخ محب الدین ابوجعفر احمد بن عبداللہ طبری متوفی ۶۹۴ھ نے سیرۃ کی بہت سی کتابوں کا عصارہ اور جوہر نکال کر ایک مختصر سیرۃ خلاصۃ السیر کے نام سے لکھی تھی۔ مولانا محمد صاحب جوناگڈھی اڈیٹر اخبار محمدی۔ باڑہ ہندوراؤ۔ دہلی نے اس کا سلیس اردو ترجمہ کرکے شائع کیا ہے جو لوگ سیرۃ کی بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کی فرصت نہیں رکھتے ان کو یہ مختصر سیرۃ ضرور پڑھ لینی چاہئے۔ مولانا نے اصل عربی سیرۃ بھی چھاپ دی ہے جس کی قیمت عربی نسخہ ہے۔ اردو ترجمہ کی ۱۲ر اور دونوں کی عہ

شان قرآن | مصر کے مشہور فلسفی فاضل علامہ فرید وجدی کے رسالۃ القرآن کا ترجمہ ہے جس کو مولوی عبدالحلیم صاحب ناظم صدیقی "مولوی فاضل" اڈیٹر رسالہ محدث ومدرس دارالحدیث رحمانیہ۔ دہلی نے صاف اردو میں

ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ تقطیع خورد لکھائی چھپائی اوسط اور کاغذ عمدہ ہے۔ قیمت فی نسخہ ۵ ر ہے۔ اس رسالہ میں علامہ موصوف نے قرآن کی مختصر تاریخ لکھی ہے اور اس کے وجوہ اعجاز سے بحث کی ہے۔ اگرچہ اردو زبان میں ان عنوانوں پر اس سے مفصل اور مبسوط کتابیں موجود ہیں جو زیادہ تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ لیکن یہ مختصر بھی اپنے معیار سے طلبار کے لئے مفید ہے۔

التنقید السدید علی التفسیر الجدید | یہ تین جزو کا ایک رسالہ ہے جس کو مولانا ابو المآثر حبیب الرحمٰن صاحب "مولوی فاضل" صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم قصبہ مئو ضلع اعظم گڈھ نے خواجہ عبد الحیٰ صاحب فاروقی شیخ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی تفسیر کی تنقید میں لکھا ہے۔ تنقید اگر اپنے وجدان اور علمی نگاہ سے لکھی جائے تو وہ ایک مفید شے ہے مگر مولانا ابو المآثر نے جو کچھ لکھا ہے وہ تقلید بلکہ ضعیفت کی حمیت میں لکھا ہے اس وجہ سے ان کی یہ تنقید سراپا تردید ہو گئی ہے۔ اور اس میں تحقیق حق کی کوئی شان باقی نہ رہی۔ خواجہ صاحب کی تفسیر میں غلطیاں نکالی جا سکتی ہیں اور دنیا میں کونسی ایسی تفسیر ہے جس میں غلطیاں نہیں ہیں۔ کیوں کہ تفسیریں انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں جن میں خطا بھی ہے اور نسیان بھی۔ غلطی بھی ہے اور غلط فہمی بھی مگر مذہبی عصبیت جس کی بنیاد پر یہ نکتہ چینیاں کی گئی ہیں خالص جدل و مکابرہ ہے اور اس سے کوئی نفع مرتب نہیں ہوتا۔

خواجہ صاحب نے "باب الحیل" پر اعتراضات کئے ہیں۔ اور یہ اعتراضات کچھ نئے نہیں ہیں بلکہ ہر اہل نظر کے نزدیک فقہ کا یہ باب افسوسناک ہے اور اس تقوے کے بالکل منافی جس کے اوپر اسلام کی بنیاد ہے۔ چنانچہ علامہ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں نہایت وضاحت کے ساتھ ان کے اوپر بحث کر دی ہے جس کا کوئی جواب آج تک نہیں ہو سکا ہے۔ مولانا ابو المآثر نے ان حیلوں کی بھی حمایت کی ہے اور بحث کا رخ بالکل دوسری جانب موڑ دیا ہے یعنی ان حیل کی نوعیت جواز یا عدم جواز کی طرف۔ حالانکہ اصل بحث یہ ہے کہ یہ حیلے اس غرض سے تراشے گئے ہیں کہ شرعی حدود جو کتاب اللہ نے مقرر کئے ہیں ساقط کر دئے جائیں۔ اس لئے یہ بجائے جرائم کے انسداد کے ان کے اضافہ کا موجب ہوتے ہیں اور اسلام کی جڑ کاٹتے ہیں۔

خواجہ صاحب نے تقلید کو حرام کہا ہے۔ اس کے جواب میں مولانا ابو المآثر نے کئی صفحے سیاہ کئے ہیں

شاہ ولی اللہ مرحوم کی کتابوں سے جو کچھ وہ ثابت کرسکے ہیں وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے ۔

"اس شخص کے حق میں حرمت تقلید کا فتوے صحیح نہیں ہے جس کا اعتقاد ہو کہ حلال اور حرام وہی ہے جس کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال یا حرام فرمایا ہے۔ لیکن چونکہ وہ بے علم ہے یا مختلف احادیث میں جمع وتطبیق کے طریق سے ناآشنا ہے اور استخراج اور استنباط کا بھی اس کو سلیقہ نہیں اس لئے کسی عالم ربانی کا محض اس اعتماد پر اتباع کرتا ہے کہ وہ غلط نہ کہے گا۔ اور احادیث کے ماتحت ہی فتویٰ دے گا۔"

لیکن شاہ صاحب کے اس قول سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ جہلار کو علمار سے دین کے مسائل دریافت کر لینا چاہئے۔ مردہ اماموں کی تقلید کا ثبوت کہاں سے نکلتا ہے جس میں نہ صرف جہلار بلکہ مولانا ابوالآثر جیسے علمار بھی جو حدیث وفقہ پر وسیع نظر رکھتے ہیں گرفتار ہیں حقیقت یہ ہے کہ ائمہ وعلمار سلف کی تصانیف اور حالات سے علمی اور تاریخی فائدے حاصل کئے جاسکتے ہیں مگر ان کی تقلید یعنی ان کے اقوال کو بلادلیل تسلیم کرلینا قرآن کی رو سے قطعاً ممنوع ہے تاوقتیکہ ان کی سند نہ دی جائے۔ یہی خود ان مجتہدوں نے بھی کہا ہے کہ ہمارے قول کے مطابق اس وقت تک کسی کو فتوے دینا حرام ہے جب تک اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ ہم نے کہاں سے کہا؟"

دین اسلام اگر صرف عرب یا عہد رسالت کے لئے مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر زمان ہر ملک اور ہر قوم کے لئے ہے تو ہر زمان ہر ملک اور ہر قوم میں مجتہد ہونے بھی لازمی ہیں۔ گذشتہ مجتہدین صرف اپنے اپنے زمانوں اور اپنے اپنے ماحول کے مجتہد تھے وہ رسول نہ تھے کہ ہر مکاں اور ہر زماں میں ان کا قول دیں مانا جائے۔

الغرض تقلید جس قوم میں پیدا ہو جاتی ہے اس کے تنزل کے لئے پھر کسی دوسرے سبب کی مطلقاً ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ حریت فکر سلوب ہونے کے ساتھ زوال لازمی ہے اور یہی مسلمانوں کے معاملہ میں ہوا ہے۔

یہ تنقید افسوسناک حد تک غلط چھپی ہے ایک ایک صفحہ میں کئی کئی مطبعی غلطیاں ہیں۔ اور شاید یہاں کی معنوی غلطیوں کا تقاضا بھی یہی تھا۔

بیان الفرقان علی علم البیان | تفسیر سورۂ فاتحہ بقرہ بہ زبان عربی۔ مولفہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرت سری مدیر اخبار اہل حدیث۔ حجم ۹۰ صفحے، کتابت، طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت فی نسخہ ۱۲ ار

مولانا ثناء اللہ صاحب نے تفسیر ثنائی اردو میں لکھی ہے جو ہمارے دیکھنے میں نہیں آئی۔ دوسری تفسیر ان کی تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن عربی میں ہے جس پر رسالہ جامعہ میں تبصرہ لکھا جا چکا ہے۔ اب انھوں نے تیسری تفسیر مذکورۂ بالا نام سے عربی زبان میں لکھنی شروع کی ہے جس کا یہ ابتدائی حصہ ہمارے پاس بغرض "تقریظ" موصول ہوا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ تفسیریں چار قسم کی ہوتی ہیں۔ تفسیر القرآن بالقرآن[۱] ۔ تفسیر علی طریقۃ المتکلمین[۲] تفسیر علی علم البیان[۳] ۔ اور تفسیر بالروایات[۴] ۔ میں سے پہلی اور دوسری قسم کی تفسیریں تو وہ لکھ چکے ہیں۔ اب یہ تیسری قسم کی لکھ رہے ہیں لہذا ہم کو چوتھی قسم کا بھی منتظر رہنا چاہئے کیونکہ روایات تو بوجہ اہل حدیث ہونے کے مولانا کا خاص فن ہیں۔ لیکن یہ تقسیم بہت کچھ محل اعتراض ہوسکتی ہے کیونکہ اہل تصوف اور اہل تاریخ ضرور کہیں گے کہ صوفیانہ اور مورخانہ تفاسیر کو کیوں خارج کردیا۔ اہل تشیع اپنے ائمہ معصومین کے اقوال سے تفسیر لکھتے ہیں وہ کس ذیل میں جائے گی؟ مصر میں ایک شخص نے معدنیات کی رو سے تفسیر لکھی ہے جس کا نام اسرار القدرانیۃ القرانیہ ہے وہ اس میں داخل نہیں ہوسکتی۔ الغرض مولانا کی یہ تقسیم نہ جامع ہے نہ مانع اور نہ اس کی کوئی سند ہے۔

معانی وبیان اولاً تو محض ایک خیالی اور قیاسی فن ہے دوسرے مولانا کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس سے کوئی لگاؤ بھی نہیں ہے پھر مجھے حیرت ہے کہ علامہ زمخشری کی تفسیر کشاف کے ہوتے ہوئے جو اس فن کے امام تھے مولانا کو یہ جرأت کیسے ہوئی کہ ایسی بے مایہ تفسیر لکھ کر آفتاب کو چراغ دکھانے کی کوشش کریں۔ ان کی تو عربی بھی صحیح نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ وہ "ہندی عربی" کہی جا سکتی ہے۔ لکھتے ہیں۔

احل اللہ البیع وحرم الربوا فکیف السواء

یہ فکیف السواء کیا ہے؟ یہ کیسا جملہ ہے؟ اور یہ کس قسم کی عربی ہے۔؟

اسی صفحہ میں اس سے بھی زیادہ عجیب ایک اور فقرہ ہے۔ "اسد میا صورت سوال" اس محتاج کو

کہتے ہیں جس کی شکل ہی سے بلا مانگے ہوئے ظاہر ہوتا ہو کہ یہ سائل ہے۔ مولانا نے سوچا کہ صورت بھی عربی اور سوال بھی عربی پھر کیوں نہ عربی میں استعمال کیا جائے۔ چنانچہ لایسئلون الناس الحافا کے تحت میں لکھتے ہیں " اما صورۃ السوال میں غیر لفظ " مجھے یقین ہے کہ اس لفظ سے سوائے نوعیت سوال کے مشکل سے کوئی عربی داں اس مفہوم کو سمجھ سکے گا جو مولانا بیان کرنا چاہتے ہیں۔

تفسیر کی کیفیت یہ ہے کہ آیات کی حقیقت کے اظہار کی طرف اُنھوں نے اپنی توجہ بہت کم رکھی ہے صرف کہیں کہیں لفظوں کے ترجمے یا معانی و بیاں کے بعض صنائع کی طرف اشارے کرتے ہیں۔ چند مثالیں ان کی تفسیر کے ملاحظہ ہوں۔

ذبح بقرہ کے قصہ کے متعلق فقلنا اضربوہ ببعضہا کی تفسیر کرتے ہیں " اضربوا المقتول بحصۃ المقتولۃ " سوال یہ ہے کہ یہ مقتولہ کون ہے؟ اگر اس سے مراد بقرہ ہے تو مذبوحہ لکھنا چاہئے تھا اور اگر کوئی دوسری شے ہے تو اس کی تصریح لازم تھی۔

ہاروت و ماروت کو بجائے مَلَکین کے شیاطین کا بدل قرار دیا ہے۔ اس پر حاشیہ میں ابن جریر اور فتح البیان سے سند نقل کر کے یہ لطیف اشارہ کیا ہے کہ " فافہم " یعنی ہم نے تو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اب تم بھی غور کر کے اسی طرح حقیقت تک پہنچ جاؤ۔ حالانکہ اس تفسیر سے حقیقت سے اس قدر بعد ہو گیا کہ وہ کبھی فہم میں نہیں آسکتی۔ مولانا نے جو کچھ سمجھا ہے وہ صرف ابن جریر وغیرہ کے بیاں کو سمجھا ہے آیت قرآنی کا مفہوم قطعاً ان پر واضح نہیں ہوا۔

اگر ہاروت و ماروت ملکین کے لفظ کا بدل نہ ہوں جو تثنیہ ہے اور شیاطین کا بدل قرار دئے جائیں جو جمع ہے تو یہ ایسی عربی ہوگی جس کو عرب کے بچے بھی نہیں بولیں گے چہ جائیکہ یہ اللہ کا کلام ہو سکے۔ کسی ماقبل تفسیر کی سند لکھ دینے سے کوئی غلط بات صحیح نہیں ہو سکتی۔

ایک تیسری مثال یہ ہے کہ بیوہ عورت کے ساتھ زمانہ عدت میں تصریحاً نکاح کا پیغام قرآن کریم نے ممنوع قرار دیا ہے لیکن تعریض اور کنایہ کی اجازت دی ہے مولانا اس کنایہ کی مثال میں امرأالقیس کا یہ مصرع کس قدر تعرف کے ساتھ لکھتے ہیں۔

" الا شک بربذا العلم صبابۃ " یعنی " عاشق بزرگ لوگ ہیں اس (ترجمہ) خرد سال کے "

غالباً مولانا کا خیال یہ ہے کہ خطبہ نکاح ممنوع ہے نہ کہ اظہار تعشق۔

ان طلقتم النساء مالم تمسوھن کے تحت میں حاشیہ لکھا ہے "کما وقع بینی وبین ولی زوجتی الاولیٰ فطلقت قبل مساسہا رحمہا اللہ" علاوہ اس کے یہ عربی خالص ہندی ہے "طلقتہا قبل المساس" چاہئے تھا۔

یہ کس قدر حیرت ہے کہ مولانا اپنے اس جزی ذاتی واقعہ کو بھی اتنا اہم سمجھتے ہیں کہ ان کے خیال میں قرآن کے طلبا کو یہ سن کر بصیرت حاصل ہو جائے گی کہ مفسر نے اپنی منکوحہ اولیٰ کو قبل مساس طلاق دیدی تھی۔ دراصل یہ مرض علمائے اہل حدیث میں نواب صدیق حسن خاں بھوپالی مرحوم کی "تقلید" سے پیدا ہوا ہے جو ایک نہایت معمولی حالت سے امارت کے رتبہ کو پہنچ گئے تھے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بھی اقبال مندی کا زینہ سمجھ کر اپنی تصانیف میں دہراتے ہوئے نہیں تھکتے۔ حالانکہ علمی کتب میں ایسی غیر متعلق باتوں کا ذکر کرنا خود پسندی کی دلیل ہے۔

آخر میں میں مولانا سے وہی عرض کرتا ہوں جو حضرت عمرؓ سابقون اولون سے فرمایا کرتے تھے۔ جب وہ فارس و روم کی جنگوں میں شرکت کی اجازت طلب کرتے تو آپ کہتے کہ رسالتمآب کے عہد مبارک میں جو جہاد تم نے کرلئے وہ تمہارے واسطے کافی ہیں اب آرام سے مدینہ میں بیٹھے رہو۔ مولانا نے آریوں۔ عیسائیوں اور مقلدوں کے ساتھ جو عظیم الشان مناظرے کئے اور قادیانیوں کی خیبر شکنی کی جن کے سبب سے وہ آج شیر پنجاب۔ فاتح قادیان اور امیر جماعت اہل حدیث کے خطابات سے پکارے جاتے ہیں ان کے لئے کافی ہیں۔ قرآن کی بھی دو تفسیریں لکھ چکے ہیں۔ اب کیا ضرور ہے کہ تفسیر پر تفسیر لکھتے چلے جائیں اور وہ بھی ایسی کہ لایسمن ولایغنی من جوع۔

مصلح | علامہ عنایت اللہ مشرقی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آج ان کی شہرۂ آفاق کتاب تذکرہ کی بدولت ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ ان سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ جہاں مغربی علوم میں بلند سے بلند پایہ رکھتے ہیں وہاں قرآن فہمی میں بھی اپنی نظیر آپ ہی ہیں۔ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کا درد ہے اور قرآن اتارنے والے رب جلیل کا وہ تقوے جس نے ان کو دنیا پر لات مار کر اسلام کے لئے عملی کام کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت غور و فکر کرکے تحریک خاکساراں جاری کی ہے جو نہ صرف یہ کہ کامیابی کے ساتھ

چل رہی ہے بلکہ دن بدن مقبول ہوتی اور ترقی کرتی جاتی ہے اور ہزار ہا مسلمان اس تحریک میں جس کی بنیاد بلا امتیاز مذاہب انسانی خدمت اور اطاعت امیر پر رکھی گئی ہے شریک ہوتے جارہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی اہم تحریک کے لئے ایک اخبار کا ہونا لازمی تھا چنانچہ اس کے مرکز لاہور سے یہ ہفتہ وار جریدہ الاصلاح کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کے چند نمبر موصول ہوچکے ہیں۔ یہ اخبار کیا ہے۔ وقت کی ایک صحیح رہنمائی اور قوم کے شکستہ دلوں کے لئے مسیحائی۔ بھائیوں کا بھائیوں سے تعلق جوڑ کر سارے مسلمانوں کو ایک رشتۂ اخوت میں پروتا ہے اور ان کو تشتت۔ تفریق اور بےعملی کے قعر مذلت ونکبت سے نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں خود علامہ موصوف کے بھی مضامین ہوتے ہیں۔ ایمان اور جوش عمل سے لبریز۔ حقیقت آموز اور ولولہ انگیز۔ ہم کو امید ہے کہ تمام مسلمان اس تحریک اور اس اخبار کی خریداری میں شرکت کریں گے جس سے توقع ہے کہ ہم ایک مرکز پر آسکیں۔ قیمت سالانہ للعہ ر اور ششماہی دو روپیہ چار آنہ ہے۔

اسی اخبار کے دفتر سے بسلسلۂ تنظیم مساجد " دعوۃ " کے نام سے عیدالفطر کا خطبہ موصول ہوا ہے جس میں مسلمانوں کی موجودہ پستی اور ان کی آئندہ ترقی کے اسباب بتائے گئے ہیں یہ خطبہ کیا ہے بس ؎

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

مسجدوں کے پیش نماز صاحبان دفتر اخبار الاصلاح لاہور سے اس کو مفت طلب کرسکتے ہیں۔

رسائل

سالنامہ ادبی دنیا لاہور۔ اڈیٹر۔ منصور احمد۔ صفحات ۲۳۴ علاوہ اشتہارات قیمت عہ۔

اردو رسائل میں یہ رواج اب کچھ مسلم سا ہوگیا ہے کہ سال میں کم از کم ایک خاص نمبر سالنامہ کی صورت میں ضرور شائع کیا جائے بعض رسائل تو محض صفحات کے اضافہ سے اس کی خانہ پری کردیتے ہیں لیکن بہت کم رسائل ایسے ہیں جو واقعی صوری اور معنوی ہر حیثیت سے سالنامہ کو کامیاب بنانے کا خاص اہتمام کرتے ہیں اور اس پر کافی خرچ بھی کرتے ہیں۔

" ادبی دنیا " اردو کا ایک پرانا اور مشہور رسالہ ہے جس نے اپنی زندگی کے کئی دور دیکھے لیکن پھر بھی

بناء معیار پست ہونے دیا۔ اس وقت اسی کا سالنامہ بابتہ ۱۹۳۶ء ہمارے پیش نظر ہے جو اشتہارات کے علاوہ بڑے سائز کے ۲۴۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ سالنامے میں متعدد ڈراموں اور افسانوں کے علاوہ چند علمی، تحقیقی، اور تاریخی مضامین بھی ہیں جن میں "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" از پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ پنڈت جی نے آزاد مرحوم کے ناقدین کے متعلق جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن بہرحال تحقیقی نظر سے آپ کا یہ مضمون پُر از معلومات ہے۔ "شعرائے ایران و جدید تحریکات" از ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے بھی بہت اچھا مضمون ہے اور ہندوستان کے موجودہ دور میں اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"بن رہس" ایک انگریز مصنفہ کے مضمون کا ترجمہ ہے جس سے جنوبی ہند کے ڈرامہ کے قدیم فن "مدرا" پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

سالنامہ میں ۲ سہ رنگی اور ۱۰ ایک رنگی تصاویر بھی ہیں۔ نظم کا حصہ بھی کافی بلند ہے۔ بہرحال ادارۂ ادبی دنیا کی یہ کوشش بڑی حد تک کامیاب ہے۔

سالنامہ ساقی دہلی۔ اڈیٹر شاہد احمد۔ صفحات ۲۷۲ قیمت عہ

ساقی، اردو کے ان اولین رسائل میں سے ہے جو فی زمانہ صحیح معیارِ ادب کو پیش نظر رکھتا ہے اور بڑے سلیقے سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ اس وقت اس کا سالنامہ ۱۹۳۵ء ہمارے سامنے ہے اور یہ دیکھ کر ہمیں مسرت ہوئی کہ اس کے مضامین میں نسائیت حاوی نہیں ہے بلکہ بڑی خوش مذاقی سے افسانہ، ڈرامہ، مزاح اور ادبی و تحقیقی مضامین کا امتزاج کیا گیا ہے اور جو کچھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کا معیار کافی بلند ہے۔ آخر الذکر قسم کے مضامین میں محسن کاکوروی کا ایک نظر افروز شاہکار۔ جاپانی عورت کی زندگی اور اس کا روزنامچہ، قدیم چینی شاعری، قدیم ہندی ڈراما، قدیم اردو ڈراموں کی بعض اہم خصوصیتیں۔ افسانہ نویسی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ریاض خیرآبادی اور ان کے کلام پر بھی ایک مفصل مضمون درج ہے طنزیات میں سید ابوطاہر داؤد کا "بان کار" بہت دلچسپ ہے۔

ساقی کے خاص قلمی معاونین میں سید وزیر حسن دہلوی کا طرزِ تحریر مجھے بہت پسند ہے ان کی زبان میں بڑی دلآویز سلاست اور انداز بیان میں ایسی سادگی ہے کہ بے اختیار رشک آتا ہے۔ سالنامہ میں آپ کا ایک تخیلی مضمون "آج میرا بھولنے والا مجھے یاد آگیا" بھی شامل ہے جو آپ کی مذکورہ بالا خصوصیات تحریر کا حامل ہے۔ غرضکہ نظم و نثر دونوں میں ملک کے مشہور اہلِ قلم حضرات کے نام اس سالنامہ میں نظر آتے ہیں جنھوں نے ناظرین کے لئے پڑھنے کے قابل کافی سامان فراہم کیا ہے۔ ہم اڈیٹر صاحب ساقی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ اردو سے شغف رکھنے والے حضرات ان کی ہمت افزائی فرمائیں گے۔

تعلیم۔دہلی | اڈیٹر محمد حسین بی۔اے۔بی۔ٹی (علیگ)۔ چندہ سالانہ عہ

یہ ماہوار رسالہ حال ہی میں دہلی سے جاری ہوا ہے اور جیسا اس کے نام سے ظاہر ہے تعلیمی مضامین پیش کرنا اس کا خاص مقصد ہے۔ اب تک اردو میں اعلیٰ معیار کے تعلیمی رسائل موجود نہیں ہیں اور یقیناً علم و ادب کی اس صف میں ابھی بہت کافی گنجائش ہے۔ اسلئے ہم اپنے اس جدید معاصر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ابتدائی دو پرچوں کے مضامین پر ایک نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا کہ تعلیمی مضامین کو دلچسپ بنانے کے لئے انھیں ادبی رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی جو مستحسن بھی ہے لیکن خطروں اور لغزشوں کا اندیشہ بھی ہے۔ یقین ہے کہ اڈیٹر صاحب کافی احتیاط سے کام لیں گے اور ناظرین آپ کی ہمت افزائی فرماکر اس کا موقع دیں گے کہ رسالہ زیادہ بہتر کتابت۔ طباعت وغیرہ کے ساتھ شائع ہوسکے۔

حسب ذیل رسائل ہمیں بغرض ریویو موصول ہوئے ہیں جن پر قلت گنجائش کی وجہ سے تبصرہ نہ کیا جاسکا۔ چنانچہ ایڈیٹر صاحب "کتاب نما" کی خدمت میں ارسال کر دیئے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ کسی قریبی اشاعت میں مفصل تبصرہ فرمائیں گے۔

مسلم راجپوت سالنامہ ۱۹۳۵ء۔ امرتسر

شاہجہاں۔ خاص نمبر۔ دہلی

نخلستان .... ملتان

گنجینہ .... پٹنہ

ادارالغربائے پنجاب ...... لاہور

تنویر .... کراچی

بہارستان .... امراؤتی

صنفِ نازک .... لاہور

فریاد

وہی کہ جس کے لئے نہیں ہے سکوں ذرا بھی دلِ حزیں میں
وہی کہ جس نے لہو کیا ہے مری تمنا کا اک نہیں میں
وہی کہ بھر دی ہے یاس جس نے خیالِ امید آفریں میں
اُسی کو دل ڈھونڈھتا ہے اب بھی اُسی کی آنکھوں کو جستجو ہے

وہی کہ جس کی بدولت اب تک فراغ پایا نہ زندگی میں
وہی کہ آیا نہ رحم مجھ پر جسے مری ایسی بے کسی میں
وہی کہ دل پہ لگا گیا جو ہزار نشتر ہنسی ہنسی میں
الٰہی میں کیا کروں کہ اب بھی اسی کی اس دل کو آرزو ہے

وہی کہ وابستہ جس کے دامن سے میری ساری مسرتیں تھیں
وہی کہ جس کی کسی زمانے میں دل پہ بے حد عنایتیں تھیں
وہی کہ سرمایہ زندگانی کا جس کی پیاری محبتیں تھیں
نہ اب ادھر التفات اس کا نہ اب وہ پُر لطف گفتگو ہے

وہی کہ جس کی جنوں نوازی نے حوصلوں کو بڑھا دیا تھا
وہی کہ جس کی فسوں طرازی نے دل سے غم کو بھلا دیا تھا
وہی کہ جس نے مری تمنا کو یاس میں آسرا دیا تھا

خدا ہی جانے کہ کیا ہوا جو بپھری ہوئی اس کی اب نظر ہے

وہی کہ جس کی عنایتوں نے مری دعا کو اثر دیا تھا
وہی کہ جس کی نوازشوں نے بلند عزموں کو کر دیا تھا
وہی کہ جس نے دلِ شکستہ کو جوش و ہمت سے بھر دیا تھا
وہی ہے آماجگاہ جس کے خدنگِ ہجراں کا اب جگر ہے

یہ کیا ہے اے انقلابِ دوراں، یہ کیا ہے اے گردشِ زمانہ
نہ تھی خبر ختم ہونے والا ہے اس طرح سے مرا فسانہ
کہ ہر ورق جس کا اہلِ دل کو ہے ایک عبرت کا تازیانہ
ہنوز اس سے مگر وہ جانِ فسانہ غافل ہے، بے خبر ہے

الٰہی اب بھی کہ میں ہوں بیزار اپنی ناشاد زندگی سے
الٰہی اب بھی کہ کام مجھ کو نہیں رہا ہے ہنسی خوشی سے
الٰہی اب بھی کہ میری حالت نہیں رہی ہے چھپی کسی سے
نہ ہو مرے حالِ زار پہ کچھ ترا کرم تو بڑا ستم ہے

نہ جانے آ آ کے درد اس دل میں بھر گیا ہے کہاں کہاں کا
نہیں اترنے کی آس کچھ یوں چڑھا ہے دریا غمِ نہاں کا
دہن کو تابِ سخن نہیں ہے، لبوں کو یارا نہیں بیاں کا
زباں پہ قفلِ خامشی ہے، شکستہ اس راہ میں قلم ہے

وہی کہ جس نے دیا تھا اکثر ہجومِ اندوہ میں سہارا
وہی کہ ہونے دیا نہ جس نے ملال سے دل کو پارہ پارہ
وہی کہ تکلیف میرے دل کی کبھی نہ جس کو ہوئی گوارا
وہی ہے اب جس کی کم نگاہی مرے لئے وجہِ صد الم ہے

بتاؤ تو کوئی کس خطا پر یہ دل ہے محرومِ چارہ سازی
کہاں وہ شانِ کرم نمائی، کہاں یہ رنگِ ستم طرازی
بھلا اک آشفتۂ محبت سے یہ تغافل، یہ بے نیازی
کسے خبر تھی کہ منزلِ عشق اس قدر سخت اور کٹھن ہے

بس اب تو کچھ رحم ہو خدارا کہ ایسا جینا نہیں گوارا
غمِ محبت نے مار ڈالا، نہیں کوئی زیست کا سہارا
جو ناخدا ہی نہ ہو تو کشتی امید کی پائے کیا کنارا
مری یہ حالت کہ جوشِ غم میں نہ ہوشِ جاں ہے نہ ہوشِ تن ہے

جگر ہے مجروح جانِ غمگیں، تباہ سب دل کی آرزوئیں
گئی ہیں برباد کوششیں سب، ہوئی ہیں بے کار جستجوئیں
یہ سب مصائب، پھر اس پہ چارہ گروں کی یہ تلخ گفتگوئیں
الٰہی تو جانتا ہے دل پر مرے جو بارِ غم و محن ہے

غزل

میری شہرت فلک پر چار سو ہے   مجھے انسانیت کی جستجو ہے
تیرا ہی درد ہے وہ بھی جو اکثر   ٹپکتا بن کے آنکھوں سے لہو ہے
کسی کی یاد ہے اور دل ہے میرا   زباں ہے اور کسی کی گفتگو ہے
کہاں ہو تم خبر بھی ہے تمھیں کچھ   عدو کی تیغ ہے میرا گلو ہے
طلسمِ زیست اک عبرت کدہ ہے   نہ دل ہے اور نہ میں ہوں اور نہ تو ہے
لپٹ کر تارِ جاں بولا اجل سے   کہ میں تیرا ہوں اب اور میری تو ہے
کہاں سے لائے وہ زندہ دلی کو   جسے مرنے کی اپنے آرزو ہے
اگر ہو تم ہی تم ہر ایک دل میں   تو پھر کوئی کسی کا کیوں عدو ہے
نہ آئے لوٹ کر یارانِ رفتہ   مجھے ملنے کی اُن سے آرزو ہے

مسل دے دل کو اخگرؔ چٹکیوں سے
جو ترکِ آرزو کی آرزو ہے

غزل

ہم یہ کہہ سکتے ہیں آسودۂ محفل آئے　　جب گئے ہوش میں تھے آئے تو غافل آئے
لو نقاب الٹے ہوئے وہ سرِ محفل آئے　　تابِ نظارہ ہو جس کو وہ مقابل آئے
سر بکف یوں تو ہزاروں سرِ محفل آئے　　اک ہمیں تھے کہ جو ہاتھوں پہ لئے دل آئے
دل میں کچھ سوچ کے منہ پھیر لیا لیلیٰ نے　　ذرّے جب اڑتے ہوئے جانبِ محمل آئے
سرفروشانِ محبت کا بھرم کھل جائے　　تیغ لے کر جو ابھی سامنے قاتل آئے
عالمِ آغازِ محبت کا کوئی کیا جانے　　کسی بیدرد پہ جب پہلے پہل دل آئے
میرے جاتے ہی ہوا حشر میں اک شور بپا　　لو وہ تیغِ نگہِ ناز کے بسمل آئے
اک نظر حسنِ دل افروز اگر دیکھ لیا　　ہوش میں پھر ترے دیوانے بمشکل آئے
جلوۂ حسن سے ہے اپنی جگہ شرمندہ　　سامنے رُخ کے ترے کیا مہِ کامل آئے
جب سفینہ مرا گرداب میں غرقاب ہوا　　سینکڑوں بار تھپیڑے سوئے ساحل آئے
اب تو گھبرا کے یہ کہتا ہے ترا دیوانہ　　موت آجائے کسی پر نہ مگر دل آئے
لطف کیا دیدۂ گریاں کی گہر باری کا　　خونِ دل بھی اگر اشکوں میں نہ شامل آئے
یوں تو فریاد و فغاں کا نہیں حاصل کوئی　　لطف تو جب ہے وہ خود تھامے ہوئے دل آئے
نزع کے وقت وہ افسوس سمجھ ہی نہ سکے　　چند فقرے جو زباں پر بھی بمشکل آئے
آپ کی مست نگاہوں نے جو کرنا تھا کیا　　ہوش میں دیکھئے کب آپ کا غافل آئے

ہمصفیرانِ چمن بھول نہ جانا ہم کو ؎ جب کہیں تذکرۂ شورِ عنادل آئے
چل کے دو چار قدم اس لئے رک جاتا ہوں ؎ تاکہ کچھ لطفِ غمِ دوریِ منزل آئے

لذتِ عمر محبت پہ ہے موقوف حمید
زیست بے کار ہے جب تک کہیں دل آئے

غزل

پوچھو نہ مجھ کو درد محبت نے کیا دیا　　دنیائے عیش دی کہ دلِ باصفا دیا
مطرب نے آج ایسا بھی نغمہ سنا دیا　　دل کو سکونِ خواب سے جس نے جگا دیا
دنیا ہی میرے شوق کی بالکل بدل گئی　　وہ آج سن کے حال مرا مسکرا دیا
سرچشمۂ[۱] محبتِ جاناں سے اے خدا　　قطرہ ہی اک پیا تھا کہ دریا بہا دیا
اس التفاتِ خاص کے قربان جائیے　　دیکھا جو اشکبار مجھے مسکرا دیا
کچھ تو سمجھ کے تم نے دلائی تھی دل کو آس　　اب کیا ہوا جو تم نے مرا دل بجھا دیا
کعبہ میں چند ایسے بھی اہلِ نظر ملے　　مجھ کو جنھوں نے کعبۂ دل کا پتا دیا
کہتے ہیں اپنے فعل کا مجھ کو ہے اختیار　　الزامِ مفت کا یہ مرے سر لگا دیا
تقسیم ہو رہے تھے ازل میں صفاتِ شعر　　مجھ کو خدا نے جوہرِ حسنِ ادا دیا

گم کردہ راہ کوچۂ الفت میں تھا جلیلؔ
صد شکر، تو نے راہ پہ اس کو لگا دیا

---

[۱] "مگر وہ بات کہاں......" سے

یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازو
یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم　　جلیل قدوائی

شذرات

ہم قارئین کرام سے معافی چاہتے ہیں کہ رسالے کی اشاعت میں بے حد تاخیر ہوگئی ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آئندہ پرچے دو دو تین تین ہفتے کے فصل سے شائع ہوں۔ شاید اس طرح اپریل تک رسالہ وقت پر آجائے۔

خالدہ ادیب خانم کو دہلی کے قیام کے زمانے میں قضائے الٰہی سے ایک صدمۂ جانکاہ اٹھانا پڑا موصوفہ کے بھتیجے کمال عاطف بے جو افغانستان میں وزارت خارجہ کے مشیر قانونی تھے اور اپنی بیوی کو ساتھ لے کر سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے انتقال کر گئے اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مرحوم خالدہ خانم سے ملنے کے لئے ۲۳ جنوری کو دہلی آئے تھے۔ ۲۴ کو انھوں نے اور ان کی بیوی نے رات کا کھانا خانم صاحبہ کے ساتھ ڈاکٹر انصاری صاحب کے دولتکدے پر کھایا، اور اس کے بعد اس ہوٹل میں جہاں ان کا قیام تھا آرام کرنے چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد ہوٹل سے ٹیلیفون آیا کہ کمال عاطف بے کو قلب کی بیماری کا دورہ پڑا اور وہ گذر گئے۔ مرحوم کی بیوی اور خالدہ خانم صاحبہ پر اس ناگہانی حادثے سے جو اثر ہوا اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ اپنوں کے صدمے کا کیا ٹھکانا جب غیروں کا یہ حال تھا کہ جو سنتا تھا اسے سکتہ سا ہو جاتا تھا۔ دوسرے روز جنازے میں دہلی کے ہزارہا مسلمان اور بہت سے ہندو اپنے ایک مہمان کو سپرد خاک کرنے اور دو مہمانوں کو پرسہ دینے کے لئے جمع ہوگئے تھے۔ ہم ارکان اردو اکادمی اور قارئین جامعہ کی طرف سے بیگم عاطف بے اور خالدہ خانم صاحبہ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے اور ان دونوں خواتین اور دوسرے عزیزوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

اس صدمے کی وجہ سے بہ تقاضائے بشریت خالدہ خانم صاحبہ کو اپنا ۲۶ جنوری کا لکچر ملتوی کرنا پڑا اس کے بجائے پنجشنبہ ۳۱ جنوری کو ایک غیر معمولی لکچر ہوا۔ ان دنوں موصوفہ کے حزن و ملال کی کیفیت اور صحت کی حالت جن لوگوں نے دیکھی ہو وہ اس فرض شناسی اور صبر و استقلال پہ ہزار آفریں کہتے ہیں کہ موصوفہ نے نہ صرف اپنے لکچر پورے کئے بلکہ دیکھنے والوں اور سننے والوں کو اپنے رنج کا اور اپنی علالت کا ذرا بھی اندازہ نہ ہونے دیا۔ دنیا میں کم عورتیں اور کم مرد اس موقع پر وہ کر سکتے تھے جو، خالدہ خانم نے کیا۔ لکچر ہر طرح سے بہت کامیاب رہے۔ صدارت ڈاکٹر انصاری، مہاتما گاندھی، مولانا شوکت علی، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، بھولا بھائی دیسائی، مسز نائیڈو، ڈاکٹر بھگوان داس جیسے لوگوں نے کی۔ حاضرین میں دہلی کے قریب قریب کل تعلیم یافتہ اور روشن خیال اصحاب و خواتین، مسلمان، ہندو، عیسائی جن میں انگریز اور دوسرے یوروپین بھی نظر آتے تھے، شامل تھے۔ اسمبلی کے ممبر اور حکومت کے اراکین بھی کثرت سے آتے تھے۔ ان سب نے نہایت پابندی سے نہایت ذوق شوق سے خالدہ خانم کے کل لکچر سنے اور ہمیں یقین ہے کہ۔ بہتوں نے سنے ہی نہیں بلکہ سمجھے بھی۔ خدا کرے ان لکچروں کا یہ اثر ہو کہ جو غلط فہمیاں ہندوستان میں ترک جیسی شریف اور بہادر قوم کے متعلق پھیلائی گئی ہیں وہ دور ہو جائیں اور ہندوستان اور ترکی کے درمیان ذہنی اور اخلاقی روابط از سر نو قائم ہو جائیں۔ امید ہے کہ مکتبہ جامعہ ملیہ کی طرف سے آخر مارچ یا وسط اپریل تک خالدہ خانم کے لکچر کتابی صورت میں شائع ہو جائیں گے اور ساتھ ہی ساتھ ان کا اردو ترجمہ بھی چھپ جائے گا۔

جامعہ کا یوم تاسیس اس سال یکم مارچ ۱۹۳۵ء کو منایا جائے گا اور اسی کے ساتھ جامعہ کی عمارت کا سنگ بنیاد بھی نصب ہوگا۔ اس مبارک رسم کے انجام دینے کے لئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا گیا ہے جو نہ فرمانرواؤں میں ہے، نہ ارکان سلطنت میں، نہ صاحبان دولت میں، نہ ارباب علم میں، نہ رہبران ملک میں، نہ اکابر قوم میں۔ جو کچھ نہیں ہے مگر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ اس نژاد نو کا نمائندہ ہے جس سے علامہ اقبال نے جاوید نامے میں خطاب کیا ہے۔ یہ جامعہ کا سب سے چھوٹا بچہ ہے۔ ارباب نظر اس

انتخاب کی داد دیں گے اور تسلیم کریں گے کہ مستقبل کا مالک ہم حال کے غلاموں سے اس منصب کے لئے کہیں زیادہ موزوں ہے۔

جامعہ کی عمارت، جتنی اس وقت درکار ہے، چار پانچ لاکھ روپئے میں بن جائے گی۔ اس میں سے والیان ملک کا حصہ چھوڑ کر ڈھائی لاکھ روپیہ ملت اسلامی کے غریبوں اور امیروں کے دست کرم سے مطلوب ہے۔ اکابر قوم اس موقع پر جامعہ کی مدد کے لئے اپیل کر رہے ہیں اور انشاء اللہ قوم ان کی صدا پر لبیک کہے گی۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان لبیک کہنے والوں میں رسالہ جامعہ اور اردو اکادمی کا حلقہ کسی سے پیچھے نہ رہے۔ چنانچہ ہم ادارت جامعہ کی طرف سے سو روپئے کی ناچیز رقم کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے سب بھائیوں سے درخواست کرتے ہیں کہ حسب مقدرت اس کار خیر میں شرکت کریں اور چندے کی رقمیں شیخ الجامعہ صاحب کے نام روانہ فرمائیں، ہمیں نہایت مسرت ہوگی اگر ہمارے حلقے کی طرف سے پانچ ہزار کی رقم ایک سال کے اندر جامعہ کی عمارت کے فنڈ میں دی جاسکے۔ قارئین کرام میں جو صاحب عمارت کے فنڈ میں چندہ بھیجیں یا کسی وفد کو ادا کریں وہ براہ کرم رسالہ جامعہ کے دفتر میں اس کی اطلاع بھیج دیں تاکہ ان کے اسمائے گرامی شکریے کے ساتھ رسالے میں شائع کئے جاسکیں۔

ہم امیر جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہٗ تعالیٰ کا اپیل اس پرچے میں شائع کر رہے ہیں۔ ہمیں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان غیور لوگوں میں ہیں جنھیں اپنے کام کے لئے بڑے بڑے تاجداروں کے آگے ہاتھ پھیلانا بھی گوارا نہیں مگر قوم کے کام کے لئے امیر غریب کسی سے سوال کرنے میں عار نہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جب ڈاکٹر انصاری جیسا شخص جامعہ ملیہ جیسی تعلیم گاہ کے لئے مدد مانگے تو مسلمانوں کا دریائے فیض جوش میں آکر رہے گا۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال
کے
تازہ دیوان

بالِ جبریلؒ

کو دیکھنے کے بعد

اقبال ہمہ آہنگ سرودِ ازلی ہے
دیوان کو تو اس کے ذرا ایک نظر دیکھ

مکرر

اشعار سے آتی ہے صدائے ملکوتی
اوراق پہ پھیلے ہیں جبریل کے پر دیکھ

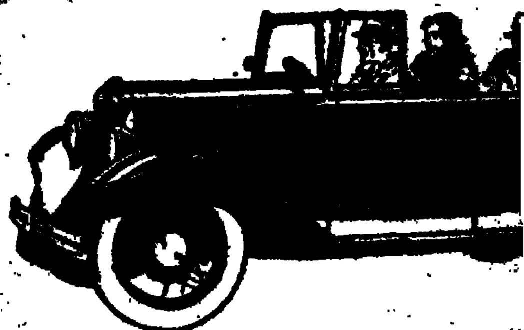
مکرر

اسلم جیراجپوری


یک وزنہ الارم ٹائم پیس چمکیلا نکل کیس، سفید ڈائل، بڑھیا الار
جس کی آواز میٹھی، اونچی اور دل کش۔ متواتر ٹھہر ٹھہر کر
گارنٹی دو سال۔ قیمت صرف سات
مفت طلب کیجیے

WITH

A GREAT TRA...



The new Austins are now available ... with sturdy Cross-braced frames particularly meet ... rigorous conditions in this Country. In ... throughout the range is fitted with Synchromesh gears ... indicators as standard—50 models covering ... motoring requirements, now have these va... added to their already World-famed ... economy.

...ED CARS T...
IN PART EXCHANGE

SPECIAL

...ERY SCHEME.

رجسٹرڈ نمبر

اپریل-۱۹۴۲

جامعہ

اُردُو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی

قیمت سالانہ صہ / مطبع جامعہ دہلی / فی پرچہ ۸ر

خطبات خالدہ خانم

محترمہ خالدہ ادیب خانم کے خطبات جو اُنھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دیے تھے۔ اُردو انگریزی دونوں زبانوں میں چھپ رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ اپریل، مئی تک شائع ہو جائیں گے۔ اُردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ، ڈی نے کیا ہے۔ اشاعت سے قبل جو حضرات قیمت بھیج دینگے اُنھیں محصولڈاک معاف ہوگا۔ قیمت انگریزی ۳ے ر، اُردو عا ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۵	ماہ فروری سنہ ۳۵ء	نمبر ۲

فہرست مضامین

(محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا)



خالدہ ادیب خانم

ہندوستان کے اکثر تعلیم یافتہ مسلمان خالدہ ادیب خانم کے نام سے واقف ہیں۔ اور ان کی ایک دو کتابوں کا اردو میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنی سوانح حیات اور ترکوں کی جنگ آزادی کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ دو جلدوں میں انگریزی زبان میں شائع کئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ جامعہ کے توسیعی لکچروں سے ان کے خیالات کی خاصی اشاعت ہو جائے گی۔ اور وہ لوگ بھی جو انگریزی نہیں جانتے خالدہ ادیب کے غور و فکر اور تجربے سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

خالدہ خانم ان برگزیدہ شخصیتوں میں سے ہیں جن کی سرگذشت قومی تاریخ کا مرتبہ رکھتی ہے۔ نہ صرف اس اعتبار سے کہ جو ان پرگذری وہی قوم پر گذری بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ ان میں قومی اور اجتماعی فرائض کو ذاتی فرائض بنا لینے کا شوق ہے اور ان کی اپنی ضروریات اور اغراض کبھی ان کی اجتماعی زندگی سے جدا نہیں ہو سکیں۔ خالدہ خانم کی ابتدائی زندگی کو ان کے خاندانی معاملات اور مصائب نے ترکی خواتین کی سرگذشت کا ایک مثالی نمونہ بنا دیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے بعد سے جب انھوں نے انشا پردازی شروع کی۔ ان کے دل نے اجتماعی زندگی سے اتنا اثر لیا۔ اور ساتھ ہی اپنا اثر بھی اس انداز سے دکھایا کہ ان کی اور ان کے ہم وطنوں کی زندگی دو ندیوں کے پانی کی طرح سے گھل مل گئی جیسے کوئی ندی سمندر سے مل کر ایک ہو جائے۔

خالدہ خانم کے والد ادیب بے۔ محل شاہی میں ایک خاصے بڑے عہدے پر مامور تھے۔ اور خوش حال ترکوں کی طرح یورپی وضع کے مطابق رہتے تھے۔ وہ اس قدر روشن خیال تھے کہ انھوں نے خالدہ خانم کو ایک امریکن اسکول میں تعلیم دلوائی اور ان کو رسم و رواج کی پابندی کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ لیکن ان کے ذہن پر یورپ کا فلسفۂ معاشرت اس قدر حاوی نہیں ہوا تھا کہ وہ تعدد ازدواج کو برا سمجھے۔ یا اس سے پرہیز کرتے اور خالدہ خانم کی ماں اگرچہ یورپی معاشرت کی دلدادہ نہیں تھیں۔ پھر بھی ان کی طبیعت یہ گوارا نہ کر سکی کہ وہ پہلی اور خاص بیوی بن کر بھی شوہر کے گھر میں رہیں۔ جیسے ہی ادیب بے نے دوسری شادی کی۔ وہ

انھیں چھوڑکر اپنے ماں باپ کے یہاں چلی آئیں اور اس صدمے نے انھیں زندگی سے ایسا بیزار کردیا کہ وہ بہت جلد دق میں مبتلا ہوگئیں ۔ ماں کے انتقال کے وقت خالدہ خانم بہت چھوٹی تھیں ۔ انھیں بس اپنی ماں کی غمگین صورت اور بڑی بڑی آنکھیں یاد ہیں ۔ اور یہ یاد ہے کہ ان کے چہرے پر مسرت کے تھوڑے بہت آثار اسی وقت نظر آئے جب وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تھیں ۔

ماں کا غم اکثر اولاد کو ورثے میں ملتا ہے ۔ خالدہ خانم پر بچپن میں دلدوز مایوسی چھائی رہتی تھی ۔ انھیں نہ ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلنے کا خاص شوق تھا نہ ان کی طبیعت میں کسی قسم کی جولانی یا شگفتگی تھی ۔ ان کی نانی ان کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ گئی تھیں ۔ اور انھیں کی محبت اور ہمدردی کی بدولت خالدہ خانم کا بچپن اگر خوشی سے نہیں تو کم سے کم اطمینان سے گذرا ۔ ادیب بے کو اپنی اولاد سے خاصی محبت تھی ، اور سب بچوں میں وہ سب سے زیادہ خالدہ خانم کو چاہتے تھے ۔ لیکن اُن کی توجہ اسی وقت کام آئی جب تعلیم کا زمانہ آیا ۔ خالدہ خانم نے کچھ دنوں گھر پر پڑھا ۔ پھر اسکول میں داخل ہوئیں ۔ اور ۱۹۰۱ء میں کالج کی تعلیم ختم کر کے انھوں نے صالح زکی بے سے ۔ جو اُن کے استاد بھی رہ چکے تھے ، شادی کرلی ۔ شادی دونوں کی خواہش سے ہوئی تھی لیکن مزاج اور خیالات کا اختلاف ہنگامے برپا کرتا رہا آخرکار پہلی شادی کے نو برس بعد صالح زکی بے نے دوسرا نکاح کرلیا خالدہ خانم نے اپنی ماں کی طرح سوت کے ساتھ رہنا منظور نہیں کیا اور صالح زکی بے کو طلاق دینے پر مجبور کیا ۔ اس وقت خالدہ کا تعلیم یافتہ طبقے سے تعارف ہو چکا تھا ۔ اور وہ مختلف تعلیمی مشاغل میں بڑی سرگرمی سے شریک ہوگئی تھیں ۔ اس سبب سے وہ گھریلو زندگی کے اچانک ختم ہو جانے کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور چند مہینے بیمار رہنے کے بعد انھوں نے ایک نئی زندگی شروع کردی جس میں اتنی مہلت اور فرصت نہیں تھی کہ وہ گذرے ہوئے زمانے کو یاد کریں اور اس پر افسوس کریں ۔

اس وقت ترکی میں ایک انقلاب ہو رہا تھا ۔ اور جن لوگوں کے دلوں میں ذرا بھی قومی درد تھا وہ سب اپنی قوت ، استعداد اور زندگی کو قوم کے لئے وقف کر چکے تھے ۔ تیس برس تک عبدالحمید کے جبر و تشدد کو برداشت کرنے کے بعد ۱۹۰۸ء میں "نوجوان ترکوں" کی پارٹی نے جو "اتحاد و ترقی" کی پارٹی کہلاتی تھی سلطان سے دستوری حکومت کا مطالبہ کیا ۔ اور چونکہ اس پارٹی کے ارکین بیشتر فوجی افسر تھے ۔

سلطان نے ڈر کر فوراً حکم دیا کہ پارلیمنٹ کے لئے نمایندوں کا انتخاب کیا جائے۔ نئی زندگی تعمیر کے حوصلوں نے ترکوں کو سرشار کر دیا - ہر طرف اصلاح تنظیم اور ترقی کا غوغا تھا۔ نئے ادارے اور انجمنیں قائم ہو رہی تھیں رسالے نکل رہے تھے ۔ صالح زکی بے خود یونیورسٹی میں پروفیسر تھے ۔ قوم کے سیاسی اور ذہنی رہبروں میں سے اکثر ان کے پرانے دوست تھے ۔ اور اگرچہ خالدہ خانم اس حد تک پردہ نشین تھیں کہ سوا صالح زکی بے کے خاص دوستوں کے وہ کسی سے ملتی نہیں تھیں ۔ لیکن یہ خاص دوست ایسے لوگ تھے کہ انھوں نے خالدہ خانم کو تعمیری کوششوں میں حصہ لینے پر آمادہ کر لیا ۔ ایک اخبار میں جو اسی زمانے میں جاری ہوا تھا ایک حصہ نسوانی مسائل کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور اس کی ادارت خالدہ خانم کے سپرد کی گئی ۔ انھوں نے بہت جلد ترکی عورتوں میں اثر پیدا کر لیا ان کے مضامین کی مقبولیت، طرز بحث کی متانت اور سنجیدگی ، اور سب سے زیادہ ان کے خلوص نے ان کے اعتبار کو اس قدر بڑھا دیا کہ بہت سی عورتیں ان سے مشورہ لینے لگیں اور اس سلسلے میں خالدہ خانم کو ترکی خاندانوں کی حالت کے متعلق جو معلومات فراہم ہوئی وہ برسوں کے مشاہدے سے حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

ترک نوجوانوں کا جوش سچا تھا ۔ لیکن ابھی ان میں اتنی موقع شناسی اور انتظامی قابلیت نہیں تھی کہ دستوری حکومت کی رسمیں برت سکیں اور کاروبار میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو ۔ جتنے قدامت پسند بادشاہ پرست، مفسد لوگ تھے ۔ وہ سب ان کی مخالفت پر تل گئے اور ان کی ابتدائی غلطیوں سے اتنا فائدہ اٹھایا کہ چند مہینے کے اندر حکومت کا تختہ الٹ دیا ۔ وہی فوج جس نے اپنے افسروں کو شہ دے کر دستوری حکومت قائم کرائی تھی ۔ اب ان افسروں کے خون کی پیاسی ہو گئی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ اصلاحی جوش کا ردعمل ایسا شدید اور خونریز ہوا کہ برسوں تک کوئی آزادی اور اصلاح کا نام لینے کی جرات نہ کر سکے گا ۔ خالدہ خانم نے اپنے مضامین میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں لکھی تھی جس پر قدامت پسند لوگ اعتراض کر سکتے ۔ لیکن تشدد کے جنون میں اصلاح کے چند مخالف ان کی عزت اور جان کے پیچھے پڑ گئے ۔ اور انھیں گھر اور وطن چھوڑ کر بھاگنا پڑا (اپریل ۱۹۰۹ء) وہ پہلے اسکندریہ گئیں ۔ اور پھر چند مہینے انگلستان میں رہ کر اکتوبر میں واپس ہوئیں ۔ اس عرصے میں محمود شوکت پاشا نے اصلاحی تحریک اور دستوری حکومت کی جان بچالی تھی ، اور اب اصلاح کی تدبیریں کرنے میں کوئی خاص خطرہ نہیں تھا ۔

اسی سال خالدہ خانم کا پہلا ناول شائع ہوا جس کی ہر دلعزیزی نے انھیں ناول نویسی کی طرف اور زیادہ مائل کر دیا۔ اسی زمانے میں محکمۂ تعلیم کے ایک سربرآوردہ عہدہ دار سعید بے نے ان سے مشورے اور مدد کی درخواست کی۔ انھیں لڑکیوں کے ایک اسکول کا معائنہ کرنے کو کہے گئے، اور ان سے تعلیم نسواں کے متعلق ایک مفصل رپورٹ تیار کرنے کی درخواست کی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالدہ خانم ایک حد تک اپنی مرضی کے خلاف تعلیم کے کام میں مشغول ہو گئیں۔ ان کا خاص مضمون فلسفۂ تعلیم تھا لیکن وہ اونچے درجوں میں نفسیات اور تاریخ کا بھی درس دیتی تھیں۔ ان کے اسکول کی صدر معلمہ نقیہ خانم کے انہماک اور کوششوں نے اسکول کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ وہ تین سال کے اندر نورمل اسکول سے بڑھ کر کالج ہو گیا۔ اور شہر میں ایک نیا نارمل اسکول کھول دیا گیا۔ اسی دوران میں اسکول کی سابق طالبات میں سے بہت سی اس قابل ہو گئیں کہ اسکولوں میں پڑھا سکیں اور ان کے سبب سے کئی ابتدائی اور ثانوی اسکول قائم کر دیئے گئے لیکن ۱۹۱۳ء میں خالدہ خانم اور نقیہ خانم اور ترکی کے وزیر تعلیم شکری بے کے درمیان ایسے اصولی اختلاف پیدا ہو گئے[۵] کہ ان دونوں نے استعفا دے دیا۔ اور سرکاری مدرسوں کے بجائے ان اسکولوں میں جن کا انتظام وزارت اوقاف کے سپرد تھا کام کرنے لگیں۔ اس وقت کے شیخ الاسلام خیری افندی ان دونوں سے بہت عقیدت رکھتے تھے، اور نقیہ خانم کی محنت اور انتظامی قابلیت سے اوقاف کے مدرسوں کو جو ترقی ہوئی اس سے خیری افندی کی عقیدت مندی حق بجانب ثابت ہوئی۔ مگر محکمۂ تعلیم خالدہ خانم اور نقیہ خانم کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ ایک سال کے اندر اوقاف کے تمام مدرسے محکمۂ تعلیم کے ماتحت کر دیئے گئے۔ اور ان دونوں کو علیحدہ ہونا پڑا۔

اس وقت جنگ بلقان ختم ہو چکی تھی۔ اور جنگ عظیم شروع ہو گئی تھی۔ ترکی کے یورپی دشمنوں نے

---

[۵] خالدہ خانم اور نقیہ خانم کا خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو تعلیم دینے کے بجائے چند لوگوں کو بہت اچھی تعلیم دینا چاہیئے۔ تاکہ بعد میں تعلیم پھیلانے میں آسانی ہو اور ماہر مدرسوں کی کافی تعداد پیدا ہو جائے۔ شکری بے تعلیم یافتہ لوگوں کے دائرے کو حتی الامکان وسیع کرنا چاہتے تھے۔

سنہ ۱۹۰۸ء کے انقلاب اور نوجوان ترکوں کی ابتدائی غلطیوں اور کمزوریوں سے پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں آسٹریا نے بوسنیا ہرزی گووینہ کے صوبے پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۱۹۰۸ء میں کریٹ کا جزیرہ ترکی سلطنت سے علیحدہ ہوگیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں اطالیہ نے طرابلس پر حملہ کیا اور سنہ ۱۹۱۲ء میں بلغاریہ، یونان، سرویہ نے ترکوں کی نازک حالت دیکھ کر ایک ساتھ ان کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ اس لڑائی میں ترکوں نے محکمۂ جنگ کی بدانتظامی کے سبب سے جو شکستیں کھائیں اور مصیبتیں اٹھائیں وہ بیان نہیں کی جا سکتیں خیریت یہ ہوئی کہ شتالجہ پر بلغاریہ کی فوجیں روک لی گئیں۔ ایڈریانوپل ہاتھ سے نکل گیا۔ مگر جب دشمنوں میں کھٹ پٹ ہوئی تو انور بے نے اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ جنگ ختم ہونے پر نوجوان ترکوں کی پارٹی جو پھر برسر اقتدار ہوگئی تھی، حکومت کے ہر شعبے اور محکمے کی اصلاح میں مصروف ہوگئی، اور اگر اسے دس پندرہ برس کی مہلت ملتی تو ترکی ہزار آفتوں سے بچا رہتا۔ اور اس کی یورپ میں اس وقت بہت نمایاں حیثیت ہوتی۔ لیکن جنگ عظیم نے نوجوان ترکوں کی ساری کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ ترک جنگ میں شریک ہونے پر مجبور ہوئے، اور اصلاح کے حوصلے اور تدبیریں صلح ہونے تک ملتوی کر دی گئیں۔

خالدہ خانم نے مضمون نگاری اور اس کے بعد تعلیمی کام کو ایک قومی فرض سمجھ کر شروع کیا تھا جنگ بلقان میں سپاہیوں کی تکلیف اور حکومت کی بے بسی کو دیکھ کر انہوں نے اپنے اور ترکی عورتوں کے فرائض کا دائرہ اور وسیع کر دیا۔ انہوں نے ایک کلب قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ عورتیں ایک جگہ جمع ہو کر ذاتی اور اجتماعی مسائل پر گفتگو کیا کریں۔ اور ان میں سے جو چاہیں وہ یورپی زبانیں اور خانہ داری کا فن سیکھیں، اسی کلب کے اراکین نے چندہ کر کے ایک چھوٹا سا ہسپتال کھولا جس میں تیس مریضوں کے رکھنے کا انتظام کیا گیا خالدہ خانم نے اس ہسپتال میں مہینوں تیمارداری کی، لیکن وہ چاہتی تھیں کہ اس زائد کام کے سبب سے ان کے اور تمام مشاغل میں حرج نہ ہو۔ اور جنوری سنہ ۱۹۱۳ء میں ان کی صحت نے جواب دے دیا۔ ان کا جسم نازک تھا۔ مگر ارادہ بہت قوی تھا اسی کے بل پر انہوں نے مرض پر فتح پائی۔ اور چند ہفتے میں پھر کام کرنے کے لائق ہو گئیں۔

بلقان کی جنگ میں اور اس سے پہلے ترکی کو جو صدمے پہنچ چکے تھے ان سے صاف ظاہر تھا کہ اگر ترک اپنے وجود کو قائم رکھنا چاہتے تو انہیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ وہ اپنی منتشر سلطنت کے کون سے

اجزا کو مستحکم اور قابل توجہ سمجھتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے کیا طرز عمل ان کے لئے سب سے مناسب ہوگا بلقان کی عیسائی آبادی ان کی سلطنت سے علیحدہ ہو گئی تھی۔ آرمینیہ، شام اور عرب کے لوگ بھی اسی فکر میں معلوم ہوتے تھے۔ کہ ترکوں سے کسی طرح پیچھا چھڑائیں۔ کیونکہ ہر طرف قومیت کا چرچا ہو رہا تھا۔ اور ترک سلطنت ہمیشہ سے ایک بین الاقوامی ادارہ رہی تھی۔ سنہ ۱۹۱۲ء کے بعد سے تعلیم یافتہ ترکوں میں قومیت کا جذبہ پیدا ہو رہا تھا اور جہاں بعض لوگ سلطنت کے استحکام کی تدبیریں کر رہے تھے۔ وہاں بعض اس فکر میں تھے کہ ایک خالص ترک نسل کا اتحاد قائم کیا جائے۔ عرب۔ شام اور عراق پر حکومت کرنے کی کوشش نہ کی جائے، اور اس کی بھی امید نہ رکھی جائے کہ وہاں کے لوگ اسلامی ہمدردی کے جوش میں یورپی قوموں کے خلاف ترکوں کی مدد کریں گے۔ اس سلسلے میں جو مباحثے ہوئے اور مختلف نظریوں اور اصولوں کا چرچا کرنے کے لئے جو ادارے قائم ہوئے، ان سے خالدہ خانم کو بہت دلچسپی رہی۔ جنگ عظیم کے دوران میں جمال پاشا نے انھیں شام میں تعلیمی اداروں کا معائنہ کرنے اور نمونے کے طور پر چند اسکول کھولنے کے لئے بلایا اور انھوں نے جا کر بہت شوق اور انہماک سے کام کیا لیکن شامی جمال پاشا کی اصلاحی کوششوں سے متاثر نہیں ہوئے۔ اور خالدہ خانم نے بھی دل میں سمجھ لیا تھا کہ شام اور ترکی کا متحد رہنا اب ممکن نہیں۔ رفتہ رفتہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ ترکی سلطنت ایک بین الاقوامی ادارہ بن کر نہیں رہ سکتی۔ اور ترکوں میں قومیت کا وہی جذبہ ہونا چاہیے جس نے یورپی قوموں کو ترقی کے عروج پر پہنچایا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک وطن پرستی کے معنی تنگ نظری اور اغراض پرستی نہیں تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ترک اپنی قومی ہستی کو دوسروں سے جدا، اپنی ریاست کو انتشار انگیز اجزا سے پاک کرلیں، اور اپنے آپ کو ایک عام اسلامی تمدن، معاشرت اور قانون کا پابند رکھنے کے بجائے اپنی قدیم تاریخ اور معاشرت کے مطالعے سے ایسے اصول حیات دریافت کریں جو ان کی قومی سیرت سے خاص مناسبت رکھتے ہوں۔ اور ان کی ترقی میں مدد دیں۔ اسی کے ساتھ وہ یورپی نظام معاشرت، اور خاص طور سے یورپ کے سیاسی اداروں کو قابل تقلید سمجھنے لگی تھیں۔ کیونکہ پرانے مسلک پر چلنا روز بروز دشوار اور خطرناک معلوم ہوتا تھا۔

سلطان عبد الحمید نے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو مرعوب کرنے کے لئے مسلمان قوموں کے

عالم گیر اتحاد (Pan Islam) کا کسی سلسلے میں ذکر کیا تھا۔ اور یہ تصور ایسا تھا جس سے یورپی مدبّر بہت ڈرتے۔ ترکوں میں شاید انور بے ہی ایک ایسے مدبر تھے جنھیں اس تصور کا سیاسی اداروں یا تحریکوں میں ظاہر ہونا ممکن نظر آیا ورنہ ترک اور دوسرے ملکوں کے مسلمان ایسے اتحاد کو خیال میں بھی نہ لاتے تھے۔ اور اگر ان کے سامنے یہ اتحاد پیش کیا جاتا تو شاید ہی اُن کی مذہبیت ان کی سیاسی و ملکی اغراض پر اتنی غالب آتی کہ وہ اسے منظور کر لیتے۔ اور اسے عمل میں لانے کی کوشش کرتے۔ ترکی میں اس نیم مذہبی، نیم سیاسی فلسفے سے بہت زیادہ موثر تورانی اتحاد کا تصور تھا، کیونکہ ایک زمانے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ترکستان اور جنوبی روس کے تاتار اور کوہ قاف کے ترک قبیلے ایسا اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ تصور بھی عملی دشواریوں کا مقابلہ نہ کر سکا اگر اس نے یہ بات تعلیم یافتہ ترکوں کے ذہن نشین کر دی کہ وہ عام اسلامی دنیا سے الگ ایک قومی تمدن اور فلسفۂ حیات رکھتے ہیں جس میں ان کے قومی اوصاف کو بہت زیادہ نمایاں اور ان کے سیاسی نظام کو بہت زیادہ مستحکم کر دینے کی قوت ہے۔ یہی بیج تھا اس قومیت کا جو آگے چل کر پھلی پھولی اور جو اب ترکی ریاست کی روح رواں ہے لیکن شروع میں اس کے قدردان بہت کم تھے۔ جنگ بلقان کے بعد سے ۱۹۱۸ء تک نوجوان ترکوں کی پارٹی جس کے سردار انور بے تھے۔ حکومت پر حاوی رہی جنگ عظیم میں ترک، عرب، شام اور عراق کے لئے لڑتے رہے جب انھیں ہر طرف شکست ہوئی اور قسطنطنیہ اور اناطولیہ کے سوا ان کے قبضے میں کچھ نہیں رہا تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی ریاست کو ایک بین الاقوامی ادارہ سمجھ ہی نہیں سکتے تھے، اور قومیت کے سوا اور کوئی سیاسی فلسفۂ قابلِ عمل نہیں رہ گیا تھا۔

خالدہ خانم نے جنگ بلقان سے کچھ پہلے ایک سیاسی ناول لکھا تھا جس کا عنوان "نیا توران" تھا اور اس میں ترکوں کی ایک خیالی، سیاسی زندگی کا نہایت ہی دلربا خاکہ کھینچا تھا۔ یہ ناول بے حد مقبول ہوا۔ قسطنطنیہ میں اس نام کے قہوہ خانے اور دکانیں کھولی گئیں اور ایک عرصے تک ہر شخص کی زبان پر اسی کا ذکر تھا۔ اس کا بہت زیادہ دیرپا اور مفید اثر ان نوجوانوں پر ہوا جو اس وقت طرابلس میں قوم کی عزت اور وقار کے لئے لڑ رہے تھے۔ اور پھر قوم کی خاطر اپنی جانیں قربان کرنے کے لئے مقدونیہ پہنچ گئے۔ لیکن خالدہ خانم کے لئے یہ ناول سیاسی خیال آرائی کی ایک دلچسپ اور کامیاب مشق کی حیثیت رکھتا تھا، انھوں نے اپنے تصورات

کو ادبی لباس پہنایا تھا۔ اپنی شخصیت سے ابھی تک وہ پوری طرح آشنا نہیں تھیں۔ اس وقت جب انگریزوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کیا، اور ترکوں کو بے بس دیکھ کر انسانیت اور ایمان داری کو ایسا بھولے کہ یونانی فوجوں کو بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو بے عزت اور قتل کرنے کے لئے سرزمین پہنچا دیا تو خالدہ ادیب کی تقریر اور تحریر میں ایک عجیب شان پیدا ہوگئی۔ پہلے وہ ایک غیر معمولی استعداد کی ادیب تھیں۔ اب وہ ایک غیر معمولی شخصیت بن گئیں۔ وہ ایک بے زبان قوم کی زبان ہوگئیں۔ دکھ بھرے دلوں کی فریاد بن گئیں۔ اور لوگ اُن کی تقریروں کو حق کا پیغام سمجھنے لگے۔ پہلے انھوں نے صرف ایک خاص انجمن میں جو "ترک اوجاقی" کہلاتی تھی اور جس کے اراکین صرف ترک ہوسکتے تھے۔ مردوں کے سامنے تقریریں کی تھیں۔ اب وہ ہزاروں کے مجمع میں تقریریں کرنے لگیں۔ اسی قسم کا ایک جلسہ جو ترک قومیت کی بہت عزیز یادگار رہے۔ مسجد سلطان احمد کے سامنے میں ہوا۔ خالدہ ادیب پر ایک وجد کی سی کیفیت تھی۔ حاضرین جلسہ کبھی روتے اور کبھی چلا اٹھتے کبھی ایک بارگی سناٹا پڑ جاتا۔ سب کے سروں پر ہوائی جہاز منڈلا رہے تھے، کہ مجمع میں ذرا بھی شورش کے آثار پیدا ہوں تو اسے گولوں سے اُڑا دیں۔

لیکن کسی قوم کا تقریروں سے کام نہیں چلتا اور اس وقت جب انگریز ہر شخص کی زبان بند کرنے پر تلے تھے ترکوں کے چارہ ساز تقریریں کر بھی نہیں سکتے تھے۔ خالدہ خانم ۱۹۲۰ء کے شروع میں قسطنطنیہ سے نکل کھڑی ہوئیں۔ اور اگرچہ انگریزوں نے انھیں گرفتار کرنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ صحیح سلامت انگورہ پہنچ گئیں۔ یہاں مصطفیٰ کمال پاشا، رفعت بے، کاظم قرا بکر، رؤف بے اور نوری بے اناطولیہ کے ترکوں کو ایک نئے نظام حکومت کے ماتحت کرکے یونانیوں اور انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ خالدہ خانم نے ایک نیوز ایجنسی قائم کی جس کے ذریعے سے تمام ضروری خبریں ملک کے ہر حصے میں پہنچائی جاسکتی تھیں۔ انگورہ کی حکومت کے خلاف "خلیفۂ وقت" کا انگریزوں کے اشارے پر جہاد کا حکم دینا، یونانیوں کا انگورہ کی طرف بڑھنا اور آخرکار اگست ۱۹۲۱ء میں دریائے سکاریہ پر شکست کھا کر پسپا ہونا۔ یہ تمام واقعات یہاں تفصیل سے بیان نہیں کئے جاسکتے۔ خالدہ خانم نے اس آزمائش کے زمانے میں بڑی تن دہی اور جوش سے ایک قوم پرست خاتون کے فرائض انجام دئے اور ان بے شمار اور گمنام عورتوں

اور مردوں کے ایثار کی یاد تازہ رکھنے کے لئے جن کی بدولت ترکی نسل کا نام باقی رہا اور وہ ذلت اور بےبسی کی انتہائی پستی سے عزت اور وقار کے عروج پر پہنچ گئی۔ انھوں نے اس زمانے کے واقعات اپنی ایک تصنیف "ترکوں کی آزمائش" میں بیان کئے ہیں۔ ان کی اس تصنیف نے بے زبان ترکوں پر ویسا ہی احسان کیا ہے جیسا ان کی ۱۹۱۹ء کی تقریروں نے۔

غازی مصطفیٰ کمال پاشا ستمبر ۱۹۲۲ء میں فاتحانہ شان سے سمرنا میں داخل ہوئے۔ اور اس کے بہت جلد بعد ترکی کے دشمنوں نے لوزان کے صلح نامے پر دستخط کرکے اپنی ناکامی کا اعتراف کرلیا، اب ترکوں کو نئی زندگی تعمیر کرنے کے لئے صاف اور زرخیز زمین مل گئی تھی۔ اس لئے کہ جس طرح ترکی عورتوں اور مردوں نے جان پر کھیل کر آزادی حاصل کی تھی۔ جس پامردی، موقع شناسی اور تدبر سے قومی نمائندوں نے اپنی بے شمار اور ہمت شکن دشواریوں کا مقابلہ کیا تھا، اور جس مستعدی سے انھوں نے فوج اور اس کے سپہ سالاروں کی لڑنے میں مدد کی تھی۔ اس سے ظاہر تھا کہ اناطولیہ کے ترک جمہوری حکومت کے اہل ہیں۔ اور اب نظام حکومت کی خامیاں اور کوتاہیاں ترقی کے راستے میں حائل نہ ہوں گی۔ لیکن خالدہ خانم جس قدر مصطفیٰ کمال پاشا کی سیرت سے واقف ہوئی تھیں۔ اس سے انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کے ذاتی مقاصد کیا ہیں۔ اور انھیں اندیشہ تھا کہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کو ٹھکرانے پر تیار ہیں۔ فتح کے بعد ایسا ہی ہوا ترکوں کی حکومت دیکھنے میں تو جمہوری ہے، لیکن دراصل وہ ایک بے زبان مرکب ہے جو بالکل راکب کے قابو میں ہے۔ وہ اسے جس طرف چاہتا ہے اور جس رفتار سے چاہتا ہے لے جاتا ہے۔ ترکوں کو اپنا خون بہا کر بھی وہی مطلق العنان حکومت ملی جس نے اب تک بڑی بیدردی سے ان کے جان و مال کو ضائع کیا تھا۔ اور دشمنوں سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی وہ اس آزادی سے محروم رہے۔ جس پر قومی نشو و نما کا دار و مدار ہوتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کے حکم سے جو اصلاحیں عمل میں آئیں ان سب کے لئے پہلے سے زمین تیار کی جا چکی تھی۔ لیکن قوم کے ارادے کو بے دخل کرنے سے یہ اصلاحیں جبری ہوگئیں۔ اور ان سے اگر معاشرت بہتر بھی ہوگئی تو ترکوں کی سیرت کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ اور ان میں سے جمہوری حکومت کی جو خلقی اہلیت تھی۔ وہ بڑی حد تک فرماں برداری

کی حالت میں گم ہو گئی ہے

خالدہ خانم اور ان کے ساتھ کئی اور ترکوں نے جن کی قومی خدمات مصطفیٰ کمال کے کارناموں سے کچھ کم نہیں تھیں۔ جنگ آزادی کے ختم ہونے پر وطن کو خیرباد کہا۔ مصطفیٰ کمال نے ہر طریقے سے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ کسی کو اپنے برابر دیکھنا نہیں چاہتے۔ اور وہ جمہوریت کے سیاسی آداب کا اتنا بھی لحاظ کرنے پر تیار نہیں تھے کہ معمولی تنقید برداشت کر سکیں۔ ان کے مقابلے پر آنے اور قوم کی رائے لینے کے معنی یہ تھے کہ خانہ جنگی یا کم از کم انتہائی بدنظمی اور انتشار کا سامان کیا جائے۔ اور یہ ایک مصیبت تھی جس سے بچنے کے لئے ان لوگوں کو جواب تک جاں بازی سے قوم کی خدمت کرتے رہے تھے۔ ہر طرح کا ذاتی نقصان گوارا تھا۔ انھوں نے اپنی تمام امیدیں قربان کر کے ترکی کو مصطفیٰ کمال کے سپرد کیا۔ اور خود کہیں چھپ کر بیٹھ رہے۔

خطابت

اور

(اس کی مختصر تاریخ)

خطابت :- ایک طبعی چیز ہے۔ انسان ابتدائے آفرینش سے اپنے تمدنی اور معاشرتی ضروریات کے سمجھنے اور سمجھانے میں مافی الضمیر زبان سے ادا کرنے پر مجبور ہے۔ لغوی معنی کے اعتبار سے ہر ایسے کلام کو جو دوسروں کو سمجھانے کے لئے کیا جائے خطابت کہتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں اس فن کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ ایک خطیب اپنی تقریر کو کن طریقوں سے موثر بنا سکتا ہے۔ اور اپنے دعوئے کو کس طرح سامعین کے دلوں میں بٹھا سکتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے۔

الخطابة في اللغة كالخطاب	خطابت اور خطاب لغت میں اس کلام کو کہتے
وهي الكلام الموجه به نحو	ہیں جو دوسروں کو سمجھانے کے لئے کیا جائے
الغير للافهام في إصطلاح	مگر حکما کی اصطلاح میں اُس فن کو کہتے ہیں جس کے
الحكماء، هي صناعة تتكلف الإقناع	ذریعے سے دوسروں کو تمام اصناف کلام میں
الممكن في كل مقولة من المعقولات	حتیٰ الامکان مطمئن کیا جاسکے۔

تلخیص الخطابت الابن رشد

علامہ ابن اثیر نے المثل السائر میں بیان کیا ہے ہر شخص کسی علم کو پڑھ کر اپنے آپ کو اس علم کی طرف منسوب کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی خطیب اور کاتب اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک وہ تمام علوم پر حاوی نہ ہو اس فن کا موضوع کوئی خاص چیز نہیں۔ کوئی چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ اور بڑے سے بڑا قضیہ ایسا نہیں جو اس کے وسیع دائرے سے خارج ہو۔ کوئی ذہنی یا محسوس چیز ایسی نہیں جس پر خطابت کا زور نہ چلتا ہو۔ اس لئے

ضروری ہے کہ خطیب کا خزانۂ دماغ ہر قسم کے معلومات سے پر ہو۔ ورنہ اس فن میں کمال حاصل نہیں ہوتا۔

خطابت کی اثر اندازی اور شان عظمت

اثر پذیری نفس انسانی کا فطری خاصہ ہے۔ ہم بعض چیزوں کو اکثر اس وجہ سے تسلیم کر لیتے ہیں کہ دوسروں کے بھی یہی خیالات ہیں۔ خواہ یہ نفس انسانی کی کمزوری ہی کیوں نہ ہو۔ تاہم یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اس خاصہ نفس کا اثر حیات اجتماعیہ پر بہت کچھ ہوتا ہے۔

خطباء اس صفت سے اس وقت زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب افراد قوم ایک انبوہ کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ان کی ذاتی رائے اور آزادی رخصت ہو جاتی ہے۔ کورانہ تقلید اور تتبع محض کا دور دورہ ہوتا ہے۔ پھر ان کو اس سے بھی غرض نہیں رہتی کہ یہ مقصد جس کے لئے وہ متاثرانہ شان سے بیتاب نظر آ رہے ہیں کس قسم کا ہے؟ بلکہ وہ اس قدر مسحور ہو جاتے ہیں کہ اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے۔ جان، مال، دولت غرض ہر عزیز سے عزیز شے کی قربانی کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

درحقیقت قوت گویائی خدا کی عطا کردہ نعمتوں میں سب سے بڑی نعمت ہے اسی کی وجہ سے انسان کو دیگر مخلوقات پر برتری حاصل ہے۔ وہی قوموں کے اخلاق سدھارتی ہے۔ عیوب کی اصلاح اور مفاسد کا سدباب کرتی ہے۔ وہی دلوں میں جوش و خروش، دماغوں میں ولولے۔ اور بازوؤں میں سکت پیدا کرتی ہے۔ دم بھر میں دنیا کے اندر گردش اور زمانے میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔

بعض الفاظ اور فقرے اپنے اندر مقناطیسی قوت رکھتے ہیں۔ ان کے متعلق یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ان کی قوت تاثیر میں ان کے معنوں کو کبھی دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کی ساحرانہ تاثیر درحقیقت مخفی ہوتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ الفاظ جو مجمع پر زیادہ اثر کرتے ہیں۔ ان کے معنی مبہم ہوتے ہیں۔ لیکن باوجود اس کے کہ ان کی حقیقت سے عوام ناآشنا ہوتے ہیں سامعین کے نفوس میں کچھ اس طرح گھر کر جاتے ہیں۔ کہ ان کے متعلق لوگوں کا یہ اعتقاد ہو جاتا ہے کہ تمام اجتماعی مشکلات کا حل ان ہی الفاظ کے ساتھ وابستہ ہے۔

ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ ادھر مقرر کی زبان سے نکلے ادھر سامعین پر ایک ہیبت سی چھا گئی اور احترام اور عظمت نے ان کو سرنگوں کر دیا گویا ان میں ایک طاقت الٰہی مضمر ہوتی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی۔ مگر ان کی مخفی قوت چند لمحوں کے اندر بڑے بڑے زاہدوں اور عابدوں کے اندر جھرجھری پیدا

کر دیتی ہے۔

خطبار ہمیشہ ملک و قوم کے جذبات و احساسات سے کھیلتے رہتے ہیں۔ کبھی اپنے قطرہائے اشک کے سیلاب میں انھیں ڈبکیاں دیتے ہیں اور کبھی انھیں برق صفت تبسم سے ان کے خرمن سکون و راحت کو جلا کر خاکستر کر دیتے ہیں۔ کبھی اپنی پرجوش تقریروں سے قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دیتے ہیں۔ اور کبھی اپنی جادو بیانیوں سے ساری قوم کو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیتے ہیں چشم زدن میں شاہی مسندوں کو الٹ دیتے ہیں۔ اور ایوانِ حکومت کو تاراج کر ڈالتے ہیں۔

شکسپیر کی روایت کے مطابق جب جولیس سیزر قتل ہو چکا تو بروٹس مع دیگر قاتلوں کے پلیٹ فارم پر آیا۔ اور اسباب قتل پر ایک شاعرانہ تقریر کی جس کا اثر یہ ہوا کہ تمام حاضرین اوس کے ہم آہنگ ہو گئے۔ اور سیزر کے قتل کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دینے لگے۔ اور بروٹس اور اس کے رفقار کو محسنین ملک کے شاندار خطاب سے پکارنے لگے۔

بروٹس کے الفاظ ابھی ہوا ہی میں گونج رہے تھے۔ کہ سیزر کا دوست مارک انٹونی جسے غلطی سے بروٹس اپنا دوست سمجھ رہا تھا۔ نمودار ہوا۔ اور بروٹس پلیٹ فارم اس کے حوالے کرکے خود چلا گیا۔ انٹونی نے اپنی تقریر شروع کی جو جس قدر بلیغ تھی اسی قدر بروٹس کے حق میں سم قاتل۔ اس کی تقریر ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ حاضرین کے دلوں میں سیزر کی موافقت اور بروٹس کی مخالفت کے جذبات پیدا ہونے لگے۔ اور اس کے ختم ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچ گئی کہ سارا مجمع ایک مجنونانہ جوش کے ساتھ قاتلیں سیزر سے انتقام لینے کے لئے بے خود ہو گیا۔ اور وہی اہل شہر جو چند منٹ قبل بروٹس کو ملک کا سب سے بڑا محسن قوم کی قیادت کا سب سے زیادہ مستحق اور اپنی عزت و احترام کا سب سے بڑا تاجدار سمجھے تھے۔ اب دفعتاً اسی بروٹس اور اس کے رفقا کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اور ان میں سے جتنے انھیں مل سکے انھیں بڑی بیدردی سے تہ تیغ کر ڈالا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی وہ مشہور تقریر جو انھوں نے رسول خدا صلعم کے انتقال کے بعد صحابۂ کرام کے اضطراب کو مٹانے کی غرض سے کی تھی، خطابات میں ایک خاص اہمیت رکھتی

ہے۔ آپ نے مسلمانوں کو مخاطب فرما کر کہا۔

الا! من کان یعبد محمداً فان محمداً قدمات، ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حیٌّ لا یموت وما محمد الا رسول، قد خلت من قبلہ الرسل افائن مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا وسیجزی اللہ الشاکرین۔

ہاں! جو لوگ محمد کو پوجتے ہیں۔ ان کو معلوم ہوجانا چاہئے کہ محمد کا انتقال ہوچکا۔ لیکن جو لوگ خدا کو پوجتے ہیں ان کو معلوم ہوجانا چاہئے کہ خداوند ہے جو مرے گا نہیں۔ محمد صلعم تو صرف ایک پیغمبر تھے ان سے قبل بھی اور پیغمبر گذر چکے ہیں۔ کیا وہ۔ اگر مر گئے یا شہید کردئے گئے تو تم لوگ پھر اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جاؤگے۔ جو لوگ اپنی ایڑیوں کے بل لوٹ جائیں وہ خدا کو کچھ نقصان نہ پہنچائیں گے۔ خدا شکر کرنے والوں کو جلد جزائے خیر دے گا۔

یہ چند جملے تھے لیکن اس مختصر سی تقریر کا لوگوں پر یہ اثر ہوا کہ روتے روتے۔ سب کی ہچکیاں بندھ گئیں اور لوگ مسجد سے نکلے تو یہ آیت پڑھتے ہوئے نکلے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جن کو سب سے زیادہ اس بات پر اصرار تھا کہ "رسول خدا صلعم کا انتقال نہیں ہوا ہے" جب انھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زبان سے اس آیت کو سنا تو وہ فرماتے ہیں کہ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ آیت آج ہی نازل ہوئی ہے

یہ دیکھا گیا ہے کہ بعض وقت صرف ایک ہی فقرہ یا شعر اپنے اندر ایسے ساحرانہ تاثیر رکھتا ہے جو قبائل و امم کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب انقلاب پیدا کردیتا ہے۔

نمیر ایک نہایت معزز قبیلہ تھا جس کو اپنے حسب و نسب پر اس درجہ غرور تھا کہ جب کوئی شخص اس کے کسی فرد سے دریافت کرتا تھا کہ تم کس قبیلے سے ہو تو وہ نہایت متکبرانہ انداز سے بھاری آواز میں کہتا تھا کہ "نمیر"۔

جریر ایک مشہور شاعر گذرا ہے جس کو اس قبیلے کے کسی شخص سے رنج پہنچا تھا۔ جریر نے اس

کی ہجو میں شعر لکھنا شروع کئے جب اس کی زبان سے یہ شعر نکلا

فَغُضِّ الطَّرْفَ اِنَّكَ مِنْ نُمَيْرٍ	اپنی آنکھوں کو نیچی کر لو اس لئے کہ تم قبیلہ نمیر سے ہو
فَلَا كَعْبًا بَلَغْتَ وَلَا كِلَابًا ۔	نہ تمہارا مرتبہ بنو کعب جیسا ہے۔ نہ بنو کلاب جیسا

تو وہ اچھل پڑا اور کہنے لگا وَاللّٰهِ اَخْزَيْتُهٗ اٰخِرَ الدَّهْرِ" یعنی خدا کی قسم میں نے اس کو ہمیشہ کے لئے رسوا کر دیا۔ چنانچہ تمام عرب میں یہ شعر مشہور ہو گیا۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ قبیلہ والوں نے اپنے قبیلے کا نام لینا چھوڑ دیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ قبیلے کا نام ہی مٹ گیا۔

ذاتی سطوت کا خطابیات پر اثر تقریر کی کامیابی کا انحصار ایک حد تک سطوت اور شخصی نفوذ پر بھی ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں یہ مقناطیسی قوت پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی غلبے کے بل پر اپنے خیالات کو سامعین کے ذہنوں میں راسخ کر دیتے ہیں اور لوگ ان کی اس طرح اطاعت کرتے ہیں جس طرح حیوانات اپنے مالک کے مطیع ہوتے ہیں۔ اس قسم کی فطری اور ذہنی سطوت قوموں کے اُن تمام اعاظم و جبال کو حاصل ہوتی ہے جنھوں نے اپنے کارناموں سے دنیا پر دھاک بٹھا دی ہے۔

دنیا میں جو صاحب سطوت ہستیاں گذری ہیں۔ ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ گو ان کے کارناموں سے ان کی سطوت بڑھ جایا کرتی ہے لیکن ان کی ذاتی سطوت اور ان کا شخصی نفوذ کسی خارجی مؤیدات کا زیر بار احسان نہیں ہوتا بلکہ ان کی شہرت کے پہلے ہی سے ان میں ایک ایسی تسخیر کی قوت پائی جاتی ہے جو قلوب انسانی کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے اور ان پر اپنے رعب کا سکہ جما دیتی ہے

نپولین اعظم جب پہلی مرتبہ گرفتار ہوا تو کچھ عرصے کے بعد موقع پا کر فرار ہو گیا۔ اس کے قدیم سپاہیوں کی ایک مختصر سی جماعت اس کے ساتھ تھی جو بلحاظ کثرت تعداد، بلحاظ آلات جنگ اور بلحاظ سامان رسد اس قابل نہ تھی کہ کسی قوی حریف کا مقابلہ کر سکتی۔ مگر اس باہمت معزول تاجدار نے اسی کی مدد سے ملک فرانس بلکہ تمام یورپ کے خلاف اپنے تخت پر قابض ہونے کی ٹھان لی۔

پہلے ہی معرکے میں بیس ہزار تازہ دم جوانوں کا سامنا پڑا، ایسے نازک موقع پر کوئی دوسرا جنرل ہوتا تو بدحواس ہو جاتا لیکن نپولین تن تنہا غیر مسلح اپنی صف سے نکلا۔ اور کمال اطمینان کے ساتھ

فریق مخالف کی صف کے سامنے آکھڑا ہوا، اور سینہ کھول کر ایک پراثر لہجے میں اپنے مخالف سپاہیوں سے جن میں اکثر ایک زمانے میں اس کے ماتحت رہ چکے تھے۔ خطاب کرکے للکارا "تم میں سے کون ہے جو اپنے باپ کے عریاں سینے پر فیر کرنے کو تیار ہے؟" اس آواز کا ساحرانہ اثر ہوا۔ ہر طرف سے کوئی نہیں کوئی نہیں کی صدا بلند ہوئی۔ اور فوجی افسر جو نپولین کو گرفتار کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے اور جنھوں نے اس کے مقید کرکے لانے کا حلف اٹھایا تھا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی اس کے حلقہ بگوش بن گئے اور معاً تمام سپاہی اپنی جماعت چھوڑ کر اس کے علم کے نیچے آ گئے۔

غزوۂ حنین میں جب مال غنیمت بہت زیادہ حاصل ہوا۔ تو اعراب کو یہ طمع دامن گیر ہوئی کہ اس کی تقسیم جلد از جلد ہو جاوے۔ یہ خواہش بیتابی کی حد تک پہنچ گئی۔ پیغمبر خدا صلعم نے تقریباً کل مال غنیمت قریشی سرداروں کو دے دیا اور ان کے مقابلے میں انصار مدینہ کو کچھ بھی نہیں دیا۔ اس پر گروہ انصار میں سخت برہمی پھیلی اور انھوں نے آپس میں کہنا شروع کیا کہ "خدا پیغمبر صلعم کو مغفرت کرے۔ آخر اس نے اپنے ہی عزیزوں اور ہم وطنوں کا ساتھ دیا اور ہمیں چھوڑ دیا۔ حالانکہ خون ہماری تلواروں سے ٹپک رہا ہے"

آں حضرت صلعم کو جب اس واقعے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے صرف انصار کو ایک خیمے میں جمع کیا اور اصل واقعہ دریافت فرمایا۔ لوگوں نے عرض کیا "ہم میں سے کسی ذمہ دار شخص نے ایک لفظ نہیں کہا ہے ہاں چند ناتجربہ کار نوجوانوں نے یہ ضرور کہا ہے" آپ نے اس وقت ایک پرجوش تقریر فرمائی جس کے جستہ جستہ فقرے مختلف حدیثوں میں ملتے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔

یامعشرالانصار۔ الم اجدکم
ضلالاً فهداکم الله بی، و
کنتم متفرقین فالفکم الله بی، و
عالةً فاغناکم الله بی۔

گروہ انصار کیا میں نے تم کو گمراہ نہیں پایا پس خدا نے
میری وجہ سے تم کو ہدایت کی تم متفرق اور ایک
دوسرے کے دشمن تھے۔ خدا نے میری وجہ سے تمہارے
دلوں میں محبت اور یک جہتی پیدا کی تم محتاج تھے خدا
نے میری وجہ سے تم کو غنی اور مالدار کر دیا۔

آپ نے اتنا ہی فرمایا تھا کہ تمام انصار نے عرض کیا "حضور! جو کچھ ارشاد ہوا حرف بہ حرف صحیح ہے۔ بے شک خدا اور اس کا رسول امین ہے"

نطری سطوت اور خطابت کی سحر طرازی کا یہ عالم تھا کہ اس وقت صدہا متنفس میں ایک شخص بھی ذی روح معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا ایک ربودگی کے عالم آپ کے چہرۂ اقدس پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں آپ نے پھر سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے ان کے اصل اعتراض کا جواب دیا۔ اور فرمایا۔

ما یمنعکم ان تجیبوا رسول اللہ	تمہیں کون سی چیز روکتی ہے کہ تم رسول خدا کا جواب دو ....
....	....
....	....
اما ترضون ان یذھب الناس بالشاۃ والبعیر وتذھبون بالنبی الی رحالکم ؟	کیا تم پسند نہیں کرتے ہو کہ لوگ اونٹ اور بکریاں لے کر جائیں اور تم اپنے گھروں میں خود پیغمبرؐ کو لے کر جاؤ۔
فواللہ لما تنقلبون بہ خیر مما ینقلبون۔	خدا کی قسم تم جو لے کر جاؤ گے وہ اس سے بہتر ہے جس کو تمام لوگ لے کر جائیں گے۔

صحیح بخاری غزوۂ حنین صفحہ ۶۲۰

اس تقریر کا یہ اثر ہوا کہ وہی انصار جو چند منٹ قبل کبیدہ خاطر ہو رہے تھے اس قدر روئے کہ ان کی ڈاڑھیاں تر ہو گئیں اور وہ سب بیک آواز پکار اٹھے "رضینا"

سطوت ذاتی کی یہی وہ صفت تھی جس نے صحرائے عرب کے ایک ان پڑھ کو دنیا سے اس کی رسالت تسلیم کرانے اور قائدین عظام کی صف میں اسے ایک ممتاز جگہ دینے میں تمام خصوصیات سے زیادہ اس کی مدد کی۔

قوت خطابت کا نیچرل فرق | قوت گویائی سب لوگوں میں یکساں نہیں پائی جاتی۔ کسی میں یہ قوت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کسی میں کم۔ بعض لوگ فطرۃً فصیح البیان اور زبان آور ہوتے ہیں اور بعض معمولی سی معمولی بات بھی زبان سے ادا نہیں کرپاتے۔ مگر اچھے انشاپرداز ہوتے ہیں۔ بعض محض خوش تقریر ہوتے ہیں مگر قوت صحافت ان میں بالکل مفقود ہوتی ہے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں جن میں تقریر و تحریر دونوں صفتوں میں سے کوئی صفت نہیں پائی جاتی اور بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو ان دونوں میں کافی ملکہ حاصل ہوتا ہے۔

علامہ ابو ہلال عسکری نے اصناف رجال کی اسی تفصیل کو بتاتے ہوئے خطیب کو مندرجہ ذیل اصول پر عمل پیرا ہونے کی تاکید کی ہے۔

فاحسن حالات المسئِ الامساكُ واحسن حالات المحسنِ التوسط. فان الاكثار يورث الاملال وقل ما ينجو صاحبِه من الزلَل والعيب والخطل

جو شخص اچھی تقریر نہ کر سکتا ہو اس کے لئے خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے لیکن جو شخص خوش بیانی میں کامیاب ہو اس کو چاہئے کہ میانہ روی اختیار کرے۔ اس لئے کہ طوالت بیانی بہرصورت تکدر اور ملال کا باعث بنتی ہے اور لمبی چوڑی تقریر کرنے والے بہت کم ایسے ہیں جو لغزشات اور عیوب سے محفوظ رہتے ہیں۔

کتاب الصناعتین صفحہ ۱۵

آداب خطابت | لوگوں کو کسی حقیقت کے سمجھانے اور کسی مسئلے کے متعلق مطمئن کرنے کے لئے ایک خطیب کو اپنے خطبے میں جن باتوں کے ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

موقع اور محل کا انتخاب | خطیب کو موقع اور محل کا صحیح اندازہ رکھنا چاہئے کہ یہاں کس قسم کے لوگ جمع ہیں۔ ان کے طبائع کا میلان کس طرف ہے۔ ان کے خاص خاص جذبات و احساسات کیا ہیں۔ ان کو کن کن طریقوں سے بیدار کیا جا سکتا ہے۔ کبھی اپنے مقصد پر سنجیدگی سے روشنی ڈالے اور موثر پیرائے میں سامعین کے مردہ جذبات کو برانگیختہ کرے۔ اور کبھی جرح و قدح، زجر و توبیخ کے پہلوے

ان کے احساسات کو ٹھیس لگادے۔

قوم وملک میں سیاسی زندگی اور قومی روح پیدا کرنی ہو تو اسے علم سیاست اور قومی روایت سے بخوبی واقف ہونا چاہئے تاکہ وہ سمجھ سکے کہ قوم اور ملک کے احساسات اور جذبات کیوں کر برانگیختہ کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں قوم پرستی، حب وطن کے شریف جذبات کیوں کر راسخ کئے جاسکتے ہیں۔ اس کے موثر طریقے کیا ہیں۔ اور ان کو کیوں کر کام میں لانا چاہئے۔

انسان چونکہ فطرۃً تقلید پرست واقع ہوا ہے۔ اس لئے اس کے اخلاق وعادات کا اپنی جگہ سے ہلانا کچھ آسان کام نہیں۔ قومی روایات اور قومی سرمائے کی حفاظت کا انسان کو سب سے زیادہ خیال ہوتا ہے، یہاں تک کہ وہ ان لوگوں سے لڑنے مرنے پر تل جاتا ہے جو اس کے قومی روایات میں کوئی تغیر یا ترمیم کرنا چاہتے ہیں۔

ہر زمانے اور ہر قوم کے سیاست داں حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو سب سے زیادہ استبداد پسند ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی قوموں کے تخیلات واعتقادات کا ہمیشہ احترام کرتے ہیں۔ اور حتی الامکان ان کے خلاف عمل پیرا ہونے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ وہ لوگوں کے خیالات واعتقادات کو پس پشت ڈال کر فرض قیادت انجام دے سکیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کی ساری عزت خاک میں مل کر رہ جائے۔

یہی وہ چیز ہے جو مختلف زمانے کے خطباء اور انسانی فطرت کے نبض شناسوں نے قومی جذبات کے مشتعل کرنے میں پیش نظر رکھی ہے۔

الفاظ کی شستگی | خطیب کو چاہئے کہ حتی الامکان وہ اپنے ما فی الضمیر کو ایسی سادہ مثالوں اور تشبیہات کے ذریعے سے ادا کرے جو سامعین کی نظروں کے سامنے اس کا ایک موثر نقشہ کھینچ دے۔ ورنہ تقریر گو کتنی ہی بلیغ ہو۔ سامعین پر اس کا خاک اثر نہ ہوگا۔

اس عنوان کے تحت میں علامہ جاحظ اور ابوہلال عسکری نے بہت سے دلچسپ واقعات نقل کئے ہیں جن میں سے ایک درج ذیل ہے۔

ابوعلقمہ نحوی مشکل اور مغلق الفاظ بولنے کا عادی تھا ۔ اس پر کبھی کبھی مرگی کا دورہ ہوا کرتا تھا ۔ ایک مرتبہ وہ بصرہ میں کسی سڑک پر جا رہا تھا ، یک بیک اس پر دورہ پڑا ، اور وہ سڑک کے کنارے گر پڑا ۔ لوگ اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے ۔ اور اس کے کانوں میں اذان دینے لگے ۔ جب اس کو ہوش آیا ۔ تو وہ یہ کہتا ہوا بھاگا ۔

مالکم تکاکئون علیّ کا تکاکئکم علی ذی جنۃٍ ۔ افرنقعوا عنی ۔ — تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ تم میرے پاس گویا اس طرح جمع ہو گئے ہو جس طرح کسی بھوت والے شخص پر تم جمع ہوا کرتے ہو ۔ ہٹو ۔ میرے پاس سے چلے جاؤ ۔

لوگ اس کی جناتی زبان بالکل نہ سمجھ سکے ۔ اور یہ کہتے ہوئے اس کے پاس سے ہٹ گئے

دعوہٗ فان شیطانہ یتکلم بالھندیۃ ۔ — اس کو چھوڑ دو ۔ اس کا بھوت ہندی میں باتیں کر رہا ہے ۔

کتاب البیان جز اول صفحہ ۲۰۲ ۔

ادعائے محکم | خطیب کو چاہیے کہ اپنا انداز بیان مدعیانہ اور محکمانہ رکھے جو کچھ بیان کرنا ہو وثوق اور انتہائی قطعیت کے ساتھ کہے اگر اسے کسی عقیدے کو راسخ کرنا ہے تو اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ وہ اپنا عقیدہ سامعین پر اس طرح ظاہر کرے کہ وہ خود اس کا حد درجہ یقین رکھتا ہے ۔ اس سے سامعین خواہ مخواہ متاثر ہوں گے اور مقرر کا خیال ان کے دلوں میں خود بخود سرایت کر جائے گا ۔

شاید ۔ غالباً ۔ ممکن ہے ، اور اسی طرح کے تمام دوسرے الفاظ جن سے مقرر کا شک و شبہ ظاہر ہوتا ہے ۔ دعوے کی قوت کو ضعیف کر دیتے ہیں اور سامعین کو خیال دلاتے ہیں کہ اس میں ضرور شک و شبہ کی گنجائش ہے ۔

اسی طرح اپنے دعوے کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنا ہی سامعین کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ محل نقد و نظر ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ نظریات خواہ کتنے ہی قوی ہوں بدیہیات کا مقابلہ نہیں کر سکتے ۔

مقرر اپنے خیالات کے اظہار میں جس قدر شک و تذبذب کے الفاظ اور عقلی دلائل و براہین سے زیادہ گریز کرے گا اسی قدر اپنی تقریر میں زیادہ کامیاب ہوگا۔ دنیا کے بڑے بڑے سیاست داں اور بانیانِ مذاہب جب کسی قوم کو برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں یا کسی عقیدے کو رواج دینا چاہتے ہیں تو ہمیشہ اسی مدعیانہ طرز کا خیال رکھتے ہیں۔

آں حضرت صلعم کے رضاعی باپ حضرت حلیمہ کے شوہر جب مکہ میں تشریف لائے تو قریش نے کہا "کچھ سنا ہے تمھارا بیٹا کہتا ہے کہ لوگوں کو مر کر پھر جینا ہوگا" انھوں نے آپ سے کہا کہ "بیٹا یہ کیا کہتے ہو۔ آپ نے نہایت پرجوش لہجے میں فرمایا" اگر وہ دن آیا تو میں تمھارا ہاتھ پکڑ کر بتا دوں گا کہ جو کچھ میں کہتا تھا سچ تھا" وہ فوراً مسلمان ہو گئے اور ان پر ان فقروں کا اثر عمر بھر رہا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "میرا بیٹا ہاتھ پکڑ کر جنت میں پہنچا ہی کر چھوڑے گا"[۱]

اسی طرح جب کفار قریش نے آکر حضرت ابو طالب سے شکایت کی کہ اب تک ہم آپ کا خیال کرتے رہے اب معاملہ حد سے تجاوز کر چکا ہے۔ محمدؐ ہمارے بتوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور ہم کو ان کی عبادت سے روکتے ہیں۔ یا تو آپ انھیں روک دیجئے یا خود بیچ سے علیحدہ ہو جائیے۔ تاکہ ہم اور وہ آپس میں نبٹ لیں۔ حضرت ابو طالب نے سرور عالم صلعم کو بلا کر فرمایا "اے برادر زادے مجھ پر ایسا بوجھ نہ ڈال جو میری طاقت سے باہر ہو" آپ نے اس وقت ایک پرشوکت اولوالعزمی اور پرجوش وقار کے ساتھ فرمایا۔

یا عم! واللہ لو وضعوا الشمس	چچا جان! خدا کی قسم اگر یہ لوگ مرے داہنے ہاتھ
فی یمینی والقمر فی یساری علی	میں آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب لاکر رکھ دیں
ان اترک ھذا الامر ما ترکتہ	تاکہ میں اس فریضہ کی تبلیغ سے باز آجاؤں تو میں کبھی
حتی یظھرہ اللہ تعالٰے او	اسے ہرگز نہ چھوڑوں گا تا وقتیکہ خدا اپنے دین کو

---

[۱] اصابہ تذکرہ حارث۔

اعلاء کلمۃ اللہ – سب پر غالب کرے یا میں اسی کوشش میں قربان ہو جاؤں۔

(سیرت حلبیہ جلد اول صفحہ ۲۰۰)

حضرت ابو طالب پر اس جواب کا بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے ایک پر ہیبت لہجے میں فرمایا جاؤ جو تمہارا جی چاہے کرو، خدا کی قسم میں تمہیں کسی حالت میں کفار کے سپرد نہ کروں گا اور پھر یہ شعر پڑھا

واللّٰہ لن یصلوا الیک بجمعھم — خدا کی قسم وہ تمہاری طرف ہرگز نہیں پہنچ سکتے جب تک میں مٹی میں نہ ملا دیا جاؤں

حتی اوسد فی التراب دفینا

ایجاز و اختصار | خطیب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خطبہ دیتے وقت اس بات کا خاص طور سے خیال رکھے کہ لوگ اس کی تقریر سنتے سنتے اکتا تو نہیں گئے ہیں۔ اس لئے کہ ایسی حالت میں جب کہ سامعین کسی تقریر سے اکتا گئے ہوں، مقرر خواہ کیسے ہی خطیبانہ پیرائے میں تقریر کر رہا ہو۔ لوگ اس کی آواز پر کان نہیں دھرتے اور جو کچھ وہ کہتا ہے غور نہیں کرتے۔

ایک ماہر علم موسیقی کی خوش الحانی اسی وقت تک لطف دیتی ہے جب تک وہ ایک خاص حد سے بڑھ جانے کے بعد وہی ترنم ریز آواز جو پہلے دل کش اور بھلی معلوم ہوتی تھی بعد میں کانوں کو گراں اور ناگوار گذرنے لگتی ہے۔

ایجاز و اختصار بلاغت کی جان ہے طوالت بیانی فی نفسہ کلام کے اثر کو گھٹا دینے والی چیز ہے مثلیں، کہاوتیں اور مقولات جو زبان زد عوام ہوتے ہیں ان کی خصوصیت مشترکہ یہ ہوتی ہے کہ ان کا مفہوم بہت ہی وسیع ہوتا ہے۔ لیکن ان کے الفاظ کا شمار بہت ہی محدود ہوتا ہے۔

جس چیز کی علمائے ادب "آمد" سے تعبیر کرتے ہیں اس کا اہم جز اختصار ہے۔ طوالت بیانی میں ہمیشہ آورد، اور تصنع کی جھلک نظر آتی ہے۔ ایجاز میں جو سحر ہوتا ہے۔ وہ تطویل میں قائم نہیں رہ سکتا

حرکات و سکنات | خطیب کو خود اپنے حرکات و سکنات کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ مثلاً اس کی آواز معتدل ہو یعنی نہ اتنی پست ہو جس کو لوگ سن نہ سکیں نہ اتنی بلند اور کرخت ہو جس سے لوگ نفرت کریں

زبان صاف اور شستہ ہو، دل قوی اور مضبوط ہو۔ تقریر کرتے وقت اس کے ہاتھ پاؤں نہ کانپیں، آواز میں رعشہ پیدا نہ ہو۔ چہرے کی رنگت نہ بدلے دل میں نہ دھڑکن ہوتی ہو، نہ ڈاڑھی میں بار بار کھجلی۔

روز مرہ کا تجربہ ہے کہ جب ہم ایک خاص طرز سے اپنے بعض اعضائے جسم میں تغیرات پیدا کر لیتے ہیں تو بغیر کسی مہیج خارجی کے ان آثار جسمانی کے متناسب ایک احساسی کیفیت از خود پیدا ہو جاتی ہے۔ تھیٹر اور سینما میں کام کرنے والے وہ ایکٹر اور ایکٹرس جو جذبات کی تصویر الفاظ، حرکات و سکنات کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں ان جذبات و کیفیات کو واقعتہً اپنے اوپر طاری کر لیتے ہیں۔ وہ اپنے مقصد کے ثابت کرنے میں زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔

مثلاً کوئی شخص اپنی زبان اور جسمانی نقل و حرکت سے دلیری اور بہادری کا نمونہ دکھانا چاہتا ہے یا کسی بے کس اور غم زدہ کا پارٹ کرنا چاہتا ہے تو ان جذبات کے ادا کرنے میں، وہ ایکٹر زیادہ کامیاب ثابت ہوگا جس کے دل میں واقعی تھوڑی دیر کے لئے شجاعت اور جواں مردی غم و الم کی کیفیت پیدا ہو جائے۔

کسی جادو بیان مقرر کی تقریر میں جس طرح اس کے الفاظ تیر و نشتر بن کر دل میں اترتے ہیں ٹھیک اسی طرح اس کی آواز حرکات و سکنات، اشارات و کنایات کا بھی عجیب اثر پڑتا ہے۔ کلام پر زور دینے کے لئے ہاتھوں سے اشارہ کرنا جوش کے مواقع پر مٹھیاں بند کر کے زور سے ہاتھوں کو ہلانا عموماً ہر مقرر کے اندر پایا جاتا ہے۔

زمانہ قدیم سے فن خطابت میں اشاروں کے استعمال پر بھی زور دیا جا رہا ہے اور آج بھی اس فن کی جہاں باقاعدہ تعلیم دی جاتی ہے۔ وہاں انتخاب الفاظ اور اس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ اشاروں کے استعمال کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے۔

انھیں باتوں کو علامہ ابو ہلال عسکری نے کتاب الصناعتین میں بالتفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کسی خطیب کو دوران تقریر میں اطمینان قلب نصیب نہ ہو۔ تو وہ دہشت اور خوف کی وجہ سے کبھی اپنے اظہار خیال میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جب مقرر سامعین کی عظمت سے زیادہ متاثر ہوجاتا ہے۔ تو اس کے قوائے دماغی ماند پڑ جاتے ہیں قوت تخیل و تنقید معطل ہوجاتی ہے۔ غور و تخیل کا مادہ سلب ہوجاتا ہے۔ اور اس کے حواس بجا اور درست نہیں رہتے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے حاضرین کی آنکھوں سے دیکھتا ہے جو کچھ سنتا ہے انھیں کے کانوں سے سنتا ہے اور جو کچھ کہتا ہے انھیں کی زبان سے کہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ گلوگرفتہ ہوجاتا ہے اور ایک لفظ بھی زبان سے نہیں ادا کر پاتا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خطبہ خلافت دینے پہلی مرتبہ جب ممبر پر تشریف لائے تو حمد و ثنا کے بعد کچھ بیان نہ کرسکے۔ اور صرف یہ کہہ کر ممبر پر سے اتر آئے۔

ان اللذین کانا قبلی کانا	بیشک مجھ سے پہلے جو دونوں حضرات (ابوبکرؓ
یعدان لھذا المقام مقالاً	(عمرؓ) گذرے ہیں وہ پہلے ہی سے اس جگہ کے لئے
وانتم الیٰ امام عادل احوج	خطبے تیار کرلاتے تھے لیکن تم کو امام قائل کی بہ نسبت
منکم الیٰ امام قائل۔	امام عادل کی زیادہ ضرورت ہے۔

(کتاب الصناعتین صفحہ ۱۵)

اسی طرح ایک اور واقعہ نقل کیا ہے کہ خراسان میں ایک شخص. بڑی آن بان اور جوش و خروش کے ساتھ خطبہ دینے کے لئے ممبر پر آیا۔ لیکن ممبر پر پہنچکر جو کچھ کہنا چاہتا ہے۔ بھول گیا اور صرف یہ شعر پڑھ کر نیچے اتر آیا۔

لئن لم اکن فیکم خطیباً فاننی	اگر اس وقت میں تمھارے سامنے فرض خطابت
بسیفی اذا احد الوغیٰ لخطیب	انجام نہ دے سکا تو خیر اس وقت جب کہ جنگ
	چھڑے گی تو میں اپنی تلوار سے اس فرض کو پورا
کتاب الصناعتین صفحہ ۱۵	کروں گا۔

لیکن یہی خاموشی اور گلوگرفتگی اگر خوف اور دہشت کی وجہ سے نہ ہو بلکہ جذبات سے متاثر ہوکر خطیبانہ پیرائے میں ظاہر ہو تو مجمع پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے۔

سکندر اعظم کا جب انتقال ہوا اور جنازہ مجمع کے سامنے لایا گیا تو ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا لوگ سیاہ لباس میں ملبوس گردن جھکائے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے دلوں پر خوف اور دہشت طاری تھی۔ اتنے میں ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے سر اٹھایا۔ گرد و پیش نظر ڈالی اور سانس بھی لی۔ ایسا معلوم ہوا کہ ان سیاہ پوش ماتمیوں کے نظارے نے اس کے دل پر کوئی خاص اثر کیا اور وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر مجمع کی طرف نیم باز آنکھوں سے دیکھا۔ ہونٹوں کو کسی قدر جنبش ہوئی اور آہ میں ملے جلے یونانی زبان کے کچھ الفاظ سنائی دیے جس کے مفہوم کو عرب کے مشہور شاعر ابوالعتاہیہ نے اپنے اس شعر میں نظم کیا ہے۔

وکانت فی حیاتک لی عظاتٌ
وانت الیوم اوعظ منک حیّا

تیری زندگی میں ہمارے لئے ایک نصیحت تھی، لیکن آج تو اپنی زندگی سے زیادہ ہمارے لئے باعث عبرت ہے۔

کتاب الصناعتین صفحہ ۱۲

اس متاثر از طرز ادا نے مجمع میں ایک عام بے چینی اور اضطراب کی لہر دوڑا دی۔ دیکھا تو حاضرین کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔

خطبے کے اجزا۔ خطبے کے عموماً تین جز ہوا کرتے ہیں۔ مقدمہ، اثبات مدعی، خاتمہ

مقدمہ | مقدمے میں خطیب کو دو چیزوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اول تو یہ کہ تقریر کی ابتدا ایسی خوبی سے ہو کر سامعین اس کے سننے کی طرف مائل ہو جائیں۔ اور ان کے دلوں پر اس کی ہمدردی کا سکہ بیٹھ جائے۔ وہ جو کچھ بیان کرے اسے غور سے سنیں۔ اور حرف بہ حرف صحیح سمجھیں۔ دوسرے یہ کہ ان کو تقریر کا مقصد اجمالی طور سے معلوم ہو جائے۔ عہد قدیم میں خطباء عرب کا دستور تھا کہ وہ اپنا خطبہ عموماً حمد و ثنا سے شروع کرتے تھے۔ پھر براعۃ استہلال کے طور پر ایسی باتیں بیان کرتے تھے جس سے مقصد کی طرف مجملاً اشارہ ہو جائے۔ اس کے بعد اپنے مقصد کا اظہار کرتے تھے

اہل عرب اکثر کجاووں پر بیٹھ کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ خود آں حضرت صلعم نے بھی بعض مواقع پر اونٹ

کی پیٹھ پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے۔ مگر علامہ جاحظ نے ایک روایت نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بعد میں اس کو ممنوع بھی قرار دے دیا تھا۔ وَھُوَ ھٰذَا

لاتجعلوا ظهور دوابکم مجالساً۔ جانوروں کی پشت کو جلسہ گاہ نہ بناؤ۔

البیان والتبیین صفحہ ۱۴۱

عصا یا اس قسم کی کوئی چیز لے کر خطبہ دینا جس پر ٹیک لگائی جا سکے مسنون ہے۔ ابن ماجہ میں ہے کہ آں حضرت صلعم جب مسجد میں خطبہ دیتے تھے تو دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا۔ اور میدانِ جنگ میں جب خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کمان پر ٹیک لگاتے تھے۔

دورۂ حاضرہ میں یہ چیزیں تقریباً مفقود ہو چکی ہیں۔ اب تقریریں مغربی تہذیب کے موافق زیادہ تر اس قسم کی رسمی چیزوں سے خالی ہوتی ہیں۔ اب خطیب و اسپیکر عموماً تکلفات سے بچ کر بہت ہی لطیف اور سادہ پیرائے میں تقریر کا آغاز کرتے ہیں۔ یہ چیز بالکل نئی نہیں ہے۔ عہدِ قدیم میں بھی کہیں کہیں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ نمونے کے طور پر حضرت جعفر طیار کی وہ تقریر جو انھوں نے محامدِ اسلام پر نجاشی بادشاہ حبشہ کے سامنے کی تھی درج ذیل ہے۔ علمائے ادب متفق اللفظ ہیں کہ محامدِ اسلام پر آج تک اس سے بہتر کوئی تقریر نہیں کی۔ وھو ھٰذا

ایھا الملك! کنا اهل جاهلیة	اے بادشاہ ہم جاہل اور گمراہ تھے۔
نعبد الاصنام۔ ونأكل الميتة	بتوں کو پوجتے تھے۔ مردار کھاتے تھے۔
ونأتي الفواحش، و	اور بدکاریاں کرتے تھے۔ رشتہ داری
نقطع الارحام ونسیٔ الجوار	کو توڑتے تھے۔ ہمسایوں کو ستاتے تھے۔
ویأکل القوی منا الضعیف	ہم میں کے قوی لوگ کمزوروں کو کھا جاتے تھے
حتی بعث الله الینا رسولاً	اسی اثنا میں خدا نے ہماری طرف ایک نبی
منا نعرف نسبهٗ وصدقه و	کو مبعوث فرمایا جس کی شرافتِ نسبی۔ راست بازی
امانتهٗ وعفافه	دیانتداری اور پاکبازی سے ہم بخوبی واقف تھے

فدعانا لتوحید اللّٰہ وانّ
لا نشرك بہٖ شیئاً ونخلع ماکنا
نعبد الاصنام وامر بصدق
الحدیث وصلۃ الرحم وحسن
الجوار ، والکف عن المحارم
والدماء ، ونہانا عن الفواحش
وقول الزور واکل مال الیتیم
وامرنا بالصلوۃ والزکوۃ والحج
فامنا بہ وصدقناہ

اس نے ہم کو خدا کی وحدانیت کی طرف بلایا
اور یہ سکھلایا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں
اور ان بتوں کی پرستش چھوڑ دیں جنکو ہم پہلے پوجا
کرتے تھے اور حکم دیا کہ سچ بولو۔ صلہ رحم کرو، اور
ہمسایوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آؤ۔ حرام کاریوں
اور خونریزیوں سے باز آؤ۔ برائیوں سے بچو اور
جھوٹی باتیں نہ کہو اور یتیم کا مال نہ کھاؤ۔ اور ہم
کو نماز پڑھنے اور زکوۃ دینے اور فریضہ حج ادا کرنے
کا حکم دیا اس پر ہم ایمان لائے اور ہم نے اس
کی تصدیق کی۔

(دروس التاریخ جلد اول ذکر ہجرت حبشہ)

اثبات مدعی خطیب کو تقریر شروع کرنے سے قبل جس چیز کی فکر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جو کچھ اسے بیان کرنا ہے اسے ثابت بھی کرے۔ اس لئے کہ کوئی دعوی بغیر دلیل کے ثابت نہیں ہوتا۔ اثبات مدعی میں اس کو قیاسات کی بھی ضرورت پڑتی ہے لیکن خطابت میں منطقی قیاسات سے کام نہیں لیا جاتا اس لئے کہ اس کی بنا اکثر یقینی مقدمات پر ہوا کرتی ہے۔ اور خطابی قیاسات عموماً مقبولات اور مظنونات ہوا کرتے ہیں۔ درحقیقت استدلال اور استشہاد عوام کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ کسی دعوے کو ثابت کرنے کے لئے سامعین نہ ثبوت کا مطالبہ کرتے ہیں اور نہ اس کے دلائل وشواہد کی تلاش کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے یقین کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ جس چیز کا انھیں یقین دلانا منظور ہو اس کی تصویر ان کی نظروں کے سامنے پھر جائے۔

کسی خیال کو عوام کے دل میں جمانے کا بہترین طریقہ اس کے متعلق وعظ کرنا نہیں بلکہ اس خیال ایک فوٹو مجمع کے سامنے پیش کرنا ہے۔ شعور جمعی کا جس سے نفس اجتماعی کا خمیر ہوتا ہے یہ خاصہ اساسی ہے

کہ محض افکار و خیالات اس کے لئے ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ وہ صرف اس بیان کو سمجھ سکتا ہے جس سے کسی واقعے کی تصویر اس کی نظروں کے سامنے پھر جائے اس کو مخاطب کرکے یہ کہنا بالکل بے سود ہے کہ مرنے کے بعد روح کو سرورِ ابدی حاصل ہوتا ہے۔ وہ اگر متاثر ہو سکتا ہے تو صرف اس طرح کہ مرنے کے بعد تمہیں بڑی چمکدار آنکھوں والی حوریں ملیں گی۔ کھانے کے لئے دودھ، شہد، انار، انگور اور ہر طرح کے تروتازہ میوے ملیں گے خدمت کے لئے ہر وقت خوب صورت غلام کمربستہ رہیں گے۔

مجمع کے سامنے اگر آلامِ دوزخ اور لذائذِ جنت محض ایک عام کلیہ کے طور پر بیان کرتے جاویں تو ان پر کچھ اچھا اثر نہ پڑے گا۔ لیکن انھیں چیزوں کی تفصیلات کی تصویر اگر اُن کے سامنے پیش کر دی جائے تو بچہ بوڑھا، مرد، عورت، خواندہ، ناخواندہ سب ہی بے اختیار ہو جاویں گے۔

خطبار جو لوگوں کی قیادت کرنا چاہتے ہیں وہ اس نکتے کو خوب سمجھتے ہیں اس لئے خطبہ و تقریر میں ہمیشہ وہ اپنا روئے سخن سامعین کے جذبات کی طرف رکھتے ہیں۔ اور دنیا جانتی ہے کہ وہ کتنے کامیاب رہتے ہیں۔

لیکن منطقی جو برزور دلائل منطقیہ سے کسی امر کے ثابت کرنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ مجمع کو مخاطب کرنا نہیں جانتے۔ وہ ہمیشہ خطابت کے مذکورہ بالا اصول کو نظر انداز کرکے اپنے دعووں کو منطقی دلائل سے ثابت کرنا چاہتے ہیں جن سے مجمع پر ذرہ برابر اثر نہیں پڑتا اور اسی بنا پر ان کو تعجب ہوتا ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے پرزور دلائل مجمع کو اثر پذیر کرنے میں بالکل قاصر ہیں۔ ممکن ہے اس طریقے سے عوام مرعوب ہو کر ان کی قابلیت کے قائل ہو جائیں لیکن اس سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اور نہ کبھی ان پر صدائے تحسین بلند کی جاتی ہے منطقی قیاسیات اور دلائل اگر کارآمد ہو سکتے ہیں تو صرف اہلِ علم کے لیے عوام کی حالت اس سے بالکل الگ ہوتی ہے۔ وہ بحث و مناظرے سے گھبراتے ہیں اور دلائل سننے کی طاقت نہیں رکھتے۔ وہ ایسی تقریروں کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو اینچ پینچ اور عقلی دلائل سے خالی ہوتی ہے ان پر جن چیزوں کا اثر ہوتا ہے وہ وہی چیزیں ہیں جن کا تعلق محض ان کے احساسات و جذبات سے ہے۔

دنیا نے آج تک جن چیزوں کے ماتحت رہ کر ترقیاں حاصل کی ہیں وہ وہی احساسات اور جذبات ہیں

جن کو ہمیشہ عظیم الشان انقلابات اور تغیرات میں دخل رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر انسانی تمدن کی بنا ان احساسات و جذبات پر نہ ہوتی تو شاید انسان کو یہ عظیم الشان ترقیاں بھی نصیب نہ ہوتیں۔

کیا یہ عقل میں آنے کی بات ہے کہ ایک یتیم بچہ عرب کی سنگ لاخ زمین میں پیدا ہوگا اور اپنے بے یار و مددگار ہونے کے باوجود دنیا کی تاریخ میں ایک زریں یادگار چھوڑ جائے گا۔ پھر یہ کس کو گمان تھا کہ عرب کے خانہ بدوش وحشی اپنے بے برگ و گیاہ صحراؤں سے ایک بارگی امڈ امڈ کر نکلیں گے اور یونانیوں اور رومیوں کی دریافت کردہ دنیائے قدیم کے ایک وسیع حصے میں ایسی زبردست حکومت قائم کریں گے جو ہیبت و شوکت میں سکندر اعظم کی حکومت سے بڑھ کر ہوگی۔

خاتمہ | خطیب کو چاہئے کہ تقریر کے آخری حصے کو زیادہ سے زیادہ دلچسپ بناوے۔ اور خطبے کے اہم اجزا کو نہایت ہی بدیع اسلوب میں سامعین کے سامنے پیش کرے تاکہ ان کی جادو بیانی اور سحر آفرینی کا اثر دیر تک قائم رہے جو ان کے گوشہائے قلب کو ایک عرصے تک متاثر کرتا رہے۔

(باقی آئندہ)

اسلامی جمہوریت اور اشتراکیت

(بہ سلسلہ ماسبق)

محمد صلعم نے اور باتوں میں بھی دوسرے مذہبی اور معاشرتی مصلحین سے جداگانہ روش اختیار کی انھوں نے اپنے پیروں کو غیر مسلموں میں شادی بیاہ کرنے کی کھلے ہوئے الفاظ میں اجازت دی جو انسانیت کی وحدت کی طرف ایک بڑا دلیرانہ قدم تھا۔ لوگوں کو متحد کرنے اور ایک مشترک خاندان کے افراد بنانے کا بھلا اس سے بڑھ کر اور کیا آسان ذریعہ ہو سکتا تھا۔ اسلام نے خانگی زندگی میں ماں اور بیوی کا نہایت ہی ممتاز درجہ رکھا ہے ماں کے متعلق قرآن مجید میں حکم ہوتا ہے کہ جب "وہ عالم ضعیفی میں پہنچیں تو اُف نہ کرو۔ اور نہ ان سے ڈانٹ کر بات کرو۔ ادب سے باتیں کرو۔ اور محبت سے خاکساری کا پہلو ان کے سامنے جھکائے رہو اور کہو " اے رب میرے مجھے انھوں نے جس طرح بچپنے میں رحم کے ساتھ پالا ہے۔ اسی طرح تو بھی ان پر رحم کر" (پارہ ۱۵ بنی اسرائیل ۱۷) پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے انسان کو وصیت کی ہے کہ وہ ماں باپ کے ساتھ سلوک کرے کیونکہ ماں نے اسے اپنے پیٹ میں ایسے حال میں رکھا کہ ضعف بالائے ضعف تھا اور پھر کہیں دو برس میں دودھ چھوٹا اور یہ بھی حکم دیا کہ وہ میرا اور اور اپنے ماں باپ کا شکر گذار رہے (پارہ ۲۱ لقمان ۲۱)

محمد صلعم نے جو اپنے پیرووں کو تلقین کی وہ اور بھی حوصلہ افزا تھی ایک صحابی آپ کے پاس آئے اور بولے "اے رسول اللہ! ہم نے ایک بہت بڑا جرم کیا ہے۔ کیا وہ توبہ سے معاف ہو سکتا ہے" آنحضرت بولے "تمھاری ماں زندہ ہے" صحابی نے جواب دیا "نہیں" پھر آنحضرت نے پوچھا "کیا تم چچی رکھتے ہو" صحابی نے کہا "ہاں" تو پیغمبر خدا نے کہا "جاؤ تم ان کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ۔ اللہ تمھارے گناہ کو معاف کر دے گا"

اسی طرح شادی کا واحد مقصد قرآن شریف نے سوشل مسرت اور انبساط قرار دیا ہے چنانچہ قرآن شریف میں حکم ہے کہ شادی حظ نفس کے لئے نہ کرو۔ "خدا نے تمھیں بیویاں عطا کی ہیں

تاکہ تم آپس میں محبت اور خلوص رکھو" پھر ارشاد ہوتا ہے کہ " اللہ نے تمھیں ایک ہی جنس کے جوڑے کے ساتھ پیدا کیا تاکہ تم امن کو قائم رکھو اور تمھارے درمیان محبت اور شفقت بھی جاری رہے (پارہ ۲۱ روم ۳۰)

قرآن کے ان احکامات اور رسول کے ان ارشادات کے مطابق ماں اور بیوی کی ایک خاص حیثیت سوسائٹی میں متعین ہوجاتی ہے ۔ ان احساسات کے ساتھ اگر مسلمان غیر مسلموں میں شادی کرکے انھیں وہی حقوق اور درجے دیں تو کیا یہ اسلام کی فیاضی اور برتری کا ثبوت نہیں ۔ اس بات کی اجازت کلام مجید ان معاشرتی تاثرات کے ساتھ دیتا ہے ۔

" آج تمھارے لئے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کردی گئیں اہل کتاب کا کھانا بھی تمھیں حلال ہے اور تمھارا کھانا ان کو حلال ہے ۔ اور حلال ہیں تم پر محصنات جو مومنہ ہوں یا ان میں سے ہوں جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی بشرطیکہ تم ان کا مہر ادا کرو ۔ اور ان کا نکاح میں لانا مقصود ہو ۔ کھلم کھلا بدکاری کرنا یا چوری چھپے آشنا بنانا مقصود نہ ہو (مائدہ ۵ پارہ ۶)

شادی خانگی اور معاشرتی زندگی کا ایک نہایت ہی نمایاں پہلو ہے ۔ چنانچہ محمد صلعم کی بھی کوشش رہی کہ شادی کی نوعیت اپنی سادہ اور فطرتی حالت میں قائم رہے ۔ چنانچہ نکاح اور بیاہ کے لئے مسلمان اصولاً اور مذہباً تمام تکلفات اور رسومات کی پابندیوں سے بالکل آزاد ہیں ۔ انھیں نکاح یا شادی کی مبارک رسم کو انجام دینے کے لئے اپنی پرستش گاہوں تک بھی جانے کے لئے مطلق ضرورت نہیں خواہ وہ کہیں ہوں ۔ شادی کو جائز قرار دینے کے لئے فریقین کی رضامندی چاہیئے اور دو گواہ ۔ اسلامی قانون ضرورت کے وقت زوجین کی علیحدگی میں بھی ہر قسم کی سہولتیں پہنچاتا ہے اور طلاق جیسے ناخوش گوار واقعے کے سد باب کی بھی ہر ممکن صورت سے کوشش کی گئی ہے ۔

اگر ایک شخص غیر جانب دارانہ نظر سے تمام تاریخوں کو پڑھے تو اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ محمد صلعم کے قبل کسی مصلح نے عورتوں کی بہتری کے لئے ایسی کوشش نہ کی جس طرح پیغمبر اسلام نے کی ۔ یہ صحرائے عرب کا ایک امی ہی تھا جس نے عورتوں میں روشن خیالی پیدا کی اور مردوں کے برابر انھیں مذہبی اور

معاشرتی حقوق ہی نہیں دیے بلکہ مردوں کو ان کو عزت کی نگاہوں سے دیکھنے کا حکم دیا۔

سورہ نسار کی پہلی آیت یہ ہے

"لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے ایک جان سے تمہیں پیدا کیا۔ اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔ اور پھر انھیں دونوں میں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔"

دوسری جگہ پھر ارشاد ہوتا ہے۔

ماں باپ اور اقارب کے ترکہ میں مردوں کا حصہ ہے اور ماں باپ اور اقارب کے ترکہ میں عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ کم ہو یا زیادہ۔ یہ حصے مقرر ہیں" (نسار ۴ پارہ ۴)

پھر ارشاد ہوتا ہے۔

"عورتیں تمھاری زینت ہیں اور تم (مرد) ان کی زینت ہو" (بقرہ ۲ پارہ ۲)

"حسب دستور جیسا عورتوں پر مردوں کا حق ہے ویسا ہی حق عورتوں کا مردوں پر ہے" (بقرہ ۲ پارہ ۲)

جس مومن نے اچھا کام کیا مرد ہو یا عورت ہم اسے اچھی زندگی دنیا میں دیں گے اور آخرت میں اسے اس کے بہترین اعمال کا ضرور بدلہ دیں گے (پارہ ۱۴ - نمل ۱۶)

حضرت عیسیٰ کا تجرد، اور گوتم بدھ کی رہبانیت عورتوں کے وجود کے خلاف کھلی ہوئی صدائے احتجاج ہے۔ لیکن محمد صلعم نے جوگیوں کی زندگی کو تحسین کی نظر سے کبھی نہ دیکھا اور رہبانیت کو قطعی طور سے مٹا دیا کیونکہ اس کے نتائج سوسائٹی کے لئے نہایت ہی مضرت رساں تھے۔ صحابہ میں بعض بزرگ میلان طبعی یا عیسائی راہبوں کے اثر سے رہبانیت پر آمادہ تھے اس سے حضرت صلعم نے اُن کو باز رکھا، کسی غزوہ میں ایک صحابی کا ایک غار پر گذر ہوا جس میں پانی تھا اور اس کے آس پاس بوٹیاں تھیں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو عرض کیا یا رسول اللہ مجھ کو ایک غار مل گیا جس میں ضرورت کی سب چیزیں ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گزیں ہو کر ترک دنیا کر لوں۔ آپ نے فرمایا " میں یہودیت اور نصرانیت لے کر دنیا میں نہیں آیا۔ میں آسان اور سہل ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں "

لیکن اس کے ساتھ ناز و نعمت، تکلف عیش پرستی کو ناپسند فرماتے اور اوروں کو بھی اس سے روکتے، فرمایا کرتے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لئے، ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے کافی ہے، چوتھا شیطان کا حصہ ہے، چنانچہ ۹ھ میں جب کہ یمن سے شام تک صرف اسلام کی سلطنت تھی تو فرماں روائے اسلام کے گھر میں ایک کھری چارپائی اور چمڑے کا سوکھا ہوا مشکیزہ تھا حضرت عائشہ بیان کرتی ہیں کہ جب آپ نے وفات فرمائی تو تھوڑے سے جَو کے سوا گھر میں کچھ کھانے کو نہ تھا، صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ دنیا میں انسان کے لئے اتنا کافی ہے جتنا کہ ایک مسافر کے زادِ راہ کے لئے جس طرح آپ خود سادگی سے رہتے تھے، اسی طرح آپ یہ بھی چاہتے تھے کہ آپ کے اہل و عیال بھی سادہ زندگی بسر کریں۔ اور تکلف و تنعم سے پاک رہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ حضرت فاطمہ کے گلے میں ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو یہ ناگوار نہ ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی لڑکی کے گلے میں آگ کا ہار ہے مہر کرنے کی ضرورت سے جب آپ نے انگوٹھی بنوائی تو پہلے سونے کی بنوائی۔ آپ کی تقلید سے صحابہ نے بھی زرین انگوٹھیاں بنوائیں۔ آپ منبر پر چڑھے اور انگوٹھیاں اتار کر پھینک دیں۔

کیا یہ ساری باتیں امارت پسندی کے خلاف تلقین نہیں؟ اسی طرح وراثت کے مستحکم اور مناسب قوانین سے محمد صلعم نے تعلقہ داروں اور کروڑپتیوں کے خاندانی سلسلے کو ناممکن کر دیا۔ اگر رسول صلعم نے جو کچھ خود کیا اسے افضل سمجھ کر مسلمان تقلید کرنے کی کوشش کریں تو پھر وراثت کا سوال مسلمانوں کے خاندان میں قطعی طور پر پیدا نہیں ہوتا۔ محمد صلعم نے کہا کہ ہم (انبیا) سے وراثت نہیں ملتی۔ اور جو کچھ ہم چھوڑ جاتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ لیکن پھر بھی ایک مسلمان کے انتقال کے بعد اس کی جائداد ٹکڑے ٹکڑے تقسیم کر دی جاتی ہے۔ اسلام میں سب سے بڑے بیٹے کی وراثت کا قانون قطعی طور پر نہیں رکھا گیا۔ جائداد صرف ایک فرد مرد یا عورت کو نہیں ملتی۔ بلکہ متوفی کے بیشتر رشتہ داروں کو۔ بیوی کو معقول حصہ ملتا ہے اور پھر قرآن شریف میں ہے کہ تقسیم ترکہ کے وقت قرابت والے، یتیم و مساکین جمع ہو جائیں تو اس میں سے ان کو بھی دو (نساء ۱۔ پارہ ۴)

کوئی آدمی ایک تہائی حصے سے زیادہ نہ تو کسی رشتہ دار کو اور نہ کسی غیر کو وصیت کر

ذریعے دے سکتا ہے ۔ لیکن اسے اپنی تمام جائداد کو رفاہ عام اور مفید کاموں میں خرچ کرنے کی مکمل آزادی ہی نہیں بلکہ اوقاف کے ذریعے اس بات کی ترغیب دی گئی ہے ۔ اسلام طریقۂ وقف کا موجد ہے اور اس مسئلہ کو اسلام نے جس حد تک صاف کیا ہے اس کا دوسرے مذاہب کے قوانین میں شائبہ تک موجود نہیں ۔ اس سے ہمارے مقنن اعظم کا مطلب یہ تھا کہ دولت اور جائداد تمام ملک میں جہاں تک ممکن ہو مساویانہ طور پر تقسیم ہوتی رہے اور اس طرح سوسائٹی کے تمام افراد میں مساوات پیدا ہو اور ہر شخص کو مساویانہ مواقع حاصل ہوں ۔

اسی غرض کو پیش نظر رکھ کر اسلام نے دولت مند لوگوں پر فرض کیا کہ وہ اپنی آمدنی میں سے ایک خاص حصہ بیت المال میں داخل کریں یا حاجت مندوں کو دیں ۔ قرآن شریف میں اکثر جگہ یہ حکم ہوا ہے انسان کے پاس ضروری مصارف سے جو کچھ بچے سب کو خیرات کر دینا چاہیئے ۔ ورنہ عذاب ہوگا یَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (یعنی لوگ تجھ سے پوچھتے کہ کیا خیرات دیں کہدو کہ جو کچھ مصارف ضروری سے بچ رہے) بہت سے لوگ خیرات کرتے تھے لیکن عمدہ مال کو محفوظ رکھتے تھے ۔ بے کار یا ردی چیزیں خیرات میں دیتے تھے اس پر حکم ہوا ۔

"مسلمانو! اپنی کمائی میں سے ، اور اس چیز میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کی ہے اچھا حصہ خیرات دو" مزید تاکید کے لئے یہ حکم ہوا کہ جو شخص اپنی محبوب چیز نہ دے گا اس کو ثواب نہ ملے گا تم لوگ ثواب نہیں پا سکتے جب تک وہ چیز خیرات نہ کرو جو تم کو عزیز ہے "

مسلمانوں پر زکوٰۃ تین مقاصد کے ماتحت لازم کی گئی ہے جو خاص اشتراکی پہلوؤں پر مشتمل ہیں ۔ اول یہ کہ مسلمانوں میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہو تاکہ اجتماعی بہبودیوں کو انفرادی بھلائیوں پر ترجیح دیں ۔ فاقہ کرو لیکن دوسروں کو فاقہ نہ کرنے دو ۔ گویا یہی اصول پیش نظر تھا ۔ دوم یہ کہ دولت کی تقسیم مساوی طور پر مسلمانوں میں ہو ۔ زکوٰۃ کو رکن اسلام قرار دے کر محمد صلعم نے سوسائٹی کے تمام افراد کی مالی حالت کو یکساں کرنے کی کوشش کی اور دولت و امارت وراثت میں داخل نہ ہونے دی محتاجوں کی مالی مدد کرنا ایک مذہبی فرض قرار دیا ۔ چنانچہ غریبوں کی نگاہ داشت کرنا ۔ ان کو ہر قسم کی

مدد پہنچانا امیروں کے فرائض منصبی تھے اور ان کی ذمہ داریوں سے حکومت ایک بڑی حد تک سبکدوش تھی۔ سوم یہ کہ غربت جرم کی بجائے صفت سمجھی جائے۔ چنانچہ تمام بزرگان اسلام غریب رہنا اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ رسول صلعم خود کہا کرتے تھے کہ الفقر فخری یعنی فقیری پر میں ناز کرتا ہوں۔ اور ایک بار اللہ سے دعا کی کہ خدایا تو مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ، مسکینی کی حالت میں موت دے اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر کر۔ آخرالذکر مقصد قدیم عرب سوسائٹی کو سوشلزم کی طرف لے جانے کے لئے بے حد ضروری تھا۔ کیوں کہ عربوں کو اپنی پیدائشی برتری اور خاندانی بہتری پر بدترین قسم کا نخوت اور غرور تھا جس کی ذرا سی تضحیک پر قرنوں خون کی ندیاں بہتی تھیں۔

اسلامی سوشلزم نے یہاں تک اجازت دی ہے کہ جب کوئی شخص کچھ دنوں تک اپنے کھیت کو چھوڑ دے۔ تو اس کے پڑوسی کو حق حاصل ہے کہ عوام کی ملکیت سمجھ کر اس کھیت میں کاشت کرے زمیندار جو کھیتوں پر ٹیکس اور لگان لگاتے ہیں اسے بھی اسلام تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھتا، آنحضرت نے فرمایا کہ جس کے پاس زمین ہو وہ اس میں خود کھیتی کرے یا اپنے بھائی مسلمان کو مفت دیدے۔ ورنہ زمین خالی پڑی رہنے دے۔ (کتاب الزرعہ)

اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ تمام بنی آدم آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ضرورت کے وقت ایک دوسرے کی مدد کرنا فرض ہے اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن میں آیت ہے "مسلمانو! دگنا، چوگنا سود نہ کھایا کرو اور خدا سے ڈرو تاکہ فلاح پاؤ (آل عمران)۔ رسول صلعم نے ہم جنس اشیا کا باہم گھٹ بڑھ کے مبادلہ بھی منع فرمایا۔ غزوہ خیبر کے موقع پر آپ نے اعلان فرمایا کہ سونے کو اشرفی کے بھاؤ گھٹا بڑھا کر بیچنا بھی سود ہے۔ یہ تمام ہدایتیں تجارت، صنعت، مزدوری، کفایت شعاری کی ذہنیت پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مال جمع کرنے کی صریحاً تذلیل ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام میں قارون کا وجود ناممکن ہو جاتا ہے۔ جن کی وجہ سے سوسائٹی میں حزن و ملال رہا کیا ہے۔

اسلام نے اپنے پیروں کو نہایت سختی سے جوا بازیوں سے منع کیا ہے اس ممانعت کی اندرونی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کوئی شخص اپنے دوسرے بھائیوں کی بدقسمتی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بے جا دولت

نہ جمع کرے۔ آنحضرت نے اجارے (Monopoly) اور احتکار (Corner Market) کو حرام قرار دیا۔ آپ نے فرمایا: "ملعون ہیں وہ لوگ جو شہروں میں غلہ لاکر لوگوں کے مقابلے میں سستے داموں بیچتے ہیں۔ اور کثیر نفع اٹھاتے ہیں اور وہ لوگ جو غلہ کو روکے رہتے ہیں تاکہ گراں قیمت پر بیچیں۔"

مختصر یہ کہ اسلام کے ہر قانون میں رہبر اعظم کا بنیادی اصول "مخلوق کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچانا" اور "اجتماعی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح" تھا۔ اور حقیقت میں یہ معجزہ تھا کہ ان حضرت نے ہر فرد میں وہی اعلیٰ مقصد پیدا کر دیا۔ انھوں نے عملی طور پر دکھلا دیا کہ نہ صرف انتہائی جمہوریت بلکہ انتہائی اشتراکیت کے ذریعے بھی حکومت کی جا سکتی ہے۔ اور یہ حکومت کے لئے مہلک نہیں بلکہ باعثِ فلاح و بہبودی ہو سکتا ہے۔ آج کل کی دنیا میں اشتراکیت مہلک اور ناقابلِ عمل سمجھی جاتی ہے اور انتہائی جمہوریت سے ملکوں کی حکومت چلانا ناممکن قرار دیا جاتا ہے لیکن محمد صلعم کی انتہائی جمہوریت اور انتہائی اشتراکیت دونوں نے کامیابی حاصل کی اور خوب کی۔

آنحضرت اوائل زندگی ہی سے ہر کام کو رائے عامہ کے ذریعے کرنا چاہتے۔ اور نمائندگی کے اصول کو فروغ دینے کے لئے برابر کامیابی کے ساتھ کوشاں رہے۔ اسلام کے قبل عربوں کے ایام جاہلیت میں ایک بار اسی اصول کو پیش کر کے ایک زبردست خوں ریزی سے انھیں بچایا۔ عرب کے مختلف قبائل آپس میں جھگڑ رہے تھے کہ سنگ اسود کو کوئی جگہ کون لے جائے۔ بالآخر انھوں نے محمد صلعم سے جو اُن میں الامین کے لقب سے مشہور تھے فیصلے کی درخواست کی۔ محمد صلعم نے ہر قبیلے والوں کو اپنا نمائندہ منتخب کرنے کو کہا اور جب وہ منتخب کر چکے تو ایک چادر بچھا کر اس پر پتھر رکھ دیا۔ اور سبھوں کو ایک ایک گوشہ پکڑ کر اپنی جگہ لے جانے کو کہا۔ اس فیصلے سے ہر شخص پھڑک اٹھا۔ اور آخر میں تمام لوگوں نے محمد صلعم ہی سے درخواست کی کہ وہ خود اس کے نمائندے بن کر پتھر کو اپنی جگہ پر نصب کرائیں۔

اس واقعہ میں جزیرہ نماعرب کی مستقبل حکومت کے اصولوں کی بنیاد رکھی گئی بعد وہی اصول تھے جن کو آج بیسویں صدی کے زبردست سیاست داں اور سیاسی فلسفی حکومت کے لئے زرین اصول سمجھتے ہیں۔

اس عقدِ اعظم کی جو تعریف روسو نے کی ہے وہ بہت ہی قابلِ التفات ہے کیونکہ حقوقِ انسانی اور معاشرتی معاہدے (Social Contract) کا علم بردار روسو سے بہتر انیسویں صدی پیدا نہیں کر سکی ہے۔ روسو کہتا ہے :۔

عقدِ خدا کی طرف اس اعلیٰ تفکر و تدبر کو منسوب کرتا ہے جو عوام کی فہم کی رسائی سے بالا ہوتا ہے تاکہ وہ خدا کے نام کی عظمت سے ان لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے جنھیں انسانی عقل و فہم متاثر نہیں کر سکتی۔ لیکن خدا کو اپنے پیغاموں کا منبع بنانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں اور نہ ہر شخص کے پیغمبری کے دعویٰ کو لوگ تسلیم کر سکتے ہیں۔ عقدِ اعظم کی عظیم روح وہ حقیقی معجزہ ہے جو اس کے مشن کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ یہ تو ہر شخص کے لئے ممکن ہے کہ پتھر پر عبارت کندہ کرا دے یا کاہنوں کو رشوت دے کر غیب کی آوازیں سنا دے یا خدا سے پوشیدہ راز و نیاز کا بہانہ کرے یا کسی چڑیا کو اپنے کان میں بات سنانے کے لئے سدھالے یا کوئی اور عجیب و غریب طریقہ لوگوں پر حاوی ہونے کے لئے نکال لے۔ ایسا شخص بے وقوفوں کے ایک گروہ کو ان ذرائع سے ممکن ہے جمع کرلے لیکن وہ ایک سلطنت کی بنیاد کبھی نہیں رکھ سکتا۔ اور اس کا عبث کارنامہ بہت جلد اس کے ساتھ فنا ہو جائے گا۔ خالی ڈھونگ ایک عارضی رشتہ قائم کرتے ہیں لیکن فہم و تدبر اس کو غیر فانی بنا دیتے ہیں۔ یہودیوں کا قانون جو ابھی تک باقی ہے اور بنی اسرائیل کا قانون جس نے صدیوں دنیا پر حکومت کی۔ ان عظیم الشان ہستیوں کا گواہ ہے جو اس کی مصنف تھیں۔ آپ ان کو خوش نصیب دھوکے بازوں سے زیادہ نہ سمجھیں لیکن ان بلند مرتبہ والے انسانوں کی تعریفیں کرتے ہیں جنھوں نے ایسے پائدار ادارے قائم کئے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ پر یہی جمہوریت کا علم بردار کہتا ہے :۔

مشرکین کو جس بات کا خوف تھا وہی ہوا۔ پھر ہر چیز نے صورت بدل دی۔ منکسر المزاج عیسائیوں نے اپنا لب و لہجہ بدل دیا۔ بہت جلد دوسری دنیا کی اس مفروضہ سلطنت نے ایک زندہ سردار کی قیادت میں ایک بڑے تشدد پسند مطلق العنان حکومت کی شکل اختیار کر لی۔

مگر چونکہ ہمیشہ دنیاوی بادشاہ اور ان کے دیوانی قوانین کا وجود رہا ہے۔ اس لئے دوعملی حکومت سے حدود اختیار کی بابت ایک مستقل جنگ کا آغاز ہوا اور اس کی وجہ سے عیسائی حکومتوں میں کسی ایسے سیاسی نظام

کا قیام ناممکن ہوگیا۔ اور کوئی شخص بھی اس بات کے سمجھنے میں کامیاب نہ ہوسکا کہ اُسے دنیاوی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیئے یا پادریوں کی۔

"محمدؐ کے خیالات نہایت ہی معقول تھے۔ انھوں نے سیاسی نظام مکمل طریقے پر متحد کردیا۔ اور جب تک ان کا طریقۂ حکومت ان کے جانشینوں یعنی خلفاء کے زمانے تک رائج رہا یہ بالکل غیر تقسیم شدہ تھا اور اس اعتبار سے مستحسن تھا لیکن جب عرب خوش حال، عالم، مہذب، کاہل اور نسائیت پسند ہوگئے اور وحشیوں کی اطاعت اختیار کرنے لگے تو دونوں اختیارات میں تفریق نمایاں ہوگئی۔"

مسلمانوں کی ایک خاص خصوصیت " امرھم شوری بینھم " کی تعلیم پر عمل درآمد کرنا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان ایک کام آپس میں کافی مشورہ کرکے شروع کرتے ہیں۔ ابتدائے اسلام میں اس پر بڑی سختی سے عمل ہوا۔ چنانچہ محمد صلعم نے حاکم اور محکوم کے تمام امتیازات کو دور کردیا تھا۔ محکوم اور ادنیٰ قسم کے لوگ نہایت آزادی سے حاکموں کو مشورہ دیتے اور ان کو تنبیہہ کرتے جس کو وہ نہایت کشادہ جبیں ہوکر قبول کرتے۔ روایت کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ آنحضرتؐ نے ایک شخص سے کچھ کھجوریں قرض کے طور پر لیں۔ چند روز کے بعد وہ تقاضے کو آیا۔ آپ نے ایک انصاری کو حکم دیا کہ اس کا قرضہ ادا کردیں۔ انصاری نے کھجوریں دیں۔ لیکن ویسی عمدہ نہ تھیں جیسی اس نے دی تھیں۔ اس شخص نے لینے سے انکار کردیا۔ انصاری نے کہا تم رسول اللہ کی عطاکردہ کھجوریں کے لینے سے انکار کرتے ہو۔ بولا ہاں، رسول اللہ عدل نہ کریں گے تو اور کس سے توقع رکھی جائے۔ آنحضرت صلعم نے یہ جملے سنے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور فرمایا کہ یہ بالکل سچ ہے

اسی طرح واقدی کی ایک روایت ہے کہ عمرؓ جب سعید بن عامر کو ایک فوج کا سپہ سالار بنا کر بھیج رہے تھے تو انھیں نصیحت کی کہ اپنے اخلاق کو درست رکھنا اور اپنی ذات کو مسلمانوں کی بہبودی کے لئے وقف کردینا۔ سعید نے عمرؓ کی نصیحتوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا "عمر جس طرح تم نے مجھے نصیحتیں دی ہیں اسی طرح میری باتیں بھی گوشگزار کرلو، خدا کا خوف ہمیشہ دل میں رکھنا اور انسان کی خاطر خدا کو نہ بھول جانا۔ تمام مسلمانوں کو اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی طرح عزیز رکھنا۔ خواہ وہ تم سے دور ہوں یا نزدیک تم اُن کا برابر خیال رکھنا، اور وہی باتیں کرنا جو اچھی ہیں۔ اور بری باتوں سے پرہیز کرنا۔ مورخین کا بیان

ہے کہ جب تک سعید بولتے رہے عمر نیچی نگاہیں کئے ہوئے اپنے عصا پر ٹیک لگائے خاموش کھڑے رہے۔ جب سعید کہہ چکے تو عمر نے سر اٹھایا اور ان کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے بولے سعید دعا کرو کہ ان باتوں پر عمل کرنے کے لئے اللہ کی مدد شامل حال رہے۔"

ایک دفعہ حضرت عمر نے منبر پر چڑھ کر کہا۔ صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم لوگ کیا کروگے ایک شخص وہیں کھڑا ہو گیا اور تلوار میان سے کھینچ کر بولا کہ تمہارا سر اڑا دیں گے۔ حضرت عمر نے آزمانے کو ڈانٹ کر کہا کہ تو میری شان میں یہ لفظ کہتا ہے اس نے کہا ہاں تمہاری شان میں حضرت عمر نے کہا الحمد للہ قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ کج ہوں گا تو مجھ کو سیدھا کر دیں گے۔"

حضرت عمر نے لوگوں کو حکام پر نکتہ چینی کرنے کی ایسی عام آزادی دی تھی کہ معمولی سے معمولی آدمی کو بھی خود خلیفۂ وقت پر اعتراض کرنے میں باک نہیں ہوتی تھی ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمر کو مخاطب کرکے کہا اتق اللہ یا عمر یعنی اے عمر اللہ سے ڈر۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کو روکنا چاہا لیکن حضرت عمر نے فرمایا نہیں کہنے دو، اگر یہ لوگ نہ کہیں تو یہ بے مصرف ہیں اور ہم نہ مانیں تو ہم۔"

یہ عام آزادی صرف مردوں تک محدود نہ تھی۔ بلکہ عورتیں بھی مردوں کے قدم بہ قدم تھیں۔ ایک دفعہ حضرت عمر مہر کے متعلق تقریر فرما رہے تھے۔ ایک عورت نے اثنائے تقریر میں ٹوک دیا۔ اور قرآن کا حوالہ دے کر کہا "اتق اللہ یا عمر" حضرت عمر نے اعتراف کے طور پر کہا "ایک عورت بھی عمر کے زیادہ جانتی ہے" حقیقت یہ ہے کہ آزادی اور مساوات کی یہی عام ہوا تھی جس نے حضرت عمر کی خلافت کو اس درجہ کامیاب کیا۔ اور مسلمانوں کو جوش استقلال اور عزم و ثبات بخشا۔ محمد صلعم نے عرب کی تمام فضا میں آزادی مساوات، جمہوریت اور اشتراکیت ایسی پھیلا دی تھی کہ ہر فرد ان کی سوسائٹی کا ایک سرگرم رکن نظر آتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق جن کے بارے میں اسی مذکورۂ بالا مورخ کا خیال ہے کہ سیرت کی پختگی کے لحاظ سے وہ بے نظیر ہیں۔ اور ان کی محمدؐ سے دوستی اور ان کے مشن پر راسخ العقیدگی محمدؐ کی سچائی کی دلیل ہے۔ جب خلافت کے عہدے پر ممتاز ہوئے تو یہ تقریر کی۔ صاحبو! میں تم پر حاکم مقرر کیا گیا ہوں حالانکہ میں تم لوگوں میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں تو تم میری اعانت کرو اور اگر

برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دو۔ صدق امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ میری نظر دل میں کمزور اور طاقتور دونوں برابر ہیں۔ اگر میں خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر اطاعت نہیں

یہ بے موقع نہ ہوگا۔ اگر یہاں پر ہم حضرت ابوبکر کے ان زرین نصائح کا ذکر کریں جو انھوں نے اپنے فوج کے سپہ سالار کو دی تھیں اور جن سے ان کی حکومت کی اسپرٹ کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ یزید ابن سفیان کو مخاطب کر کے بولے "اپنے لوگوں پر کسی قسم کا ظلم نہ کرنا بلکہ اپنے تمام کاموں میں ان سے نصیحت لینا۔ وہی کام کرنا جو درست اور مناسب ہوں۔ غیر مناسب کام کرنے والوں کو فلاح و بہبودی نہیں ہوتی۔ جب تم اپنے دشمنوں کے مدمقابل ہو تو بہادری سے لڑو اور اپنی پشت نہ دکھاؤ لیکن اگر تمھیں فتح حاصل ہو تو کسی عورت بچے بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ پھل دار درخت کو نہ کاٹنا کسی آباد جگہ کو ویران نہ کرنا۔ بکری اور اونٹ کھانے کے سوا بیکار ذبح نہ کرنا نخلستان نہ جلانا، مال غنیمت میں غبن نہ کرنا۔ اور جب مفتوحین سے کسی قسم کا معاہدہ کرو تو ان کو پورا کرنا اور اپنے وعدے کو ایفا کرنا۔ تم ایک ایسی قوم کو پاؤ گے جنھوں نے اپنے آپ کو خدا کی عبادت کے لئے وقف کر دیا۔ ان کو چھوڑ دینا۔ اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان نہ پہنچانا"

جب حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو عوام کے سامنے خلافت کے لئے پیش کیا اور وہ منتخب ہوئے تو بستر مرگ پر دعائیں دیں۔ خدایا میں نے تیرے بندوں میں سے اس کو منتخب کیا ہے جو ان میں سب سے اچھا ہے۔ خدا تو اپنے بندوں کو متفق کر دے، اور ان کو خوش حال کر دے۔ اور عمر کو ایک اچھا حاکم بنا۔

حضرت عمر جزیرہ نما عرب کے بادشاہ ہونے کے باوجود بے خانماں لوگوں کے ساتھ مسجد کے زینے کے نیچے سویا کرتے۔ اور جب فلسطین میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے تو ایک اونٹ پر باری باری کبھی خود سوار ہوتے اور کبھی اپنے غلام کو سوار کرتے۔ ایک نہایت ہی متعصب مورخ کا بیان ہے کہ عمر صحیح معنوں میں امیر المومنین تھے اور گو اُن کی سلطنت ایک طرف خراسان سے لے کر بحر عرب تک اور دوسری طرف بحر قزوین سے لے کر نیل تک پھیلی ہوئی تھی لیکن ان میں کوئی شاہی دبدبہ نہ تھا۔ وہ غریبوں کے حامی اور فقیروں کے دوست تھے۔ اور اپنی مٹی کے جھونپڑے میں ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ کھانا تناول کرنے میں انھیں کوئی عار نہ ہوتا۔ حضرت عمر کے بارے میں مسٹر جے پول کا خیال ہے

کہ ایسی سچی شخصیت والے آدمی پر ہر قوم اور ملت بجا طور پر فخر کرسکتی ہے۔ ان کی اشتراکی اور جمہوری فطرت مندرجہ ذیل چند واقعات سے معلوم ہوگی۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کی زوجہ نے قیصر روم کی حرم کے پاس تحفہ کے طور پر عطر کی چند شیشیاں بھیجیں۔ اس نے اس کے جواب میں شیشیوں کو قیمتی جواہرات سے بھر کر بھیجا۔ حضرت عمرؓ کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو ام کلثوم سے بولے "اس میں شک نہیں عطر تمہارا تھا لیکن قاصد جو لے کر گیا وہ سرکاری تھا اور اس کے مصارف عام آمدنی سے ادا کئے گئے تھے۔ یہ جواہرات تمہارے نہیں ہوسکتے"۔ چنانچہ جواہرات لے کر بیت المال میں جمع کردیے گئے۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ بیمار پڑے۔ لوگوں نے علاج میں شہد تجویز کیا۔ بیت المال میں شہد موجود تھا۔ بلا اجازت نہیں لے سکتے تھے۔ مسجد نبوی میں لوگوں سے جاکر کہا "اگر تم لوگ اجازت دو تو بیت المال سے تھوڑا شہد لے لوں"۔ کتنا سبق آموز واقعہ ہے۔ خزانہ عامرہ پر خلیفۂ وقت کا اتنا اختیار بھی نہ تھا کہ وہ معمولی چیز بھی ذاتی خرچ کے لئے لے سکتے۔

حضرت عمرؓ رات کو برابر گشت لگایا کرتے تاکہ رعایا کے حال سے اچھی طرح واقف کار رہیں۔ ایک دفعہ گشت لگا رہے تھے کہ ایک ضعیف العمر دودھ والی عورت کو اپنی لڑکی سے دودھ میں پانی ملانے کو کہتے ہوئے سنا لیکن لڑکی جو عمرؓ کے دور کی سچائی اور ایمان داری کی فضا میں پرورش پائے ہوئے تھی اس کام کرنے سے انکار کررہی تھی۔ ماں بولی "اس وقت تو نہ امیر المومنین موجود ہیں نہ ان کا کوئی آدمی۔ پھر تو کیوں ڈر رہی ہے"۔ ایمان والی لڑکی نے جواب دیا "میں امیر المومنین کی غیر موجودگی میں ان سے اتنا ہی ڈرتی ہوں جتنا کہ ان کی موجودگی میں۔ اور ان کی غیر موجودگی میں ہرگز ایسا کام نہ کروں گی جو ان کی موجودگی میں ان کے خوف سے نہیں کرسکتی ہوں"۔ عمرؓ اس بات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اس لڑکی سے اپنے لڑکے کی شادی کا پیغام دیا۔ اور باوجود فریقین کے فرقہ کے شادی ہوکر رہی اور ان دونوں کی اولاد سے حضرت عمر عبدالعزیز پیدا ہوئے۔ جو جب خلافت پر مسند نشیں ہوئے تو اپنی ساری دولت بیت المال کے حوالہ کردی اور اپنے اپنے اہل وعیال خرچ کے لئے صرف دو درہم روز لیا کرتے تھے۔

اسی طرح ایک بار حضرت عمر رات کو گشت کے لئے نکلے تو دیکھا کہ ایک غریب عورت کچھ پکا رہی ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں پاس جاکر حقیقت حال دریافت کی۔ اس نے کہا کئی وقتوں سے بچوں کو کھانا نہیں ملا ہے اُن کے بہلانے کے لئے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دیا ہے۔ حضرت عمر اسی وقت اٹھے اور بیت المال سے آٹا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور خود پیٹھ پر لاد کر لے چلے اور عورت کے آگے لاکر رکھ دیں اس نے آٹا گوندھا، ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمر خود چولھا پھونکتے جاتے تھے کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمر دیکھتے اور خوش ہوتے۔ عورت نے کہا خدا تم کو جزائے خیر دے۔ سچ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہو نہ کہ عمر۔

ایک دن حضرت عمر بیت المال کے ایک گم شدہ اونٹ کی تلاش خود ریگستان میں کر رہے تھے۔ لوگوں نے کہا کہ امیر المومنین یہ کام آپ کے رتبے سے فروتر ہے۔ خلیفۂ وقت بولے "میں بیت المال کا ذمہ دار ہوں اور اس کا حساب مجھ کو روز آخرت میں دینا ہوگا۔ میں دوسروں پر اس کی تلاش کیسے چھوڑ سکتا ہوں"۔

عمرؓ کی اشتراکی فطرت نے یہ اصول قائم کر رکھا تھا کہ تمام عمال ہر سال حج کے زمانے میں حاضر ہوں حج کی تقریب سے تمام اطراف کے لوگ موجود ہوتے تھے۔ حضرت عمر کھڑے ہو کر باعلان کہتے تھے کہ جس کسی کو عامل سے کچھ شکایت ہو پیش کرے چنانچہ ذرا ذرا سی شکایتیں پیش ہوتی تھیں اور تحقیقات ہو کر ان کا تدارک کیا جاتا تھا۔ عمال کی بے جا حرکتوں پر کھلم کھلا ملامتیں کی جاتی تھیں اور ظالم یا ناقابلِ قبول حاکم بہتر حاکم سے بدل دیا جاتا تھا۔

حضرت عثمان باوجود اپنی تمام کمزوریوں کے انفرادیت کو اپنی راہ میں حائل نہ ہوتے دیتے وہ ذاتی خرچ سے کنوئیں بنواتے اور خریدتے مگر عوام کی خاطر وقف کر دیتے۔ جتنے غلام انھوں نے آزاد کئے کسی اور نے نہیں کئے جب دشمنوں نے انھیں محصور کر لیا تھا تو چند وفادار غلام ان کے پاس دوڑے ہوئے آئے اور دشمنوں سے لڑنے کی اجازت چاہی۔ لیکن حضرت عثمان نے انھیں یہ کہہ کر روکا کہ میں اپنی ذات کو خوں ریزی کا باعث نہ ہونے دوں گا۔ اور اسی وقت تمام غلاموں کو اس خیال سے آزاد

کردیا کہ شاید وفاداری اور فرض کے جوش میں آکر اُن کے حکم کے خلاف محاصرہ کرنے والوں سے جنگ نہ شروع کر دیں۔ عثمانؓ دس روز تک برابر فاقہ کرتے رہے اور بالآخر شہید ہوئے۔ مگر اُن کی شہادت میں سوشلزم کی فتح اور انفرادیت کی شکست آج تک نمایاں ہے۔

مصنف روضۃ الصفا نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مقتدر مسلمان سوشلسٹ عوام کے مال وزر کی امانت میں کس قدر محتاط تھے اور ذاتی یا اپنے محبوب ترین عزیز و اقارب کے اغراض کو کس طرح پس پشت ڈال کر خزانہ عامرہ کی حفاظت کیا کرتے تھے۔ جب حضرت علی خلیفہ وقت تھے تو ان کے بھائی عقیل نے اپنی غربت اور افلاس کی شکایت ان سے کی اور درخواست کی کہ ان کے وظیفے میں کچھ اضافہ کر دیا جائے۔ علی امانت میں خیانت نہ کر سکتے تھے چنانچہ اضافہ کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تمھیں اتنے مل چکے ہیں جتنے کے تم مستحق تھے اب میں تمھارے لئے خیانت کر کے گنہگار نہیں ہو سکتا۔ عقیل نے اصرار کیا۔ آخر علی نے سوچ کر ان کی مدد کی ایک ترکیب نکالی اور بولے " اچھا آج کی رات ہم تم مل کر اپنے فلاں متمول ہمسایہ کے گھر نقب زنی کریں گے۔ اس کے مال سے تمھاری حاجت پوری ہو جائے گی" عقیل سن کر حیران ہو گئے اور پوچھا کہ واقعی یہ گناہ وہ اپنے سر لیں گے۔ حضرت علی نے جواب دیا " ہاں آخرت کے روز ایک فرد کے الزام سے بریت حاصل کرنا زیادہ آسان ہوگا مگر بیت المال سے تمھیں کچھ دے کر ساری قوم کے متحدہ الزامات سے بری ہونا مشکل ہوگا" عقیل ناراض ہو کر واپس چلے گئے اور علی کے خلاف معاویہ کے گروہ میں شامل ہو گئے۔ لیکن ناراضی سے حضرت علی اپنے اشتراکی اصولوں پر آنچ کیوں آنے دیتے۔

ایک دوسرے موقع پر حضرت علی کو کسی نے خبر دی کہ ان کے عزیز عبداللہ بن عباس نے بصرے کے خزانے عامرہ سے کچھ مال غبن کر لیا ہے یہ خبر حضرت علی کو اس وقت موصول ہوئی جب اُن کے مخالفین ہر جگہ شورش مچا رہے تھے۔ ایسی حالت میں ابن عباس کو ناراض کرنا ظاہرا مناسب نہ تھا۔ لیکن شیر خدا نے فوراً ایک خط ابن عباس کو لکھا کہ اگر واقعی انھوں نے مال کچھ غبن کر لیا ہے تو وہ بدترین قسم کی سزا پانے کے لئے تیار رہیں۔ لیکن حساب کی جب جانچ پڑتال ہوئی تو غبن مطلق ثابت نہ ہوا۔ مگر ابن عباس کو اس الزام کا اتنا قدر رنج ہوا کہ اپنے عہدے سے جس کو وہ اپنے لئے طرۂ امتیاز نہیں سمجھتے تھے مستعفی ہو کر مکہ واپس چلے آئے

اسلامی تاریخ اور بھی پرشکوہ اور پرشوکت ہوتی۔ اگر علی جو اپنی ذات بابرکات، خصائل حمید اور اوصاف پسندیدہ کے لحاظ سے لاثانی ہیں اپنے بدبخت قاتل کے خنجر سے شہید نہ ہوتے اور حکومت کو اپنے بہترین اشتراکی اصولوں پر چلاتے۔ حضرت علی کی وفات کے بعد حکومت کا رنگ بدل گیا۔ مگر چونکہ محمد صلعم کے اثر سے عرب کی فضا میں ایک خاص انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ اس لئے اشتراکیت بالکلیہ مفقود نہ ہوسکی۔

خالد سیف اللہ جب معزول ہوئے تو اس کا تذکرہ (Ockley) اس دلچسپ پیرائے میں کرتا ہے۔

"(حضرت) عمر ابو عبیدہ کو ان کے زہد و تقویٰ کی وجہ سے عزیز رکھتے تھے لیکن خالد کے بارے میں ان کی رائے اچھی نہ تھی۔ ایک بار جب انھوں نے مجمع عام میں حضرت خالد کی معزولی کی وجہ اور اپنی برات بیان کی تو ایک شخص نے وہیں اُٹھ کر کہا کہ "اے عمر تو نے انصاف نہیں کیا۔ تو نے رسول اللہ کے عامل کو موقوف کیا۔ تو نے رسول اللہ کی کھنچی ہوئی تلوار کو نیام میں ڈال دیا۔ تو نے قطع رحم کیا۔ عمر تجھے اللہ کے یہاں اس کا جواب دینا پڑے گا۔" عمر نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ منبر سے نیچے اتر آئے اور رات بھر غور و خوض کرتے رہے صبح کو وہ پھر مجمع میں آئے اور کہنے لگے کہ مسلمانوں کے فلاح و بہبود کا میں ذمہ دار ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں کروں گا مجھے اللہ کے یہاں جواب دینا ہوگا۔ اسی احساس کا خیال رکھتے ہوئے میں فوج کی سپہ سالاری ابو عبیدہ کو دیتا ہوں جو شریف النفس ہیں اور مسلمانوں پر شفیق رہیں گے اور میں خالد کو خسیس کی نظروں سے نہیں دیکھتا ہوں کیوں کہ لوگ ان کے مفتوں ہوئے جاتے ہیں۔ اور وہ فضول خرچ ہیں۔"

وہی مصنف پھر لکھتا ہے:۔

جب ابو بکر کا انتقال ہوا تو تمام لوگ روتے تھے۔ خالد نے کہا خدا کی قسم ابو بکر سے محبوب تر میرے لئے دنیا میں کوئی نہ تھا۔ ساتھ ہی عمر سے زیادہ میں کسی اور سے نفرت نہیں

کرتا ہوں ۔ مگر چونکہ ابوبکر کا انتقال ہو چکا ہے اور وہ (حضرت) عمر کو خلیفہ بنا گئے ہیں، مجھ کو خدا اور عمر کا حکم ماننا فرض ہے "

اشتراکیت اور جمہوریت کی اسپرٹ اسلامی لشکروں میں بھی جاتی تھی، خالد جو اسلام کے نپولین سمجھے جاتے ہیں۔ اور جن کے بارے میں پروفیسر اوکلے کا خیال ہے کہ اپنے زمانے کے بے نظیر سپہ سالار تھے جب یونانیوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے تو مخالفین کے سفیر نے ان سے پوچھا کہ "کیا تم ہی مسلمانوں کی فوج کے افسر ہو" خالد نے جواب دیا "مجھے افسر وہ اس لئے ملنتے ہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو بجالاتا ہوں، ورنہ نہیں ان کا افسر ہوں اور نہ وہ میرے ماتحت ہیں" یہ خالد اور ضرار بن ازور ہی جیسے لوگ تھے جن سے مسلمانوں کی رضاکار فوج بنی تھی اور وہ لوگ جو رضاکار فوج کے وجود کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے، ان کے لئے مسلمانوں کی رضاکار فوج کے عظیم الشان فتوحات اور مقبوضات ایک دل چسپ سبق ہے ۔ ان مسلمان سپاہیوں کے پاس نہ تن پر کافی کپڑے تھے اور نہ جنگ کے لئے کافی اسلحہ برخلاف اس کے غنیم کے پاس زرہیں، خود اور ہر قسم کے ہتھیار ہوتے ۔ مگر مسلمان کے جوش کے آگے کوئی چیز حائل نہ ہوتی ۔ اور عمر نے اپنے رضاکار فوج کے ذریعے جو فتوحات حاصل کئے ہیں ۔ وہ آج تک اپنی نوعیت، وسعت اور شوکت کے لحاظ سے بے عدیل ہیں ۔ مسلمان فوج ایک آندھی کی طرح روانہ ہوتی اور سیلاب کی طرح واپس آتی ۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ ہر مسلمان سپاہی بے غرض اور بے لوث ہوتا اور ملت کی خاطر اپنی جان گنوانا عین فرض سمجھتا ۔

جب خالد اپنے عہدے سے الگ ہوئے اور ابوعبیدہ نے شام کی فوج کی سپہ سالاری اختیار کی تو لوگوں کو یقین تھا کہ خالد اپنی معزولی کے تکدر اور رنج کے سبب آیندہ جنگ میں شریک نہ ہوں گے لیکن اس عہد میں کا فی ذاتی نمائش، اور شخصی شہرت مسلمانوں کا شیوہ نہ تھا چنانچہ خالد جنگ میں شریک ہوئے اور دار المقدس کا عالی شان کارنامہ کر دکھایا، وہ ایک معمولی سپاہی بن کر اپنے مذہب و ملت کی خاطر اسی طرح لڑے جس طرح کہ وہ ایک شاندار سپہ سالار بن کر لڑتے تھے ۔ معزولی کے فوراً ہی بعد ابوعبیدہ نے خالد سے پوچھا کہ کیا وہ اب بھی دشمنوں سے لڑنے کے لئے جانا پسند کریں گے ۔ خالد نے کہا " خدا کی قسم، عمر ایک طفل کی سرکردگی میں بھی پر از خطر مہم پر بھیجیں تو بھی مجھے کوئی عذر نہ ہوگا " خالد مسلمانوں کے ان جانباز سپاہیوں میں سے ایک تھے

جو اپنی ذاتی حشمت کو قربان کر کے ملت کے لئے جان گنواتے تھے، اسلام کا ہر سپاہی سوشلسٹ تھا اور وہ بھی کوئی معمولی درجے کا نہیں۔ ڈبلن کا ارک بشپ رقمطراز ہے کہ " نہ صرف خالد ہی بلکہ ہر مسلمان اپنے کو سیف اللہ سمجھتا تھا اور جب وہ خیال کرتے تھے کہ ایام جاہلیت میں وہ کیا تھے اور اب کیا ہیں تو انھیں محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک نئی روحانی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ جہاں تمام لوگ ایک ہی رب العالمین کے بندے اور غلام ہیں جن کا واحد مقصد اپنی قوم کو اقتدار پر لا کر دوسرے تمام لوگوں کو اللہ کی وحدانیت کی ترغیب دلانا تھا۔ اور اس پیام میں معلوم کون سی سچائی تھی کہ لاکھوں آدمیوں کی روحیں یکایک مسحور ہو گئیں اور وہ تمام قومیں اور افراد جن کا شیوہ قتل و غارت تھا ایک واحد رشتے میں منسلک ہو گئے اور وہ تمام لوگ جو ہزاروں جھوٹے معبودوں کی پرستش کیا کرتے تھے ایک ایسی سوسائٹی کے ارکان ہو گئے۔ جو ہمارے گرجے سے مشابہت رکھتی تھی"۔

ایشیا میں خصوصاً اور دوسرے براعظموں میں عموماً تجارت اور اسی طرح دوسرے پیشے عالی خاندان اور عالی نسب والوں میں تحسین کی نظروں سے نہیں دیکھے جاتے۔ زور بازو سے معاش پیدا کرنا ایک ادنیٰ درجے کی چیز سمجھی جاتی ہے اور ایسے افراد سوسائٹی میں وقعت کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے اس قسم کی ذہنیت کو برا سمجھا ہے اور کام اور مزدوری کو بلند مراتب دئے ہیں۔ محمد صلعم نے فرمایا۔

" جو اپنی روزی سے پیدا کرتا ہے۔ وہ اللہ کا دوست ہے"

" جو ہر حال سے لائق اور درست ہیں۔ مگر نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے کام کرتے ہیں اللہ ان پر مہربان نہیں "

" بے شک یہ ہر حال میں بہتر ہے کہ تم رسی لے جا کر لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لے آؤ اور بازار میں بیچو۔ ایسی حالت میں خدا تمھاری عزت کا نگہبان ہے۔ لیکن یہ کبھی اچھا نہیں کہ تم لوگوں سے بھیک مانگو جو تمھیں دیں یا نہ دیں۔ اگر انھوں نے تمھیں نہ دیا تو تمھاری عزت پر حرف آئے گا۔ اور تم مایوس واپس آؤ گے۔ اور اگر انھوں نے تمھیں دیا تو یہ اس سے بھی برا ہے کیونکہ تم خواہ مخواہ ممنون احسان رہے "

" اللہ انھیں پر مہربان ہے جو اپنی روزی مزدوری کر کے حاصل کرتے ہیں۔ نہ

کہ بیشک سے :

" جو نہ اپنے لئے اور نہ دوسروں کے لئے کام کرتے ہیں، انھیں اللہ کے یہاں
کوئی اجر نہ ملے گا۔"

چنانچہ آنحضرت خود اپنے ہاتھوں سے معمولی مزدور کی طرح کام انجام دیتے۔ مدینے میں آکر سب سے پہلا کام مسجد نبوی کی تعمیر تھی، اس مسجد اقدس کی تعمیر میں دیگر صحابہ کی طرح خود آں حضرت بہ نفس نفیس شریک تھے۔ خود اپنے دست مبارک سے اینٹ اٹھا کر لاتے تھے، صحابہ عرض کرتے تھے کہ ہماری جانیں قربان، آپ کیوں زحمت فرماتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے فرض سے باز نہ آئے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر بھی جب تمام صحابہ مدینے کے چاروں طرف خندق کھود رہے تھے۔ آپ بھی ایک ادنیٰ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی اور خاک کی تہ جم گئی تھی۔ آں حضرت فرمایا کرتے تھے کہ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے۔

آں حضرت کو حضرت فاطمۃ الزہرا اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں تو فرط محبت سے کھڑے ہو جاتے۔ پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ بٹھاتے، تاہم شہنشاہِ عالم کی لڑکی کی عسرت اور تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی۔ خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں۔ اور مشک کے اثر سے سینے پر نیل پڑ گئے تھے۔ ایک دن خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں اور کچھ کنیزوں کی درخواست کی۔ آپ نے ارشاد فرمایا، ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہو لے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت علی نے کسی امر کی درخواست کی۔ فرمایا یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تم کو دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ وہ بھوک سے اپنے پیٹ لپیٹے پھریں۔

حضرت علی جب خلیفۂ وقت ہوئے تو ایک غیر مسلم حکمراں کا جاسوس ترقی پذیر عربوں کی عادات و اطوار کا مطالعہ کرنے آیا۔ جاسوس نے عربوں کے بادشاہ کے محل کا پتہ جو پوچھا تو لوگوں نے حضرت علی کے مٹی کے جھونپڑے کی طرف اشارہ کر دیا جس کو دیکھ کر وہ بالکل ششدر رہ گیا۔ اس کے بعد وہ خلیفہ کو دیکھنے

سوختن ہوا گھر کی عورتوں نے ایک غلام ساتھ کر دیا تاکہ اس اجنبی کو وہاں تک پہنچا دے جہاں وہ مزدور کی طرح کام کر رہے تھے۔ علی اپنے شک کو بھر کر درختوں میں پانی دے رہے تھے۔ جاسوس پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اس کی آنکھیں اس کو دیکھنے کے لئے تیار نہ تھیں کہ وہ شخص جو قیصر روم سے زیادہ قوت اور دبدبہ والا تھا وہ اپنی روزی کے لیے اپنے ہاتھوں سے خود مزدوری کر رہا تھا۔

جب آں حضرت کو اپنے ملک کی حکومت کے لئے ایک لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے ایک ایسا طریقہ عمل جاری کیا جو محض اشتراکیت اور جمہوریت پر مبنی تھا اور چونکہ وہ خود ایک عملی شخص تھے۔ اس لئے اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہنانے میں انھیں کچھ دقت حاصل نہ ہوئی اور ان کے اس طریقہ عمل کی پوری نشو و نما حضرت عمر کے زمانے میں ہوئی جو ابتدا میں محض عرب کے حکمران کی حیثیت رکھتے تھے لیکن آخر زندگی میں مصر، فلسطین، عراق اور فارس کے بھی مالک تھے۔

حضرت عمر جو فاروق اعظم کے لقب سے ملقب ہوئے اپنی بے لاگ بے انصافی، سچائی اور حق پرستی کے لحاظ سے بے نظیر تھے۔ عمر کے اوصاف ایسے تھے کہ ڈیوڈ پرائس نے بجا طور پر کہا ہے کہ دنیا کی خواہ کوئی سوسائٹی ہو انھیں بلند مدارج دینے کے لئے تیار ہو سکتی ہے۔ عمرؓ کی سلطنت میں مختلف رنگ و ملت کے لوگ اور مختلف تمدن کے اجزا تھے لیکن جہاں تک حقوق اور اختیارات کا تعلق تھا سبھوں میں یکسانی تھی سلطنت کے تمام افراد "شہریت" کے مساوی حقوق رکھتے تھے اور محکوموں کو سلطنت کی فلاح کا اتنا ہی خیال تھا جتنا کہ حاکموں کو، اسلامی سلطنت کا ہر فرد فرماں برداری نہیں بلکہ اس کے شان و شوکت کے اضافے میں اپنے تمام جوش و خروش سے کام لیتا، عربوں کی کامیابی کا راز جیسا ہرقلس کے ایلچی نے بیان کیا، ان کے سیاسی مجالس اور مذہب کی پختگی میں مضمر تھا جس کی بنا پر انھوں نے اپنے کو برائیوں سے بچایا اور بھلائیوں کی طرف راغب کیا۔ اور یہی اُن کے مخالفین پر فوقیت حاصل کرنے کا سبب رہا۔

رنگ کی تفریق کو جس طرح مسلمانوں نے ناپید کیا وہ آج موجودہ دنیا کے لئے شمع ہدایت ہے۔ ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابراہیم نے جو ہارون رشید کا بھائی اور ایک حبشی عورت کے بطن سے پیدا ہوا تھا بغداد میں اپنی خلافت کا علم بلند کیا۔ لیکن اسے ناکامی حاصل ہوئی اور وہ المامون کے سامنے حاضر کیا گیا۔

المامون نے پوچھا "کیا تم ہی حبشی خلیفہ ہو؟" ابراہیم نے جواب دیا "امیر المومنین! میں وہی ہوں جس کو تم نے امان دی ہے۔ میں ایک غلام ہوں لیکن میری روح آزاد ہے میرا جسد خاکی سیاہ ہے لیکن میرا دماغ سیاہ نہیں" المامون نے جواب دیا "عم محترم میرے مذاق نے تمہیں رنج پہنچایا۔ چمڑے کی سیاہی ہرگز ایک لائق آدمی اور فاضل ادیب کی فوقیت کو کم نہیں کر سکتی، چمڑے کی سیاہی تمہارے لئے۔ لیکن تمہاری روح کی صفائی اور پاکیزگی میرے لئے ہے"۔

اولسنر مسلمانوں کے بارے میں لکھتا ہے:۔

"مسلمانوں کے قانون نے برتری اور ملت کی تفریق مٹا کر دو شاندار نتائج پیدا کئے ایک تو زمین عرب کو تمام وحشیانہ قوانین سے پاک کیا اور دوسرے تمام لوگوں کو مساویانہ حقوق دئے"

بوسورتھ اسمتھ لکھتا ہے:۔

"جہاں تک فرد کا تعلق ہے ہر شخص نے تسلیم کیا ہے کہ اسلام نے اپنے حبشیوں کو بھی ایسے مراتب اور مدارج دئے ہیں جو دوسری جگہ خصوصاً عیسائی مذہب میں نہیں پائے جاتے"

مورگن نے مراکش کے ایک مسلمان کی تقریر درج کی ہے جو اس نے (Inquisition) کی سزا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کی تھی جس سے اسلام کی اجتماعیت اور رواداری کا پتہ چلتا ہے:۔

"تمہیں کوئی حق نہیں کہ اعتقادات کے اختلاف کے خلاف کوئی خونچکاں عدالت قائم کرو۔ ہمارے ہاتھ ہمیشہ ان کے لئے کشادہ ہیں۔ جو ہمارے مذہب کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن قرآن نے ضمیر پر دباؤ ڈالنے کی تعلیم ہرگز نہیں دی۔ جو لوگ مشرف بہ اسلام ہوئے ان کی ہمیشہ ہمت افزائی کی گئی کہ وہ ہم میں یکساں ہو کر رہیں۔ وہ بلا پس و پیش ہماری لڑکیوں کو اپنی بیویاں بنا سکتے ہیں اور وہ ہمارے تمام معزز اور ممتاز عہدوں پر سرفراز

ہو سکتے ہیں :

عرب پر مسلمانوں کا اقتدار قائم ہوتے ہی جزیرہ نما کے تمام جابر اور قاہر حکمرانوں کا خاتمہ ہو گیا۔ اور جمہوریت کا جھنڈا ہر جگہ لہرانے لگا۔ اور جب اسلامی سلطنت غیر ممالک میں قائم ہوئی تو وہاں بھی یہ اصول قائم کیا گیا۔ عمر نے منادی کرادی تھی کہ اگر ایک شخص عوام کے خلاف کسی دوسرے شخص کی سرداری تسلیم کرے تو دونوں یعنی جس نے تسلیم کی اور جس نے اپنی سرداری تسلیم کرائی تہ تیغ کر دئے جائیں (ابو الفرج)۔

تمام مسلمانوں کے حقوق برابر تھے۔ اور ہر شخص کا یہ فرض تھا کہ کمزوروں کی حمایت اور خدمت کرے۔ نظام تعلیم ریاست کی طرف سے ہوتا جس کے تمام اخراجات وہ خود برداشت کرتی طلبہ کے لئے دار الاقامے ہوتے، جہاں لباس، قیام و طعام کے اخراجات حکومت کے سر ہوتے۔ تمام حاصل کردہ زمینیں عوام کی ملکیت سمجھی جاتیں۔ افراد کی پرورش اور مدد ریاست کی طرف سے ہوتی۔ قوم کی خاطر جو شخص مرتا اس کے بچوں بیواؤں اور رشتہ داروں کی پرورش ریاست کرتی۔ سلطنت میں اہم کام قوم کے مشورے سے کئے جاتے۔ اور تمام لوگ اپنی رائے دینے میں بالکل آزاد تھے اور کثرت رائے سے جو چیز طے پاتی، ہر شخص تسلیم کرتا۔ اقلیت کی رائے خواہ وہ کیسی ہی مناسب اور افضل ہوتی رد کر دی جاتی اور اس کا تذکرہ کلام مجید میں بھی پایا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ، حضرت ابوبکرؓ، عثمانؓ، اور علیؓ جو یکے بعد دیگرے خلافت پر مسند نشین رہے، رائے منسوخ کرنے کا حق یعنی (Power of veto) نہ رکھتے تھے۔ ایک بار عمر کو ایک ضعیف عورت نے ایک غلطی پر ٹوکا۔ اور انھیں اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ ایک قسم کا کابینہ بھی تھا جس کے ارکان وہی لوگ ہوتے جو لوگوں کے نزدیک قابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ لیکن علیحدہ علیحدہ ان کے پاس کوئی قلم دان وزارت نہ تھا۔ شریعت اور ملک کے قوانین کی پابندی ہر شخص پر لازم تھی۔ عورتوں کو بھی رائے کا حق تھا حضرت عائشہ اور دیگر معزز خواتین سے ریاست اور قوانین کے متعلق مشورے لئے جاتے تھے۔

آزادی ضمیر ہر شخص کو حاصل تھی۔ مسلمانوں کو بھی ٹیکس کی صورت میں اتنا ہی ادا کرنا ہوتا جتنا کہ غیر مسلمانوں کو، شہریت کے حقوق کی حفاظت کی ذمہ داری مسلمانوں پر ہوتی جس پر غیر مسلمانوں کو بیرونی حملے سے بچانا بھی فرض ہوتا۔ ایک بیت المال بھی تھا جو بالکل عوام کی ملکیت تھی۔ اس کی ساری آمدنی

حکومت کی عملداری اور غریبوں کی مدد کے لئے وقف ہوتی۔ کوئی گراں قدر تنخواہ کسی کے لئے مقرر نہ تھی۔ خلیفہ اور
ان تمام لوگوں کو جو ریاست کی خدمت کے لئے مقرر ہوئے۔ بسر اوقات کے لئے تھوڑا سا وظیفہ ملتا۔ "افسریت"
مطلق نہ تھی۔ تمام لوگ اپنے ملک اور ملت کی خدمت کسی ذاتی فائدے کے لئے نہ کرتے۔ وہ محض سوسائٹی
کی فلاح و بہبودی کے لئے اپنی جان لڑا دیتے۔ حضرت عمر نے بار بار اپنے ہم وطنوں سے کہا کہ میں تمہاری سرداری
اسی وقت تک کروں گا جب تک تم کو مجھ پر اعتقاد رہے گا۔

امن قائم رکھنے کے لئے اور جرائم کے سدباب کے لئے کوئی پولیس کا محکمہ نہ تھا۔ جب حضرت
ابو عبیدہ نے عمرؓ کو اطلاع دی کہ شام کے مسلمانوں نے شراب پینی شروع کی ہے تو حضرت عمر دستور کے مطابق
مسجد میں تشریف لائے اور خط کو عوام کے سامنے پیش کیا۔ حضرت علیؓ نے جو عمر کے دست راست تھے
یہ فیصلہ کیا کہ شراب پینے والوں کی ایڑیوں پر اسی درے لگائے جائیں۔ فیصلے کو لوگوں نے قبول کیا
اور حضرت عمر نے اس فیصلے کی تعمیل کا حکم ابو عبیدہؓ کے نام جاری کیا۔ حضرت ابو عبیدہ نے اس پیغام کو
مشتہر کیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ جو مجرم ہوں وہ خود اس سزا کے لئے اپنے کو پیش کر دیں۔ تاکہ ان کے توبہ کی
سچائی کا صحیح حال معلوم ہو، سچائی دیکھو کہ جوق، جوق لوگ سزا کی خاطر اپنے کو پیش کر رہے تھے، انہیں
گرفتار کرنے والا سوائے ان کے ضمیر کے اور کوئی نہ تھا۔ مدینے میں حضرت عمر کے صاحبزادے کو اپنے
باپ کے ہاتھوں اسی قسم کی سزا ملی جو ان کے لئے باعث موت ہوئی۔

حضرت عمر نے زمین کی پیمائش کرائی۔ اور اس کی قیمت لگا کر جمہوری اصولوں پر ٹیکس لگائے۔ ایڈیو
کا طریقۂ زمینداری بدل دیا گیا اور تمام زمینیں کاشتکاروں میں تقسیم کر دی گئیں۔

حضرت عمر کے زمانے میں اشتراکیت کی روح اس قدر غالب تھی کہ عربوں نے جب ایران فتح کیا
تو شاہ ایران کے محل میں ایک قیمتی قالین دستیاب ہوا جو ہر قسم کے زر و جواہرات سے آراستہ تھا، لیکن یہ کسی
ایک شخص کی ملکیت قرار نہ دیا گیا بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمام لوگوں میں تقسیم کر دئے گئے۔

آن حضرت نے پنشن کا طریقہ اپنے عہد میں جاری کیا جس کی پابندی بعد میں بھی کی گئی بیت المال
سے بیواؤں یتیموں اور بوڑھے آدمیوں کے وظیفے مقرر کئے گئے۔

حضرت عمرؓ کے خلافت کے زمانے میں بھی ایک باضابطہ محکمہ تھا جہاں سے رسولؐ کے عزیز و اقارب سے لے کر ادنیٰ مرد اور عورت کو حسب ضرورت وظیفے ملتے تھے، ہمارے موجودہ زمانے کے سوشلسٹ یہ سن کر خوش ہوں گے کہ حضرت عمرؓ نے بچوں کے لئے بھی روزینے مقرر کئے تھے۔ مولینا شبلیؒ نے ایک دلچسپ واقعہ اس سلسلے میں اپنی شہرہ آفاق کتاب الفاروق میں بیان کیا ہے۔ ایک دفعہ ایک قافلہ مدینہ منورہ میں آیا اور شہر سے باہر اترا اس کی خبر اور حفاظت کے لئے حضرت عمرؓ خود تشریف لے گئے پہرہ دیتے پھرتے تھے کہ ایک طرف سے رونے کی آواز آئی ادھر متوجہ ہوئے دیکھا کہ ایک شیرخوار بچہ ماں کی گود میں رو رہا ہے۔ ماں کو تاکید کی کہ بچے کو بہلائے تھوڑی دیر میں ادھر سے گذرے تو بچے کو روتا پایا غیظ میں آکر فرمایا کہ تو بڑی بے رحم ماں ہے اس نے کہا کہ تم کو اصل حقیقت معلوم نہیں خواہ مخواہ مجھ کو دق کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے کہ بچے جب تک دودھ نہ چھوڑیں بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے اس غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے۔ حضرت عمرؓ کو رقت ہوئی اور کہا کہ ہائے عمرؓ! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا۔ اسی دن منادی کرادی کہ بچے جس دن پیدا ہوں، اسی تاریخ سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں۔

جب کوئی شخص کہیں کا عامل مقرر کیا جاتا تو حضرت عمرؓ لوگوں کے سامنے اس کو فرمانِ تقرری عنایت کرتے تھے۔ اور ان کو گواہ مقرر کرتے تھے جس سے یہ مقصد تھا کہ جو شخص مقرر کیا جاتا ہے اس کی لیاقت و دیگر بعض کا اعلان ہو جائے۔ ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ ترکی گھوڑے پر سوار نہ ہوگا باریک کپڑے نہ پہنے گا چھنا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔ دروازے پر دربان نہ رکھے گا اہلِ حاجت کے لئے دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا وہ بیت المال سے اپنے خرچ کے لئے کچھ نہ لے گا بلکہ اپنے اور اہل و عیال کی پرورش کے لئے خود مزدوری کرے گا، ہاں اگر علالت یا ضعیفی کے سبب کام کرنے کے لائق نہ ہو تو لوگوں کی اجازت سے ایک دو درہم روزانہ خرچ کے لئے بیت المال سے لے سکتا ہے۔

ہر فرد ریاست کا رکن تھا اور ذاتی طور پر ریاست کے تمام کاموں سے دلچسپی رکھتا تھا۔ حاکموں کی کوئی جماعت نہ تھی ہر شخص ریاست کا ملازم تھا۔ اور اپنی روزی کے لئے کچھ نہ کچھ کام کرتا تھا۔ ریاست صرف ان ہی لوگوں کے اخراجات فراہم نہ کرتی جو اس کی خاطر کام کرتے۔ بلکہ ان کی بھی پرورش کرتی جو جسمانی کمزوری

کے باعث کام کرنے سے معذور رہتے۔ قوم کا ہر فرد ریاست کا سپاہی تھا اور ساتھ ہی ساتھ ہر فرد خواہ مرد ہو یا عورت سلطنت کے کاموں میں دخل دینے کا حق رکھتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک فرد گڈریا تھا جو اپنی ذمہ داریوں کے مناسب اور نامناسب مصرف کے لئے اللہ کے یہاں جوابدہ ٹھہرایا جاتا تھا۔ آں حضرت نے ارشاد فرمایا۔

تم میں سے ہر ایک شخص گڈریا ہے۔ اور ہر شخص سے اس کے گلے کی بابت سوال کیا جائے گا اور اس کو جواب دینا ہوگا۔ ہر مرد اپنے کنبے کا گڈریا ہے اس کو بھی جواب دینا ہوگا۔ ہر عورت اپنے گھر میں گڈرئے کی حیثیت رکھتی ہے اس کو بھی جواب دینا ہوگا۔ تم میں سب گڈریے ہیں اور تم سب کو جواب دینا ہوگا۔"

مندرجہ بالا حقیقتوں سے ظاہر ہوگا کہ آں حضرتؐ اور عمرؓ نے جو ریاست قائم کی تھی وہ صحیح معنوں میں آئیڈیل ریاست تھی۔

مگر پروفیسر تھیوڈور نولڈیکے جو اشتراکیت اور جمہوریت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے حضرت عمرؓ کی حکومت پر یہ خیال ظاہر کرتے ہیں۔

عمرؓ کی خلافت مذہبی اور حربی تھی۔ عرب جو اپنے کو بندۂ خدا کہتے تھے سپاہی تھے اور ساتھ ہی حکمراں، مذہب کی پابندیاں سختی سے کرتے اور خلیفہ ادنیٰ لوگوں کی طرح زندگی بسر کرتا۔ لیکن لڑائی میں جو مال غنیمت ہاتھ آتا یا محکوموں پر جو ٹیکس لگایا جاتا وہی ہر عرب کی تنخواہ ہوتی۔ تنخواہ کے پانے والے بچے اور عورتیں بھی ہوتیں۔ اور ان میں اضافہ حکومت کی آمدنی کے اضافے کے ساتھ ہوتا رہتا۔ جو چیزیں دشمنوں کے ملک سے حاصل ہوتیں وہ تمام مسلمانوں میں برابر تقسیم کردی جائیں۔ مفتوح ممالک میں عربوں کو اجازت نہ تھی کہ زمینداریاں قائم کرتے۔ انھیں خیموں میں رہنے کا حکم ہوتا۔"

پروفیسر موصوف آگے چل کر فرماتے ہیں کہ اسلام کے لئے برا ہوا اور دنیا کے لئے اچھا ہوا کہ اس قسم کی اجتماعی اور اشتراکی حکومت بہت دنوں تک قائم نہ رہی۔

اسی سلسلے میں ایک عقلیت پسند مسلمان کی رائے کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا۔ امیر علی

رقمطراز ہیں :-

"سیاسی اصولوں کے لحاظ سے اسلام کے بانی نے مدینے میں چند سال رہ کر انسانیت کو جو فائدہ پہنچایا ہے وہ کہیں بہتر ہے ۔ (Poetco) اور (Academy) کے مقلدین اور روم کے (Comitia Curiata) کے سینکڑوں برس متواتر کوششوں کے بنائے ہوئے نظریے کے نتائج سے ۔ اسلام نے لوگوں کو ایک ایسا آئین اور ریاست کو ایک ایسا دستور اساسی دیا جو مذہب پر مبنی تھا۔ اس نے لگان اور ٹیکس کا دائرہ تنگ کر دیا ہے ۔ اور تمام آدمیوں کو قانون کی نگاہ میں یکساں کر دیا ہے ۔ اور خود مختار اصولوں کو اچھی طرح واضح ، حکومت عامہ کو قانون کے ماتحت کر کے حاکم اعلیٰ کے اختیارات پر پابندیاں عاید کر دی ہیں ۔ خلفاء راربعہ کے ماتحت مذہبی جواز سے جو مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تھی اس سے پتہ چلتا ہے کہ محدود قوانین کے ماتحت ایک مقبول عام حکومت تھی جو محدود اختیارات کے منتخب افراد سے چلائی جاتی تھی ۔ حکومت کے ارکین رائے عامہ کے پابند تھے ۔ جن کو معمولی رعایا بھی تنبیہ کر سکتی تھی ۔ حضرت عثمانؓ مجبور تھے کہ ہر روز بیت المال کا حساب پیش کریں ۔ اور حضرت علیؓ کو مجلس عدالت کے سامنے ایک عیسائی چور کے خلاف مدعی بن کر حاضر ہونا پڑا تھا ۔ قاضی کے فیصلے سب سے اعلیٰ ہوتے تھے اور اولین خلفاء کو یہ حق نہ تھا ۔ جیسا کہ بعد کے غاصبوں کو تھا کہ ایسے مجرم کو معاف کر دیں جس کو عدالت سزا دے چکی ہو ۔ امیر ، غریب ، حاکم اور مزدور قانون کے سامنے سب یکساں تھے ۔"

موجودہ زمانے کے اشتراکیت کے علمبردار اصولی غلطی یہ کرتے ہیں کہ اپنی اشتراکی کوشش کا آغاز نیچے سے نہیں بلکہ اوپر سے کرتے ہیں ۔ وہ افراد کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں اور یکایک ملک اور سوسائٹی کے نظام میں انقلاب برپا کرنا چاہتے ہیں ۔ آں حضرتؐ نے پہلے افراد کو درست کیا اور جب وہ ایک اشتراکی نظام کے لئے تیار ہو گئے تو ایک اعلیٰ پیمانے کی حکومت قائم کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔

اسلامی اشتراکیت کی خوبی یہ تھی اسے شخصی تقدم (Personal enterprise)

اور انفرادی تجدد Individual initiative میں کسی قسم کا دخل نہ دیا لیکن ساتھ ہی ساتھ صورت حال ایسی پیدا کر دی تھی کہ ایک فرد کے لئے یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ وہ دوسرے فرد کو لوٹ سکے یا بے جا طور پر اس کی مزدوری سے یا اوروں کی مدد سے خود امیر بن بیٹھے۔ ہر فرد اپنے کو ایک سطح پر رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آنحضرت نے جمہوریت اور اشتراکیت پھیلانے میں کوئی جبر یا طاقت نہیں استعمال کیا۔ وہ جاہی جنگ کبھی نہیں لڑے۔ انھوں نے کسی جائداد یا آمدنی کا غلط استعمال نہیں کیا۔ سوسائٹی کی ترقی کے لئے جو کچھ انھوں نے کیا وہ ترغیب اور تبلیغ کے ذریعے کیا۔ انھوں نے لوگوں کے لطیف جذبات کو ابھارا، اور بلا تفریق حیثیت ہر شخص سے اپیل کی۔ اُن کی سب سے پہلی کوشش یہ تھی کہ افراد کے اخلاق کا معیار بلند ہو کر سوسائٹی تمام خرابیوں سے پاک ہو جائے۔

چنانچہ اسلامی جمہوریت اور اشتراکیت کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ ہر فرد اپنی اخلاقی طاقت کی بنا پر اشتراکی اصول کو قبول کرنے کے لئے تیار تھا۔ ہر فرد کو خودی کو مٹانے کی تعلیم دی گئی۔ اور ایک متحدہ مشترکہ مقصد حاصل کرنے کی ترغیب۔ ایک دوسرے کی بے لوث مدد کی ہدایت کی گئی۔ کلام پاک نے بلند ترین اور قابل عمل اصول اخلاق پیش کئے اور خدا کے پیغمبر نے اس کو لوگوں کے رگ و ریشہ میں پیوست کیا۔

اشتراکی حکومت ایک ملک میں اسی وقت قائم ہو سکتی ہے جب کہ ملک کی تمام آبادی کے سامنے موت و زیست کے لئے ایک واحد نصب العین ہو اور سوسائٹی کا ہر فرد "خود پسندی" اور "شخصی منفعت" کے جذبات سے پاک اور آزاد ہو۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کو ان باتوں کی تعلیم اچھی طرح دی اور دل خواہ کامیابی حاصل ہوئی۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ آں حضرت نے جن زریں اصول کو اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور جن کے ذریعے حضرت عمر کو ساری کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ ان کی قدر بعد کے لوگوں نے نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی سوسائٹی میں ایک ناخوشگوار انقلاب پیدا ہو گیا۔ اور جمہوریت اور اشتراکیت محض طوائف الملوکی سے بدل کر رہ گئی۔ معاویہ کی شخصی حکومت نے جو عجم و یونان کے شوکت پسند حکمرانوں سے ملتی جلتی تھی اشتراکیت کا خاتمہ کر دیا۔ خارجیوں کا ایک علیحدہ فرقہ قائم ہوا جو خدا کے سوا کسی انسانی رہنما اور خلیفہ کے مطلق قائل نہ تھے

اس فرقے کے تین افراد نے بیڑا اٹھایا کہ روئے زمین سے ان مسلمانوں کا خاتمہ کریں گے۔ جو حکمرانی کا دعوی کر رہے تھے چنانچہ ان میں تین شخص خلیفۂ وقت حضرت علی ابن ابی طالب، امیر معاویہ اور عمرو بن عاص کے قتل کی خاطر ایک ساتھ روانہ ہوئے۔ ایک امیر المومنین علی کے قتل کے لئے کوفہ، دوسرا امیر معاویہ کے لئے دمشق، تیسرا عمرو کے لئے مصر روانہ ہوا۔ قضاء الہی دیکھو جو سبھوں میں معصوم تھے وہ اس ناپاک حملے کے شکار ہوئے۔ یعنی اسد اللہ۔ رسول کے محبوب ترین عزیز اور خلیفۂ وقت شہید ہوئے۔ لیکن معاویہ کو کاری زخم نہ لگا۔ اور عمرو بن عاص کے دھوکے میں اور شخص مارا گیا۔ اس واقعے کا مذہبی پہلو کچھ بھی ہو لیکن تاریخ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتی کہ ان حضرت کے قائم کردہ اصولوں کی بربادی کا عذاب معاویہ کے سر ہے۔ حضرت علی کی زندگی اگر وفا کرتی تو اشتراکیت اور جمہوریت کی نشوونما خوب ہوتی۔ حضرت علی جب بستر مرگ پر تھے تو لوگوں نے انھیں اپنے فرزند کو اپنا جانشین مقرر کرنے کو کہا۔ لیکن شیر خدا نے کہا کہ جانشین مقرر کرنا میرا کام نہیں۔ یہ کام قوم کا ہے۔ لیکن معاویہ کو دیکھو کہ انھوں نے اپنے لڑکے یزید کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اور جب یزید کی ولیعہدی کا اعلان کیا گیا تو معاویہ کے طرفداروں نے مکہ کے سالانہ اجتماع حج کے موقع پر یہ کہا کہ معاویہ نے اپنا جانشین مقرر کر کے وہی بات کی ہے جو حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو مقرر کر کے کی تھی۔ لیکن ایک عربی جس میں اشتراکیت بھری ہوئی تھی، اٹھ کر بولا "ہرگز نہیں معاویہ نے یزید کو اپنا جانشین مقرر کر کے وہی بات کی ہے جو قیصر و کسریٰ کرتے آئے ہیں"

معاویہ کی اسلامی خدمات کچھ بھی ہوں لیکن جبری اور استبدادی حکومت قائم کر کے جو بدترین مثال انھوں نے پیش کی اس قصور سے وہ کبھی بری نہیں ہو سکتے۔ اور بعد کے تمام مسلمان حکمرانوں نے معاویہ کی تقلید کی جو صریحاً اسلامی تعلیم کی مخالفت پر مشتمل تھی۔

شعاع اور حیات

ہم تموجات کے دور میں زندگی گذار رہے ہیں۔ یہ تموجات لاکھوں کروروں قسم کے ہیں اور ان تموجات سے بالکل مختلف ہیں جو لاسلکی کی ان لہروں میں پائی جاتی ہیں، جن کا طول بیس ہزار میٹر سے لے کر لاشعاع (ایکس ریز) تک پہونچتا ہے۔ شعاع کونیہ کا طول ملیمیٹر کے کروروں حصہ سے زائد نہیں ہوتا ان میں سے بعض تموجات یا لہروں کو خالی آنکھ سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور انھی کے ذریعہ ہمیں اجسام محدثہ نظر آتے ہیں جن کو ہم نورالابیض (یا سفید روشنی) کہتے ہیں۔

بعض امواج یا لہریں ایسی ہیں کہ ہم ان کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے (لیکن ان کا وجود ضرور ہے) ان کو ہم نورالاسود (یا سیاہ روشنی) کہتے ہیں۔ یہی امواج اور لہریں زندہ اجسام پر (عام اس سے کہ وہ حیوانات کے ہوں یا نباتات کے) مختلف انواع سے اثر انداز ہوتی ہیں جس سے مختلف معلومات حاصل ہوتے ہیں اور ہم مختلف قیاسات لے کر مختلف نتائج اخذ کرتے ہیں۔

یہ عجیب غریب موضوع ہماری روزمرہ زندگی میں ہر ہر قدم پر نظر آتا ہے کہیں ہم اس کے ذریعہ سے خبریں یا دیگر حالات ایک ملک و شہر سے دوسرے ملک و شہر میں بھیجتے ہیں۔ کہیں اسی سے ہم تصاویر و دیگر اشیاء کا عکس دور دراز ملکوں میں منتقل کرتے ہیں۔ کہیں بجلی کے آنکھ سے ہم دور دور کی چیزیں دیکھتے ہیں۔ حیات انسانی و دیگر اقسام حیات۔ مثلاً حیوانات نباتات پر ہم اس کا نمایاں اثر دیکھ رہے ہیں۔

فیتامین (وٹیامین ڈی) (د) کی تکوین ایک حد تک خون میں اسی کے سبب سے ہوتی ہے۔ عموماً وہ جراثیم جو خون میں نقصان پیدا کرنے والے ہیں بیشتر ان تموجات سے فنا ہو جاتے ہیں۔ قواہر کی مضبوطی حواس کی تقویت عقل و ذہن کی جلاء کا سبب بھی یہی ہیں۔ بعض بعض وقت مرض سرطان کے حملہ کی بھی ان سے مدافعت ہوتی ہے۔ وہ غدود جو صحت انسانی کے محافظ ہیں زیادہ تر ان کی صحت ان سے ہی قائم رہتی اور ان میں ترقی

ہوتی ہے اور بڑھاپا دیر میں آتا ہے۔

اس موضوع پر ہمیں چاہیئے کہ پہلے حیات انسانی کی معرفت حاصل کریں پھر اس کی خدمت کے لحاظ سے اس پر بحث کریں اور اسی سلسلے میں حسب ذیل سوالات کے جوابات مدلل پیش کریں۔ ۱۔ کیا سبب ہے کہ صحرائی سانپ میں بمقابلہ دیگر سانپوں کے سخت مہلک زہر ہوتا ہے۔ ۲۔ وہ پرندے جو ایک ہی زمانہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت کرتے ہیں۔ ان کو ہم کس طرح الطفیں کے ملک میں روک سکتے ہیں۔
۳۔ کیا سبب ہے کہ بعض تموجات یا لہریں اپنا مفید عمل جلد اور کافی طور پر انجام دیتی ہیں اور بعض خلیوں کو برباد کر دیتی ہیں۔

ہم نے تاریخوں میں دیکھا ہے کہ اگلی قومیں اکثر سورج دیوتا کے نام کے مندروں میں اس کے نام کی پرستش کرتی ہیں۔ ان مندروں میں سے بعض بعض میں ہمیں ایسے مقامات بھی ملتے ہیں جہاں لوگ بالکل برہنہ ہو کر آفتاب کی شعاعوں سے غسل کیا کرتے تھے مشہور مورخ ہیروڈے ٹس نے بھی ایسے غسل اور حماموں کا ذکر کیا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ غسل عضلات کی تقویت کے لئے اکسیر تھا۔
حکیم بقراط کی رائے میں دھوپ عقل و جسم دونوں کے لئے نہایت درجہ مفید ہے۔ باوجود ان سب دلائل کے خون اور جسم میں نور آفتاب جو کچھ کیمیاوی اثر کر رہا ہے وہ اصلی اثر ابھی تک قدرت کے ان رازوں میں سے ہے جو پورے طور پر منکشف نہیں ہو سکے اور اس عدم انکشاف میں عالم و جاہل و عام و خاص میں کوئی خاص فرق نہیں دونوں برابر ہیں۔

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ضربۃ الشمس و ضربۃ الحرارہ میں فرق سمجھتے ہیں جن مقامات میں آفتاب کم نظر آتا اور زیادہ تر پوشیدہ رہتا ہے وہاں آنکھوں کا رنگ عموماً کرنجی کیوں ہوتا ہے جیسے قطبین کے قریب۔ اور جب ہم سطح البحر کے برابر ہوتے ہیں تو کیمیاوی معنوی روشنی آفتاب کی روشنی میں زیادہ کیوں

ہو جاتی ہے۔

آفتاب کی طبعی روشنی ان مصنوعی برقی لیمپوں سے کیوں بڑھ جاتی ہے جو خصوصیت کے ساتھ صحت بخش شعاعیں پیدا کرنے کے لئے روشن کی جاتی ہیں۔

ہم نے سائنس کے بعض مختلف کتابوں میں پڑھا ہے کہ نباتات دھوپ میں زندہ رہتی اور بڑھتی ہیں۔ جو روشنی صبح کو حاصل ہوتی ہے وہ نباتات کی ترقی و احیا میں دوسرے وقتوں کی دھوپ سے بہت زیادہ کارآمد و مفید ثابت ہوتی ہے

یہ بھی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ دھوپ ان جراثیم کو بھی ہلاک کر دیتی ہے جو حیوانات کے جسم میں مہلک ہوتے ہیں۔ فاسفورس۔ لوہے اور چونے وغیرہ کے سفید اجزا رخون حیوانی میں زیادہ کرتی ہے خصوصاً انسانی جسم میں وہ جراثیم زیادہ پیدا کرتی ہے جو خون کے لئے مفید ہوتے ہیں اور خون کے سفید اجزا اسکے نام سے مشہور ہیں ان اجزا میں مدافعت مرض کی استعداد زیادہ ہوتی ہے باوجودیکہ ہم یہ سب مسائل جانتے ہیں لیکن اب بھی بہت کثرت سے ایسے مسائل ہیں جن میں ضرورت ہے کہ سنجیدگی سے بحث کی جائے اور تحقیق کر کے مفید نتیجہ اخذ کیا جائے۔

اس وقت یہ مضمون اسی غرض سے حوالۂ قلم کیا جا رہا ہے کہ کوشش کر کے شعاعوں کے اس تعلق کو جو انہیں حیات حیوانی اور خصوصاً حیات انسانی سے ہے ظاہر کیا جائے یہ تعلق حیات حیوانی اور حیات نباتی دونوں سے یکساں ہے) اور یہ بھی معلوم کیا جائے کہ شعاعیں خون میں کیا کیمیاوی تغیرات کرتی ہیں۔ امراض سے شفا، ہڈیوں کی مضبوطی، دانت کی تقویت کے اسباب کیا ہیں اور شعاعوں کا کیا اثر ان پر پڑتا ہے اور یہ اثر کس طرح مترتب ہوتا ہے۔

یہ شعاعیں کس طرح متعدی امراض سے انسان کو بچاتی ہیں۔ عضلات کے ساتھ کیا عمل کرتی ہیں اور غدود کی کس طرح حفاظت کرتی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہم کس طرح ان شعاعوں کی خدمات مختلف ضروریات میں مختلف طریقوں سے حاصل کر سکتے ہیں۔

شعاع حیات

اس وقت تک جو حقائق ہمارے سامنے ہیں ان سے ہم کو کافی ثبوت ملا ہے کہ مادہ کلوروفل جو نباتات کو سبز رکھتا اور ہماتین (ہموگلوبین) جو خون کو سرخ رکھتا ہے دونوں میں ایک حد تک مشابہت ہے۔ کیونکہ مادہ کلوروفل میں میگنیشیم کے کافی اجزا موجود ہیں۔ اسی طرح ہماتین میں لوہے کے کافی اجزا پائے جاتے ہیں جب آفتاب کی روشنی نباتات کو کافی نہیں ملتی تو وہ زرد اور کمزور ہو جاتی ہے۔ اور بعض نباتات جلد سے جلد امراض کا شکار ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ اس سے اور دیگر عملی دلائل سے معلوم ہوا کہ آفتاب کی شعاعوں کو نباتات کی ترقی نمو اور زندگی سے خاص تعلق ہے خصوصاً وہ شعاع جس کا نام ہم نے بالائی بنفشی شعاع رکھا ہے۔ کیونکہ یہ شعاع بنفشی شعاع کے اوپر ہی نظر آتی ہے۔ یہ شعاع نباتات میں قوت نمو پیدا کرتی اس کو تندرست رکھتی اور بڑھاتی ہے۔ اس کا ایک ثبوت وہ تجربہ ہے جو حال میں ایک زراعتی یونیورسٹی میں کیا گیا۔

بالکل ہموزن ایک ہی قسم کے چند چقندروں کی کاشت اس طرح کی گئی کہ ان کے ایک حصہ میں کانچ لگا دیا گیا کہ صرف بالائی بنفشئی شعاع کو کانچ روک دے زیرین شعاع سرخ کو اس کے عوض دگنا کر دیا گیا۔ چقندروں کا دوسرا حصہ کھیت میں معمولی طریقہ سے کاشت کیا گیا۔ بالائی بنفشی شعاع اس کھیت میں پورے طور سے پڑتی تھی۔ اس کاشت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول الذکر یعنی جس حصہ کاشت پر کانچ کے ذریعہ بالائی بنفشی شعاع روکی گئی تھی اس کی پیداوار بمقابلہ دوسرے کھیت کے کم ہوئی اور نسبت پیداوار ۹۰ فیصدی دوسرے کھیت میں زائد تھی۔ اسی قسم کے بہت کثرت سے مختلف نباتات اور پھولوں پر تجربہ کیا گیا ہے اور نتیجہ یقینی اور بدیہی طور پر یہی نکلا ہے کہ بالائی بنفشی شعاع نباتات کے لئے مفید ترین ہے۔

کاشتکاروں کے ایک تجربہ کار گروہ نے چند سور ایک ہی قسم کے پالے بعض ویسے ہی رہے اور بعض کو یومیہ چند منٹ (کوارٹز) کی مصنوعی روشنی کے سامنے رکھا گیا اس مصنوعی روشنی میں بالائی بنفشی شعاع پیدا ہو جاتی ہے۔ دس ہفتہ کے تجربہ کے بعد دونوں قسم کے سور بازار میں فروخت کی غرض سے لائے گئے۔ وہ سور جو بالائی بنفشی شعاع کے سامنے چند منٹ یومیہ رہے تھے وزن قد و قامت میں دوسرے سوروں کے

زائد تھے اور اُن کی قیمت بھی بہت زیادہ حاصل ہوئی۔

ایسے ہی ایک تجربہ مرغیوں پر کیا گیا ایک ہی قسم اور نسل کی چند مرغیاں لی گئیں اور ان کو معمولی طریقہ سے پرورش کیا گیا انھوں نے ۱۲۴-انڈے ۱۶ ہفتہ میں دئے۔ اسی قسم کی دوسری مرغیوں نے جو یومیہ دس منٹ اس شعاع حیات کے سامنے رکھی گئیں تھیں اُسی مدت میں ۷ ۹ ۴-انڈے دئے موخرالذکر انڈوں میں اول الذکر کے مقابلہ میں مادہ کیلیشیم (چونے کے اجزار) کی مقدار بہت زیادہ تھی جس سے یہ غذا انسانوں کے لئے بہت زیادہ مفید ہو گئی۔

مذکورہ بالا تجربوں سے یہ بدیہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ شعاع بالائی بنفشی صحت وقوت اور انکے اجسام کے لئے نہایت درجہ مفید ہے۔

دیگر تجارب ومباحث علمیہ کی رو سے شعاع زیرین سُرخ بھی لازمہ حیات اور نباتات وحیوانات کے اجسام میں صحت وقوت کے عناصر بڑھانے کے لئے بہت مفید ہے لازماً یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ہم آج کل ایسے دور سے گذر رہے ہیں کہ آفتاب کی روشنی باغبان وکاشتکار اور مویشی پالنے والوں کے لئے یکساں مفید ثابت ہوتی جاتی ہے۔ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ والدین اپنی اولاد کے لئے ایسے انڈوں اور اس دودھ کی خریداری سے انکار کر دیا کریں گے جس میں شعاع حیات کم حاصل کی گئی ہوگی۔ اور اُس دودھ اور انڈے کی زائد قدر ہوگی جس کے حصول میں ان علمی طریقوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہوگا بہ الفاظ واضح وہ انڈے پسند کئے جاویں گے جن کی دینے والی مرغیاں شعاع حیات کے سامنے رکھی گئیں اور اس گائے کا دودھ مقبول ہوگا۔ جو شعاع حیات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوئی ہے

~ ⁂ ~

تغیر صفات

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان علمی مباحث نے انسانی اذہان وافکار میں عجیب وغریب انقلاب پیدا

کردیا ہے اور اس انقلاب کی لہر علم کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔ انسان اپنی فکر اپنی عادات میں اپنے لباس وغیرہ غرض اکثر چیزوں میں تغیر کرنے پر مجبور ہوگیا ہے۔

ایک معدنیات کا انجنیر کانوں میں اپنے کاموں کے لئے مجبور ہے کہ اسی قسم کے مصنوعی شعلے استعمال کرے۔ ایک کیمیا کا فاضل ایک طبیعیات کا ماہر سب اپنے اپنے کاموں کے لئے اس کے محتاج نظر آرہے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانہ دار لیبوریٹری کے مالک سب کو اس کی حاجت ہے (لاشعاع) X ریز کے عجیب و غریب اعمال و تجارب دیکھے گئے ہیں۔ جس طرح یہ اجسام کے نمو کے لئے مفید ہے اسی طرح بعض صفات اجسام میں اُن سے تغیر بھی ہو جاتا ہے۔ یہ بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ بعض حیوانات جب لاشعاع کے اثر میں لائے گئے تو ان میں سے قوت توالد و تناسل فنا ہوگئی بعض حشرات پر اس کا تجربہ کیا گیا اُن میں جدید صفات نمایاں ہوئیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ لاشعاع (ایکس ریز) نشو و ارتقاء کی حرکت کو تیز کر دیتی ہے۔

بعض بعض رنگین چوہوں پر تجربہ ہوا بعض سفید رنگ والوں نے بھورا رنگ اور بعض بھورے رنگ والوں نے سفید رنگ اختیار کر لیا۔

ان تمام مثالوں اور نظیروں سے یہ اچھی طرح ثابت ہوگیا کہ یہ شعاعیں نباتات میں کیسے کیسے عجیب و غریب تغیرات اور قوت و ضعف پہونچا سکتے ہیں۔ یہ بھی تجربہ کیا گیا ہے کہ بعض بعض خوشبودار اور خوشنما پودے جیسے تمباکو وغیرہ جب لاشعاع (x ریز) کے سامنے رکھے گئے تو ان کی خوشبو و خوشنمائی میں بمقابلہ پہلے کے خاص بیشی ہوگئی۔

اور انسانی خون جب لاشعاع (x ریز) کے سامنے لایا گیا تو اس میں امراض کی مدافعت کرنے کی قوت کمزور ہوگئی

باوجود اس کے لاشعاع (اکس ریز) اور شعاع گما (γ Rays) یعنی گاما ریز کے ذریعہ سے مرض سرطان کا نہایت کامیاب علاج ہوتا ہے کیونکہ وہ جراثیم جو مرض سرطان کا سبب ہیں وہ ان شعاعوں سے ہلاک ہو جاتے ہیں اور اصلی خون میں کوئی نقصان نہیں واقع ہوتا وہ خلیے جو مفید ہیں باقی رہتے ہیں۔

ایک غلط فہمی اس وقت یہ بھی مروج ہو گئی ہے کہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ لاشعاع (اکس ریز) صرف طب ہی میں مستعمل ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ طب میں تو ایک یا صرف چند اغراض کے لئے لاشعاع مستعمل ہوتی ہے لیکن دوسری اغراض کے لئے خصوصاً صنعتی غرض کے لئے تو وہ ہزاروں ضرورتوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ تمام آلات و اوزار جو کسی سخت چیز یا ایلیومونیم یا لکڑی کے بنائے جاتے ہیں۔ ان کی اندرونی تشخیص لاشعاع ہی سے کی جاتی ہے اور اسی سے ان کی اندرونی جانچ ممکن ہے۔ کیونکہ کسی لکڑی کے اندر یہ معلوم کرنا کہ یہ اندر سے کھوکلی ہے یا ٹھوس یا اس میں کہیں گوند ہے یا بالکل عمدہ حالت میں ہے ایسی معلومات انجنیری کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہیں، اور یہ جو صرف لاشعاع کے ہی ذریعہ حاصل ہو سکتی ہیں۔

معمار لوگ جب لکڑی کی بڑی بڑی عمارتیں تیار کرتے ہیں تو ان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ لکڑی کے اندرونی حالت اور اس کی قوت سے کما حقہ واقفیت حاصل کریں اور لکڑی کی اندرونی حالت کا بسا اوقات علم معمولی طور سے نہیں ہو سکتا اس وقت لاشعاع (اکس ریز) کی مدد معاون ہوتی اور ان کو وہ سب کچھ بتا دیتی ہے جو اور طریق پر ممکن نہیں۔

اسی طرح کانوں کے انجنیر بہت سے اچانک حادثات سے اس کے ذریعہ محفوظ ہو گئے ہیں اور وہ لاشعاع کے ذریعہ تمام ان اشیاء کا معائنہ کر سکتے ہیں ان کی اندرونی حالات سے واقفیت حاصل کر سکتے ہیں جن پر بہت کچھ ان کے کام کا دارومدار ہے موٹروں ریلوں میں جو حادثات کان کے اندر پہلے ہوا کرتے تھے اب لاشعاع کی بدولت اس میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ لاشعاع کے ذریعہ سے ایک عجیب و غریب اقتصادی راز حل ہو گیا ہے مختلف پتھر کے کوئلوں میں اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ کس قدر حصہ راکھ ہے اور کس قدر حصہ جلانے کے قابل۔ کیونکہ جو حصہ جلنے کے قابل ہوتا ہے وہ لاشعاع پڑنے سے شفاف ہو جاتا ہے اور نہ جلنے والا حصہ یا وہ راکھ جو کیلسیم اور لوہے کے نمک سے مرکب ہوتی ہے غیر شفاف رہتا ہے۔ اس انکشاف سے دنیائے اقتصادیات کو جو منافع پہونچے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

شعاع اور صحت

چونکہ جمہور کی توجہ لاشعاع اور اس کے صنعتی منافع پر اتنی نہیں ہے جتنی شعاعوں کے اس قسم پر مبذول ہے جو لاشعاع اور شعاع مرئی یعنی بالائی بنفشی شعاع کے بین بین ہے اور یہ ظاہر ہے کہ بالائی بنفشی شعاعیں (وٹامن) (ڈی) کی تولید کا باعث ہیں۔ کیونکہ یہ جلد کو جلاتی ہوئی خون میں نفوذ کر جاتی ہیں اور اجزا رفیتامن (وٹیامن) پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں جس کا وجود کیلشیم اور فاسفورس کے لئے ناگزیر ہے کہ یہی دونوں اجزا رغلیوں کی بنیاد ہیں۔

اگر مقدار فیتامین جسم میں ناقص ہو تو خوراک سے اس کمی کو پورا کیا جاتا ہے لیکن اس طرح وہ کافی فوائد نہیں حاصل ہوتے جو بالائی بنفشی شعاع کے ذریعہ سے خون کو حاصل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جب جلد بالائی بنفشی شعاع سے محروم رہتی ہے تو یہ دونو عناصر جسم میں مشکل پیدا ہوتے ہیں۔ امراض کی مدافعت کم ہو جاتی ہے اور جسم مختلف امراض کے حملوں کا آماج گاہ بن جاتا ہے اور اکثر اوقات ہاتھ پاؤں بے کار ہو جاتے ہیں بچوں کی ہڈیاں کمزور ہوتی ہیں جوانوں اور بوڑھوں میں نشاط و خوشی اور ان سے نفع اٹھانے کا حوصلہ کم ہوتا ہے زکام کا حملہ ایسے اجسام پر جلد ہوتا ہے اور قوت مدافعت کافی نہ ہونے کے سبب سے ایسے اجسام زکام کا جلد شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اور بہت سے نقائص پیدا ہوتے ہیں۔ ان تمام امور کا ثبوت ممالک متحدہ امریکہ میں متعدد تجربات کے بعد فراہم کیا گیا اور حفظان صحت کے مرتبہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوا کہ اوائل موسم بہار میں اموات کی تعداد بمقابلہ سال کے دوسرے حصوں کے زیادہ پائی جاتی ہے۔ کیونکہ سردیوں میں آفتاب کی روشنی کم پڑتی ہے اور اجسام کو امراض کے مدافعت کے لئے کافی مواد نہیں ملتا۔ اس لئے تعداد اموات زیادہ ہوتی ہیں امراض اجسام پر حملہ کرتے ہیں اور مدافعت نہ ہونے کے سبب سے حملہ کامیاب ہوتا ہے اور موت واقع ہو جاتی ہے۔ یہ بھی ظاہر کرنا ضروری ہے کہ یہ مفید شعاعیں نہایت معمولی روک سے بھی جسم انسانی تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہیں مثلاً ابر۔ غبار۔ دھند جو فضا میں ہو یا کانچ والی کھڑکیاں جن میں سے دھوپ اور روشنی نفوذ کر جاتی ہے ان مفید شعاعوں کے نفوذ سے مانع ہوتی ہیں۔

بعض مباد مات

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تموجات یا لہریں بہت مختلف ہیں ان کی چھوٹی لہروں کا اثر خود اُن کے بڑی لہروں کے اثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے اسی طرح لا شعاع x ریز کی بڑی لہروں کا اثر اس کی چھوٹی لہروں سے اثر میں مختلف ہے۔ یہ بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ اس وقت تک جتنی قسم کی شعاعیں دریافت ہوئی ہیں ان سب کی لہروں میں یعنی خود ان ہی شعاعوں میں چھوٹی بڑی طویل و قصیر کا فرق ہے اور ان کے اثرات میں بھی فرق ہے یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک جانب کی لہروں میں دوسری جانب کی لہروں کے مقابلہ میں طول میں نمایاں فرق ہے یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ نور الابیض (سفید روشنی) کی لہروں میں اور سرخ رنگ کی لہروں میں اور بالائی بنفشی شعاعوں کے ایک طرف لہروں کا طول کچھ ہے اور دوسری طرف کچھ غرض اختلاف ظاہر ہے۔ بالائی بنفشی شعاع اور لاشعاع اکس ریز میں ہی اسی قسم کا تباین و فرق مشاہدہ ہوا ہے۔

اس اصول کو پیش نظر رکھ کر ہم نے غور کیا تو ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ جو شعاعیں بالائی بنفشی شعاعوں سے ملتی ہوئی ہیں وہ بالائی بنفشی شعاعوں سے زیادہ طویل ہیں ان میں بھی بعض بعض مفید اثرات صحت کے لئے موجود ہیں مگر ان میں خون کے مضر جراثیم کو ہلاک کرتے اور وٹامین (د) کو پیدا کرنے کی قدرت نہیں۔ ان کی دوسری طرف جو شعاعیں ہیں ان کا کوئی حصہ صحت پر کسی قسم کا خاطر خواہ اثر ڈالنے والا نہیں ہے۔ وہ شعاعیں جو ان کے درمیان میں ہیں ان کے متعلق ہمیں یہی کہنا ہے کہ یہی شعاع حیات ہیں۔

لاشعاع ایکس ریز اور بالائی بنفشی شعاع کے درمیان جو شعاعیں ہیں۔ ان کو علمار طبیعیات خوب جانتے ہیں لیکن ابھی تک ان کا حیاتیاتی فعل علمار ترکیب الاجسام (فزیالوجی) کے نزدیک نامعلوم ہے ممکن ہو کہ ہم ان سے کبھی واقف ہو جائیں اور ان کے مفید و مضر اثر معلوم کرسکیں۔ ممکن ہے کہ ان شعاعوں کا بھی کوئی نہ کوئی مفید اثر صحت و حیات کے لئے مدثابت ہو لیکن ابھی پوری تحقیقات ہو کر قابل اطمینان نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ امید ہے کہ یہ صنعت و صحت دونوں کے لئے یکساں مفید ہوں گی۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان لہروں یا موجوں کی ایک لہر یا موج کا ہم کو کوئی نہ کوئی اصطلاحی نام رکھنا پڑے گا اس لئے (انجسٹرم) کا لفظ وضع کیا گیا ہے ایک لہر یا موج کے پیمائش کے لئے ایک انجسٹرم ہے جو ایک ملیمیٹر کا ایک کروڑواں حصہ ہے باوجود اس قدر چھوٹا اور حقیر ہونے کے علمار نے ریڈیم کے ایک شعاع کا طول جو سرطان کے علاج میں بے حد مفید ہے ۰۱ انجسٹرم تک معلوم کر لیا ہے ۔ لاشعاع (ایکس ریے) کا طول ۵۰۰ انجسٹرم تک پہونچا ۔ بالائی بنفشی شعاع کا طول (یعنی لہروں یا موجوں کا طول) دو ہزار انجسٹرم سے (۳۹۰۰) انجسٹرم تک معلوم ہوا ہے، وہ چھوٹی سے چھوٹی لمبائی جو آنکھ سے دیکھی گئی ہے ۔ وہ بنفشی شعاع میں ۳۹۰۰ سے ۷۷۰۰ تک ہے ۔ اور اسی شعاع میں ۵ لاکھ انجسٹرم کا طول بھی دیکھا گیا ہے ۔

ان امور میں جب غور کیا گیا اور ان کی قوتوں کی جانچ کا وقت آیا تو علمار نے معلوم کیا کہ لہروں کا طول قوت کی نوعیت معین کرتا ہے ۔ اور انھی سے روشنی حرارت یا آواز حاصل ہوتی ہے ۔ اگر ہوا میں یہ لہریں بڑی بڑی پیدا ہو گئی ہیں ۔ یہاں تک کہ چند فٹ کی لہریں ہیں تو ہوا نہایت سست رفتار ہوگی ۔ کان آسانی سے آواز سن سکتے ہیں لیکن اگر لہریں ہوا میں چھوٹی چھوٹی ہوں اور روشنی تیزی کے ساتھ آئے تو اس وقت کان آسانی کے ساتھ نہیں سن سکتے ۔ اسی طرح جبکہ شعاعیں اپنی لہروں یا موجوں کو نہ حد سے بڑی نہ حد سے چھوٹی بناتی ہوں تو ہم ان کو آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں ورنہ نہیں ۔ چنانچہ لاسلکی کی لہریں یا موجیں جب کبھی طول میں بیس ہزار میٹر ہو جائیں تو وہ بھی نظر نہیں آئیں گی ۔ اسی طرح لاشعاع (اکس ریز) کی لہریں یا موجیں بہت ہی چھوٹی ہوتی ہیں ۔ اور یہی وجہ ان کی تیز رفتاری کے ہوتی ہے اور ان کو ہم صاف و صریح طور پر دیکھنے سے قاصر رہتے ہیں ۔ اسی طرح زیرین سرخ شعاع کی لہر طویل اور بہت تیز رفتار ہوتی ہے اس کو بھی نہیں دیکھتے ۔ لیکن جسم اس کی گرمی محسوس کرتا ہے ۔ اس کے انکشاف اور اس کی قوت کا اندازہ کرنے کے لئے آلات ایجاد ہو چکے ہیں ۔

شعاع بالائی بنفشی کو آنکھ نہیں دیکھ سکتی کیونکہ وہ بے حد چھوٹی اور نہایت ہی تیز رفتار ہوتی ہے لیکن فوٹو گرافی کی پلیٹیں اس کے اثر کو محسوس کرتی ہیں ۔

بالائی بنفشی شعاع چونکہ حد سے زیادہ چھوٹی ہوتی ہیں ان کا مضر اثر جلد اور آنکھ پر ہوتا ہے لیکن

فضار آسمانی میں اوازون جو ایک قسم کی اکسیجن گیس ہے ان شعاعوں کی بڑی مقدار کو روک دیتی ہے اور سب کو سطح زمین تک نافذ نہیں ہونے دیتی ۔

ہم پہلے ہی یہ ظاہر کر چکے ہیں کہ اس شعاع کا طول زیادہ سے زیادہ ۳۹۰۰ انجسٹرم ہوتا ہے ۔اور کم سے کم دو ہزار انجسٹرم ہے ۔لیکن انسانی جسم کے لئے مفید وہ شعاع ہے جوان کے وسط میں ہو نہ زیادہ سے زیادہ لانبی ہو اور نہ چھوٹی سے چھوٹی ہو ۔ اس لئے مفید ترین شعاع جسم کے لئے وہی ہے جس کا طول ۳۲۰۰ انجسٹرم ہو لیکن جو شعاع اس سے بہت زیادہ چھوٹی ہوگی وہ مفید ہوگی اوزون اس قسم کی تمام ان شعاعوں کو فضار آسمانی میں روک دیتا ہے جن کا طول ۲۹۵۰ انجسٹرم سے کم ہو ۔اس لئے ہمارے لئے صرف وہی شعاع مفید ہے جو ۳۲۰۰ اور ۲۹۵۰ انجسٹرم کے درمیان میں ہو ۔ اور اس کا سبب ہم بیان کر چکے ہیں ۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کانچ تمام ان شعاعوں کو روک دیتا ہے جن کا طول ۳۲۰۰ انجسٹرم سے کم ہو ۔ یہی ایک سخت ترین مشکل ہے جس کے دفعیہ کی علمار کوشش کر رہے ہیں ۔صناع بھی اسی فکر میں ہیں کہ ایسا کانچ طیار کیا جائے کہ جو ان شعاعوں کو نہ روکے لیکن ابھی تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے تاہم بعض بعض عالم کسی قدر اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے جاتے ہیں ۔

ان شعاعوں کے منافع

یہ ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ ان شعاعوں سے فیتامین (ویٹامین) (د) کے جسم میں افزائش ہوتی ہے جس کے سبب سے کیلشیم اور فاسفورس پیدا ہوتا ہے ۔اور وہ خون میں مفید ذرات پیدا کر کے جراثیم کو ہلاک کرنے کی قوت بڑھا دیتی ہے ۔ اس کے علاوہ دانت کے ڈاکٹر مرض پائریا کا بھی علاج ان شعاعوں سے کرتے ہیں ۔

بعض علمار ان شعاعوں سے ان حوضوں اور تالابوں کے پانی کو بھی صاف کرتے ہیں جو نہانے یا پینے

کے کاموں میں لایا جاتا ہے۔ تجربہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ پانی کی کسی لہر کو جس کی گہرائی چند انچ ہو ایسے طاقت ور لیمپ کی مدد سے جس سے یہ شعاع نکلتی ہو جراثیم سے پاک کیا جا سکتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ان شعاعوں کے مدد سے جو صفائی ہوتی ہے اس میں پانی کے مزے میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا مصارف صفائی بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ بلکہ ایک صاحب جو ان شعاعوں کے طرفداروں میں ہیں ثابت کرتے ہیں کہ دیگر ذرائع سے جو پانی صاف ہوتا ہے اس کے مقابلے میں یہ پانی جسم کے لئے زیادہ مفید اور عمدہ ہے۔ بلکہ اگر یہ پانی ایسے کھانے میں جس میں قوت نمونہ ہو ملایا جائے تو اس کھانے میں شعاع کا اثر آجائے گا یعنی قوت نمو پیدا ہو جائے گی۔ لیکن اس کا خیال رکھنا لازم ہے کہ اس پانی میں اس کے بعض مفید اجزار باقی رہیں۔ کیوں کہ یہی مفید اجزار شعاع سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور کاڈلیور آئل میں فیتامن (د) پیدا ہونے کا یہی سبب بھی ہے۔ سمندر کے پانی میں بھی بعض نہایت باریک زندہ اجسام ہیں۔ جو محض آفتاب کی روشنی سے متاثر ہوتے ہیں اور اسی کے اثر سے ان میں (وٹیامن (د) پیدا ہوتی ہے۔ ان اجسام حیات میں فیتامن (وٹامن د) محفوظ رہتی ہے ان اجسام کو چھوٹی چھوٹی مچھلیاں کثرت سے کھاتی ہیں ان مچھلیوں کو بڑی مچھلیاں کھاتی ہیں اس طرح مادہ فیتامن منتقل ہوتا ہوا اس مچھلی تک پہونچتا ہے جس کے جگر سے تیل حاصل کیا جاتا ہے جب یہ بڑی مچھلیاں ان مچھلیوں کو کھاتی ہیں اور فیتامین اجزار (وٹامن) ان کے جسم میں ذخیرہ ہو جاتے ہیں تو یہ مچھلیاں شکار کی جاتی ہیں اور ان کا تیل نکالتے اور فروخت کرتے ہیں۔ جو بہت مفید ہوتا ہے علمار سلف نے بھی یہ بات دریافت کرلی تھی کہ مچھلی کا تیل اکثر حالتوں میں بعض امراض کے لئے نہایت درجہ شفا بخش ہے۔ خصوصاً ہڈیوں میں طراوت و تازگی پیدا کرنے کے لئے تو یہ خاص دوا ہے اگرچہ یہ لوگ اس کے خاص وجہ نہ دریافت کر سکے ہوں کہ یہ کیوں مفید ہے لیکن مفید ہونا وہ دریافت کر چکے تھے۔

نہایت عجیب و غریب دریافت ان شعاعوں کی بابت وہ ہے جو بعض علمار فرانس نے کی ہے۔ یعنی سانپ کے زہر کے ساتھ ان شعاعوں کا کیا عمل ہوتا ہے۔ یہ بات تجربہ سے مانی گئی تھی اور عام طور سے مشہور تھی کہ صحرائی سانپ بمقابلے دوسرے سانپ کے بہت زہریلا ہوتا ہے۔ اس شہرت کی بنا پر

بعض علمار فرانس نے معمولی سانپ کا زہر لیا، اس کے دو برابر حصّے کئے، ایک حصّہ کو بالائی بنفشی شعاع کے سامنے رکھا دوسرے حصّہ کو ویسے ہی رہنے دیا۔ اب ان دونو زہروں کی آزمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ زہر جو بالائی بنفشی شعاع کے سامنے رکھا گیا تھا اثر میں بہت زیادہ خطرناک اور نہایت مہلک ہے۔

شعاعیں اور سیاح پرندے

اکثر علمار ان شعاعوں کا تجربہ ان پرندوں پر کر رہے ہیں جو اپنے ملک سے دوسرے ملک کو ایک خاص موسم میں سفر کرتے نظر آیا کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمارا یہ کہدینا کافی نہیں ہے کہ فضار آسمانی کا تغیر ان پرندوں کو اپنے ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت پر آمادہ کرتا ہے۔ اس لئے تحقیق کی غرض سے علمار کنیڈا نے اس پر توجہ کی تو معلوم کیا کہ ان پرندوں کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں ہجرت پر آمادہ کرنے کا سبب وہ تغیر ہے جو پرندے کے آفتاب کی روشنی میں زیادہ یا کم مدت تک رہنے سے بعض غدودوں میں پیدا ہو جاتا ہے ان علمار نے ان پرندوں کے مختلف قسموں پر شعاع حیات کا اثر ڈالا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو اس ملک سے اس موسم میں پیش اپنے ان ہم جنسوں کے ہجرت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی جن کا علاج ان شعاعوں کے ذریعہ نہیں کیا گیا تھا۔

اب ہم اس بحث کے اس حصّہ پر آگئے ہیں جو سب سے زیادہ عجیب اور سب سے زیادہ حیرت ناک ہے۔ یہ عجیب ترین چیز انسانی غدودوں پر ان شعاعوں کا اثر ہے جو روز روشن کی طرح واضح اور آفتاب کی طرح ظاہر ہے۔

ان امور پر کثرت سے بحث کرنے کے بعد علمار اس امر کے قائل ہوگئے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو صرف غدودوں کے تغیر و تبدل سے بہت سے امراض انسانی کا علاج ممکن ہے اور یہ صرف اس طرح ہوگا کہ غدہ درقیہ و تمامیہ کے سب نقائص بالائی بنفشی شعاعوں سے رفع ہو جائیں گے۔

جب کوئی شخص مریض ہو تو اس کو چاہیئے کہ وہ قابل ڈاکٹر سے مشورہ کرے ڈاکٹر لاشعاع اکس رنیہ یا گامائیر (camera) کے ذریعہ سے مرض اور اس کے اکثر امور دریافت کرے گا۔ اور جن شعاعوں کے ذریعہ سے مناسب ہوگا علاج کرے گا۔

اس طرف بھی کافی توجہ کی جا رہی ہے کہ جہاں تک ہو سکے بڑھاپے کا بھی علاج ان شعاعوں اور غدود لیا کے تعلق سے کیا جائے۔ اور بڑھاپے کے آنے کے زمانہ کو جہاں تک ممکن ہو دور کر دیا جائے اس بارے میں اب تک جو ترقی ہوئی ہے بشرط گنجائش ہم آئندہ اس پر روشنی ڈالیں گے۔

شعاع و حیات نمبر ۲

آفتاب کی روشنی کے مفید ہونے پر جو جدید دلائل قائم کئے گئے ہیں ان میں جزائر اسلنڈ افاروز اور اس کے قرب و جوار کے باشندوں کی صحت نمایاں درجہ رکھتی ہے۔ جزائر اسلنڈ کے باشندوں کو مرض کساح یا ایسی قسم کا کوئی دوسرا مرض نہیں ہوتا۔ ان کے قویٰ کبھی بے کار نہیں ہوتے۔ مگر جزائر فاروز کے باشندے جو اسلنڈ سے دو سو میل دور ہے کساح جیسے امراض میں بہت مبتلا ہوتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے باشندوں کی خوراک وغیرہ تقریباً ایک ہی قسم کی ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ اسلنڈ کے باشندے آفتاب کی روشنی سے کافی فائدہ حاصل کرتے ہیں لیکن فاروز کے باشندے اس سے ایک حد تک محروم رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جزائر فاروز کے پاس ایک خلیج ہے جس کی وجہ سے سال کے اکثر حصہ میں بادل رہتے ہیں جزائر فاروز ان بادلوں کی کثرت سے کافی روشنی آفتاب کی حاصل نہیں کر سکتے۔ خصوصاً شعاع بالائی بنفشی سے تو وہ محروم ہی سے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں چھ یا آٹھ روز سے زائد آفتاب کی روشنی پوری پوری ان کو نہیں ملتی۔ بہت غور و خوض اور کافی توجہ سے جو ہم حساب مرتب کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے ۹۰ گھنٹے زیادہ سے زیادہ ان کو دھوپ اور روشنی میسر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے اہل اسلنڈ کافی دھوپ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ موسم گرما میں ان کے یہاں رات کو دس بجے تک شفق کا اثر رہتا ہے یہ بھی قیاس کیا گیا ہے کہ

شعاع بالائے بنفشی کی بڑی مقدار شفق کے ذریعہ بھی ہمیں حاصل ہوتی ہے ۔ اہل اسلنڈا کی صحت کی تحقیقات کے لئے جو ایک علمی کمیٹی مقرر کی گئی تھی اس کی رپورٹ ہے کہ اہل اسلنڈا کو جو اعلیٰ صحت و تندرستی حاصل ہے اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ موسم سرما میں بھی ان کو بالائی بنفشی شعاع کی کافی مقدار میسر ہوتی ہے اور موسم بہار میں اور گرمی میں توان کو بہت زیادہ یہ مفید شعاع فائدہ پہنچایا کرتی ہے ۔ اور ان کی صحت و تندرستی اور بشاشی کا بڑا اور اہم راز یہی شعاع ہے جو قدرت کی جانب سے ان کو حاصل ہے ۔ اس سلسلہ میں اس علمی کمیٹی نے ایک اور راز فاش کیا ہے کہ اہل اسلنڈا و فاروز دونوں مچھلی کا تیل کھاتے ہیں جس میں بالائی بنفشی شعاع کا اثر کافی ہوتا ہے ۔ اور یہ تیل اور بالائی بنفشی شعاع مرض کساح کے لئے مفید ہے پھر کیا وجہ ہے کہ ۵۵ فی صدی بچے فاروز کے مرض کساح میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ اس کا جواب اس علمی کمیٹی نے یہی دیا ہے کہ بالائی بنفشی شعاع اہل فاروز کو براہ راست نہیں ملتی جس کی انہیں ضرورت ہے ۔

اس تحقیقات کے بعد انجنیروں نے اس طرف توجہ کی کہ مکانات اس قسم کے تیار کئے جائیں کہ زیادہ سے زیادہ بالائی بنفشی شعاع میسر ہوسکے ۔ اور اس قسم کی کھڑکیاں مکان میں رکھی جائیں کہ جو انسانی صحت پر خوشگوار اثر ڈالیں ۔ اور ان شعاعوں کو جہاں تک ممکن ہو نہ روکا جائے ۔ انسان عموماً رات کو سوتا ہے سونے کے کمرے ضروری نہیں ہیں کہ ایسے ہوں جن میں آفتاب کی روشنی بکثرت آئے لیکن دن میں جو استعمال کے کمرے ہوں خصوصاً بچوں کے کھیلنے اور پڑھنے اور خود انسان کے رات دن کے کام کے کمرے وہ ایسے ہونا چاہئیں کہ ان میں کافی مقدار میں دھوپ اور روشنی پہنچتی رہے ۔ ان نتائج پر غور کرکے مشہور اہل قلم مسٹر برنارڈ شا کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی کہ مذکورہ بالا اصول پر مٹی کے گھر یورپ میں تیار کئے جائیں ۔ اور آفتاب کی روشنی اور حرارت بغیر کسی رکاوٹ کے حاصل ہوتی رہے گھر کے دروازوں میں ایسے کانچ استعمال کئے جائیں جو شعاع بالائے بنفشی کو نہ روکیں ان کھڑکیوں کے شیشے ایسے ہوں کہ بالائے بنفشی شعاعیں ان میں سے نفوذ کر جائیں ۔ فرانس میں اس اصول پر بعض مکانات ایسے تعمیر کئے گئے جو آفتاب کے ساتھ ساتھ بجلی کی طاقت سے حرکت کرتے ہیں اور روشنی اور حرارت برابر لیتے رہتے ہیں ۔ امریکہ میں ایک کمپنی قائم ہوئی ہے جس نے ویٹا گلاس یعنی مذکورہ بالا قسم کے کانچ تیار کرنا شروع کردئے

بجلی کے لیمپ

ان اصولوں کو تسلیم کرنے والوں نے ایک بجلی کا لیمپ اس قسم کا بنایا ہے کہ اس کی شعاعیں حاصل ہونے کے بعد بالا ئی بنفشی شعاع کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس طرح کے بجلی کے لیمپوں میں سب سے زیادہ اہم لیمپ جو اس وقت تک ایجاد ہوئے ہیں۔ وہ قوسی شکل کے برقی لیمپ ہیں۔

لیکن یہ خیال رہے کہ ان لیمپوں میں وہ جن کی برقی قوت ضعیف ہوتی ہے فائدہ میں بہت کم اور بعض وقت بالکل بے فائدہ ثابت ہوتے ہیں۔ جب اس شعاع کے فائدے یا نقصان پر بحث ہو اور احتمال ہو ان سے فائدہ ہوگا یا نقصان تو اس وقت ان کے استعمال سے پہلے کسی ماہر فن ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے، ورنہ ایسی جرأت نہ کرنا چاہئے۔

اب ایک اور طریقہ بھی ہے جس پر ہمیں روشنی ڈالنا چاہئے اس سے ثابت ہوگا کہ جسم میں بالائی بنفشی شعاع محفوظ رہتی ہے اور ایسے اجسام جن میں بالا ئی بنفشی شعاع محفوظ ہو کھانے میں انسان کے لئے بہت ہی مفید ہیں۔ اور ایسے کھانے تولید (حیاتین) (وٹامن د) کا بڑا سبب ہوتے ہیں جیسے چاکولیٹ جو اس خصوصیت کے ساتھ بعض کمپنیوں نے طیار کئے ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ بالا ئی بنفشی شعاع کا اثر براہ راست مادہ کوسٹرل پر ہوتا ہے جو جسم انسان میں ہر ہر چیز پر اثر کرتا ہے یعنی خون۔ صفرا۔ تلی۔ جگر۔ دماغ۔ جلد مسامات اور بالوں کی جڑ تک اس سے متاثر ہوتی ہیں یہی مادہ شعاع بالائی بنفشی سے متاثر ہوتا اور اس کو اخذ کرتا رہتا ہے۔ وہ غذا جو اس شعاع سے متاثر ہو چکی ہے وہ بھی معدے میں جاکر کولسٹرول مادہ کی طرف مستحیل ہو جاتی ہے اور پھر یہ مادہ اپنے موقع پر مادہ ارجسٹرول بنکر آفتاب کی روشنی سے حیاتین بن جایا کرتا ہے۔ چربی اور روغنیات مادہ کوسٹرول میں شامل ہو جایا کرتی ہیں اور ایسی ہی قسم کی اشیاء اور مچھلی کا تیل خاص طور پر یہ صفات زیادہ رکھتا ہے اور یہی سبب ہے کہ وہ مرض کساح کی سب سے زیادہ مدافعت کی قوت رکھتا ہے۔ یہ سب اشیاء ایسی صورت میں مفید ہیں جبکہ شعاع بالائی بنفشی کے سامنے رہی ہوں۔

معصوم بچہ

(۱)

گنگو کو لوگ برہمن کہتے ہیں۔ اور وہ اپنے کو برہمن سمجھتا بھی ہے۔ میرے سائیس اور خدمت گار مجھے دور سے سلام کرتے ہیں، گنگو مجھے کبھی سلام نہیں کرتا وہ شاید مجھ سے پالاگن کی توقع رکھتا ہے۔ میرا جھوٹا گلاس کبھی ہاتھ سے نہیں چھوتا اور نہ میری کبھی اتنی ہمت ہوئی کہ اس سے پنکھا جھلنے کو کہوں۔ جب میں پسینے میں تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا تو گنگو آپ ہی آپ پنکھا اٹھا لیتا ہے، لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے اور میں بھی نہ جانے کیوں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیتا ہوں۔ تیز مزاج آدمی ہے، بات کی مطلق برداشت نہیں۔ ایسے بہت کم آدمی ہیں جن سے اس کی دوستی ہو، سائیس اور خدمت گار کے ساتھ بیٹھنا شاید وہ کسرِ شان سمجھتا ہے۔ میں نے اسے کسی سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ کبھی میلے تماشے میں جاتے دیکھا۔ حیرت یہ ہے کہ اُسے بھنگ بوٹی سے بھی شوق نہیں جو اس طبقے کے آدمیوں میں ایک غیر معمولی وصف ہے۔ وہ کبھی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور نہ اُسے ندی میں اشنان کرنے کا خبط ہے۔ بالکل ناحرف شناس آدمی ہے لیکن پھر بھی وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اسی شان سے قابض ہیں۔ گویا انھوں نے خود پیدا کی ہو تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے۔ جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ یہی اس کا ترکہ ہے۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اپنے ملازموں سے بہت کم بولتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا اپنا لیمپ جلا لینا، یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا اس سے کہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے کہ ہنگن اور میکو کو

بیکاروں۔ اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اعتباری کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے مزاج سے واقف ہوگئے ہیں۔ اور بلا ضرورت میرے پاس بہت کم آتے ہیں۔ اس لئے ایک دن علی الصباح جب گنگو میرے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تو مجھے کچھ ناگوار گذرا۔ یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لئے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لئے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں۔ میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بیباق کر دیتا ہوں۔ اور بیچ میں جب کوئی کچھ مانگتا ہے تو مجھے غصہ آجاتا ہے۔ کون دو، دو، چار، چار روپے کا حساب رکھتا پھرے۔ پھر جب کسی کو منہ بھری مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اسے پندرہ دن میں خرچ کردے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے۔ اور شکایتوں سے تو مجھے نفرت ہے۔ میں شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یا خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینہ کوشش۔

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ کیا معاملہ ہے۔ میں نے تو تمھیں بلایا نہیں۔

گنگو کے تیکھے۔ بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی لجاجت۔ کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا۔ آخر کیا بات ہے؟ کہتے کیوں نہیں۔ تم جانتے ہو یہ میری ہوا خوری کا وقت ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ تو آپ ہوا کھانے جائیں۔ میں پھر آجاؤں گا۔

یہ صورت اور بھی پریشان کرنے والی تھی۔ اس رواداری میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگذشت کہہ سنائے گا۔ وہ جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے دوسرے موقع پر تو کمبخت گھنٹوں روئے گا۔ میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہو۔ لیکن غور وخوض کو جو میرے لئے انتہائی مصروفیت ہے وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی وقت آکر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔

میں نے تلخی کے ساتھ کہا۔ کیا کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو۔ میں پیشگی نہیں دیتا۔

جی نہیں سرکار۔ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی۔

تو کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے۔

جی نہیں سرکار۔ میں نے تو کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔

تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟

گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ گویا کوئی جست لگانے کیلئے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ آخر اس نے کہا۔ مجھے اب آپ چھٹی دیدیں۔ میں آپ کی نوکری اب نہ کر سکوں گا۔ یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خودداری کو چوٹ لگی میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں اپنے ملازموں سے کبھی سخت کلامی نہیں کرتا، اپنی آقائیت کو حتی الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں، اس درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا تحکم کے لہجے میں پوچھا کیوں کیا شکایت ہے

آپ نے تو حضور جیسی نیک طبیعت پائی ہے۔ ویسی کیا کوئی پائے گا۔ لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہو جائے تو آپ کی بدنامی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ کی آبرو میں بٹہ لگے۔

میرے دل میں الجھن پیدا ہوئی۔ دریافت حال کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ہوا خوری کا نشہ اتر گیا توکل کے انداز سے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ تم تو پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے۔ کیا معاملہ ہے؟

گنگو نے مجسم معذرت بن کر کہا۔ بات یہ ہے کہ وہ عورت جو ابھی بدھوا آسرم سے نکال دی گئی ہے۔ وہی گومتی دیو۔ . . . .

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے بے صبر ہو کر کہا۔ ہاں نکال دی گئی ہے تو پھر؟ تمھاری نوکری کا اس سے کیا تعلق ہے؟

گنگو نے جیسے اپنے سر کا بھاری بوجھ زمین پر پٹک دیا۔

میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں حضور

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا یہ پرانے خیال کا بونگا برہمن جسے نئی تہذیب کی ہوا تک نہیں

گی ۔ اس عورت سے شادی کرے گا جسے کوئی بھلا آدمی اپنے گھر میں قدم بھی نہ رکھنے دے گا ۔ گومتی نے محلے کی پرسکون فضا میں تھوڑی سی حرکت پیدا کر دی تھی کئی سال قبل وہ بدھوا آشرم میں داخل ہوئی تھی تین بار آشرم کے منتظموں نے اس کی شادی کر دی مگر ہر بار وہ ہفتہ عشرہ کے بعد بھاگ آئی ۔ یہاں تک کہ آشرم کے سکریٹری نے اب کی بار اسے آشرم سے نکال دیا تھا ۔ وہ اسی محلے میں ایک کوٹھری لے کر رہتی تھی اور سارے محلے کے شہدوں کے لئے دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی ۔

مجھے گنگو کی سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی ۔ اس بے وقوف کو ساری دنیا میں کوئی عورت ہی نہ ملتی تھی جو اس سے شادی کرنے جا رہا ہے جب وہ تین بار شوہروں کے پاس سے بھاگ آئی تو اس کے پاس کتنے دنوں رہے گی ۔ اکوئی گانٹھ کا پورا آدمی ہوتا تو ایک بات بھی تھی ۔ شاید سال چھ مہینے ٹک جاتی ۔ یہ تو محض آنکھ کا اندھا ہے ۔ ایک ہفتہ بھی تو نباہ نہ ہوگا ۔

"میں نے تنبیہ آمیز لہجے میں پوچھا ۔ تم اس عورت کے حالات سے واقف ہو؟"

"گنگو نے عین الیقین کے انداز سے کہا ۔ سب جھوٹ ہے سرکار ۔ لوگوں نے اس کو ناحق بدنام کیا ہے ۔"

"کیا معنی؟ کیا وہ تین بار اپنے شوہروں کے پاس سے نہیں بھاگ آئی؟"

ان لوگوں نے اسے نکال دیا تو کیا کرتی ۔"

"کیسے احمق آدمی ہو ۔ کوئی اتنی دور سے آکر شادی کر کے لے جاتا ہے ۔ ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے ۔ اس لئے کہ عورت کو نکال دے؟"

گنگو نے شاعرانہ جوش کے ساتھ کہا ۔ جہاں محبت نہیں ہے حضور ۔ وہاں کوئی عورت نہیں رہ سکتی ۔ عورت کھالی روٹی کپڑا تو نہیں چاہتی ہے ۔ کچھ محبت بھی تو چاہتی ہے ۔ وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم نے ایک بدھوا سے بیاہ کر کے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے ۔ چاہتے تھے کہ وہ دل و جان کو اس کی ہو جائے ۔ لیکن دوسرے کو اپنا بنانے کے لئے پہلے آپ اس کا بن جانا پڑتا ہے حضور ۔ یہ بات ہے ۔ پھر اسے ایک بیماری بھی ہے ۔ اسے کوئی بھوت لگا ہوا ہے ۔ وہ کبھی بک جھک کرنے لگتی ہے اور بیہوش ہو جاتی ہے ۔

"اور تم ایسی عورت سے شادی کروگے ؟" میں نے شبہ کے انداز سے سر ہلا کر کہا ۔" مجھ لو زندگی تلخ ہو جائے گی ۔"

گنگو نے شہیدانہ سرگرمی سے کہا ۔ میں تو سمجھتا ہوں میری جندگی بن جائے گی ۔ آگے بھگوان جی کی مرجی ۔ میں نے زور دے کر کہا 'تو تم نے طے کر لیا ہے ؟'

ہاں ہجور'۔

تو میں تمہارا استعفا منظور کرتا ہوں ۔'

میں بے معنی رسوم اور مہمل بندشوں کا غلام نہیں ہوں لیکن جو آدمی ایک فاحشہ سے شادی کرے ۔ اسے اپنے یہاں رکھنا اندیشے سے خالی نہ تھا ۔ آئے دن قضیے ہوں گے ۔ نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں گی ۔ کبھی پولیس تحقیقات کرنے آئے گی کبھی مقدمے کھڑے ہوں گے ۔ کیا عجب ہے چوری کی وارداتیں بھی ہوں ۔ گنگو مر بھوکے آدمی کی طرح روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا ہے ۔ روٹی خشک ہے بدمزہ ہے ۔ اس کی اسے پروا نہیں ۔ اس کا عقل سلیم سے کام لینا محال تھا ۔ میں نے اس کے علیحدہ کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی ۔

(۲)

پانچ مہینے گذر گئے ۔ گنگو نے گومتی سے شادی کر لی تھی اور اسی محلے میں ایک کھپریل کا مکان لے کر رہتا تھا وہ اب چاٹ کا خوانچہ لگا کر گذر بسر کرتا تھا مجھے جب کبھی بازار میں مل جاتا میں اس سے فوراً استفسار حال کرتا ۔ مجھے اس کے حالات سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی ۔ یہ ایک معاشرتی مسئلہ کی آزمائش تھی ۔ معاشرتی ہی نہیں نفسیاتی بھی ۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے ۔ میں گنگو کو ہمیشہ خوش و خرم دیکھتا ۔ فراغت اور بے فکری سے چہرے پر جو ایک نفاست اور مزاج میں ایک خودداری پیدا ہو جاتی ہے وہ مجھے یہاں صریحاً نظر آتی تھی ۔ روپے بیس آنے کی روز بکری ہو جاتی تھی ۔ اس میں لاگت نکال کر آٹھ دس روپے بچ جاتے تھے یہی اس کی معاش تھی ۔ مگر اس میں کوئی خاص برکت تھی ۔ کیونکہ اس طبقے کے آدمیوں میں جو بے سروسامانی جو بے غیرتی نظر آتی ہے ان سے وہ پاک تھا ۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور مسرت کی جھلک تھی جو سکون قلب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے ۔

ایک دن میں نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے اطمینان اور پرعافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رسواکن سانحے کسی دل فگار اور تباہ کن تغیر کا منتظر تھا آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔ اب دیکھیں وہ کس طرح منہ دکھاتا ہے۔ اب آنکھیں کھلیں گی اور معلوم ہوگا کہ لوگ جو اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہ کتنے نیک نیت تھے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حضرت کو ایک نایاب چیز ملی جا رہی ہے۔ گویا نجات کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لوگوں نے کتنا سمجھایا کتنا کہا کہ یہ عورت اعتبار کے قابل نہیں کتنوں کو دغا دے چکی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی دغا کرے گی۔ مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اب اس ابلہانہ ضد کا خمیازہ اٹھاؤ۔ اب ملیں تو ذرا مزاج پرسی کروں، کہوں کیوں مہراج۔ دیوی جی کا یہ بردان پاکر خوش ہوئے یا نہیں۔ تم تو کہتے تھے وہ ایسی ہے اور ویسی ہے۔ لوگ اسے محض بدخواہی کے باعث تہمت لگاتے ہیں۔ اب بتلاؤ کون غلطی پر تھا۔ اب آگیا خیال شریف میں کہ حسن فروش عورتوں سے لوگ کیوں احتراز کرتے ہیں۔

اسی دن اتفاق سے بازار میں گنگو سے میری ملاقات ہوگئی۔ بدحواس تھا۔ بالکل کھویا ہوا، گم گشتہ کشتی شکستہ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ندامت سے نہیں، درد سے۔ میرے پاس آکر بولا۔ "بابو جی گومتی نے میرے ساتھ بھی دغا کی۔"

میں نے حاسدانہ مسرت سے لیکن بظاہر ہمدردی کا اظہار کرکے کہا۔ تم سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا لیکن تم مانے ہی نہیں۔ اب صبر کرو۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے۔ روپے پیسے صاف کرے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟
گنگو نے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا میرے اس سوال نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دئے ہیں۔

ارے بابو جی۔ ایسا نہ کہئے۔ اس نے دھیلے کی چیز بھی نہیں چھوئی۔ اپنا جو کچھ تھا وہ بھی چھوڑ گئی۔ نہ جانے مجھ میں کیا برائی دیکھی میں اس کے لائق نہ تھا۔ بس اور کیا کہوں۔ وہ پڑھی لکھی۔ میں کریا اچھر بھینس برابر۔ میرے ساتھ اتنے دن رہی یہی بہت تھا۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اس کی آپ سے کہاں

تک بچھاں کروں بابوجی۔ اوروں کے لئے وہ چاہے جو کچھ رہی ہو۔ وہ میرے لئے کسی دیوتا کا اشیرباد تھی۔ کہ جانے مجھ سے ایسی کیا کھتا ہوگئی مگر کسم لے لیجئے جو اس نے بھول کر بھی کبھی شکایت کی ہو۔ میری اوکات ہی کیا ہے بابوجی۔ اس بارہ آنے روز کا مجور ہوں مگر اسی میں اس کے ہاتھوں اتنی برکت تھی کہ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوئی کبھی میں نے اس کے چہرے پر میل نہیں دیکھا۔

مجھے ان الفاظ سے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا وہ اس کی بے وفائی کی داستان کہے گا اور میں اس کی حماقت پر حاسدانہ ہمدردی کا اظہار کروں گا۔ مگر اس احمق کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔ اب بھی اسی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ ضرور اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔

'میں نے شماتت آمیز ظرافت شروع کی۔ تو وہ تمھارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟'

'کچھ نہیں بابوجی۔ دھیلے کی چیز بھی نہیں۔'

'اور تم سے محبت بھی بہت کرتی تھی؟'

'اب آپ سے کیا کہوں بابوجی۔ وہ محبت تو مرتے دم تک یاد رہے گی۔'

'پھر بھی تمھیں چھوڑ کر چلی گئی؟'

'یہی تو تعجب ہے بابوجی۔'

'تریا چرتر کا نام کبھی سنا ہے۔'

'ارے بابوجی ایسا نہ کہیئے۔ میری گردن پر کوئی چھری بھی رکھ دے تو بھی میں اس کا جس ہی گائے جاؤں گا۔'

'تو پھر ڈھونڈھ نکالو۔'

'ہاں مالک۔ جب تک اُسے ڈھونڈھ نہ لاؤں۔ مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے۔ پھر تو میں اسے لے ہی آؤں گا۔ اور بابوجی۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئے جرور۔ دیکھ لیجیئے گا۔ وہ مجھ سے خفا نہیں تھی۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ جاتا ہوں مہینے دو مہینے جنگل پہاڑ کی خاک چھان لوں گا۔ جیتا رہا تو پھر آپ کے درشن کروں گا۔' یہ کہہ کر وہ مجنونانہ رفتار سے ایک طرف چل دیا۔

اس کے بعد مجھے ایک ضرورت سے نینی تال جانا پڑا ۔ تفریح کے لئے ۔ ایک مہینے کے بعد لوٹا اور ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں گنگو ایک نوزائیدہ بچے کو گود میں لئے کھڑا ہے ۔ شاید کرشن کو پاکر نند بھی اتنے باغ باغ نہ ہوئے ہوں گے ۔ معلوم ہوتا تھا مسرت اس کے جسم سے باہر نکلی پڑتی ہے ۔ چہرہ اور آنکھوں سے تشکر اور نیاز کے نغمے سے نکل رہے تھے کچھ وہی کیفیت تھی جو کسی فاقہ کش سائل کے چہرے پر شکم سیر ہو جانے کے بعد نظر آتی ہے ۔

میں نے پوچھا کہو مہراج ۔ گومتی دیوی کا کچھ سراغ ملا ۔ تم تو باہر گئے تھے ؟

گنگو نے جامے میں پھولے نہ سماتے ہوئے جواب دیا ۔ ہاں بابو جی ۔ آپ کی دعا سے ۔ ڈھونڈھ لایا لکھنؤ کے زنانے ہسپتال میں ملی ۔ یہاں ایک سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر وہ بہت بے قرار ہوں تو بتلا دینا بس سنتے ہی لکھنؤ بھاگا ۔ اور انھیں لے آیا ۔ گھلتے میں یہ بچہ بھی مل گیا ۔

اس نے بچے کو گود میں اٹھا کر میری طرف بڑھایا گویا کوئی کھلاڑی تمغہ پاکر اسے دکھا رہا ہو ۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی ۔ ابھی اس کی شادی کو ہوئے کل چھ مہینے ہوئے ہیں پھر بھی یہ بچے کو کتنی بے حیائی سے دکھا رہا ہے ۔ میں نے تمسخر کے انداز سے پوچھا اچھا یہ لڑکا بھی مل گیا ۔ شاید اس لئے وہ یہاں سے بھاگی تھی ۔ ہے تو تمہارا ہی لڑکا نہ ؟

' میرا کاہے کو ہے بابو جی ، آپ کا ہے ۔ بھگوان کا ہے ' ۔

' تو لکھنؤ میں پیدا ہوا ' ۔

' ہاں بابو جی ۔ ابھی تو کل ایک مہینے کا ہے ' ۔

' تمہاری شادی ہوئے کتنے دن ہوئے ' ۔

' یہ ساتواں مہینہ جا رہا ہے جی ' ۔

' تو شادی کے چھٹے مہینے میں پیدا ہوا ' ۔

' اور کیا بابو جی ' ۔

پھر بھی تمھارا لڑکا ہے ؟

'ہاں جی '

'کیسی بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو '

'معلوم نہیں وہ میرا منشا سمجھ رہا تھا ۔ اسی سادہ لوحانہ انداز سے بولا ۔ گھر میں مرتے مرتے بچی بالو جی یہ بالک جنم ہوا ۔ تین دن تین رات چھٹ پٹاتی رہی ۔ کچھ نہ پوچھئے '

'میں نے اب کی ذرا طنز کے ساتھ کہا ' لیکن چھ مہینے میں لڑکا ہوتے میں نے آج ہی سنا

یہ کنایہ نشانے پر جا بیٹھا ۔ معذرت آمیز تبسم کے ساتھ بولا ۔ مجھے تو بالو جی اس کا خیال بھی نہیں آیا ۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی ۔ میں نے کہا گومتی اگر تمھارا دل مجھ سے نہیں ملتا ہو تو تم مجھے چھوڑ دو ۔ میں اس دم چلا جاؤں گا اور پھر کبھی تمھارے پاس نہ آؤں گا ۔ تمھیں جب کسی چیز کی ضرورت ہو مجھے لکھنا ۔ میں بھر سک تمھاری مدد کروں گا ۔ مجھے تم سے کوئی ملال نہیں ہے ۔ تم میری نظر میں اب بھی اتنی ہی بھلی ہو ۔ اب بھی میں تمھیں اتنا ہی چاہتا ہوں ۔ نہیں اب میں تمھیں اور زیادہ چاہتا ہوں ۔ لیکن اگر تمھارا دل مجھ سے پھر نہیں گیا ہے تو میرے ساتھ چلو ۔ گنگو جیتے جی تم سے بے وفائی نہیں کرے گا ۔ میں نے تم سے اس لئے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو ، بلکہ اس لئے کہ میں تمھیں چاہتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو ۔ یہ بچہ میرا بچہ ہے ۔ میرا اپنا بچہ ہے میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اس کی پھسل کو اس لئے چھوڑ دوں گا کہ اسے کبھی دوسرے نے بویا تھا ۔ یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا ۔

میں کپڑے اتارنا بھول گیا ۔ کہہ نہیں سکتا کیوں ۔ میری آنکھیں پرآب ہوگئیں نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے میری دلی کراہت کے باوجود میرے ہاتھوں کو بڑھا دیا ۔ میں نے اس معصوم بچے کو گود میں لے لیا ۔ اور اس نے پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کا کبھی نہ لیا ہوگا ۔

گنگو بولا ۔ بالو جی آپ بڑے سریف ہیں ۔ میں گومتی سے برابر آپ کا بکھان کیا کرتا ہوں ۔ کہتا ہوں چل ایک بار ان کے درسن کر آ ۔ لیکن مارے سرم کے آتی ہی نہیں ۔

میں اور سریف ! اپنی شرافت کا پردہ آج میری نظروں سے ہٹا ۔ میں نے عقیدت سے

ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ نہیں جی۔ وہ میرے جیسے سیاہ دلوں کے پاس کیا آئیں گی۔ چلو میں ان کے درشن کرنے چلتا ہوں۔ تم مجھے شریف سمجھتے ہو۔ میں ظاہر میں شریف۔ مگر دل کا کمینہ ہوں۔ اصلی شرافت تم میں ہے۔ اور یہ معصوم بچہ وہ پھول ہے جس سے تمہاری شرافت کی مہک نکل رہی ہے۔

میں بچے کو سینے سے چپٹائے ہوئے گنگو کے ساتھ چلا۔

یادگار

سمند عمر فنا سیر پر سوار ہوں میں
غبار جادۂ ہستیٔ مستعار ہوں میں

الم پرست الم دوست الم نگار ہوں میں
ادا شناس ہوں فطرت کا رازدار ہوں میں

اک اضطراب مسلسل ہے زندگی میری
دل فگار ہوں میں روح بے قرار ہوں میں

اب اور مجھ میں رہا کیا ہے حسرتوں کے سوا
نگاہ شوق ہوں آغوش انتظار ہوں میں

شگفتگی کسے کہتے ہیں انبساط ہے کیا
خزاں نصیب ہوں بیگانۂ بہار ہوں میں

سوائے تہمت ہستی نہیں وجود مرا
سراب دشت ہوں میں نقش رہگذار ہوں میں

فروغ شعلۂ خس ہوں ضیائے شمع سحر
شبیہہ درد ہوں تصویر اضطرار ہوں میں

بقدر ذوق تمنا کہاں ہے فرصت عمر
نمود برق ہوں میں جلوۂ شرار ہوں میں

چھپا سکا نہ حجاب سکوت سوز دروں
برنگ شعلہ فروزاں تہ غبار ہوں میں

ستم یہ ہے کہ شکایت بھی کر نہیں سکتا
فریب خوردۂ مہر و وفائے یار ہوں میں

سرور غم ہے نہ کیف نشاط لے کوکب۔
گذشتہ عہد کی افسردہ یادگار ہوں میں

تنقید و تبصرہ

بلاغ مبین | مولفہ مولوی حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات تقطیع ۲۶×۲۰ ۸ کتابت وطباعت اچھی کاغذ اعلیٰ ۔ قیمت فی نسخہ عہ ۔ ملنے کا پتہ :۔ دفتر بلاغ مبین ۔ دہلی

اس کتاب میں پہلے ایک تعارف نہایت اختصار کے ساتھ مولوی سعید احمد صاحب بی اے کا لکھا ہوا ہے جس میں انھوں نے اس کی اجمالی کیفیت بیان کر دی ہے کہ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے پہلے حصہ میں اشاعت تبلیغ دین کے وہ اصول بیان کیئے گئے ہیں جو خود اسلام نے سکھائے ہیں۔ دوسرا حصہ فرامین سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے ہے جس میں ان تمام خطوط کو فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو تبلیغی غرض یا ضرورت سے سرور کائنات نے دنیا کے مختلف بادشاہوں ، رئیسوں اور امیروں کے نام لکھائے تھے ۔ ان مکاتیب کے متعلق تاریخی بحثیں بھی کہیں کہیں ضرورت کے موقع پر کی گئی ہیں ۔ تیسرا حصہ نتائج وغیرہ ہے ۔ اس میں اس تبلیغ کے نتائج دکھائے گئے ہیں۔ جس کے ذیل میں جہاد کی حقیقت قتل مرتد اور جزیہ وغیرہ کے مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں

مولف نے اس کتاب کو جس محنت اور تحقیق سے لکھا ہے قابل داد ہے۔ میرے خیال میں اس عنوان پر اب تک اردو زباں میں اس سے بہتر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی ۔ مکاتیب رسالت مآب کو بعض لوگوں نے اردو میں جمع کیا ہے لیکن صرف تاریخی حیثیت سے نہ کہ تبلیغی ۔

مولوی حفظ الرحمٰن صاحب ماشاء اللہ ابھی جواں ہیں اور تصنیف کا زندہ قلم اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں جس سے ہم کو آیندہ بہت کچھ توقعات ہیں ۔ اس لئے ہم ان کو یہ مشورہ دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنی تصانیف میں ہمواری کا ضرور خیال رکھیں ۔ اس تصنیف میں کہیں کہیں ان کا انداز بیاں خطیبانہ ہوگیا ہے بالخصوص اصول تبلیغ یعنی کتاب کے پہلے حصہ میں جو اس تاریخی کتاب کے لئے موزوں نہ تھا ۔ اسی طرح بعض مسائل کے بیان خاص کر "قتل مرتد" کے سلسلے میں تو انھوں نے جو کچھ لکھا ہے دل سے لکھا

بے دماغ سے نہیں لکھا یعنے صرف اپنے خیال کی حمایت کی ہے اور دلائل کی طرف جن سے دوسرے بھی قائل ہوجاتے توجہ نہیں کی۔ حالانکہ کسی کی جان لینے کے لئے کسی امام کا مذہب کافی نہیں ہے بلکہ قرآنی سند درکار ہے جس میں ہر قسم کے حدود اور کفارے تک بیان کردیے گئے ہیں مگر کسی مرتد کو قتل کر دینے کا حکم نہیں ہے بلکہ ہر انسان کو اپنے طریق نجات تلاش کرنے کی پوری آزادی اور حریت عطا کی گئی ہے۔

عرب کی موجودہ حکومتیں | مرتبہ مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی دارالمصنفین اعظم گڈھ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط تقطیع ٢٦×٢٠/٨ ، ضخامت ٢٠٠، قیمت ۱۲؍۔ معارف پریس اعظم گڈھ سے ملتی ہے۔

اس کتاب میں پہلے ٥٨ صفحوں میں ایک "طالب علم" مقیم مکہ معظمہ کا لکھا ہوا عرب کا جغرافیہ ہے جس میں انھوں نے نہایت اختصار اور خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ عرب کے جملہ حصص کے جغرافی حالات بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب نے عرب کی موجودہ قابل ذکر حکومتوں، نجد، عسیر یمن، حجاز، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق، شام، اور فلسطین وغیرہ کے مختصر مگر جامع حالات لکھے ہیں مسلمانوں کے لئے یہ کتاب دلچسپ بھی ہے۔ اور مفید بھی ہے کہ بیک نظر عرب کی جغرافی، ملکی، قبائلی اور سیاسی حالت نگاہ کے سامنے آجاتی ہے۔

بالعموم کتابوں کے سرورق پر مولفین کوئی مناسب قرآنی آیت لکھد یا کرتے ہیں۔ اس عادت کے مطابق اس کتاب پر شاہ صاحب موصوف نے سورۂ رعد کی یہ آیت لکھی ہے۔

وَكَذٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا

ہم کو قرآن کے ساتھ یہ بدمذاقی دیکھ کر افسوس ہوا کیونکہ آیت مذکورہ قرآن کے متعلق ہے۔ حکومت سے اس کا کوئی علاقہ نہیں اگر کوئی مناسب آیت نہیں مل سکی تھی تو کیا فرض تھا کہ خواہ مخواہ ایک غیر متعلق آیت چسپاں کی جائے۔

نفس کتاب میں ایک مقام پر اخوان کو جو سلطان رضا کار کی۔ فوج ہے بے عقل اور روحانیت ناآشنا کہا گیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

''اخوان کا ایک طبقہ بلاشبہ نہایت جاہل، متعصب ہے۔ اس کو روحانیت اور عقل سے کوئی تعلق نہیں'' صفحہ ۵۵۔ لیکن اس سے ایک ہی صفحہ پہلے لکھ چکے ہیں کہ

اخوان جن سے فوج کا بڑا حصہ مشتمل ہے، سخت جفاکش ہیں۔ جفاکشی میں شاید ہی افریقہ کے وحشی ان کا مقابلہ کر سکیں۔ دو، دو تین تین دن تک بے آب و دانہ رہ سکتے ہیں اور ابرو پر شکن نہیں پڑتی۔ عرب کے ریگستان میں کوسوں ننگے پاؤں چلے جاتے ہیں۔ اور زبان سے اُف نہیں کرتے۔ ان کا نمایاں وصف جہاد کا ولولہ ہے۔ جہاد کی اسپرٹ ان کے رگ و ریشہ میں ساری ہے۔ خدا کے نام پر جان دے دینا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہے۔ ان کو فتح مندی سے زیادہ شہادت کی تمنا رہتی ہے اور جنگ کے زمانے میں نہایت جذب و ولولہ کے ساتھ نعرہ لگاتے ہیں ''کہ جنت کی ہوا چل رہی ہے۔ اس کا باغی کہاں ہے'' جس میں یہ اسپرٹ ہو اس کو دنیا کی کون سی طاقت مغلوب کر سکتی ہے اس لئے نجدی فوج بہت کم ناکام ہوتی ہے۔ یہ وہی جذبۂ فدویت ہے جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے نصف صدی کے اندر اندر ایران و روم کی پرشوکت سلطنتوں کو ریگ بنا کر اڑا دیا تھا۔ گو مسلمانوں میں یہ جذبہ عرصہ ہوا رخصت ہو چکا لیکن الحمد للہ کہ ویرانہ نجد کے وحشی مسلمانوں میں آج بھی یہ خصوصیت نظر آتی ہے صفحہ ۵۴۔

ان مناقب کے ساتھ الاخوان کے خشونتِ عیش، خشونتِ لباس اور خشونتِ اخلاق کی وجہ سے ایک رہبانی جو نصرانی ہے اور اس پاک جذبے کی حقیقت سے ناواقف، وہ تو ان کو جاہل وحشی، اور روحانیت سے کورا کہہ سکتا تھا لیکن شاہ معین الدین احمد سے ہم کو تعجب ہے کہ انھوں نے کیوں ان کے اوپر عدمِ روحانیت کا الزام لگایا۔

وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے ؎ نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگر تابی

چونکہ مولوی صاحب موصوف نے کتاب ترجمے کی حیثیت سے نہیں بلکہ تالیف کی حیثیت سے ترتیب دی ہے اس لئے اس الزام کی تمام تر ذمہ داری اب ان کے اوپر ہے اور مجھے ڈر ہے کہ قیامت کے دن جب کوئی خطخط

(الاخوان کی ایک جماعت) ان کا گریبان پکڑے گا تو جواب دینا مشکل ہو جائے گا۔

عبارت مذکورہ بالا میں الاخوان کے نعرۂ جنگ کا جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ صحیح نہیں کیا گیا ہے۔ باغی کے معنی طالب کے ہیں۔ اور قرآن میں بغی بمعنی "طَلَبَ، یَطْلُبُ" کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ اس کے صحیح معنی یہ ہوئے۔

هبت هبوب الجنة ، این انت — جنت کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ اے کہ تو اس کا طالب

یا باغیها — ہے کدھر ہے؟

ان اعتراضات سے کتاب کی منقصت مقصود نہیں ہے۔ کتاب نہایت مفید اور عمدہ ہے صرف مولف کو توجہ دلانا ہے کہ وہ جو کچھ لکھیں سوچ کر اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے لکھیں۔

مجموعہ رسائل حج | مصنفہ مولوی عبدالوہاب صاحب دہلوی مقیم مکہ معظمہ، لکھائی چھپائی نہایت دیدہ زیب کاغذ نہایت اعلیٰ قسم کا تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت ۱۱۰ صفحات صرف محصول ڈاک کے لئے ۱۰ کا ٹکٹ بھیجنا چاہئے حسب ذیل پتوں سے مفت مل سکتی ہے۔ کوٹھی حاجی علی جان صاحب۔ نئی سڑک۔ دہلی۔

حکیم عبدالمجید صاحب دہلوی مالک دواخانہ مجیدی، جامع محلہ بمبئی، حاجی عبدالغنی صاحب اینڈ کمپنی۔ بندر روڈ کراچی۔ یہ کتاب تین رسالوں کا مجموعہ ہے۔ پہلے رسالے میں جو تقریباً ۸۰ صفحوں کا ہے۔ اسرار و حقائق حج و مناسک کی حکمت تشریع بیان کی گئی ہے۔ قرآن اور مستند احادیث سے۔ دوسرے رسالے میں جو ۳۲ صفحوں کا ہے۔ حج نبوی کی تاریخ ہے اور تیسرے میں حج کی جملہ دعائیں مع اردو ترجمہ کے درج کر دی گئی ہیں۔ بیان نہایت سلجھا ہوا اور صاف ہے اور اختصار کے ساتھ وہ باتیں بیان کر دی گئی ہیں جو محقق ہیں۔ عوام الناس آسانی سے اس کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ مولف نے جو اکثر مکہ ہی میں قیام رکھتے ہیں محض مسلمانوں کی نفع رسانی اور رہنمائی کے لئے اس کو تالیف کیا ہے۔ امید ہے کہ جو لوگ اس سے نفع اٹھائیں گے ان کے حق میں دعائے خیر کریں گے۔

عروسِ خیال | یہ ماہانہ ادبی رسالہ نوجوان ادیب جناب مظہر انصاری صاحب بی اے کی ادارت میں اس سال سے دہلی سے نکلنا شروع ہوا ہے اس کا پہلا نمبر ہمارے سامنے ہے جو نہ صرف اپنی ظاہری حالت میں لکھائی چھپائی اور کاغذ کے اعتبار سے اچھا ہے۔ بلکہ مضامین کے اعتبار سے بھی قابلِ قدر ہے۔ متعدد نظمیں اور غزلیات ہیں جو دل کش ہیں۔ افسانے بھی خاصے اچھے ہیں۔ ادبی مضامین میں حضرت پرتو یز کا مضمون ریاض مرحوم کے متعلق اہلِ ادب کے لئے خصوصیت کے ساتھ بہت دل چسپ اور اہلِ تنقید کے لئے ایک عمدہ نمونہ ہے۔ امداد صابری کا مضمون، علامہ شبلی مرحوم کی تحقیقی غلطیوں پر کد و کاوش سے لکھا گیا ہے امید ہے کہ اس کے بقیہ حصے جن کی بابت وعدہ کیا گیا ہے کہ آیندہ نمبروں میں شائع کئے جائیں گے اور زیادہ مفید اور دل چسپ ہوں گے۔

پہلا نمبر ساڑھے چار جزو پر نکلا ہے۔ اور اس کی سالانہ قیمت ہے جو بمقابلہ اس کی خوبیوں کے کچھ نہیں اگر اس رسالے کے کارکن استقلال اور محنت کے ساتھ اس کو نکالتے رہے تو یہ دہلی کا شان دار ادبی رسالہ ہوگا۔ اور اردو کی قابلِ قدر خدمت انجام دے گا۔

تقریرِ سیرت | از مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند۔ تقطیع درمیانی، ضخامت دوسو صفحات۔ کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ۔ منیجر الجمعیۃ، دہلی۔

جناب مولینا احمد سعید صاحب ہندوستان کے خوش بیان واعظوں میں ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں ان کے دل آویز شگفتہ اور دل چسپ اندازِ بیاں کا وہی شخص اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے جسے ایک بار بھی ان کے وعظ میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی ہے دلی کی نکھری ستھری زبان پر ان کو جو قدرت ہے کم کسی کو ہوگی زیرِ نظر کتاب ان کے ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے سیرۃ رسول پر وقتاً فوقتاً کی ہیں ان تقریروں میں ان کی مذکورہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا نے نہایت شگفتہ اور اچھوتے انداز میں آں حضرت صلعم کی سیرت قوم کے سامنے پیش کی ہے۔ اگرچہ بعض مقامات پر غیر ضروری طوالت پیدا ہوگئی ہے اور بعض جگہ غیر متعلق باتیں شامل ہوگئی ہیں۔

بھاگوت گیتا یا نغمۂ خداوندی | ترجمہ از جناب محمد اجمل خاں صاحب ام اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحے
کتابت وطباعت اور کاغذ متوسط قیمت بشگی عہ مع محصول ڈاک

ملنے کا پتہ :- ادارۂ نوامیس الٰہیہ دائرہ الہ آباد۔

یہ ہندؤں کی مشہور اور مقدس کتاب گیتا کا ترجمہ ہے اور فاضل مترجم نے نہایت محنت جانفشانی اور احتیاط سے یہ اہم کام انجام دیا ہے۔ ترجمے کے قابل استناد اور لائق اعتماد ہونے کے ثبوت میں اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پنڈت سندر لال اور ڈاکٹر بھگوان داس نے اسے شروع سے آخر تک دیکھ لیا ہے کتاب کے شروع میں سر کرشن مولینا حسرت موہانی کی ایک دلچسپ نظم ہے۔ پھر ڈاکٹر بھگوان داس کی تقریظ ہے پھر مترجم کا دیباچہ ہے۔ اس کے بعد مقدمہ بھگوت گیتا" کے تحت میں بھگوت گیتا کے متعلق مشاہیر کی رائیں نقل کی گئیں ہیں۔ پھر ۵۰ صفحے کا ایک طویل مقدمہ ہے جس میں مترجم نے مہابھارت کی لڑائی۔ ہندؤں کی قدیم تاریخ، ہندؤں کے مذہبی رہنماؤں، ہندو دیوتاؤں، ہندو فلسفے، ویدانت وغیرہ پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے بعد بھگوت گیتا کا ترجمہ ہے اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ اکثر مقامات پر گیتا کو اشعار کو لے کر مولانائے روم، حافظ، عطار، سعدی اور دوسرے فارسی اور اردو شعرا کے اشعار، تطبیق دینے کی کوشش کی گی ہے۔ کہیں کہیں کلام پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے بھی تطابق پیدا کیا گیا ہے۔ اور جناب مترجم کو اس میں کافی محنت کرنا پڑی ہوگی۔

یہ کتاب ادارۂ نوامیس الٰہیہ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مذاہب عالم کی صداقتوں کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش کیا جائے اور اس میں شک نہیں کہ اس مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی ہے علاوہ اس کے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ مسلمان نوجوان اپنی ہمسایہ قوم کے مذہب کا مطالعہ نہایت رواداری اور بے تعصبی سے کرنے لگے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے شاہانہ مغلیہ کے زمانے میں بہت سے مشاہیر علما و مصنفین کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے نہ صرف ہندو مذہب کا عمیق مطالعہ کیا بلکہ اس زمانے کی سرکاری زبان (فارسی) میں ہندو مذہب فلسفہ اور ادب پر کتابیں لکھیں۔ خود اکبر کے زمانے میں فیضی نے بھگوت گیتا کا فارسی

میں ترجمہ کیا ہے۔ اسی کا اثر تھا کہ باوجود اپنے اپنے مذہب پر سختی سے قائم رہنے کے ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات نہایت خوش گوار اور مخلصانہ تھے لیکن آج کل۔ انگریزی حکومت کی برکت کہئے یا خود اپنی بدقسمتی کہ اب وہ فضا باقی نہیں رہی ہے، اور اس کی جگہ باہمی عناد، نفرت اور تعصب نے لے لی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کے مذہب سے قطعاً ناواقف ہیں۔ اور تعصب نے ہمیں اس قدر اندھا کر دیا ہے کہ ہم واقفیت پیدا کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ ان حالات میں جناب اجمل صاحب اور ادارۂ نوامیس الہیہ کا یہ اقدام نہایت مستحسن ہے اور پوری حوصلہ افزائی کا مستحق۔ جناب ڈاکٹر بھگوندس صاحب نے جو سنسکرت ہندویت اور ہندو فلسفے کے بہت بڑے عالم ہیں۔ مترجم کی محنتوں کی نہایت ہمت افزا الفاظ میں داد دی ہے جس سے کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

رفیق النسا | مصنفہ ڈاکٹر سید غلام حسین صاحب نقیر ممتازیہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۸ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط قیمت عہ ۔ ملنے کا پتہ جناب نیر پنشنر تحصیلدار، نیر منزل فرولباغ دہلی

اس کتاب میں قصے کے پیرائے میں عورتوں اور بچوں کے امراض اور ان کے علاج کے طریقے لکھے گئے ہیں زچہ اور بچے کے لئے بہت سے مفید اصول بتائے گئے ہیں جن پر عمل کرنے سے بہت سے خطرات کا امکان نہیں رہتا ضمناً شادی کی موجودہ رسوم اور عورتوں کی اوہام پرستی، ٹونے، ٹوٹکوں اور تعویذ گنڈوں کی مذمت کی گئی ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی تھی اور مصنف کی زندگی میں اس کے پانچ اڈیشن نکل گئے۔ اب مصنف کے صاحبزادے جناب نیر نے حذف و اضافہ کے بعد اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔ نام بھی بجائے رفیق الصحت کے رفیق النسا کر دیا گیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر جناب نیر کتاب کی زبان پر بھی نظر ثانی کر لیتے۔

راسپوٹین | از جناب ملیح آبادی صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۵۲ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط۔ قیمت ۸ر ملنے کا پتہ :۔ ہند جدید نمبر ۷۸ لے چتر نجن ایونیو کلکتہ۔

یہ روس کے ایک بدمعاش راہب کا قصہ ہے جس نے زار و زارینہ کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا روس کی سیاست میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اور زار کی حکومت تباہ کردی۔ پہلے یہ قصہ ہند جدید میں بالاقساط شائع ہوتا رہا۔ اب جناب مترجم نے اسے کتابی صورت میں شائع کردیا ہے۔ کتاب میں تقریریں بھی ہیں جنھوں نے قصے کی دلچسپی میں اضافہ کردیا ہے۔ داستان بہت عبرت انگیز ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک بدمعاش آدمی مذہب اور درویشی کا روپ بھر کر کیا کچھ نہیں کرسکتا ہے

لال قلعہ کی ایک جھلک | مصنفہ حکیم سید خواجہ ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۸ صفحات، کتابت و طباعت نفیس کاغذ متوسط۔ قیمت عمر ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو۔ دہلی۔

اس کتاب میں خواجہ صاحب کے اپنے خاندان کی ایک مرید بیوی ننھی خانم کی زبانی لال قلعہ کے حالات بیان کئے ہیں جن سے شاہان مغلیہ ان کی بیگمات اور متعلقین کی خانگی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے جناب خواجہ صاحب مرحوم کو دلی کی زبان لکھنے میں خاص مہارت تھی یہ کتاب ان کے اس کمال کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

تعلیم ونفسیات | از جناب پروفیسر میاں محمد ظہور الدین احمد صاحب ایم اے ال ال بی علیگ۔ پروفیسر فلسفہ ومنطق۔ اسمٰعیل کالج اندھیری۔ ضخامت ۴۸ صفحات تقطیع چھوٹی، کتابت وطباعت اور کاغذ معمولی قیمت ۸ر ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

یہ اصل میں ایک لیکچر ہے جو پروفیسر صاحب نے بمبئی کارپوریشن کے اردو اسکولوں کے اساتذہ کی سہ سالہ کانفرنس میں پڑھا تھا۔ اس لیکچر میں فاضل پروفیسر نے تعلیم ونفسیات کے تعلق کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے۔ ساتھ ہی اس امر کی شدید کوشش کی ہے کہ اساتذہ کو بچوں کی نفسیات سے پورے طور پر واقف ہونا چاہیئے۔ آپ نے ان نقصانات کو بھی بتایا ہے جو سادہ لوح اور پرانے ڈھرے کے استادوں سے بچوں کی تعلیم کو پہنچتا ہے۔ اساتذہ اور مدرسین کے مطلب کی چیز ہے۔

منشورات | از جناب پنڈت برج موہن دتاتریہ صاحب کیفی دہلوی حجم ۲۴۲ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶/۸
کاغذ نفیس، چھپائی اچھی، لکھائی اوسط درجے کی قیمت ؏ ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ، لاہور۔

پنڈت برج موہن صاحب کی جو شہرت دنیائے ادب میں ہے اس میں یہ کتاب چار چاند لگا دے گی یہ پنڈت صاحب کے بارہ علمی اور ادبی لیکچروں کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر کا موضوع زبان و ادب کی تنقید اور لسانیاتی تحقیق ہے۔ "اردو لسانیات" اور "مبادیات فصاحت" اس مجموعے کی جان ہیں۔ یہ وہ توسیعی خطبات ہیں جو پنڈت صاحب نے ۱۹۳۱ء میں کلیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھے تھے۔ ایک میں موصوف نے زبان کا تاریخی خاکہ کھینچ کر دکھایا ہے اور دوسرے میں معانی و بیان کے آب و رنگ سے ایک دل آویز تصویر تیار کر دی ہے۔ "اردو اور لکھنؤ" "اردو اور پنجاب" میں مرکز زبان اور اہل زبان کے مسئلے پر نہایت بے تعصبی اور وسعت قلب سے نظر ڈالی ہے۔ "تذکیر و تانیث" "تشبیہ" "متروکات" "گل۔ گلاب" "نظر اور خود نظری" میں ادبی تحقیق و تنقید کی داد دی ہے۔ "شمس العلما حضرت آزاد مرحوم" اور "نئی شاعری کا پہلا مشاعرہ" تاریخ ادب کے دو اہم باب ہیں۔ "اردو کی موجودہ ضروریات" میں ترقی اردو کی عملی تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ ایک تو موضوع کی دلچسپی، دوسرے پنڈت صاحب کے انداز بیان کی دل آویزی اور دل کشی، پھر ظرافت کا چٹخارا، غرض لیکچروں کا یہ مجموعہ صرف علمی فوائد کا گنجینہ نہیں، بلکہ ادبی لطائف کا خزانہ بھی ہے۔ امید ہے کہ شائقین ادب اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس کے مطالعے سے فیض اور لطف حاصل کریں گے۔

ہمارے شہید (باتصویر) | مولفہ سید تجمل حسین صاحب ایم اے۔ حجم ۱۰۴ صفحے تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
لکھائی، چھپائی اچھی۔ کاغذ اوسط درجے کا۔ قیمت ۵؍ ملنے کا پتہ: دفتر رہبر قرول باغ نیو دہلی

سید صاحب نے اپنے وسیع تعلیمی تجربے اور اصول تعلیم و نفسیات کے گہرے مطالعے سے بچوں کے لئے کتابیں لکھنے کا وہ گر سیکھ لیا ہے جو ہندوستان میں بہت کم لوگوں کو آتا ہے۔ موصوف

کی کتاب "آسمانی دولہا" جس میں ہیئت کے پیچیدہ مسائل اس قدر سہل اور دل آویز انداز میں لکھے گئے ہیں کہ اسے بچے کہانی کی طرح مزے لے لے کر پڑھتے ہیں، بہت مقبول ہو چکی ہے ۔ آپ نے "ہمارے شہید" کے نام سے سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے حالات لکھے ہیں بچوں اور نوجوانوں کے لئے عموماً سوانح عمری جو تعلیمی قدر رکھتی ہے وہ ادب کی کسی صنف کو حاصل نہیں کیونکہ تعلیم میں جو اثر نمونے کا ہوتا ہے وہ خالی خولی تلقین کا نہیں ہوتا ۔ پھر سید الشہدا کی سیرت پاک تو نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ ساری دنیا کے لئے سراپا تعلیم، مجسم ہدایت ہے اور سید صاحب نے کتاب لکھی بھی اس خوبی سے ہے کہ ہر مذہب و ملت کے بچے اسے پڑھ کر اپنے اپنے طرز پر ، ایثار شجاعت، خلق و مروت ، حق سے محبت کرنے ، باطل سے نہ ڈرنے کا سبق سیکھ سکتے ہیں ہمیں امید ہے کہ بچوں کے ادب میں یہ کتاب بڑی شہرت اور مقبولیت حاصل کرے گی ۔ کتاب کے ہر باب کے ساتھ مشقی سوالات اور جا بجا روضہ ہائے شہدا کی تصویریں بھی دی گئی ہیں ۔

شذرات

خدا کا شکر ہے کہ تاسیس کا جلسہ خیر و خوبی کے ساتھ ہوگیا۔ اور سنگ بنیاد نصب کرنے کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔ جلسہ دہلی شہر سے نو، دس میل کے فاصلے پر تھا۔ دن جمعے کا تھا۔ جب حکومت کے دفتروں اور مدرسوں میں تعطیل نہیں ہوتی وقت ۳ بجے سہ پہر کا تھا۔ جو مارچ میں بھی خاصا گرم ہوتا ہے۔ کسی کو امید نہ تھی کہ تین چار سو سے زیادہ لوگ آسکیں گے۔ مگر جذب محبت نے اپنا اثر دکھایا۔ اور ایک ہزار سے زیادہ اشخاص جن میں شہر کے امیر و غریب ہندو مسلمان، ارباب علم، ارباب ہنر، ارباب حکومت، ارباب دولت اور وہ لوگ جو علم و ہنر حکومت و دولت سے محروم ہیں مگر ایمان، خلوص، اور جوش سے خالی نہیں، موٹروں میں، لاریوں میں، تانگوں میں سوار ہوکر پہنچ گئے، جلسے کی کارروائی، قرآن مجید کی تلاوت سے شروع ہوئی، مولینا اسلم جیراجپوری کی ایک نظم پڑھی گئی جس کا ہر لفظ دل سے نکلا تھا۔ اور دل میں بیٹھ گیا شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے تقریر کی جس میں سچائی تھی، درد میں ڈوبی ہوئی، جوش تھا۔ متانت میں سمویا ہوا، عزم تھا عجز میں ملا ہوا، جامعہ کی مختصر تاریخ تھی، بانیاں جامعہ کی یاد تھی، اہل جامعہ کو نصیحت تھی، ہمدردان جامعہ کا شکریہ تھا۔ تقریر اخباروں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا اثر دلوں میں محفوظ ہے اور رہے گا۔ سننے والوں کی آنکھیں اشک آلود تھیں، امیر جامعہ ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مدظلہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو جوش گریہ گلو گیر تھا۔ امیر جامعہ نے جن الفاظ میں جامعہ کے استادوں اور کارکنوں کا ذکر کیا، وہ کسی افسر نے اپنے ماتحتوں کے متعلق، کسی جنرل نے اپنے سپاہیوں کے متعلق کم کہے ہوں گے۔ اعتراف، قدردانی، ہمت افزائی، محبت، شفقت کے یہ کلمے ملک و ملت کے ایک قائد جلیل کی زبان سے نکل رہے تھے اور جامعہ والے، ادب، نیاز، ندامت، مسرت، فخر کے جذبات دل میں لئے سر جھکائے سن رہے تھے۔ خالدہ ادیب خانم جامعہ کی، ملت اسلامی کی، ہندوستان کی محترم مہمان نے ایک مختصر سے خطبے میں جس سے اندازہ ہوگیا کہ کمال خطابت، کمال خلوص کے ساتھ مل کر

کس طرح انسان کے کلام میں کلیمی کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ جامعہ کے مستقبل کی وہ تصویر دکھائی کہ تصور میں مشاہدے کا لطف آگیا اور سننے والوں پر وجد کا عالم طاری ہو گیا جس آواز نے سکاریہ میں کڑک کڑک کر ترک سپاہیوں کو ابھارا تھا وہ آج اوکھلے میں گونج کر جامعہ کے طلبہ کو ہمت اور جوش دلا رہی تھی کہ جامعہ کے نام اور اس کے پیام کی لاج رکھ لیں۔

قائدین ملک و ملت کے ہمدردی کے پیام پڑھے گئے، مہاتما گاندھی، سر محمد اقبال، مولینا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر بھگوان داس کی مبارک باد اور دعائیں، اسمبلی کے کل مسلمان ممبروں کا اپیل، دوسرے بزرگوں کی تہنیت اور تبریک۔ آخر میں چندوں کا اعلان شروع ہوا جن کی میزان ۴۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے علاوہ ۵۰ ہزار کی مالیت کے ایک وقف کی خوش خبری سنائی گئی۔ آغاز اچھا ہوا انجام خدا کے ہاتھ ہے۔

اس جلسے کے ختم ہوتے ہی سارا مجمع اس جگہ پہنچ گیا جہاں سنگ بنیاد رکھا جانے والا تھا جامعہ کے سب سے چھوٹے بچے عبد العزیز نے چند اور بچوں کی مدد سے جو قریب قریب اسی کی عمر کے تھے اس مبارک رسم کو انجام دیا۔ خدا اس معصوم بچے کی برکت سے جامعہ کی عمارت کو اور اس کے مقاصد کو تکمیل کے درجے تک پہنچائے۔ اور اسے اور اس کے ننھے رفیقوں کو دین و دنیا میں کامیاب کرے۔ جامعہ کی حقیقی بنیاد یہی بچے ہیں اور اس کی اصل عمارت انکی زندگی ہے۔

اس رسم کے پورا ہونے کے بعد سب مہمانوں نے چائے نوش فرمائی۔ اور ان چند ساعتوں کا گہرا اثر دل پر لئے ہوئے رخصت ہو گئے۔

---

۲ مارچ کو سہ پہر کے وقت جامعہ کے کھیل کے میدان میں ورزشی کھیلوں کا مقابلہ ہوا جس میں سب سے مزے کی چیز اساتذہ کی دوڑ تھی۔ تمام اساتذہ نے جن میں علمائے کرام حضرت شیخ جامعہ

اور بڑے بڑے ثقہ حضرات شامل تھے۔ ہمت کا احرام باندھ کر مقابلے کی سعی فرمائی حسب معمول بلکہ حسب دستور جناب شیخ الجامعہ مقابلے میں اول رہے۔ خالدہ ادیب خانم صاحبہ نے انعامات تقسیم کئے۔ اور مغرب کے وقت یہ دلچسپ تقریب ختم ہوئی۔

شب کو ۸½ بجے جامعہ کا سالانہ مشاعرہ شروع ہوا۔ اس مشاعرے نے ہندوستان کے ادبی جلسوں میں ایک خاص حیثیت حاصل کرلی ہے۔ وہ استادان فن جنھوں نے اب مشاعروں کی شرکت قریب قریب ترک کردی ہے، محض جامعہ کی محبت میں دور دراز سفر کی زحمت گوارا کرکے تشریف لاتے ہیں اور ان لوگوں کو جو حق کی تلاش علم کی سنگلاخ زمینوں میں کیا کرتے ہیں چمنستان شعر میں جلوۂ حقیقت دکھاتے ہیں۔ اس سال بھی لکھنؤ سے حضرت صفی، حضرت ظریف، حضرت ثاقب تشریف لائے۔ حضرت آرزو مشاعرے کے وقت نہ پہنچ سکے۔ دوسرے دن صبح کو پہنچے، اور کئی روز قیام فرمارہے۔ حضرت جگر مرادآبادی، الٰہ آباد میں حضرت اصغر گونڈوی کی عیادت اور تیمارمیں مصروف تھے، دونوں کو جامعہ سے قلبی تعلق ہے۔ یہاں سے دعوت کا پہنچنا تھا کہ بیمار نے بیماردار کو خود اصرار کرکے بھیجا۔ خدا تعالیٰ انھیں صحت عطا کرے۔ افسوس ہے کہ حضرت جوش ملیح آبادی، مکرر وعدوں کے باوجود تشریف نہیں لاسکے۔ دلی سے حضرت مومن ٹونکی استاد جامعہ اور جامعہ کے تمام کرم فرما۔ حضرت ساحر، حضرت اکبر، حضرت عشرت، ڈاکٹر سعید احمد صاحب، حضرت حیرت شملوی، حضرت حفیظ فرخ آبادی اور دوسری ارباب سخن موجود تھے۔ حاضرین کی تعداد اس سال ڈیڑھ ہزار کے قریب تھی مگر ان کے حسن ذوق اور اہل جامعہ کے حسن انتظام کی بدولت ذرا بے ترتیبی نہیں ہونے پائی۔ پانچ گھنٹے تک لوگ نہایت ذوق و شوق سے اس روحانی دعوت کا لطف اٹھاتے رہے۔ بلبل ہند مسز نائیڈو مشاعرے میں اول سے آخر تک موجود رہیں۔ اور حاضرین کے اصرار پر انھوں نے اپنی ایک انگریزی عربی نظم سے بھی محظوظ کیا جس میں اسمائے باری تعالیٰ بڑی خوبی سے نظمین کئے گئے ہیں۔ جناب شیخ الجامعہ نے اپنی طبیعت کی ناسازی کے باوجود صدارت کے فرائض انجام دے۔ سب لوگ متفق ہیں کہ اس سال مشاعرہ غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔

۳ مارچ کو عورتوں کا جلسہ محترمہ بیگم محمد علی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں تقریباً سو خواتین تشریف لائی تھیں۔ صدر صاحبہ اور بیگم عابد حسین نے اپنی تقریروں میں جامعہ کے مقاصد بیان کئے۔ اور عمارت کے لئے چندے کا اپیل کیا۔ بیگم عبدالمجید ہارون نے لیڈیز کانفرنس کے حالات سنائے۔ اس کے بعد چندوں کا اعلان شروع ہوا۔ کوئی چار سو کی یکمشت رقم اور کچھ ماہانہ چندوں کے وعدے کئے گئے دو ایک خواتین نے اپنے کچھ زیور بھی چندے میں دے۔

اس کے علاوہ قدیم طلبہ کا جلسہ، اسکول کے لڑکوں کا تقریری مقابلہ اور مشاعروں کی کئی صحبتیں ہوئیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ تین چار روز تک جامعہ کے اکثر اساتذہ اور طلبہ دن رات مصروف رہے ان کو جو مشقت اور زحمت اٹھانی پڑی وہ وس گنی بلکہ ہزار گنی وصول ہوگئی اس لئے کہ تمام تقریبیں باوجود ہماری خامیوں کے خیر و خوبی سے انجام پا گئیں اور سب مہمان باوجود ہماری کوتاہیوں کے خوش رہے اور خوش گئے۔

مندرجہ بالا سطریں لکھتے وقت یہ اندوہناک خبر پہنچی کہ جنگ آزادی کے سرفروش سپاہی اور سپہ سالار، ملک و ملت کے محترم رہبر نصدق احمد خاں صاحب شیروانی جو کچھ عرصے سے علیل تھے آج صبح (۲۴ مارچ) دار فانی سے رحلت کر گئے (انا للہ و انا الیہ راجعون) شیروانی صاحب کا ماتم سارا ملک کرے گا، ساری قوم کرے گی مگر اہل جامعہ کے لئے یہ صدمہ اور بھی زیادہ سخت ہے اس لئے کہ مرحوم جامعہ کی مجلس اساسی کے رکن تھے ایک عرصے تک سکریٹری رہے تھے اور ہمیشہ اس کی فلاح و بہبود سے دلچسپی رکھتے تھے شیروانی صاحب کی وفات خصوصاً اس نازک زمانے میں ملت اسلامی کے لئے اور ہندوستان کے لئے ناقابل تلافی نقصان اور ان کے عزیزوں کیلئے ناقابل برداشت صدمہ ہے۔ خدا سے دعا ہے۔ کہ ان بے چاروں کو صبر عطا فرمائے اور اس مصیبت میں ان کی دستگیری کرے۔

روحِ جامعہ

(از حضرت مولینا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری، پروفیسر جامعہ)

زندگی نازو نیاز و سوز و سازِ دل میں ہے
ہائے وہ زندہ کہ جو مدفون آب و گِل میں ہے

بو پریشاں ہو کے نکلی خیمۂ گلزار سے
کب سبک روحوں کو آسائش کسی منزل میں ہے

بادیہ گردی ہے مجنوں کے لئے سامانِ زیست
ایک جانِ تازہ ہر نظارۂ محمل میں ہے

پوچھ آسانی پسندوں سے ہے آسانی کہاں؟
جو نہیں مشکل میں ہے، وہ بھی بڑی مشکل میں ہے

عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو
وہ مزا جو کوہکن کی سعیِ بے حاصل میں ہے

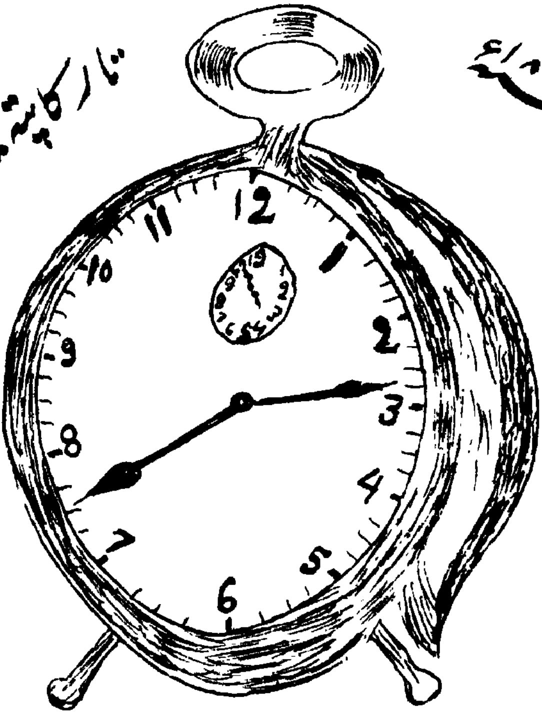
شیخ ہند و اجمل و جوہر کی روحِ انقلاب
جامعہ ملیہ کے سر میں، جگر میں، دل میں ہے

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے

"جاگو" الارم ٹائم پیس

قائم شدہ ۱۸۹۲ء

تار کا پتہ نیو فرینڈ



یک روزہ الارم ٹائم پیس، چمکیلا نِکل کیس، سفید ڈائل،
بڑھیا الارم جس کی آواز میٹھی، اونچی اور دل کش، متواتر ٹھہر ٹھہر
کر بجنے والی گھنٹی ڈائل ۳ ¼ گارنٹی دو سال قیمت صرف مع/

فہرست مفت طلب کیجئے

نیو فرینڈ اینڈ کمپنی چاندنی چوک دھلی

رجسٹرڈ نمبر ال-۱۸۹۲

جامعہ

اردو اکادمی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی

قیمت سالانہ صر   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴	مارچ ۱۹۳۵ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

ترکی اور جنگ آزادی

یہ خالدہ ادیب خانم صاحبہ کے چوتھے توسیعی لکچر کا ایک حصہ ہے۔
لکچروں کا مجموعہ مکتبہ جامعہ کی طرف سے جلد شائع ہونے والا ہے۔

خواتین اور حضرات!

اگرچہ میں دل سے دعا کرتی ہوں کہ دنیا میں جنگ و جدل کا خاتمہ ہو جائے مگر اس کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ البتہ ۱۹۱۸ء میں جب دو کروڑ آدمی قتل ہو چکے تھے، ملک کے ملک اُجڑ چکے تھے، بے شمار مخلوقِ خدا خانماں بربادی کی مصیبت میں گرفتار تھی غرض دنیا تہ و بالا ہو گئی تھی۔ تمام انسانوں کے دل امن و امان کی آرزو سے معمور تھے۔ فاتح اور مفتوح دونوں خلوص اور جوش سے اس بات کی تمنا کرتے تھے کہ دنیا میں صلح و آشتی کا دور دورہ ہو جائے۔ نوعِ انسانی کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جب دنیا کی سب قومیں عدل و انصاف اور ہمدردی کا ایک نیا دور شروع کرنے پر اس قدر مائل ہوں جتنی اُس زمانے میں تھیں۔

جنگ سے ترکوں کو جتنا نقصان پہنچا اتنا شاید ہی کسی قوم کو پہنچا ہو۔ وہ پورے دس سال سے میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے اور اِدھر خود اُن کے گھر میں خونریزی اور انقلاب کا بازار گرم تھا جس کی وجہ سے ملک کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ صلح کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار تھے۔ یہ قیمت عارضی صلح سے قبل مغربی مدبروں کے اعلانات میں معین کی جا چکی تھی۔ لائڈ جارج نے ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو اعلان کیا تھا کہ وہ علاقہ جہاں ترک خود آباد ہیں اور دارالسلطنت قسطنطنیہ ترکی کے قبضہ میں رہنے دیا جائے گا۔ اِس کے معنی یہ تھے کہ اُسے اپنے دو تہائی مقبوضات سے

ہاتھ دھونا پڑے گا۔ ترک اِسی کو غنیمت سمجھتے تھے کہ انہیں اپنے گھر میں چین سے بیٹھنا نصیب ہوگا اور غیروں کی مداخلت سے محفوظ رہ کر اپنی نئی زندگی کی تشکیل اور نشوونما کا موقع ملے گا۔

پرلیسیڈنٹ ولسن نے کہا تھا "جتنے ملک جنگ میں شریک ہیں اُن کی نئی تقسیم ریاستوں کے مطالبات کے اعتبار سے نہیں بلکہ رعایا کے مفاد کے لحاظ سے کی جانے"۔ ایک اور موقع پر انھوں نے فرمایا تھا "ہمارا فیصلہ بے لاگ ہوگا۔ اِس میں یہ تفریق نہیں کی جائے گی کہ جن کے ساتھ ہم چاہیں انصاف کریں اور جن کے ساتھ نہ چاہیں نہ کریں۔ انصاف ایسا ہونا چاہیئے جس میں کسی کی رعایت نہ کی جائے۔ جس کا معیار صرف یہ ہو کہ قوموں کے حقوق میں مساوات برتی جائے۔" پُرانے مُدبّروں میں صرف یہی ایک شخص تھا جس نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ نوعِ انسانی امن کی آرزومند ہے۔ اِن الفاظ میں جو شیکسپیر کا سا زورِ بیان اور انجیل کی سی سادگی رکھتے تھے اس نے اپنے چودہ اصولوں کا اعلان کیا۔ حضرت موسیٰ کے دس احکام کے مقابلے میں وِلسن کے چودہ احکام بھی یادگار رہیں گے۔ مگر فرق یہ تھا کہ حضرت موسیٰ اپنے احکام کو نافذ کرنے کی قوت رکھتے تھے اور وِلسن اِس سے محروم تھا۔ وہ دُنیا کی بزمِ مشورہ میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آ نکلا۔ اور تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ صُلح کی شرطیں اُنھیں پُرانے طرز کے مدبّروں نے طے کیں۔ یہ بڑے قابل لوگ تھے اور جنگ سے پہلے حُبِّ وطن کے جو معنی سمجھے جاتے تھے اُن کے لحاظ سے محبِ وطن بھی تھے۔ مگر سب کے سب اتنے بے بصیرت تھے کہ خدا کی نشانیوں کو جو نور کے حرفوں میں دیوار پر نظر آ رہی تھیں نہیں دیکھ سکے، اتنے بے حِس تھے کہ جذبات کی نئی لہروں کو جو جمہور کے دلوں میں اُٹھ رہی تھیں نہیں سمجھ سکے، اتنے نافہم تھے کہ انھوں نے جنگِ عظیم کے بعد بھی یہ سبق نہیں سیکھا کہ جو محبِ وطن اپنے ملک کی سلامتی چاہتا ہے اُسے اپنے ہمسایہ ملکوں میں بھی

امن و امان کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔

عارضی صلح کے بعد اتحادیوں کی فوجوں نے استنبول، سلیشیا اور چنک پر قبضہ کرلیا۔ ترکوں کی فوجیں منتشر ہونے لگیں۔ چھ مہینے تک ترک اس دھوکے میں رہے کہ یہ قبضہ عارضی ہے اور صلح نامہ پر دستخط ہونے کے بعد ختم ہو جائے گا۔

مگر حریفوں نے جب یہ دیکھا کہ ترکی کے پاس فوج نہیں رہی ہے، تمام ملک میں ابتری اور بے بسی کی حالت ہے تو ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ خواہشیں جن کی بنا پر مخفی معاہدے کئے گئے تھے پھر ابھر آئیں۔ آرنلڈ ٹوائنبی اپنی کتاب "ترکی" میں لکھتا ہے۔ "جس طرح بھوکے بھیڑیئے شکار کی تاک میں خیمہ گاہ کے گرد چکر کاٹتے ہیں اسی طرح مغرب کی ریاستیں اس فکر میں تھیں کہ موقع پاکر ترکی پر لوٹ پڑیں۔ کیونکہ ترکی ایک زرخیز ملک ہے اور یورپ کی شہنشاہیت بہت لالچی ہے۔

اندرونی حالت اتحاد و ترقی کے لیڈر ملک سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کی انجمنوں کی رہبری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی اور منظم پارٹی موجود نہ تھی جو اس کی جگہ لے لیتی۔ اور قوم کی نمایندگی کرتی اس لئے کہ نوجوان ترکوں نے کوئی اور پارٹی قائم ہی نہیں ہونے دی تھی۔ ایک پارٹی کی حکومت میں یہ بھی ایک بڑا عیب ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ جنگ اور انقلاب کے زمانے میں بہت کامیاب ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نئی اصلاحات کو بہت جلد عمل میں لاسکے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ جہاں اس میں انتشار پیدا ہوا پھر ملک کی سیاسی حالت سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ پارٹی اپنے آپ کو کل قوم کا نمایندہ سمجھتی ہے اور اس کے دشمن بھی یہی سمجھتے ہیں۔ اس لئے اگر انھیں اس پارٹی سے کوئی نقصان پہنچا ہو تو وہ کل قوم سے اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ ایک طرف اتحادی ریاستیں اور دوسری طرف اتحاد و ترقی کے اندرونی دشمن، نوجوان ترکوں کی زیادتیوں کی سزا بے قصور ترکی قوم کو دینا چاہتے تھے۔ جو لوگ دراصل قصوروار تھے وہ تو

چلے گئے تھے۔ اَب صرف وہ لوگ باقی تھے جنھوں نے صرف بعض حسینوں میں جماعت اتحاد و ترقی کا ساتھ دیا تھا اور جن کا وجود ترکی کے لئے نہایت مفید اور ضروری تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ملک کے سربرآوردہ اشخاص میں سے کوئی ایسا نہ تھا جو کبھی نہ کبھی اس جماعت کا رکن نہ رہا ہو۔

حکومت پھر سلطان کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا۔ چونکہ اس پارلیمنٹ کی حیثیت ایک کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی اس لئے اس کے برخاست کئے جانے سے کوئی حرج نہیں ہوا۔ مگر سلطان نے نئے انتخابات کا حکم نہیں دیا۔ اور ملک کی حکومت خود اُس کے اور اُن ریاستوں کے ہاتھ میں رہی۔ جن کی فوجیں قسطنطنیہ پر قابض تھیں۔ وہ اپنی مجلس وزراء میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کو بھی رکھتا تھا جن کی قابلیت درحب وطن میں شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ مگر جہاں انھوں نے بیرونی حکومتوں کے احکام بہ آنکھ بند کر کے عمل کرنے سے انکار کیا وہ فوراً موقوف کر دیئے جاتے تھے۔

ترکی کے حصّے بخرے کرنے کی تجویز ترکوں کے سامنے صلح کی شرائط پیش کرنے سے پہلے اتحادی ترکوں کے متعلق ایک خطرناک فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ یہ تھا کہ مشرق ادنیٰ میں ایک یونانی سلطنت قائم کی جائے جس میں مشرقی اور مغربی تھریس، سمرنا اور اس کے عقب کا علاقہ شامل ہو۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس ترکیب سے آبنائے اتحادیوں کے لئے کھُلا رہے گا اور ترک، بلغاری اور روسی اس کے قریب نہ آنے پائیں گے۔ انھوں نے یہ بھی طے کر لیا تھا کہ مشرق میں شمسون سے لے کر بحیرۂ اخضر تک اور بحیرۂ روم سے سلیشیا تک جو بحر اسود کے کنارے واقع ہے آرمینیہ کی خودمختار ریاست قائم کی جائے گی۔ اس نئی ریاست کے لئے وہ نہ صرف ترکی کا علاقہ بلکہ ایران اور روس کا کچھ حصہ بھی چھیننا چاہتے تھے۔ اس دوسری تجویز کو عمل میں لانے کی انھیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ ترکی آرمینیہ کی مستقل حیثیت کو

پہلے ہی تسلیم کر چکا تھا۔ نئی تجویز سے اور مشرقی سلطنتوں کے بھڑک جانے کا اندیشہ تھا۔ اس کے علاوہ کاظم قارا اکبر پندرہ ہزار باقاعدہ ترکی فوج لئے ہوئے موجود تھا اور سرحد پر جو مسلمان قبائل رہتے تھے وہ بھی بڑے جنگجو لوگ تھے۔ اتحادی جہازوں کی توپوں کی زد سے یہ علاقہ باہر تھا۔ البتہ پہلی تجویز یعنی سمرنا کو یونانیوں کے حوالے کر دینا، قابل عمل تھی اور اس کے لئے یہ موقع بھی بہت اچھا تھا۔ اس لئے کہ اٹلی جو خود سمرنا کا دعویدار تھا صلح کی کانفرنس سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ارنلڈ ٹوائنبی اتحادیوں کی اس قسم کی حرکتوں کو ایک دوسرے کی جیبیں کترنے سے تعبیر کرتا ہے۔ اتحادیوں نے چوبیس گھنٹے پہلے یہ نوٹس دیا کہ ہماری فوجیں جہاز سے اتر کر سمرنا میں داخل ہوں گی۔ اس بہانے سے یونانی فوج ۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو سمرنا پہنچا دی گئی۔ اس واقعہ نے دم بھر میں کایا پلٹ کر دی۔ ترکوں نے اپنی فوجوں کو منتشر کرنا روک دیا اور فوراً لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ آرنلڈ ٹوائنبی جو مورخانہ بے تعصبی اور انصاف پسندی کی وجہ سے نوع انسانی کے لئے فخر کا باعث ہے یونانی فوج کے سمرنا میں داخل ہونے کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔ "۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو مغربی اناطولیہ پر ایک بلائے ناگہانی نازل ہو گئی جیسے کوہ آتش فشاں پھٹتا ہے اور لوگ حیران رہ جاتے ہیں کہ یہ کیا ہو گیا۔ جنگ یورپ کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد ایک روز دفعتہً سمرنا کی گلیوں میں شہر کے لوگوں اور نہتے سپاہیوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ محلے کے محلے اور گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے گئے۔ عقبی خطے کی زرخیز وادیوں میں آگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خون کی ندیاں بہ گئیں۔ ایک فوجی دیوار کھڑی ہو گئی جس نے قسطنطنیہ اور سمرنا کی بندرگاہوں کو اندرونی ملک سے جدا کر کے تجارت کو تباہ کر دیا۔ لڑائی کے دوران میں مکان، پل اور سڑکیں مسمار کر دی گئیں۔ ملک کے باشندے تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور جو بچ رہے وہ یا تو زبردستی فوج میں بھرتی کر لئے گئے

یا جلا وطن کر دئے گئے۔ غرض قتل و غارت کا یہ سیلاب سمرنا سے شروع ہوا اور دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔"

مغربی مسئلہ یونان اور ترکی میں ترکی کی طرف سے جو ردّ عمل ہوا اُس کے متعلق یہ بات دنیا کو نہیں بھولنی چاہیے کہ اس کا آغاز حکومت کی طرف سے نہیں بلکہ خود جمہور کی طرف سے ہوا۔ جن میں کسان، پہاڑی لوگ بلکہ عورتیں تک شامل تھیں۔ استنبول سے فوجی افسر بے اجازت بھاگ کر تھریس پہنچے اور انھوں نے چھوٹے چھوٹے جتھے بنا کر لڑنا شروع کیا۔ سارے ملک میں احتجاج کے جلسے کئے گئے۔ دو چیزوں نے اس قوّتِ جذبات کو کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ ایک تو یہ کہ اوسط طبقے کے ترکوں میں سے ہزارہا آدمی ایسے نکل آئے جنھوں نے نہ صرف اپنی جانوں کو قربان کیا بلکہ تنظیم میں بھی کمال کر دیا۔ دوسرے یہ کہ معدودے چند لیڈر جو انہیں ہاتھ آئے اس مادی اور اخلاقی قوّت سے کام لینے کی خداداد قابلیت رکھتے تھے۔ میں نے یہ حیرت انگیز تاریخی ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اپنی بساط کے مطابق اس میں حصّہ بھی لیا ہے۔ مجھے بڑے سرداروں کی قابلیت اور ان کی خدمات کا دل سے اعتراف ہے مگر میرے نزدیک لڑائی کی جان اور کامیابی کا راز جمہور کا عزم تھا۔ جنھوں نے زندگی سے مایوس ہو کر دل میں سمجھ لیا تھا کہ بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جانے سے بہتر ہے کہ میدانِ جنگ میں لڑ کر مارے جائیں۔ اِس بات کو پیش نظر رکھ کر ہم جنگ کے واقعات نہایت اختصار کے ساتھ بیان کریں گے۔

اندرونی قوتیں اور ان کا اتحاد جب لڑائی شروع ہوئی تو اتحادیوں کی ایک لاکھ فوج ترکی میں موجود تھی۔ اس کے مقابلے میں ترکوں کے پاس مشرق میں کاظم قارا بکر کی پندرہ ہزار باقاعدہ فوج، وسط اناطولیہ میں علی فواد پاشا کی چھوٹی سی جمعیت اور چند ادھ نیم مسلح دستے تھے جو اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے۔ باقی جو کچھ تھے وہ رضاکار تھے

کے بے قاعدہ جتھے تھے جن کے پاس سامانِ جنگ برائے نام تھا۔

اتحادیوں کو مشرق کی طرف سے زیادہ اندیشہ تھا۔ اِس لئے انھوں نے سلطان سے کہہ کر مصطفےٰ کمال پاشا کو وہاں ناظرِ حربی کی حیثیت سے بھجوایا کہ ترکی فوجوں کو منتشر کردیں۔ مصطفےٰ کمال نے وہاں جانے سے پہلے استنبول میں فوج کے سرداروں سے خفیہ طور پر ملاقات اور گفت و شنید کرلی تھی۔

اماسیا کا اقرار نامہ ۱۹ر جولائی ۱۹۱۹ء کو مصطفےٰ کمال پاشا، رفعت پاشا، علی فواد پاشا اور رؤف بے نے اماسیا کے مقام پر جمع ہوکر ایک اقرار نامے پر دستخط کئے۔ جسے موجودہ ترکی ریاست کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :- "ملک کی مرکزی حکومت، بیرونی ریاستوں کے ہاتھ میں ہے۔ ترکی جمہور نے اپنے عمل سے یہ ثابت کردیا ہے کہ ایسے غیر ملکیوں کے ماتحت رہنا ہرگز منظور نہیں اور وہ ان سے لڑنے کو طیار ہے۔ قوم کی قوت اور جدّوجہد کو متحد اور منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک کانگریس جو تمام قوم کی نمایندہ ہو منعقد کی جائے اور وہ یہ فیصلہ کرے کہ ملک کی حفاظت کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

ارضِ رُوم کانگریس ۲۳ر جولائی ۱۹۱۹ء کو پہلی کانگریس مصطفےٰ کمال پاشا کی صدارت میں منعقد ہوئی اور اُس نے یہ فیصلہ کیا کہ ایک نمایندہ جماعت منتخب کی جائے جو ضرورت کے وقت اناطولیہ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے اور ملک کی حفاظت کا سامان کرے۔ اِس کانگریس کی ہدایت کے مطابق تمام ترکی فوجیں جو یونانی حملے کی مدافعت کررہی تھیں اناطولیہ کے مرکز کے ماتحت متحد ہوگئیں اور ایک قومی عہد نامہ طیار کیا جانے لگا جو ساری قوم کے لئے قابلِ قبول ہو۔

سیواس کانگریس ۴ر ستمبر ۱۹۱۹ء کو سیواس کانگریس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اناطولیہ سلطان کی حکومت سے علیحدہ ہوگیا۔ اور اُس نے ملکی اور فوجی انتظام اپنے ہاتھ میں

لے لیا۔ سلطان نے خوف زدہ ہوکر داماد فرید پاشا کی وزارت کو جو اتحادیوں کا آلۂ کار سمجھی جاتی تھی معزول کردیا۔ اور ایک نئی کابینہ مقرر کی جس کے اکثر ارکان قوم پرور پارٹی کے تھے۔ یا اس سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس نے پارلیمنٹ کے انتخابات کا بھی حکم دے دیا۔ ملک نے قوم پرور پارٹی کو بہت بڑی تعداد میں منتخب کیا۔ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں پارلیمنٹ کا اجلاس استنبول میں منعقد ہوا۔ اس کے لیڈر بالفعل رؤف بے تھے۔ خوش قسمتی سے مصطفےٰ کمال اور دوسرے فوجی سردار اناطولیہ ہی میں رہے۔

پارلیمنٹ نے پہلا کام یہ کیا کہ قومی معاہدے کو مکمل کرکے شائع کردیا۔ اس کا مضمون قریب قریب وہی رہا جو پہلی بار ارضِ روم کی کانگریس میں تجویز ہوا تھا۔ اس میں یہ مطالبہ کیا گیا کہ جن علاقوں میں ترکوں کی اکثریت ہے اور جن پر عارضی صلح کے وقت اتحادیوں نے قبضہ نہیں کیا تھا وہ ترکی کی حکومت میں رہیں۔ بقیہ علاقے جن پر اس وقت قبضہ کیا گیا تھا (اور جن میں زیادہ تر عربوں کی آبادی تھی)، اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں اور اس میں اُن کے باشندوں کو آزادی سے رائے دینے کا حق دیا جائے۔ ترکی کی طرف سے یہ وعدہ کیا گیا کہ باسفورس اور دردانیال میں سب قوموں کے تجارتی جہازوں کو آنے جانے کی اجازت ہوگی بشرطیکہ وہ اس بات کا ذمہ لیں کہ استنبول اور بحیرۂ مارمورہ بیرونی دست اندازی سے محفوظ رہے گا۔ ترکی میں اقلیتوں کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمسایہ ملکوں میں مسلم اقلیتوں کو حاصل ہیں۔

ابھی اتحادیوں نے صلح کے شرائط کا جو وہ ترکی کے سامنے پیش کرنے والے تھے عام اعلان نہیں کیا تھا کہ انھیں قومی معاہدے کی اطلاع بھیج دی گئی۔ اب اُن کے سامنے دو صورتیں تھیں یا تو وہ ترکوں کی یہ شرائط جو خود انھوں نے عارضی صلح سے پہلے ترکوں کے سامنے پیش کی تھیں منظور کرلیں اور جنگ ختم کردیں

یا سینہ زوری سے کام لے کر ترکی کے حصے بخرے کرنے کی تجویز پر اڑے ہیں انھوں نے دوسری صورت اختیار کی۔

۱۶ مارچ کو اتحادیوں نے وہ معرکے کا حملہ کیا جو دنیا میں مشہور ہو گیا۔ انھوں نے استنبول میں اور فوجیں اُتار دیں جو تمام قوم پروروں کے گھروں پر چھاپہ مار کر انھیں اُن کے بستروں سے کھینچ لائیں۔ اس کے بعد وہ پارلیمنٹ پر ٹوٹ پڑیں اور بہت سے قوم پرور ممبر جن میں رؤف بے بھی شامل تھے گرفتار کر کے مالٹا بھیج دیئے گئے۔ جہاں ہزاروں آدمی جو اتحاد و ترقی کے رکن تھے یا سمجھ لئے گئے تھے، پہلے سے نظر بند تھے۔ اتحادیوں نے مارشل لا جاری کر دیا اور یہ اعلان کیا کہ جو شخص کسی قوم پرور کو اپنے گھر میں پناہ دے گا اُسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ عیسائیوں کے جتھے مسلح کر کے اُن سڑکوں پر جو اناطولیہ کو جاتی تھیں متعین کر دیئے گئے کہ قوم پرور بھاگ کر اُس طرف نہ جانے پائیں۔ ترکوں نے بھی فوراً اپنے جتھے بنا لئے اور قوم پروروں کو بھاگنے میں مدد دینے لگے۔ اتحادیوں اور فوجیوں کے تدغن کے باوجود بہت سے لوگ سامانِ جنگ کے ساتھ بچ کر نکل گئے۔

سلطان کی حکومت نے ایک عدالتِ خاص قائم کی۔ جس کی طرف سے اِن قوم پروروں کی جو سزائے موت کے مستوجب قرار دیئے گئے تھے پہلی فہرست شائع کی گئی۔ اِس میں مصطفےٰ کمال پاشا، علی فواد پاشا، ڈاکٹر عدنان اور ایک عورت کا نام بھی شامل تھا۔ اِس کے علاوہ شیخ الاسلام نے فتویٰ دیا کہ جو مسلمان ان لوگوں میں سے کسی شخص کو قتل کرے گا وہ سیدھا مسلمانوں کی جنت میں جائے گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ شیخ الاسلام نے پہلی بار نہ صرف غیر ملکی حکومتوں کا ساتھ دیا بلکہ ظلم و استبداد پر کمر باندھی۔

اِس اثنا میں مصطفےٰ کمال پاشا نے جو کچھ دن پہلے انگورہ پہنچ چکے تھے

یہ اعلان کیا کہ قومی پارلیمنٹ کا اجلاس انگورہ میں ہوگا۔ جمہور کو چاہیئے کہ پُرانے ممبروں میں سے جو لوگ اِس میں شریک نہیں ہو سکتے یا نہیں ہونا چاہتے اُن کی جگہ دوسرے ممبروں کو منتخب کر کے بھیجیں۔ یہی وہ جماعت تاسیسی تھی جس نے نئی ریاست قائم کی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت | جماعت تاسیسی کا اجلاس ۲۳ر اپریل ۱۹۲۰ء کو انگورہ میں ہوا۔ اُس نے مُلک کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اُس کا نام قومی مجلس عالیہ رکھا۔ مشرق میں یہ پہلی جمہوری حکومت تھی جو خود جمہور نے قائم کی۔ مشرق اور مغرب کی کش مکش میں یہ سب سے اچھی مغربی چیز تھی جو مشرق نے اختیار کی۔ تاریخ میں پہلی بار نہایت نازک موقع پر مُلک کی حکومت کا پورا بار اہل اناطولیہ کے کاندھوں پر رکھا گیا۔ جمہور کے نمایندوں نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ان لوگوں کا کام اتنا ہی مشکل تھا جتنا ان مٹھی بھر شمالی ترکوں کا جنھوں نے تیرھویں صدی میں شمالی سلطنت کی ایسی مضبوط بُنیاد رکھی کہ وہ سات سو سال تک ہلائی نہ ہلی۔

قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور انقلاب فرانس کی حکومت میں بہت مشابہت تھی۔ وہ مقننہ اور عاملہ دونوں کے فرایض ساتھ ساتھ انجام دیتی تھی۔ مجلس کا پریسیڈنٹ حکومت کا افسر اعلیٰ تھا۔ وائس پریسیڈنٹ پارلیمنٹ کے اجلاس میں صدارت کے فرایض انجام دیتا تھا۔ اس کی انتظامی کمیٹی مجلس وزرار کا کام کرتی تھی۔ ہر وزیر کا انتخاب مجلس، علیحدہ علیحدہ کرتی تھی۔ اور وہ انفرادی حیثیت سے مجلس کے سامنے جواب دہ تھا۔ اِس مجلس کا دستور اساسی اِس قابل ہے کہ اُس کا غور سے مطالعہ کیا جائے۔ اِس لئے کہ دنیا کی تاریخ میں کسی طرزِ حکومت کی مثال، جو حقیقی جمہوریت سے اتنی قریب ہو، مشکل سے ملے گی۔

اپریل سے جون تک اِس حکومت کے لئے سب سے مشکل زمانہ تھا۔ اُسے

سارے ملک میں عدالتی اور انتظامی محکمے قائم کرنے تھے۔ اس کام میں کسی قدر آسانی اس وجہ سے ہوگئی کہ نوجوان ترکوں نے جو نظم قائم کیا تھا وہ اب تک چل رہا تھا۔ مرکزی حکومت کی ترتیب میں زیادہ دقت پیش آئی۔ کیونکہ ایسے لوگ جو اس میں حصہ لے سکتے ہوں یا لینا چاہتے ہوں بہت کم تھے۔ مگر سب سے بڑی مشکل اور سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ملک میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ وسطِ اناطولیہ کی حفاظت کا دار و مدار بے قاعدہ فوج پر تھا۔ اس میں شک نہیں کہ اس فوج میں بعض لوگ بڑے بلند خیالات کے تھے اور وہی اس قومی تحریک کے ہراول تھے۔ مگر عام سپاہیوں میں نظم و ضبط قائم رکھنا بہت مشکل تھا۔ اور وہ بعض اوقات اتنی ہی زیادتیاں کر بیٹھتے تھے جتنی یونانیوں کی فوجیں کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ سلطان نے اتحادیوں کے روپئے سے غیر ترکی فوجیں بھرتی کی تھیں اور انھیں افواجِ خلافت کے نام سے اناطولیہ میں قوم پروروں سے لڑنے کے لئے بھیج دیا تھا۔

معاہدۂ سیورے اور بے قاعدہ فوج کا خاتمہ

اس زمانے میں دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے قومی مجلس عالیہ کی حکومت کی بن آئی۔ ان میں سے پہلی چیز سیورے کا معاہدہ تھا جس پر دستخط کر کے سلطان کی حکومت نے ترکی قوم کو سزائے موت کا حکم سنا دیا۔ اس معاہدے کی شرطیں ترکی کے متعلق یہ تھیں کہ سمرنا اور اس کا عقبی علاقہ اور مشرقی اور مغربی تھریس یونان کو دے دیا جائے، مشرق سے لے کر جنوب میں سلیشیا تک جس میں کردوں کا علاقہ شامل تھا آرمینیہ کی ریاست قائم کر دی جائے، بندرگاہیں اتحادیوں کے سپرد کر دی جائیں، درِ دانیال استنبول اور بحیرۂ مارمورہ کے مشرقی اور مغربی ساحل اتحادیوں کے انتظام میں رہیں۔ ترکی کی مالیات بھی ان کی نگرانی میں دے دی جائے۔ قدیم تجارتی اور عدالتی حقوق صرف فاتح قوموں کے لئے بحال کر دئے جائیں۔ ترکی کو ہوائی یا جنگی جہاز رکھنے کی اجازت

نہ ہو بلکہ صرف پندرہ ہزار بری فوج جس میں فوجی پولیس شامل ہے باقی رہنے دی جائے، اناطولیہ کا بے آب وگیاہ علاقہ جو ترکوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا وہ بھی مغربی ریاستوں کے حلقہ ہائے اثر میں تقسیم کر دیا جائے۔

سلطان کا معاہدۂ سیورسے پر دستخط کرنا اور پھر غیر ملکی فوجوں کے ساتھ افواجِ خلافت کو ترکی قوم کا خون بہانے کے لئے بھیجنا ایسی چیزیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ سلطنت اور خلافت دونوں کے نام سے بیزار ہو گئے۔

اِدھر نئی حکومت نے اپنی باقاعدہ فوج ترتیب دی اور بے قاعدہ جمعیتوں کو اس میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ بعض جمعیتوں نے سرکشی اختیار کی اور وہ بھی عین اُس وقت جب یونانیوں کی طرف سے شدت کا حملہ ہو رہا تھا۔ مگر نئی حکومت کی چھوٹی سی فوج نے اِنُونُو کے مقام پر ایک طرف یونانی فوج کو اور دوسری طرف ترکوں کی باغی فوج کو شکست دی۔ اِس فتح سے ترکی قوم کے حوصلے بڑھ گئے اور اسے اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا۔ اَب لوگ دل وجان سے نئی حکومت کا ساتھ دینے لگے۔

اِس زمانے میں لندن میں جو کانفرنسیں اناطولیہ کے مسئلے کے متعلق ہوئیں اُن کا ذکر میں چھوڑتی ہوں۔ یہ اُسی وقت کی جاتی تھیں جب ترکوں کی فتح ہوتی تھی۔ اُن کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یونانی فوج کو سنبھلنے کی مہلت مِل جائے۔

معرکۂ سقاریہ | ترکوں اور یونانیوں کی فیصلہ کن لڑائی سقاریہ کے مقام پر ہوئی۔ یونانیوں نے اَسکی شہر میں ترکوں کو شکست دینے کے بعد تمام ریلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اور انگورہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ یہ ترکوں کے لئے نازک وقت تھا مگر اُن کی قوم اور قومی مجلس اس امتحان میں پوری اُتری۔

مصطفےٰ کمال پاشا سپہ سالارِ اعظم بنائے گئے اور انھیں غیر معمولی اختیارات

دیئے گئے۔ عصمت پاشا محاذ جنگ کے سپہ سالار، فیضی پاشا اُن کے نائب اور رفعت پاشا وزیرِ جنگ ہوئے۔

ترکوں کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا تھا۔ انھیں مشرق سے سپاہی اور سامانِ جنگ محاذ پر پہنچانا تھا۔ موسم انتہا سے زیادہ خراب تھا۔ راہ میں صحرا اور پہاڑ حائل تھے۔ باربرداری کا ذریعہ اونٹوں، بیل گاڑیوں اور انسانوں کے کندھوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو چار سو میل سے زیادہ کی سنگلاخ اور دشوار گذار راہ پیدل طے کرنی پڑی۔ اسلحہ سازی کے عارضی کارخانے قائم ہوگئے۔ اور ریلوں کی بچی کھچی پٹریاں اُکھاڑ کر ہتھیار ڈھالے جانے لگے۔

یونانیوں کے پاس اسّی ہزار تربیت یافتہ فوج، اعلیٰ درجے کا توپ خانہ جس میں دو سَو توپیں تھیں، سامانِ جنگ بہ افراط، ریلیں۔ لاریاں اور مغربی ترکی کی عمدہ سڑکیں، ترکوں کی کُل کائنات چھبیس ہزار فوج جس کے پاس کچھ نئی کچھ پرانی، کچھ ماؤزر، کچھ مارٹینی بندوقیں، کُل چھ توپیں، بہت تھوڑا سامان جنگ اور باقی خدا کا نام۔

ترکوں نے جو شجاعت میدانِ جنگ میں دکھائی زبان میں طاقت نہیں کہ اُسے بیان کرسکے۔ تیئس دن کی لڑائی میں ساڑھے سولہ ہزار ترک کام آئے جن میں افسروں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ ترک حملہ کرتے تھے اپنی گنی چنی چھ توپوں کے سہارے پر یونانیوں کا پشت پناہ زبردست توپ خانہ تھا۔ مگر کیا مجال کہ ایک ترک سپاہی بھی میدانِ جنگ سے منہ موڑے۔ کاظم قارابکر پاشا نے میدانِ جنگ سے جو تار مصطفےٰ کمال پاشا کو بھیجا تھا اُس سے ترکی قوم کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ "جب تک پہاڑی کی کسی چوٹی پر ایک ترک سپاہی بھی باقی رہے گا، مقابلہ جاری رہے گا" مصطفےٰ کمال پاشا نے اُن دِنوں ایک تقریر کی تھی جس کے چند دلآویز فقرے میں آپ کو سُناتی ہوں:۔

"قومی مجلس کے صدر کی حیثیت سے میں آپ حضرات کے سامنے یہ اعلان

کرتا ہوں کہ ہمارا مقصود جنگ نہیں ہے۔ ہم صلح کے طالب ہیں۔ میرے خیال میں کوئی چیز ہمیں اپنے ارادے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر یونانی فوج یہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے جائز حقوق چھوڑ دیں گے تو یہ محض اُس کی خام خیالی ہے۔ دشمن ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنی حفاظت کے لئے تلوار اُٹھائی ہے۔ اِس سے بڑھکر اور معقول بات کیا ہوسکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دِلاتا ہوں کہ ہم یونانی فوج کو ڈھکیلتے چلے جائیں گے یہانتک کہ اُس کا ایک سپاہی بھی ہماری زمین پر باقی نہ رہے۔"

ترکوں کو سقاریہ میں فتح حاصل ہوئی۔ کلیر پرائس نے اپنی کتاب "ترکی کی دوبارہ زندگی" میں اِس فتح کی پوری اہمیت ذیل کے الفاظ میں دکھائی ہے:۔

"ترکوں کو دریائے سقاریہ کے کنارے جو فتح حاصل ہوئی اُس نے مشرقِ ادنیٰ اور مشرقِ وسطیٰ کا سیاسی نقشہ بدل ڈالا۔ دوسو سال سے مغرب قدیم عثمانی سلطنت کو پارہ پارہ کر رہا تھا۔ مگر سقاریہ کے کنارے اس کا سامنا خود ترکی قوم سے ہوا۔ اس چٹان سے ٹکرانا تھا کہ دھارے کا رُخ پلٹ گیا۔ مورخوں پر ایک دن یہ حقیقت کھل جائے گی کہ سقاریہ کی یہ چھوٹی سی لڑائی ہمارے زمانے کا سب سے زبردست فیصلہ کن معرکہ تھا۔

اِس فتح کی بدولت نئی حکومت کے قدم جم گئے۔ یونانی فوج کی کمر ٹوٹ گئی اور اتحادیوں میں پھوٹ پڑگئی۔ فرانس نے صُلح کر لی، قومی مجلس عالیہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور سلیشیا سے اپنی فوجیں ہٹا لیں۔ اٹلی نے عدالیہ کو خالی کر دیا۔ سوویٹ روس نے سنہ ۱۹۲۰ء میں انگورہ کی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ اِس سے ہمیں بہت بڑی مادی اور اخلاقی مدد مِلی کہ لڑائی کے زمانے میں جب ہمیں اپنی ساری قوت مغربی سرحد پر مجتمع کرنی تھی ہم مشرقی سرحد کی طرف سے مطمئن رہے۔ ایک بڑی وجہ کامیابی کی یہ بھی تھی کہ کاظم قارا بکر پاشا نے آرمینیہ کی لڑائی میں اردھان اور قرص لے کر صلح کر لی تھی۔ اس لئے سقاریہ کی جنگ میں ترکی کو مشرق سے فوجیں اور سامانِ جنگ برابر پہنچتا رہا۔

اس نازک زمانے میں ہندوستان نے بھی ترکوں سے بڑی ہمدردی کی۔ اور انھیں بہت مدد دی۔ میں اس معرکے کے ایک ناچیز کارکن کی حیثیت سے آپ لوگوں کے سامنے سرِ نیاز خم کرتی ہوں اور دلی مسرت کے ساتھ یہ الفاظ کہتی ہوں کہ بھائیو اور بہنو! میرا شکریہ قبول کیجئے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔"

آخری فتح | جنگ سقاریہ کے سال بھر بعد اگست ۱۹۲۲ء میں ترکی فوج نے مصطفےٰ کمال پاشا کی سرکردگی میں جارحانہ اقدام شروع کیا اور سمرنا کو فتح کرنے سے پہلے اپنا سارا ملک یونانی فوجوں سے خالی کرا لیا۔ مغربی ریاستوں نے یہ فیصلہ کیا کہ لوزان میں صلح کی کانفرنس منعقد کی جائے۔ دنیا نے مان لیا کہ ترکی قوم لڑائی کی آگ میں تپ کر، تلوار کی باڑھ پر چل کر اپنے امتحان میں پوری اتری۔

لوزان کانفرنس | مغربی ریاستوں نے استنبول کی حکومت اور قومی مجلس عالیہ کی حکومت دونوں کو کانفرنس میں مدعو کیا۔ لوزان جانے سے پہلے اِس دوعملی کی گتھی کو سلجھانا ضروری تھا مجلسِ عالیہ نے ایک طویل اور معرکۃ الآراء اجلاس کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ سلطنت اور خلافت کے منصب الگ الگ کر دئیے جائیں۔ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور سلطان منصبِ حکومت سے معزول کر دیا گیا۔ استنبول نئی حکومت کا ایک صوبہ قرار دیا گیا۔ (نومبر ۱۹۲۲ء) سلطان وحیدالدین نے اتحادیوں کے ایک جنگی جہاز میں پناہ لی۔ اور مجلس نے عبدالمجید آفندی کو خلیفہ منتخب کر لیا۔ لوزان کانفرنس نومبر ۱۹۲۲ء میں شروع اور جولائی ۱۹۲۳ء میں ختم ہوگئی۔ قومی مجلس عالیہ کی حکومت اور اتحادیوں کے درمیان جو صلح نامہ ہوا اُس میں ترکوں کے قومی معاہدے کی تمام دفعات تسلیم کر لی گئیں۔

خواتین اور حضرات!

آپ سب لوگ اور ساری دنیا بجا طور پر اِن مشاہیر کی قدر کرتی ہے جنھوں نے ترکوں کو اِس جنگ میں کامیابی کی منزل پر پہنچایا۔ مگر آپ کو کیا معلوم، دنیا کیا جانے کہ

اُن ہزاروں گمنام عورتوں اور مردوں نے جو اِس لڑائی میں کام آئے کیسی کیسی عظیم الشان قربانیاں کیں اور کیا کیا کارہائے نمایاں کر دکھائے۔ میری التجا ہے کہ جب آپ مسجدوں اور مندروں میں جاکر دُعا مانگیں تو اِن لوگوں کو نہ بھولیں۔ شہیدوں کی یہ جماعت، مرد، عورت، بوڑھے، جوان، بچے، جنھوں نے اِس کوشش میں جان دی کہ اُن کی قوم امن اور عزت کے ساتھ دنیا میں رہ سکے اِس قابل ہیں کہ دُنیا کی ساری قومیں قیامت تک اُن کے لئے دُعا کرتی رہیں۔

مطلع اسلام

(ترجمہ از "زوال روما" مصنفہ ایڈورڈ گبن)

ٹھیک اُس وقت جب رُومی حکومت، فارس والوں کی جنگ سے تھک کر چور ہو گئی تھی اور کلیسا نسطوریون اور منوفیسیون کی وجہ سے پریشان تھا حضرت محمدؐ ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن لئے ہوئے روم اور نصرانیت کے کھنڈروں پر اپنا تخت بچھا رہے تھے۔ رسولِ عربی کی قابلیت اور ذہانت، ان کی قوم کے اخلاق و عادات، اور اُن کے مذہب کے جوش و ولولے میں روم کی مشرقی حکومت کے زوال کے اسباب مضمر ہیں۔ اب ہماری آنکھیں حیرت کے ساتھ اِس سب سے زیادہ یادگار انقلاب پر گڑی ہوئی ہیں جس نے کرۂ ارض کی قوموں پر ایک بالکل نرالا اور دیرپا نقش چھوڑا ہے۔

مُلکِ عرب کا حال فارس، شام، مصر اور حبشہ کے درمیان جو خالی جگہ ہے اس میں جزیرہ نمائے عرب ایک وسیع مگر بے قاعدہ مثلث کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ شمالی کونے (بالیس) سے لے کر جو دریائے فرات پر واقع ہے خاکنائے باب المندب تک جہاں لوبان پیدا ہوتا ہے پندرہ سو میل کا فاصلہ ہے۔

مشرق سے مغرب تک یعنی بصرہ سے سویز تک اور خلیج فارس سے بحیرۂ احمر تک درمیانی چوڑائی اس کی نصف[1] (۲۵۰ میل) سمجھ لیجئے۔ مثلث کے ضلعے تدریجاً بڑھتے چلے جاتے ہیں یہاں تک کہ جنوبی ضلع بحر ہند پر ایک ہزار میل کا محاذ بناتا ہے۔

زمین اور آب و ہوا جزیرہ نما کا پورا رقبہ جرمنی یا فرانس سے چوگنا ہے۔ لیکن اس کے بڑے حصے پر جائز طور سے ریگستانی یا کوہستانی علاقہ ہونے کا

---

[1] یہ پیمائش صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ چوڑائی ۹۰۰ میل ہے۔ جنوبی ضلع ۱۲۰۰ میل ہے۔ ۱۲

الزام عائد ہوتا ہے۔

گئے گزرے صحرائے تاتار کو بھی قدرت نے تناور درختوں اور ہری بھری جڑی بوٹیوں سے آراستہ کر دیا ہے۔ کوئی راہ رو جو اُدھر جا نکلے اِن سبز قامتوں کی موجودگی سے آرام پاتا ہے اور تنہائی محسوس نہیں کرتا لیکن عرب کا سنسان لق و دق صحرا تو ریت کا ایک ناپیدا کنار ہموار میدان ہے۔ جس کو کہیں کہیں نوکیلے عریاں پہاڑ کاٹتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔ نہ کہیں سایہ ہے نہ جائے پناہ۔ صفحۂ ریگستان، برجِ سرطان کے آفتاب کی تیز اور سیدھی شعاعوں سے جھلستا رہتا ہے۔

خوشگوار ہواؤں کے بدلے آندھیاں چلتی ہیں۔ بالخصوص جنوب و مغرب سے چلنے والی آندھی جو زہریلے کیا بلکہ مہلک بخارات پھیلاتی ہے۔ خاک کے تودے جو اِن ہواؤں کے چلنے سے بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں سمندر کی اونچی اونچی لہروں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ کاروان کے کاروان، لشکر کے لشکر اِس طوفانِ گرد میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ پانی جیسی عام فائدے کی چیز بھی اِس قدر کمیاب کہ اُس پر وہاں لوگ جان دیتے اور اکثر لڑ مرتے ہیں۔ لکڑی کی اِس قدر قلت ہے کہ آگ جیسے معمولی عنصر کو محفوظ رکھنے اور ایک سے دوسرے کو پہنچانے کے لئے بھی بڑی کاریگری کی ضرورت ہے۔

جہازرانی کے قابل دریا جو ایک طرف تو زمین کو زرخیز بناتے ہیں اور دوسری طرف ملکی پیداوار کو قریبی ملکوں تک لے جاتے ہیں عرب میں ناپید ہیں۔ چشمے (ندی نالے) جو پہاڑیوں سے بہ کر آتے ہیں، پیاسی زمین جذب کر لیتی ہے۔ کمیاب اور سخت تنے والے پودے مثلاً املی، ببول وغیرہ جن کی جڑیں چٹانوں میں سے پھوٹ نکلتی ہیں، شبنم کے سہارے پھلتے پھولتے ہیں۔ بارش کے پانی کا تھوڑا سا ذخیرہ حوضوں اور تالابوں میں جمع کر لیا جاتا ہے۔ یہ کنوئیں اور چشمے تو وہ تو ریگستان کے پوشیدہ خزانے ہیں۔

خشک اور گرم میدانوں کے طویل سفر کے بعد جب حاجی لوگ وہ پانی پیتے ہیں جو

گندھک آمیز یا شور زمین پر بہ کر آیا ہے تو اُن کی طبیعت بہت مکدر ہوتی ہے۔

یہ عرب کا ایک مختصر سا خاکہ ہے۔

تکلیف اُٹھانے کے بعد اگر کسی مقام پر معمولی سا آرام بھی مِل جائے تو اُس کی قدر و قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک سایہ دار کنج۔ ہری بھری چراگاہ یا تازہ پانی کا ایک چشمہ اقامت گزین عربوں کی نو آبادی کو اِس مبارک مقام کی طرف کھینچنے کے لئے کافی ہے جہاں اُن کو اور اُن کے مویشیوں کو کھانا اور آرام مِل سکے اور اُن کی کھجوروں اور انگوروں کی زراعت سرسبز ہو سکے۔

وہ سطح مُرتفع جو بحر ہند کے ساحل کے قریب ہے پانی اور لکڑی کی افراط کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ وہاں ہوا نسبتاً معتدل ہے۔ پھل آس پاس کے دوسرے خطوں کی بہ نسبت لذیذ ہوتے ہیں۔ حیوانات اور انسان بھی وہاں زیادہ ہیں۔ زمین کی زرخیزی دیکھ کر کسان محنت پر آمادہ ہوتا ہے اور خاطر خواہ منافع حاصل کرتا ہے۔ اِس سرزمین کا مخصوص تحفہ بخورات اور قہوہ ہیں جن کی کشش ہر زمانے میں تاجروں کو یہاں لاتی رہی۔ اگر اِس خطے کا بقیہ جزیرہ نما سے مقابلہ کریں تو بے شک یہ الگ تھلگ قطعہ زمین اس کا پورے طور پر مستحق ہے کہ اس کو شاداب کے خطاب سے یاد کیا جائے اِس مُلک کے متعلق تخیّل اور فسانے کی یہ شاندار رنگ آمیزی جو تم دیکھتے ہو تضاد نے تجویز کی ہے اور فاصلہ و مسافت نے اِس کی شکل و صورت بنادی ہے۔

اِس فردوس ارضی ہی کے لئے قدرت نے اپنے منتخب عطیے اور حیرت انگیز صنائع محفوظ رکھے تھے۔ نفیس فراوانی اور سادگی کی گوناگون برکتیں یہاں کے رہنے والوں کی قسمت میں لکھی گئیں۔ زمین سونے اور جواہرات سے مالا مال تھی۔ اور بحر و بر دونوں کو خوشبودار لذتوں سے بہرہ مند ہونے کی عادت ڈالی گئی تھی۔

عرب کے طبعی حصے عرب کی تقسیم، ریگستانی، کوہستانی اور شاداب علاقوں میں یونانیوں اور رومیوں میں تو عام ہے لیکن خود عرب اِس

تقسیم سے نابلد ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ کوئی ملک جو زبان اور باشندوں کے لحاظ سے ہمیشہ ایک رہا ہو اپنے قدیم جغرافیہ کی شکل کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ عرب کے ساحلی علاقے بحرین اور عمان، فارس کی حکومت کے مقابل ہیں۔ یمن کا علاقہ شاداب عرب کی حدود یا کم از کم محلِ وقوع کو ظاہر کرتا ہے۔ نجد نام کا خطہ اندرونی علاقے میں پھیلا ہوا ہے۔ اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ کی ولادت کے شرف نے حجاز کے خطے کو جو بحیرۂ احمر کے ساحل پر واقع ہے مشہور و معروف کر دیا ہے۔

بدوؤں کے اخلاق و عادات

مردم شماری کا دارو مدار گذر اوقات کے سامان کی قلت یا کثرت پر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی ایک چھوٹے سے زرخیز اور صنعتی صوبے کی آبادی اُس وسیع جزیرہ نما کی آبادی سے زیادہ ہو (ابتدائی عہد میں) خلیج فارس۔ بحرِ ہند اور بحرِ احمر کے ساحل پر وحشی لوگ جن کا گذارہ مچھلی پر تھا اپنی خوراک کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ اِس ابتدائی اور بے سروسامانی کی حالت میں جس کو سماج کہنا سماج کا نام بدنام کرنا ہے۔ اِس بن مانس کو جو نہ صنعت و حرفت سے آگاہ تھا نہ قانون سے واقف۔ جو سمجھ سے عاری اور زبان سے نا آشنا تھا، حیوانِ مطلق کے گروہ سے علیحدہ کرنا مشکل ہے۔ اِس خاموش تغافل کی حالت میں نسلیں اور مدتیں گذر گئی ہوں گی اور اِن رکاوٹوں، حوائج اور مشاغل کی وجہ سے جو اس بے بس وحشی انسان کو تنگنائے ساحلِ بحر میں روکے ہوئے تھے وہ اپنی نسل بڑھانے سے معذور رہا ہوگا۔

لیکن اس قدیم زمانے کے ابتدائی حصے ہی میں عربوں کی ایک بڑی جماعت نے اپنے آپ کو اِس مصیبت کی حالت سے نکال لیا تھا۔ چونکہ کف دست صحرا، شکاری لوگوں کی پرورش نہیں کر سکتا تھا اِس لئے انھوں نے یک لخت ترقی کر کے چرواہوں کی زندگی اختیار کر لی۔ جس میں شکاری کی زندگی سے زیادہ محفوظ اور منفعت بخش سیر حاصل ہے۔

ریگستان کی خانہ بدوش قوموں کا طرزِ زندگی اُس زمانہ سے لے کر اب تک یکساں

چلا آتا ہے۔ اور موجودہ زمانے کے بدوؤں کی شکل وصورت میں ہم اُن کے اُن آباد و اجداد کے خدوخال کا پتہ لگا سکتے ہیں جو حضرت موسیٰ یا حضرت رسول خدا کے عہد میں بالکل ایسے ہی خیموں میں رہتے تھے اور اپنے گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کو انہی چشموں یا چراگاہوں کی طرف ہنکاتے تھے۔

مفید جانوروں کے قابو میں آجانے سے ہماری محنت کم اور دولت زیادہ ہو جاتی ہے۔ عرب چرواہوں کو بھی ایک وفادار دوست (گھوڑا) اور ایک محنتی نوکر (اونٹ) ہاتھ آگیا تھا۔ علمائے طبیعیات کے قول کے مطابق عرب گھوڑوں کا اصلی وطن ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اس شریف الطبع جانور کے قد و قامت کے لئے نہ سہی مگر تیزی اور پھرتی کے لئے بہت سازگار ہے۔ بارب، اسپینی اور انگریزی نسل کے گھوڑوں کی خوبی عربی خون کی آمیزش ہی سے پیدا ہوئی ہے۔

بدو لوگ اس احتیاط کے ساتھ جو توہم کی حد تک پہنچ گئی ہے اپنے خالص نسل کے گھوڑوں کے کارناموں کی یاد محفوظ رکھتے ہیں۔ نر بہت گراں قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں اور مادہ کو تو شاید ہی کبھی جدا کیا جاتا ہو۔ کسی اچھی نسل کے بچھڑے کے پیدا ہونے کو عربی قبائل میں نیک فال سمجھا جاتا تھا۔ اور (اس موقع پر) ایکدوسرے کو مبارکباد دی جاتی تھی۔ گھوڑوں کو عرب اپنے اُن خیموں میں جہاں بال بچے رہتے ہیں اُنس و محبت کے ساتھ سدھاتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن میں شرافت اور خاندان کے ساتھ اُلفت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ صرف قدم چلنے اور سرپٹ دوڑنے کے عادی بنائے جاتے ہیں۔ مہمیز اور چابک کے لگاتار غلط استعمال سے اُن کے احساسات کو کند نہیں کیا جاتا۔ اُن کی قوتوں کو بھاگنے اور تعاقب کرنے کے مواقع کے لئے محفوظ رکھا جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ ہاتھ کی تھپکی یا رکاب کا اشارہ پاتے ہیں تو ہوا کی طرح اُڑنے لگتے ہیں۔ اور اگر اُن کا سوار اُن کی رفتار کی تیزی کی وجہ سے زین سے جدا ہو جائے تو فوراً رُک جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ پھر اپنی نشست جمالے۔

افریقہ اور عرب کے ریگستان میں اونٹ ایک مقدس اور بیش بہا چیز ہے۔ یہ مضبوط اور صابر باربردار بغیر کھائے پئے کئی کئی دن تک سفر کر سکتا ہے۔ تازہ پانی کا ذخیرہ ایک بڑی تھیلی میں محفوظ رہتا ہے جو حقیقت میں اس جانور کا جس کے جسم پر محنت و مشقت اور غلامی کے نشانات پڑے ہوئے ہیں پانچواں پیٹ ہے۔ بڑی نسل کے اونٹ ہزار پونڈ تک بوجھ لے جا سکتے ہیں۔ اور ناقہ جو ہلکا پھلکا اور پھرتیلے بدن کا ہوتا ہے۔ دوڑ میں تیز سے تیز گھوڑے کو مات کر سکتا ہے۔

مُردہ یا زندہ اونٹ کے جسم کا ہر حصّہ انسان کے لئے کارآمد ہے۔ اُس کا دودھ بکثرت ہوتا ہے اور اُس میں غذائیت ہوتی ہے۔ نوعمر اونٹ کا نرم گوشت بچھڑے کے گوشت کی طرح لذیذ ہوتا ہے۔ اس کے پیشاب سے ایک قسم کا قیمتی نمک نکالا جاتا ہے۔ اس کی مینگنیاں، ایندھن کی قلت کو دور کرتی ہیں۔ اس کے لمبے لمبے بالوں سے جو ہر سال گر کر نئے پیدا ہوتے ہیں، بدوؤں کے کپڑے، فرش فروش اور خیمے بُنے جاتے ہیں۔

برسات کے موسم میں وہ ریگستان کی کمیاب اور ناکافی گھاس پھوس پر گذارہ کرتے ہیں۔ موسم گرما کی شدّت اور سرما کے قحط کے زمانے میں وہ اپنے ڈیرے خیمے ساحل کی طرف یمن کی پہاڑیوں میں یا فرات کے آس پاس لے جاتے ہیں۔ اکثر انھوں نے دریائے نیل کے ساحل یا شام و فلسطین کے دیہات پر چڑھنے کا خطرناک اقدام بھی کیا ہے۔

خانہ بدوش عرب کی زندگی خطرہ اور مصیبت کی زندگی ہے۔ اور گو بعض اوقات وہ لوٹ یا تبادلہ کے ذریعہ سے اپنی کارگیری کا ثمر حاصل کر لے مگر یورپ کا ایک معمولی شہری عرب کے اُس صاحب اختیار امیر سے جو میدانِ جنگ میں ۱۰ ہزار سواروں کی کمان کرتا ہے زیادہ دولت و عیش کا مالک ہے۔

عرب کے شہر | لیکن پھر بھی عربی قبائل اور سمتیا قوم کے وحشی گروہوں میں ایک خاص

فرق پایا جاتا ہے۔ کیونکہ عربوں میں سے بہت سے لوگ شہروں میں رہتے تھے اور تجارت و زراعت میں مشغول تھے۔ ان شہری عربوں کے وقت اور صنعت کا ایک حصہ اپنے مویشیوں کے انتظام کی نذر بھی ہوتا تھا۔ وہ صلح اور جنگ میں اپنے بدوی بھائیوں سے ملتے جلتے تھے اور بدوی ان لوگوں کے تعلقات کی وجہ سے اپنی ضروریات کے سامان اور صنعت و حرفت اور علم کی شُد بُد حاصل کرتے تھے۔

عرب کے بیالیس شہروں میں سے جن کے نام ابوالفدا نے گنائے ہیں سب سے پرانے اور سب سے زیادہ آباد شہر، عرب کے زرخیز خطہ یمن میں واقع تھے۔ صنعا کی مینار اور مارب کے حیرت انگیز حوض حمیری بادشاہوں کے بنوائے ہوئے تھے۔ لیکن ان کے دنیاوی جاہ و جلال پر مدینہ و مکہ کی پیغمبرانہ عظمت کی وجہ سے پردہ پڑ گیا۔

مکّہ مکہ و مدینہ، یہ دونوں شہر بحر احمر کے کنارے ایک دوسرے سے ۲۷۰ میل کے فاصلے پر واقع ہیں۔ موخر الذکر مقدس شہر یونانیوں میں مکروبا کے نام سے مشہور تھا اس کے آخری حرف (با) سے اس کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ جو درحقیقت اپنے عروج کے زمانہ میں بھی کیا بلحاظ طول و عرض اور کیا بلحاظ مردم شماری مارسیلز سے نہیں بڑھا۔ کسی پوشیدہ مقصد نے، شاید توہم پرستی نے اس شہر کے بانیوں کو اس بنجر زمین کے انتخاب پر آمادہ کیا ہوگا۔

تین خشک پہاڑوں کے دامن میں دو میل لمبے اور ایک میل چوڑے میدان میں انہوں نے اپنے مٹی اور پتھر کے مکانات کھڑے کر دیئے۔ زمین پتھریلی ہے۔ زمزم کے مقدس کنوئیں تک کا پانی کڑوا اور کسیلا ہے۔ چراگاہیں شہر سے فاصلہ پر ہیں۔ انگور تقریباً ستر میل دور طائف کے باغوں سے یہاں لائے جاتے ہیں۔

مکہ کے حاکم قبیلہ قریش کا جوش و خروش اور ان کی شہرت عربی قبائل میں نمایاں تھی۔ لیکن ان کی بنجر زمین زراعت کے موافق نہ تھی۔ اس لئے ان کی حالت تجارتی جدوجہد کے لئے

سازگار تھی۔ جدّہ کی بندرگاہ کی وجہ سے جو صرف چالیس میل کے فاصلہ پر ہے وہ اہلِ سینیا کے ساتھ آسانی سے تعلقات رکھتے تھے۔ یہی عیسائی حکومت تھی جس نے پہلے پہل حضرت نبی کریم کے اصحاب کو اپنے ہاں پناہ دی۔ افریقہ کی دولت جزیرہ نما کے اِس طرف جرہہ یعنی قطیف تک جاتی تھی جو بحرین کے صوبہ میں ہے۔ یہ وہ شہر ہے جس کے لئے مشہور ہے کہ کلدانیہ کے نکالے ہوئے لوگوں نے شور چٹان سے بنایا تھا۔ وہاں سے یہ سامان خلیج فارس کے موتیوں کے ساتھ بیڑوں پر فرات کے دہانہ تک پہنچایا جاتا تھا۔

مکّہ :- دائیں طرف یمن اور بائیں طرف شام، اِن دونوں کے بیچ میں مکّہ تقریباً مساوی فاصلہ پر یعنی ایک مہینہ کی راہ پر واقع ہے۔ اوّل الذکر مکّہ کے (تجارتی) کاروانوں کا سرمائی مستقر اور آخر الذکر گرمائی مستقر تھا۔ اِن کاروانوں کی وقت پر آمد ہندوستان کے جہازوں کو بحرِ احمر کے تکلیف دہ سفر کی زحمت سے بچا لیتی تھی۔ صنعاً اور ماریب کی منڈیوں میں، عمان اور عدن کی بندرگاہوں پر قریش کے اونٹ خوشبودار مصالحوں کے قیمتی سامانِ تجارت سے لادے جاتے تھے۔ اور بصریٰ اور دمشق کے بازاروں سے غلّہ اور مصنوعات خریدا جاتا تھا۔ اِس منفعت بخش تبادلہ اجناس کی بدولت مکّہ کی گلیوں میں دولت اور افراط بکھری پھرتی تھی۔ اور وہاں کے شریف زادے فنونِ جنگ کے شغف کے ساتھ ساتھ تجارت کو بھی اپنا مشغلہ بناتے تھے۔

عربوں کی فوجی آزادی

عربوں کی ازلی آزادی کی اپنے اور پرائے سب قصیدہ خوانی کرتے چلے آئے ہیں اور فنِ مناظرہ کی بدولت تو یہ عجیب واقعہ اسمٰعیل کی اولاد کے حق میں ایک پیشینگوئی اور معجزہ بن گیا ہے۔ بعض مستشنیات جن کو نہ نظر انداز کیا جاسکتا ہے نہ چھپایا جاسکتا ہے، اِس قسم کے طرزِ استدلال کو فضول اور لایعنی بنا دیتے ہیں ولایتِ یمن یکے بعد دیگرے حبشیوں، ایرانیوں، مصری سلاطین اور ترکوں کے ماتحت رہتی چلی آئی ہے؛

حرمین شریفین تو کئی بار ایک سے تین ظالم کے سامنے جھک چکے ہیں۔ عرب کے دوسرے صوبے میں تو (خصوصیت سے) وہ مخصوص صحرا شامل تھا جس میں اسمٰعیل اور ان کے فرزندوں نے اپنے بھائیوں کے مقابل خیمے لگائے ہوں گے۔

خیر یہ مستثنیات عارضی یا مقامی حیثیت رکھتی ہیں۔ بحیثیت ایک قوم کے عرب بڑے سے بڑے شہنشاہ سے بھی مغلوب نہیں ہوئے۔ سیسا طرس ہو یا سائرس۔ پوپی ہو یا طریجان کوئی بھی عربوں پر فتح حاصل نہ کر سکا۔ ترکوں کا موجودہ بادشاہ ایک موہوم اقتدار رکھتا ہو تو رکھتا ہو مگر اس کا سارا فخر صرف اس بات تک محدود ہے کہ وہ ایک ایسی قوم کی دوستی کا خواہاں ہے جس کو اشتعال دلانا خطرناک ہے اور جس پر حملہ کرنا بے سود ہے۔

ان کی آزادی کے اسباب نمایاں ہیں اور ان کے کردار اور ان کے ملک کے چپے چپے پر ثبت ہیں۔ ظاہری اسباب ان کے اور ان کے ملک کے حالات میں مضمر ہیں۔ حضرت رسولِ خدا سے صدیوں پہلے جارحانہ اور مدافعانہ جنگوں کے دوران میں ان کی ہیبتناک شجاعت کا سکہ ان کے ہمسایوں کے دلوں پر جم چکا تھا۔ صبر و استقلال اور پھرتی کی سپاہیانہ صفتیں شبانی زندگی کی منضبط عادتوں کی بدولت غیر محسوس طور پر نشو و نما پاتی ہیں۔

بھیڑوں اور اونٹوں کی نگہداشت کا کام قبیلے کی عورتوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے لیکن جنگجو نوجوان گھوڑے پر سوار اپنے امیر کے علم کے زیر سایہ ہمیشہ میدانِ جنگ میں حاضر رہتا ہے اور کمان، نیزہ اور خنجر کے استعمال کی مشق بڑھاتا رہتا ہے۔ ان کی حریت اور آزادی کی طویل یاد اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ ہمیشہ آزاد رہیں گے۔ اور آنے والی نسلیں اپنے آپ کو خلفِ صالح ثابت کرنے کے لئے بے چین اور اپنی اس موروثی خصوصیت کو قائم رکھنے کے لئے جوش و خروش کے ساتھ آمادہ رہتی ہیں۔ مشترک دشمن کے حملے کے وقت ان کی خانہ جنگیاں ملتوی ہو جاتی ہیں چنانچہ ترکوں سے ان کی پچھلی جنگ میں مکے کا کارواں اسّی ہزار اتحادیوں نے لوٹ لیا تھا۔

جب وہ لڑائی کے لئے بڑھتے ہیں تو فتح وظفر کی امید اُن کی نظروں کے سامنے اور بھاگ کر صاف نکل جانے کا یقین اُن کے عقب میں ہوتا ہے۔

ان کے گھوڑے اور اونٹ جو آٹھ دس دن میں پانچ پانچ سو میل کے دھاوے مارتے ہیں فاتح کی نظروں سے غائب ہو جاتے ہیں۔ ریگستان کے پوشیدہ چشمے اس کی تلاش وجستجو سے باہر ہوتے ہیں۔ ایک ایسے اوجھل دشمن کے تعاقب میں جو اُس کی کوششوں کو خاک میں ملا دیتا ہے اور مزے میں ریگستان کے بیچ میں کسی تپتے ہوئے گوشے میں آرام لیتا ہے اس کا ظفریاب لشکر بھوک پیاس اور تکان سے چکنا چور ہو جاتا ہے۔

بدوؤں کے ہتھیار اور اُن کا ریگستان صرف انھی کی آزادی کا ضامن نہیں بلکہ یہ شاداب عرب کے لئے بھی روک ہیں، جہاں کے باشندے لڑائی سے الگ تھلگ رہنے اور زمین اور آب وہوا کی دی ہوئی نعمتوں کی افراط کی بدولت بزدل ہو گئے ہیں۔

اغسطس[1] (نے جب حملہ کیا ہے تو اُس) کا لشکر بیماری اور تکان کے مارے تتر بتر ہو گیا تھا اور یہ صرف بحری قوت ہی ہے جس کی بدولت کبھی کبھی یمن کو کامیابی کے ساتھ زیر کیا جا سکا ہے۔

جب نبی کریم علیہ وآلہ الصلوٰۃ والتسلیم نے اپنا مقدس علم بلند فرمایا تو یہ خطہ حکومت فارس کا ایک صوبہ تھا۔ لیکن پھر بھی سات حمیری شہزادے پہاڑوں میں حکمرانی کرتے تھے اور کسریٰ کے نائب السلطنت کو اپنے دور دراز ملک اور بدقسمت آقا کو بھول جانے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ جسٹینین کے عہد کے مورخین نے آزاد عربوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے جن کو مشرق کی طرح جنگوں کے زمانہ میں تعلق یا مفاد نے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ قبیلہ غسان کو شامی علاقہ میں آباد ہونے دیا گیا۔

---

[1] ۲۴ ق.م میں جب اغسطس روم کا قیصر تھا تو اس کے حکم سے الیس گیلس حاکم مصر نے عرب پر حملہ کیا۔ پلینی جو قدیم زمانہ کا مشہور ...... مورخ ہے لکھتا ہے کہ اس نے مدینہ کے قریب لنگر انداز کیا اور ایک ہزار میل تک دھاوا مارا۔ مگر بے سود۔ فوج گرم آب وہوا کی تاب نہ لا سکی اور بیمار پڑ گئی ۔

حیرہ کے شہزادوں کو بابل کے کھنڈروں سے تقریباً چار میل جنوب کی طرف ایک شہر بسانے کی اجازت دے دی گئی۔ میدانِ جنگ میں تو یہ لوگ پھرتی اور ہمت سے کام کرتے تھے۔ مگر اُن کی دوستی بے بقا، وفاداری ناپائدار اور دشمنی مستعجل تھی۔ اِن خانہ بدوش وحشیوں کو مشتعل کر دینا سہل مگر اُن سے ہتھیار رکھوا دینا مشکل تھا۔

جنگ کے دوران میں ملنے جلنے کی وجہ سے اُنھوں نے روم اور فارس دونوں کی اندرونی کمزوری کا پتہ لگا لیا تھا اور وہ اُس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔

یونانیوں اور رومیوں نے مکّہ سے لے کر فرات تک رہنے والے تمام عربی قبائل کو "سیراسنس" کا مبہم لقب دے رکھا تھا۔ یہ وہ لقب ہے جو عیسائی کی زبان پر خوف اور نفرت کے ساتھ آتا ہے۔

عربوں کی خانگی آزادی اور سیرت

خانگی استبداد کے بندے خواہ مخواہ اپنی قومی حریت کی شیخی بگھارتے ہیں۔ مگر عرب سچ مچ شخصی آزادی کا مالک ہے۔ خدا کے دئے ہوئے مخصوص اختیارات کو ہاتھ سے دئے بغیر وہ ایک حد تک سوسائیٹی کی برکات سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہر قبیلے میں توہم، احسان، یا دولت کی وجہ سے ایک مخصوص خاندان اپنے ہمسروں پر سبقت لے جاتا ہے۔ ریاست اور امارت ہمیشہ اسی مخصوص نسل میں چلتی رہتی ہے۔ لیکن وراثت کا قانون بے ضابطہ اور غیر معیّن ہوتا ہے۔ اپنے مفید مشوروں سے جھگڑے چکانے اور اپنی (اعلیٰ) مثال سے بہادروں کی رہنمائی کرنے کے سادہ مگر اہم عہدے کے لئے اپنے شریف اقرباء میں سے سب سے زیادہ لائق یا معمّر بزرگ کو چُن لیا جاتا ہے۔ ملکہ زینوبیہ کے اُن ہموطنوں نے عقل و فراست والی پرجوش عورتوں کو بھی حکمرانی کرنے کا موقع دیا ہے۔

چند قبیلوں کا ہنگامی طور پر ایک جگہ جمع ہو جانا لشکر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ذرا اور گہرا تعلق قائم ہوا تو ایک قوم بن گئی۔ اب اُن کا بڑا سردار امیر الامراء ہو جس کا عَلَم

اُن کے سروں پر لہرا رہا ہے باہر والوں کی نظر میں شاہی خطاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔

اگر عربی اُمرا، اپنی قوت کا غلط استعمال کرتے ہیں تو اُن کو فوراً ہی یہ سزا مل جاتی ہے کہ اُن کی رعایا جو نرم اور پدرانہ سلوک کی عادی ہے اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔

اُن کی رُوح آزاد ہے۔ اُن کے قدم غیر مقید۔ ریگستان کھلا ہوا ہے۔ قبائل اور خاندان باہمی اور اختیاری سمجھوتے سے مجتمع رہتے ہیں۔

یمن کے نسبتاً نرم باشندے شاہی شان و شوکت کی تائید تو کرتے تھے لیکن اگر بادشاہ اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر محل سے نہیں نکل سکتا تھا تو حکومت کی عاملانہ قوت اُمرا اور قاضیوں کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ ایشیا کے بیچوں بیچ مکہ اور مدینہ کے شہر (یونان سمجھ لیجئے کہ) دولتِ مشترکہ کی شکل یا ہیولیٰ پیش کرتے ہیں۔ حضرت نبی کریم کے دادا اور اُن کے آباو اجداد، خارجی اور داخلی معاملات میں ملک کے حاکم نظر آتے ہیں۔ لیکن ایتھنز کے پیری کلیس اور فلورنس کے میڈی چی کی طرح وہ اپنی عقل اور دیانت کی وجہ سے حکمران تھے۔ اُن کا اثر اُن کے ترکے کے ساتھ ساتھ تقسیم ہوتا رہا۔ اور امارت رسول کریم کے اعمام سے نکل کر قریش کی ایک نوخیز شاخ کے قبضہ میں چلی گئی۔

اہم مواقع پر وہ بزم شوریٰ منعقد کرتے تھے۔ نوع انسانی سے اپنی بات منوانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں۔ یا تو قوت کے زور سے اُسے دبایا جائے یا اُس کو ہم خیال بننے کی ترغیب دی جائے۔ قدیم عربوں میں فنِ خطابت کا رواج اور شہرت اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ اُن میں جمہوری آزادی موجود تھی۔ لیکن اُن کی سیدھی سادی آزادی یونان اور روم کی جمہوریتوں کی اس لطیف اور مصنوعی مشینری سے جُدا تھی جس میں ہر رکن جماعت کے شہری اور ملکی حقوق میں غیر منقسم حصہ رکھتا تھا۔ عربوں کی نسبتاً زیادہ سادہ ریاست میں قوم بالکل آزاد ہوتی ہے۔ کیونکہ ملت کا ہر فرد کسی آقا کی ذلیل اطاعت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا سینہ ہمت و شجاعت۔ صبر و استقلال، اقتصاد و

پرہیزگاری کی سخت و ترش صفات سے مضبوط رہتا ہے۔ آزادی کی محبت اُس کو خود اختیاری کی عادتوں پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ کرتی رہتی ہے اور بے عزتی کا خوف اُس کو تکلیف، خطرے اور موت کے ذلیل خوف سے محفوظ رکھتا ہے۔ اُس کے ارادے کی پختگی اُس کے ظاہری حرکات و سکنات تک سے نمایاں ہوتی ہے۔ اِس کی گفتگو آہستہ وزن دار اور مختصر ہوتی ہے۔ وہ شاید ہی کبھی کھل کھلا کر ہنستا ہو۔ وہ صرف ایک ہی حرکت کرتا ہے کہ اپنی ڈاڑھی پر جو مردانگی کا قابلِ عزت نشان ہے ہاتھ مارتا ہے۔ اپنی عزت کے احساس نے اُس کو اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ بے تکلف اور اپنے سے بڑے رتبہ والوں کے ساتھ بے خوف ہو کر بات چیت کرنا سکھا دیا ہے۔

عربوں کی آزاد منشی اُن کی فتوحات کے بعد بھی قائم رہی۔ خلفائے سابقین اپنی رعایا کی صاف گوئی اور آزاد بیانی کی قدر کرتے تھے۔ وہ جماعت مسلمین کو اپنا ہمخیال بنانے اور باخبر کرنے کے لئے اکثر منبر پر جاتے تھے۔ دار الخلافہ کے دجلے کے کنارے منتقل ہو جانے سے قبل عباسیوں نے ایرانی اور بازنطینی دربار کی متکبرانہ زرق برق رسمیں بھی اختیار نہ کی تھیں۔

ملکی جنگیں اور ذاتی انتقام

اقوام اور افراد کا مطالعہ کرتے وقت ہم اُن اسباب پر نظر ڈالتے ہیں جو اُن کو ایک دوسرے کا دوست یا دشمن بنا دیتے ہیں یا اُن کے سماجی کردار کو محدود یا وسیع یا دھیما یا تیز کر دیتے ہیں۔

عرب باقی دُنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ "اجنبی" اور "دشمن" کے لفظ کو مترادف سمجھنے لگے ہیں۔ ملک کے افلاس نے ایک اصولی قانون بنا دیا ہے جس کو وہ اب تک مانتے ہیں اور اُس پر عمل پیرا ہیں۔ اُن کا گمان ہے کہ جب زمین تقسیم ہو رہی تھی تو سیر حاصل اور زرخیز اقلیمیں نسل انسانی کی دوسری شاخوں کو دے دی گئی تھیں۔ اب نافرمان اسمٰعیل کی اولاد اپنا وہ حصہ جس سے وہ محروم رکھی گئی تھی واپس لینے کا حق رکھتی ہے خواہ جبر کا ہو

یا دھوکے سے۔

پلینی کے بیان کے مطابق عربی قبائل تجارت اور لوٹ مار دونوں کے مساوی طور پر عادی ہیں۔ وہ کارواں جو ریگستان میں سے گذرتے ہیں یا تو لوٹ لئے جاتے ہیں یا اُن کا فدیہ لے لیا جاتا ہے۔ ہمسایہ ممالک کے باشندے یونس اور سیسا سطرس کے زمانہ سے اُن کے غارتگرانہ جوش وخروش کا شکار ہوتے چلے آئے ہیں۔

جب کوئی بدو کسی تنہا مسافر کو دور سے آتا ہوا دیکھتا ہے تو غصے میں بھرا ہوا اُس کی طرف گھوڑا بڑھاتا ہے اور چلا کر کہتا ہے "کپڑے لتے اُتار کر رکھ دو"! تمہاری چچی (یعنی میری بیوی) بے چاری ننگی بیٹھی ہے"۔ اگر وہ فوراً ہی اِس حکم کی تعمیل کر دے تو رحم کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ مزاحمت ظالم کو اور برانگیختہ کرتی ہے۔ جو خون وہ (مسافر) اپنی جائز حفاظت کے لئے بہانا چاہتا ہے۔ اُس کا کفارہ صرف اُس کا خون ہی ہو سکتا ہے۔

کوئی اکاّ دکاّ قزاق یا چند ساتھی تو اپنے اصلی نام سے پکارے جاتے ہیں لیکن ایک پورے گروہ کی ترکتازیاں جائز اور قابلِ فخر جنگ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ایک ایسی قوم کا مزاج جو نوعِ انسانی کے خلاف یوں آمادہ جنگ بیٹھی تھی، لوٹ مار۔ قتل و غارت اور انتقام کی خانہ ساز اجازت سے اور مشتعل ہو گیا۔

یورپ کے قانون اساسی میں آج کل صلح و جنگ کرنے کا اختیار چند گنے چُنے معزز با اختیار آدمیوں کو حاصل ہے۔ اور اِس اختیار کو استعمال کرنے کا حق اور بھی کم لوگوں کو ہے۔ لیکن ہر ایک عرب بے خوف وخطر اور کھُلم کھُلا اپنے نیزے سے کسی ہموطن پر حملہ کر سکتا ہے۔

قومی اتحاد، زبان اور اخلاق کی ایک مبہم مشابہت پر مشتمل تھا اور ہر جماعت میں قاضی کا اقتدار اور اثر برائے نام تھا۔

زمانۂ جاہلیت (یعنی نبی کریمؐ کی آمد سے قبل) کی سترہ سو لڑائیوں کا حال روایتوں میں موجود ہے۔ کسی بدخلق گروہ کی عداوت کی وجہ سے لڑائی چھڑ جاتی تھی۔ کسی ہٹی ہوئی جنگ کا بیان

نظم یا نثر میں سُنا دینا حریف قبائل کی اولاد کے سینوں میں عداوت کی بجھی ہوئی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ خانگی زندگی میں ہر آدمی یا کم ازکم ہر خاندان اپنے مقدمات کا خود ہی جج اور خود ہی بدلہ لینے والا تھا۔

خود داری کا وہ لطیف احساس جو نقصان سے زیادہ ہتک حرمت کو اہمیت دیتا ہے عرب کی لڑائیوں پر مہلک زہر پاشی کرتا ہے۔ ان کی عورتوں اور ڈاڑھیوں کی ہتکِ عزت بڑی جلدی ہو جاتی ہے۔ کسی ناشائستہ فعل یا قابلِ نفرت لفظ کا کفارہ صرف مُلزم کے خون ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور اللہ رے اُن کا صبر آزما استقلال کہ مہینوں اور برسوں وہ انتقام کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ جرمانہ یا خونبہا کا رواج ہر زمانہ کے وحشیوں میں رہا ہے مگر عرب میں مقتول کے وارثوں کو اختیار ہے خواہ خونبہا قبول کرلیں یا قانونِ انتقام پر عمل درآمد کریں۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کی عداوت کا تو یہ حال ہے کہ قاتل کا سر لینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ بلکہ مجرم کے بدلے کسی بے گناہ کو فدیہ قرار دیتے ہیں۔ قاتل کے خاندان کے بہترین اور سربرآوردہ آدمی کو مار کر انتقام کی آگ بجھاتے ہیں۔ اگر وہ ان کے ہاتھوں مارا جاتا ہے تو اب اُن سے انتقام لینے کی باری آتی ہے۔ اور اُن کی جان ہر وقت خطرے میں ہے۔ اِس خونی قرضہ کا اصل اور سود اِسی طرح جمع ہوتا رہتا ہے۔ فریقین میں سے ہر قبیلے کے افراد عداوت اور بدگمانی میں زندگیاں گذار دیتے ہیں اور بعض اوقات انتقام کے حساب کتاب کو طے کرتے ہوئے نصف صدی گذر جاتی ہے۔

یہ خونی جوش و خروش جس میں رحم اور عفو کا پتہ بھی نہیں چند اصول اخلاق نے پیدا کر دیا ہے۔ اِن اصول کی رو سے یہ ضروری ہے کہ ان متحارب فریقوں کی عمر۔ قوت۔ تعداد اور ہتھیار میں کچھ مساوات ہو۔

حضرت نبی کریم سے قبل عرب دو ماہ یا شاید چار ماہ کو مقدس سمجھتے تھے اور اِس زمانے میں اُن کی تلوار مذہبی احکام کی رو سے زیر نیام رہتی تھی۔ خارجی اور داخلی کسی قسم کی لڑائی

میں حصّہ نہ لیتے تھے۔ یہ عارضی صلح کا زمانہ اُن کی سرکشانہ اور غازیانہ عادات کا مضبوط ثبوت ہے

شہری عادات وخصائل

لوٹ مار اور انتقام کا جذبہ، تجارت اور ادبیات کی سکون بخش اثر سے اعتدال پر آگیا تھا۔ یہ تاریک جزیرہ نما چاروں طرف سے عہدِ قدیم کی مہذب ترین اقوام سے گھرا ہوا ہے۔ تاجر، نوعِ انسانی کا ہمدرد ہوتا ہے۔ سالانہ آنے جانے والے (تجارتی) کاروانوں نے علم اور شائستگی کے ابتدائی اصول شہروں اور ریگستان کے خیموں تک میں داخل کر دیئے۔ عربوں کا حسب ونسب کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اُن کی زبان، زبانوں کے اُسی خاندان کی شاخ ہے جس سے عبرانی، سُریانی اور کلدانی زبانیں نکلی ہیں۔

قبائل کی آزادی کا اثر اُن کی مخصوص بولیوں پر بھی نمایاں تھا۔ لیکن اپنی زبان کے بعد ہر قبیلہ مکّے کے خالص اور صاف محاورات کو بجا طور پر ترجیح دیتا تھا۔

یونان کی طرح عرب میں بھی زبان کی تکمیل، اخلاق و آداب کی تہذیب پر سبقت لے گئی تھی۔ ان کی گفتگو میں شہد کے لئے ۸۰ سانپ کے لئے ۲۰۰ شیر کے لئے ۵۰۰ اور تلوار کے ۱۰۰۰ مختلف نام استعمال ہوتے تھے۔ اور یہ حال اس وقت تھا جب لمبی چوڑی لغت، جاہل قوم کی قوتِ حافظہ کے سپرد تھی۔ حمیریوں کی یادگاروں پر ایک متروک اور مخفی رسم الخط میں کتبے لکھے ہوئے تھے لیکن خطِ کوفی جس پر موجودہ خط کی بنیاد رکھی گئی ہے، فرات کے کنارے ایجاد ہوا تھا۔ اور اس جدید ایجاد کی تعلیم مکّے میں ایک اجنبی آدمی نے پھیلائی جو حضرت نبی کریم کی ولادت کے بعد اس شہر میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ فنِ صرف ونحو، عروض ومعانی وبیان سے عرب کے آزاد فصحا نا بلد تھے۔ لیکن ان کی قوتِ فہم تیز۔ ان کی قوتِ متخیلہ بھرپور اور اُن کی عقل وفراست پختہ، جچی تُلی تھی۔ اُن کے محنت سے تیار کئے ہوئے خطبے زوردار طریق پر سامعین کے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اور اُن کے دل پر اُن کا اچھا خاصا اثر ہوتا تھا۔ ایک نوخیز شاعر کی جدّت اور کمال پر اُس کے اور اُس کے عزیز قبیلوں کے لوگ خوشیاں

مناتے تھے۔ شاندار دعوت کی جاتی تھی۔ جس میں عورتیں اپنی شادی کی سی شان و شوکت کا مظاہرہ اپنے لڑکوں اور شوہروں کے سامنے کرکے دَف بجا بجا کر اپنے قبیلہ کی اس خوش قسمتی کے گیت گاتی تھیں کہ ایک بہادر پیدا ہو گیا ہے جو اُن کے حقوق کی نگرانی کرے گا اور ایک نقیب نے آواز بلند کی ہے جو اُن کے نام کو حیاتِ جاوداں بخشے گا۔

دور و دراز مقامات پر رہنے والے یا دشمن قبائل ایک سالانہ میلے میں جمع ہوتے تھے جو ابتدائی مسلمانوں کے مذہبی تعصب کی وجہ سے بند ہو گیا۔ یہ ایک قومی اجتماع تھا جس کے اثر نے ان وحشی لوگوں کو شائستہ بنانے اور میل جول پیدا کرنے میں ضرور امداد کی ہوگی۔ تیس روز شراب اور غلّے ہی کے نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور شاعری کے یعنی دین کے شغل میں گذر جاتے تھے۔ شاعر لوگ دل کھول کر اس انعامی مقابلے میں حصہ لیتے تھے۔ اور فاتح کا شہ کار اُمراء و رؤساء کے خزانوں میں محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ ہم اپنی زبان میں وہ سات اصل نظمیں پڑھ سکتے ہیں۔ جو سنہری حرفوں سے لکھ کر کعبہ کے معبد میں معلق کر دی گئی تھیں۔ عرب کے شعراء اپنے عہد کے مورّخ اور معلمِ اخلاق ہوتے تھے۔ اور اگر ایک طرف وہ اپنے ہم وطنوں کے تعصبات سے ہمدردی رکھتے تھے تو دوسری طرف اُن کی صفاتِ حسنہ کو بھی بڑھاتے چڑھاتے تھے۔ سخاوت اور شجاعت کا چولی دامن کا ساتھ اُن کے قصیدوں کا محبوب موضوع ہوتا تھا۔ اور جب وہ کسی بڑے خاندان کی سخت ہجو کرنا چاہتے تھے تو وہ بُرا بھلا کہتے کہتے یہ بیان کرتے تھے اُن کے مَرد دینے کا اور اُن کی عورتیں انکار کرنے کا نام بھی نہیں جانتیں۔

سخاوت کی مثالیں

وہی مہمان نوازی جس کا مظاہرہ حضرت ابراہیم نے کیا تھا اور جس کی تعریف ہومر شاعر نے کی ہے اب بھی عربوں کے خیموں میں موجود ہے۔ خونخوار بدو جس سے سارا ریگستان کانپتا ہے بغیر سوال و جواب یا تامّل کے اس اجنبی مسافر کو گلے لگا لیتا ہے جو اُس پر اعتماد کر کے اُس کے خیمے میں داخل ہو جائے۔ اُس کے ساتھ مہربانی اور ادب سے سلوک کیا جاتا ہے اور وہ اپنے میزبان کی

مفلسی یا امیری میں حصّہ دار ہو جاتا ہے اور جب وہ آرام کر چکتا ہے تو شکریے کے ساتھ دعاؤں کے ساتھ اور کبھی کبھی تحفہ تحائف کے ساتھ رخصت کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی بھائی یا دوست حاجتمند ہو تو دل اور ہاتھ زیادہ کشادہ ہو جاتے ہیں۔ جو عامۃ الناس کی تحسین و آفرین کے مستحق ہوتے ہیں بہادرانہ کارنامے وہ ہیں جو تمیز اور تجربے کے تنگ اندازے سے بالا ہوں۔ ایک بحث شروع ہوئی تھی کہ مکے کے باشندوں میں سب سے زیادہ سخی کہلانے کا مستحق کون ہے۔ یکے بعد دیگرے اُن تین آدمیوں کو آزمایا گیا جو سب سے زیادہ اس کے مستحق نظر آتے تھے۔ عبداللہ ابن عباس کو ایک لمبا سفر درپیش تھا اُنھوں نے پاؤں رکاب میں رکھا تھا کہ ایک سائل کی آواز سُنی۔ "اے ابنِ عمِ رسول! میں ایک مصیبت زدہ مسافر ہوں" وہ فوراً اُتر پڑے اور زائر کو اپنا اونٹ معہ قیمتی ساز و سامان اور چار ہزار اشرفیوں کی ایک تھیلی کے عطا فرما دیا۔ صرف تلوار بچالی یا تو اس لئے کہ وہ اصلی فولاد کی تھی یا اس لئے کہ کسی عزیز کا تحفہ تھی۔

قیس کے غلام نے دوسرے سائل سے کہا کہ میرا آقا خوابِ راحت میں ہے مگر لو یہ سات ہزار اشرفیوں کی تھیلی ہے (بس اس وقت ہمارے پاس یہی ہے) اور لو یہ ایک نوشتہ ہے جس کے ذریعے تم کو ایک اونٹ اور غلام مل جائے گا۔ آقا جب خواب سے بیدار ہوا (تو یہ حال سُن کر) اُس نے وفادار غلام کی تعریف کی اور اُس کو آزاد کر دیا۔ مگر اس کو یہ نرم سی ملامت بھی کی کہ میری نیند کا خیال کر کے تم نے میری سخاوت پر دھبہ لگایا ہے؛ ان بہادروں میں سے تیسرا عرابہ نابینا نماز کے وقت دو غلاموں کے کاندھوں پر سہارا لگائے ہوئے جا رہا تھا۔ اُس نے سائل کا سوال سُن کر کہا "افسوس میرا خزانہ خالی ہے۔ تو تم ان غلاموں کو فروخت کر ڈالو۔ اگر تم ان کو قبول نہیں کرتے تو میں ان سے دست کش ہوتا ہوں" یہ کہہ کر اُس نے نوجوان غلاموں کو علیحدہ کر دیا۔ اور لاٹھی کے سہارے دیوار ٹٹول کر راستہ چلنے لگا۔

حاتم کی سیرت عربی صفات کا مکمل نمونہ ہے۔ وہ بہادر بھی تھا اور سخی بھی فصیح البیان شاعر بھی تھا اور کامیاب لٹیرا بھی۔ اس کے مہمان نواز دسترخوان پر چالیس اونٹ کباب کئے جاتے تھے۔ ایک دشمن سائل کی درخواست پر اس نے قیدی اور مال غنیمت دونوں واپس کر دیئے تھے۔ اس کے ہم وطنوں کی آزاد منشی کے سامنے قانونِ عدل کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ وہ فخر کے ساتھ رحم اور مہربانی کے فطری جذبے سے مغلوب ہو جاتے تھے۔

خطابت

اور

اُس کی مختصر تاریخ

بسلسلۂ ماسبق

وعظ گوئی خطابت کی ایک قسم وعظ گوئی بھی ہے۔ مذہبی حیثیت سے اس کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ واعظ درحقیقت خلیفۃ اللہ اور نائب رسول کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے موضوع کا تعلق روحانیات اور نجاتِ ابدی سے ہوتا ہے۔ وہ سامعین کے ایمانی جذبات کو برانگیختہ کر کے اُن تمام حقوق کو واضح کرتا ہے جو خدا کے اُس پر اور اُس کے خدا پر ہیں۔ وہ جو کچھ کہتا ہے خدا اور رسول کی طرف سے کہتا ہے اس لئے وہ دماغ میں جلا، جسم میں حرارت اور دلوں میں عمل کا جوش پیدا کر دیتا ہے۔

مذہب کا اثر اور اُس کی ضرورت دُنیا میں اَب تک جتنے بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے ہیں اُن پر اگر ہم نظرِ غائر ڈالیں نیز اُن انقلابات کی آڑ میں جو مختلف عوامل پوشیدہ ہیں اُن کی بھی جستجو کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اُن حالات کے دَوران میں انسان ہمیشہ خیالات کا ایک مخصوص جامہ پہن لیتا ہے۔ اور انھیں مخصوص خیالات کا اُس پر غلبہ ہوتا ہے جن سے وہ اثر پذیر ہوتا ہے۔ اور وہی اُس وقت اُس کے اعمال کے محرک ہوتے ہیں۔ لیکن یہ مجموعۂ خیالات جو اُس وقت انسان پر حاوی ہوتا ہے اُس کی تعبیر اگر ہوسکتی ہے تو صرف لفظِ "مذہب" یا "دین" سے۔

انسان کے لئے ہمیشہ ایک دین و مذہب کی ضرورت رہی ہے۔ جب تک کوئی مذہبی عقیدہ اُس کے دل و دماغ پر غلبہ حاصل نہیں کر لیتا اُس وقت تک اُس کی

قوائے عمل شل اور اُس کے اعضاء بے حس و حرکت رہتے ہیں۔ مذہب کو لوگوں کے مشاعر و احساسات اور اعمال و افعال پر جو تسلط اور غلبہ حاصل ہے اُس کی بنا پر اس کی اہمیت سے کسی سمجھ دار شخص کو انکار نہیں ہو سکتا۔

دنیا پر جب سے آفتاب تمدن نور افگن ہوا ہے اُس وقت سے اب تک انسان ہمیشہ مذاہب ہی کے آگے سرنگوں رہا ہے اور بانیانِ مذاہب ہی کے لئے اُس نے مختلف زمانوں میں طرح طرح کے بت، ہیاکل اور معابد تعمیر کئے ہیں۔ دُنیا کا ہر وہ تمدن جو کبھی روئے زمین پر آب و تاب سے جلوہ گر ہوا اُس کے آگے آگے ہمیشہ مذاہب ہی کی مشعلیں رہنمائی کرتی رہی ہیں۔

ہر قوم کے لئے اُس کے عقائد اساسی نعمت ہوتے ہیں۔ اُن کی قدر کرنا اور شورشوں سے اُن کو محفوظ رکھنا اُس قوم کا اوّلین فرض ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ اُن کے زوال کا دن دراصل وہی ہے جب اُن کے عقائد کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں اور معتقدات نشانۂ ہدف بن جائیں۔

چونکہ لوگ ہمیشہ اپنے اپنے معتقدات کے پیچھے سرگرداں رہتے ہیں اس لئے واعظوں کا اُن پر بہت آسانی سے منتر چل جاتا ہے۔ وہ بڑی شان سے اُن کے افعال و اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے قوائے عمل سے حسب موقع اپنی مرضی کے مطابق جو چاہتے ہیں کام لیتے ہیں اور اُن کے خوف زدہ دلوں کے لئے سامانِ امید فراہم کرتے رہتے ہیں۔ گویا سامعین اُن کے ہاتھ میں ایک آلۂ بے جان ہوتے ہیں۔ وہ اُنھیں جدھر چاہتے ہیں گھماتے رہتے ہیں۔

اتقا اور پرہیزگاری واعظ کو حقائق دینیہ اور احکام شرعیہ سے بخوبی واقف ہونے کے علاوہ دین دار اور متقی بھی ہونا چاہئے۔

یونان میں ڈیماستھینز ایک مشہور جادو بیان خطیب گذرا ہے، جو فنِ خطابت کے

اسرار و دقائق کا بخوبی ماہر تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے اُس سے دریافت کیا کہ "خطابت میں کامیابی کا اصل راز کیا ہے؟" اُس نے جواب دیا "عمل" لوگوں نے پوچھا "اُس کے بعد؟" اُس نے کہا "عمل" اُنہوں نے پھر یہی سوال کیا کہ "اُس کے بعد؟" اُس نے اِس مرتبہ بھی یہی جواب دیا کہ "عمل"۔

دُنیا میں کامیابی جس چیز کا نام ہے وہ در اصل تمام تر نتیجہ ہے اُس کے عمل اور پرہیز گاری کا۔ تاریخ میں صدہا ایسی ہستیاں گذری ہیں جو علم و فضل، عقل و دانائی کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھیں۔ لیکن اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے آج مرقع عبرت بنی ہوئی ہیں۔

دنیا میں گو صدہا واعظ پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر غور سے دیکھا جائے تو ایسے بہت کم نکلیں گے جو وعظ گوئی کی درحقیقت اہلیت بھی رکھتے ہوں۔ مقررین اور واعظین کی فہرست میں ایسے لوگ بکثرت نظر آئیں گے جو اپنے مؤثرانہ خطبوں اور اسپیچوں کے ذریعے سے لوگوں کو مسحور کرتے تھے اور اپنے تقدس سے مرعوب کر کے لوگوں کو اپنے ذاتی اغراض کا شکار بناتے تھے۔ اور اس میں ایک حد تک کامیاب بھی ہوتے تھے مگر آخر ملمع کہاں تک اصل حقیقت کو چھپا سکتا ہے۔ کبھی نہ کبھی اُنھیں ناکامی کا منہ دیکھنا ہی پڑتا تھا۔

تاریخ میں اِس کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں کہ بڑے بڑے پارساجن کے علم و فضل اور تقدس کی دور دور تک شہرت تھی جب اُن کا جامۂ پارسائی چاک ہوا تو کیا کچھ داغ سیہ کاری دیکھنے میں نہیں آئے۔

عہدِ اکبری کا مشہور عالم قاضی مخدوم الملک جو ایک عرصہ تک ہندوستان کی مسند شیخ الاسلامی پر بھی متمکن رہ چکا تھا اور جس کی پابندیِ شریعت کی ایک دُنیا مداح تھی جب اُس کی قلعی کھلی تو دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے

حیرت و استعجاب کے کانوں سے سُنا کہ غصب کا سارا مال اُس کے یہاں سے برآمد ہوا۔ پھر آخر جو کچھ اُس کا حشر ہوا دُنیا سے پوشیدہ نہیں۔

روبس پیر ایک زبان آور خطیب تھا جسے انقلاب فرانس کے دَور اوّلین میں ایک خاص زعیمانہ اقتدار حاصل ہو گیا تھا۔ مگر اُس کی بداخلاقیوں نے اُس کی قسمت کا پانسہ پلٹ دیا۔ انقلابات کا جدید دَور اُس کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ مدّت کی دبی ہوئی مخالفتیں اُبھریں جو بالآخر اُس کے نام و نمود، عزّت و اقتدار کو خاک میں ملا کر رہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو بات واعظ کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قبل اس کے کہ وہ مسندِ وعظ پر اپنے لئے کوئی جگہ حاصل کرے اُس کو چاہیئے کہ وہ اَپنے عمل اور کردار کی اصلاح کرے، اپنے ظاہر و باطن کو درست کرے۔ اپنے عزوم، ارادے، عقائد و خیالات میں پختگی پیدا کرے۔ دعوت الی الحق اور اشاعتِ دین میں دُنیا کا خوف، حکومت کا ڈر، جان و مال کی محبت، اعزا و اقربا کی ملامت، کسی چیز کی پروا نہ کرے۔ اپنے اندر قوتِ ایمانی پیدا کرے۔ یہ ایک ایسی قوّت ہے کہ جس شخص میں یہ پیدا ہو جاتی ہے اُس کی قوتِ اثر اندازی میں دس گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔

دنیا میں اَب تک جو لوگ تاریخی انقلابات کے باعث ہوئے ہیں۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو وہ صِرف چند مسکین ہستیاں نکلیں گی جن کی قوتِ ایمانی نہایت مضبوط اور مستحکم تھی۔

انسان کی اصلی دین داری کا ظہور اُس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے ارادے اور اپنی ذات کو معبودِ حقیقی کے ارادے اور اُس کی ذات پر چھوڑ دیتا ہے اور اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے لئے بالکل فنا کر دیتا ہے۔ جب یہ اعتقادی کیفیت انسان میں پیدا ہو جاتی ہے

تو اُس وقت تمام دوسرے خیالات کے گرد و غبار سے اُس کا شیشۂ دِل پاک صاف ہو جاتا ہے اور اُس کے تمام افعال و اعمال کا محور اور مرجع صرف وہی ذات ہوتی ہے جس کی رضاجوئی اور ذات پر اُس نے اپنی مرضی اور شخصیت کو نثار کر دیا ہے۔

عموماً ہر شخص کی زبان اُس کے خیالات اور جذبات کی صحیح ترجمان ہوتی ہے۔ ایک متقی اور خدارسیدہ شخص کی زبان پر وہی الفاظ آتے ہیں جو دنیا کی بے ثباتی، کائنات کی بے چارگی، حمایتِ دینی، اور طاعتِ خداوندی کے مترادف ہوتے ہیں۔

مگر اس کے برعکس ایک دنیادار اپنی بات چیت اور گفتگو میں انھیں الفاظ کا خوگر ہوتا ہے جن سے دُنیا پرستی، غفلت شعاری، عیش پسندی اور بدکرداری ظاہر ہوتی ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے وہ صدہا خطبات جو نہ صرف خطابت و بلاغت کی جان سمجھے جاتے ہیں بلکہ حمیتِ دینی، غیرتِ مذہبی، خداپرستی اور اس کی رضاجوئی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ اُٹھا کر دیکھئے تو آپ کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے کیا اوصاف تھے اور کن باتوں کی وجہ سے مذہب و دین کے مقدس صفحات پر آپ نے عزت و نام پایا ہے۔ بطور نمونہ کے ایک خطبہ درج ذیل ہے۔

اتقوا اللہ عباد اللہ! بادروا
اٰجالکم باعمالکم وابتاعوا
ما یبقی لکم بما یزول عنکم
وترحلوا فقد جد بکم واستعدوا
للموت فقد اظلکم وکونوا
قوماً صیح بھم فانتبھوا واعلموا
ان الدنیا لیست لکم بدار
فاستبدلوا فان اللہ سبحانہٗ

بندگانِ خدا! خدا کے عذاب سے ڈرو، تقویٰ اختیار کرو
اور اعمالِ خیر کے ساتھ اپنی موت کی طرف عجلت کرو۔
اُس چیز کے عوض میں جو تمھارے پاس سے زائل ہونے والی ہے
وہ چیز خریدو جو تمھارے پاس ہمیشہ رہنے والی ہے۔ تم
کوچ کرو اور دیر نہ کرو، موت کے لئے تیار ہو جاؤ جس کا
سایہ تم پر چھایا ہوا ہے۔ تم وہ قوم بن جاؤ جو آواز دینے پر
بہت جلد بیدار ہو جاتی ہے اور جان لو کہ تمھارا اصلی
گھر دنیا نہیں ہے۔ تم اس کو تبدیل کر ڈالو خدا تعالیٰ نے

لم يخلقكم عبثا ولم يتركم سدى . وما بين احدكم وبين الجنة او النار الا الموت ان ينزل به وان غاية تنقصها اللحظة وتهدمها الساعة لجديرة بقصر المدة .....

تم کو بے کار نہیں پیدا کیا ہے اور تم کو مہمل نہیں بنایا ہے۔ تمھارے اور جنت یا دوزخ کے مابین، موت کے سوا کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ تمہاری عمر اور بقا کی مسافت جس کو ایک ایک لمحہ فنا کئے ڈالتا ہے، تقلیلِ مُدت کے لائق ہے

....

فيا لها حسرة على كل ذي غفلة ان يكون عمره عليه حجة وان تؤديه ايامه الى شقوة نسئل الله سبحانه ان يجعلنا واياكم ممن لا تبطره نعمة ولا تقصر به عن طاعة ربه غاية ولا تحل به الموت ندامة ولا كآبة ؛

کس قدر افسوس ہے اُس غافل شخص پر جس کے لئے اُس کی زندگی ایک حجت و برہان ہے لیکن وہ اپنا زمانہ شقاوت میں گذار رہا ہے۔ ہم خدا سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اور تم کو اُن لوگوں میں سے بنا دے جن کی نعمتیں اُنھیں تکبّر اور سرکشی میں مبتلا نہیں کرتیں اور کوئی دنیاوی فائدہ اُنھیں عبادتِ پروردگار سے باز نہیں رکھتا اور نہ اُن کو موت کے بعد ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے۔

(نہج البلاغہ ص۵۶)

تاریخ خطابت | قدیم ترین خطبات کا بیشتر حصہ جو مدون ہو چکا ہے وہ صرف وہ ہے جو حضرت موسیٰ کلیم اللہ یا دیگر انبیائے بنی اسرائیل کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام سے قبل یونانیوں کے اندر بہت سے ماہرین خطابت پیدا ہو چکے تھے جنھوں نے اپنے زورِ بیان سے قوم و ملک میں ایک ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اسی عہد کی ایک گراں قدر ہستی امام الفلاسفہ ارسطاطالیس ہے جس نے اس فن کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی؛ اس کے اصول و قوانین مرتب کر کے جامۂ تدوین سے آراستہ کیا۔

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا نے ارسطو کی اس کتاب کا ترجمہ عربی میں کیا جو کتاب الخطابہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعدازاں چھٹی صدی ہجری میں علامہ ابن رشد اندلسی نے اس کتاب کا خلاصہ کیا جس کا نام تلخیص الخطابہ ہے۔ اس میں علمی طریقے سے مندرجہ ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے۔

(۱) خطابی قیاسات کی تعریف جو جلسوں میں تقریر کرتے وقت سود مند ہوتے ہیں۔

(۲) خطابی قیاسات کے اقسام یعنی مشاورہ، مخاصمہ، مشاجرہ وغیرہ وغیرہ۔

(۳) وہ تدابیر جو قوم کے مائل کرنے اور ابھارنے یا کسی چیز کی تحقیر و تعظیم کرنے میں کارگر ہوتی ہیں۔

(۴) عذر یا عتاب کرنے کا طریقہ۔

(۵) کسی قصہ یا لیکچر کے بیان کرنے کے وقت مضامین کی تمہید و ترتیب۔

عہد عیسوی | حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور وہ تھا جب خطابت ابتدائی منازل طے کر کے مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی تھی۔ آپ کے شاگرد والہیں بطرس، پولیس، وغیرہ خطابت کے بڑے ماہر تھے۔ ان کے خطبات بڑی بڑی مجلد کتابوں میں موجود ہیں۔

جو اُن کے کمالِ خطابت کی زندہ یادگاریں ہیں۔ مذہبِ عیسوی اُن پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

عہدِ اسلامی | زمانۂ جاہلیت میں قوتِ خطابت سے جو کام لئے جاتے تھے، اُن کا دائرہ محدود تھا اِس لئے اُس زمانے میں خطابت اور تقریر کو وہ عروج نہ ہو سکا جو شعر و شاعری کو حاصل تھا لیکن زمانۂ اسلام میں یہ حالت بدل گئی سیاسی واقعات اور غزوات و فتوحات نے عرب کی پر جوش طبیعتوں کے لئے بہت سے نئے میدان کھول دیئے جن میں اُن کو زبان آوری کا جوہر دکھانے کا موقع ملا۔ اِس بنا پر اسلام کے بعد اگرچہ عربی شاعری میں زمانۂ جاہلیت کا زور باقی نہیں رہا تاہم اُس کی طاقت، خطابت اور تقریر کی طرف منتقل ہوگئی۔

دراصل خطابت اور شاعری کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں، اسی وجہ سے اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ جو خطیب ہوتا ہے وہ شاعر بھی ہوتا ہے۔ اور جو شاعر ہوتا ہے وہ خطیب بھی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ بعضوں کی طبیعت کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ شاعر بن جاتے ہیں اور بعضوں کی طبیعت کا میلان خطابت کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہ آخر خطیب کے لقب سے مشہور ہو جاتے ہیں۔

علامہ جاحظ نے " الجمع بین الخطابۃ والشعر ومَن اشتہر بذٰلك " کا عنوان قائم کرکے اُن تمام ادبار کی ایک مکمل فہرست لکھی ہے جو خطبا بھی تھے اور شعرا بھی[۵۰]۔ خطبائے عرب میں بڑی جماعت وہ ہے جس کا دور عہدِ اسلامی تھا۔ تاہم کچھ ایسے گزرے ہیں جن کا زمانہ اسلام سے قبل تھا۔ جن میں سے سحبان وائل باہلی خاص طور سے قابلِ ذکر ہے۔ یہ شخص اپنے زمانہ کا ایک بلند پایہ خطیب اور امام مانا جاتا ہے۔ جس کی خطابت آج تک ضرب المثل ہے، کسی اسپیکر کی بہت زیادہ تعریف کرنی

---

۵۰ کتاب البیان والتبیین جزو اول ص۲۷۔

ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے "ھو اخطب من سحبان وائل"۔

سحبان کا خاص کمال یہ تھا کہ وہ خطبہ دیتے دیتے پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا لیکن نہ دوران تقریر میں کہیں ٹھہرتا تھا اور نہ سارے خطبے میں کوئی لفظ دُہراتا تھا۔ لوگ اُس کی خطبہ کو خطبۂ شوہار کہا کرتے تھے۔

قس بن ساعدہ ایادی نے عہدِ جاہلیت اور عہدِ اسلامی دونوں پائے تھے۔ آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ اُس کو سوقِ عکاظ میں دیکھا کہ سُرخ اونٹ پر بیٹھا ہوا خطبہ دے رہا ہے۔ آپ نے اُس کے خطبہ کو بغور سُنا اور اُس کی بلاغت پر تعجب بھی کیا وہ کہہ رہا تھا:۔

ایها الناس! اجتمعوا، فاسمعوا وعوا، من عاش مات ومن مات فات، وکل ما هو آتٍ آت،

لوگو! جمع ہو اور سُنو! اور یاد رکھو، جس کو زندگی عطا ہوئی ہے وہ مرے گا اور جو مر گیا اُس کا قصہ ختم ہوا۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے ہو کر رہے گا۔

مالی اری الناس یموتون ولا یرجعون ارضوا فاقاموا، ام حبسوا فناموا۔

مجھے کیا ہوا ہے کہ لوگوں کو دیکھتا ہوں کہ مرتے ہیں اور پھر واپس نہیں ہوتے کیا وہ پسند کرتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں یا روک لئے جاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔

یا معشر ایاد این ثمود وعاد، واین الآباء والاجداد این المعروف الذی لم یشکر والظلم الذی لم ینکر۔ اقسم قسماً باللہ ان للہ دیناً

گروہ ایاد! کیا ہوئے ثمود و عاد، کہاں گئے آباء و اجداد، وہ احسان کیا ہوا جس کا شکر نہیں ادا کیا گیا اور وہ ظلم کدھر گیا جس کا کبھی انکار نہیں کیا گیا۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں کہ بیشک خدا کا

آداب اللغۃ العربیہ جز اول صفحہ ۱۰۰

هُوَ ارضیٰ لہٗ من دینکم هٰذا۔ — ایک دین ہے جس کو وہ تمہارے اس دین سے زیادہ پسند کرتا ہے۔
(کتاب البیان والتبیین ص۱۶۵)

حضرت سہیل بن عمرو نہایت پرجوش خطیب تھے۔ حالتِ کفر میں وہ اسلام کی مخالفت پر تقریریں کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ اُن کے نیچے کے اگلے دو دانت تڑوا دیجئے تاکہ تقریر کرنے میں اُن کی زبان نہ چلنے پائے۔" آپ نے فرمایا اگرچہ میں نبی ہوں لیکن میں مثلہ نہیں کرسکتا۔ عمرؓ! اس کو جانے دو۔ ممکن ہے کہ اُن کی تقریر سے کبھی اسلام کو فائدہ پہنچے۔

چنانچہ وہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور رسول خدا صلعم کی وفات کے بعد جب تمام عرب میں ارتداد کی ہوا چل پڑی تو اُنھوں نے قریش کے سامنے ایک تقریر کی جس کا یہ اثر ہوا کہ تمام قبیلہ قریش اسلام پر قائم رہا اور کسی قسم کی بد امنی ظہور پذیر نہیں ہوئی۔ وھو ہٰذا:۔

ایھا الناس! ان یکن محمدٌ مات فان اللہ حیٌّ لم یمت	لوگو! اگر محمد صلعم وفات پاگئے تو خدا زندہ ہے جو نہیں مرا۔
وقد علمتم انی اکثرکم تقتباً فی برٍّ وجاریةً فی بحرٍ	تم جانتے ہو کہ میں بہت زیادہ بری و بحری سفر کیا کرتا ہوں۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہتا
فاقرّوا امیرکم وانا ضامنٌ ان لم یتم الامر ان اردھا علیکم۔	ہوں کہ تم اپنا خلیفہ مقرر کرلو۔ میں ضمانت کرتا ہوں کہ اگر معاملۂ خلافت طے نہ ہوا تو اُس کو میں تم پر لوٹا دوں گا۔

(کتاب البیان والتبیین ص۱۷۳)

اہلِ عرب کو فطرتاً زبان کا ذوق تھا اور قدرت نے جذبات اور مدرکات کے اظہار پر اُن کو ایسی قوت عطا فرمائی تھی کہ اُس زمانے کی بڑی سے بڑی شائستہ اور متمدن قومیں اُن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھیں۔ اُن کی آتش بیانی لڑائیوں کی آگ بھڑکا دیتی تھی جو صدیوں بجھائے نہیں بجھتی تھی۔ سخن سنجی، سخن فہمی، شعر گوئی اور زبان آوری کا بازار گرم تھا۔ عرب کا بچہ بچہ ہومر اور شکسپیر ہو رہا تھا۔ اُن کے کسی قبیلہ میں جب کوئی نیا شاعر یا خطیب پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارکباد کے پیغام پہنچتے تھے۔ عورتیں اِس خوشی میں رقص و سرود کے جلسے منعقد کرتی تھیں اور سارے قبیلے میں خوشیاں منائی جاتی تھیں۔

ٹھیک اُسی زمانے میں جب عرب کی شاعری اور خطابت، بلاغت کی معراج پر پہنچ چکی تھی اور اہلِ عرب اِس ذوق سے مخمور اور اِس نشہ میں سرشار نظر آرہے تھے حجاز کی مقدس سرزمین مکہ سے ایک نئی آواز سُنائی دی جس کو سب نے حیرت و استعجاب کے کانوں سے سُنا۔ یہ داعیِ حق پیغمبرِ اسلام صلعم کی آواز تھی جو ایک ولولہ انگیز اور مغلوب نہ ہونے والی طاقت رکھتی تھی۔ اور بلاغت کے اُس مرتبہ کی مُدعی تھی جو بشری طاقت سے بالاتر ہے۔ سارا عرب مقابلے کے لئے تیار ہوا لیکن اُس عظیم الشان جبروت اور جلال نے مخالفانہ ہمتوں کو شکست اور ارادوں کو پست کر دیا۔

اَب کیا تھا؟ قوتِ خطابت نے اور زور پکڑا۔ اہلِ عرب کے مذہبی جوش اور اُن کی فطری بے باکی نے اِس قوت میں اور چار چاند لگا دیئے۔ جذباتِ بہیمیہ کا اظہار موقوف ہو گیا اور اُن کی زبان آوری، دعوتِ الی الحق، حمایتِ دین، ترغیبِ شجاعت اور تعلیمِ اخلاق میں صرف ہونے لگی۔

خطبائے اسلام اپنی تقریروں کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے اکثر آیاتِ قرآنی سے استدلال کرتے تھے۔ بلکہ بسا اوقات آیات کے مجموعے سے پورا پورا

سب تیار کر لیتے تھے۔ چنانچہ مصعب بن زبیر نے اہل عراق کو اپنے بھائی عبداللہ بن زبیر کی اطاعت پذیری پر آمادہ کرنے کے لئے جو خطبہ دیا تھا درج ذیل ہے:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۝
طسم ۝ تلك آیات الكتاب
المبین ۝ نتلو علیك من نبأ
موسیٰ وفرعون بالحق لقوم یؤمنون ۝
ان فرعون علا فی الارض وجعل
اھلھا شیعاً یستضعف طائفة
منھم یذبح ابناءھم ویستحیی
نساءھم انه كان من
المفسدین ۝ (واشار بیدہ
نحو الشام) ونرید ان نمن
علی الذین استضعفوا فی الارض
ونجعلھم ائمة ونجعلھم
الوارثین ۝ (واشار بیدہ
نحو الحجاز) ونمكن لھم فی
الارض ونری فرعون وھامان
وجنودھما منھم ما كانوا
یحذرون ۝ (واشار بیدہ
نحو العراق)

بسم اللہ الرحمن الرحیم
طسم۔ یہ کتاب مبین کی آیتیں ہیں، ہم تم کو
موسیٰ اور فرعون کا سچا قصہ سناتے ہیں اُن
لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہیں۔ بے شک
فرعون نے دنیا میں سرکشی کی، اس نے زمین
کے رہنے والوں کے بہت سے گروہ کر دیئے
بعض اُن میں سے کمزور تھے جو اپنے لڑکوں کو ذبح
کرتے تھے اور اپنی عورتوں کے بارے میں ترحم
کرتے تھے بیشک وہ فساد کرنے والوں میں سے تھے۔
(اور اپنے ہاتھ سے شام کی طرف اشارہ کیا)
ہم چاہتے ہیں کہ اُن لوگوں پر احسان کریں جو ملک
میں کمزور ہیں اور ان کو امام بنا دیں اور اُن کو
ملک کے وارثین میں سے کریں (اور ہاتھ سے حجاز کی طرف
اشارہ کیا) اور ہم ملک میں اُنھیں طاقتور بنا دیں
اور فرعون اور ہامان اور اُن کے لشکروں میں سے
اُن لوگوں کو دکھا دیں جو پرہیز نہیں کرتے ہیں
(اور ہاتھ سے عراق کی طرف اشارہ
کیا)

(آداب اللغة العربیہ جزء اول ص ۱۹۲)

قائد اور سپہ سالار مواقع جنگ پر اپنے خطیبانہ اندازِ بیان میں بہت ہی پرجوش خطبے دیا کرتے تھے، جس میں فوجوں کی ترتیب، صف بندی کے اصول، دشمن پر حملہ کرنے اور اس سے بچنے کے قواعد پر زور دیا جاتا تھا۔ اور فتح و شکست کے مواقع کو نمایاں کر کے مسلمانوں کے دلوں میں قومی غیرت اور دینی حمیت کے جذبات برانگیختہ کئے جاتے تھے اور انھیں بتایا جاتا تھا کہ بقائے حیات کے لئے صرف یہی ضروری نہیں کہ انسان اپنے دشمنوں کی مدافعت کرے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خود سبقت کر کے ان کو فنا کرنے اور شکست دینے کی کوشش کرے۔

اس موضوع پر ان کے پرجوش خطبے ہی دراصل ان کی کامیابی کا اصلی راز ہوتے تھے۔ چنانچہ جنگِ یرموک میں حضرت خالد بن ولید کا خطبہ، جنگ قادسیہ میں حضرت مغیرہ کا خطبہ، غزوۂ فارس میں حضرت خلید بن منذر کا خطبہ، اور فتح اندلس میں حضرت طارق بن زیاد کا خطبہ، مذکورۂ بالا بیان کی زرین مثالیں ہیں، جن کے ساحرانہ اندازِ بیان اور زورِ خطابت پر اگر تبصرہ کیا جاوے تو بڑی بڑی مجلد کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔

روم اور یونان کی تاریخیں پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں قومیں فنِ خطابت میں بہت کمال رکھتی تھیں۔ ان میں بہت سے خطبار ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اپنی زبان کی طاقت اور زورِ بیان سے بڑے بڑے انقلابات برپا کر دیئے۔ ان کے خطبے آج بھی کمالِ خطابت کی بے مثال یادگار ہیں۔

خصوصاً یونان، تہذیب و تمدن، تعلیم و ترقی کے اعتبار سے بہت ہی امتیازی شان رکھتا تھا۔ وہاں اس فن کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ قوم و ملک کی بہتر سے بہتر طریقے پر خدمات انجام دے سکیں۔ اس موضوع پر سب سے پہلی تصنیف اسی خطۂ ارضی کی یادگار ہے۔ لیکن اہل عرب کو یہ خاص فخر و امتیاز حاصل ہے کہ جب ان پر ترقی کا سایہ بھی نہ پڑا تھا اس وقت بھی زبان آوری اور فصیح البیانی ان کے قومی خصائص میں داخل سمجھی جاتی تھی۔

اور اُن کے خطیب دُنیا کے بہترین اسپیکر مانے جاتے تھے۔

نوشیرواں نے جب خطبائے عرب کی تعریفیں سنیں تو اُس کو اُن سے ملاقات کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے نعمان بن منذر سے کہا "میں خطبائے عرب میں سے کسی ایک ہی ملنا چاہتا ہوں" نعمان نے ہر قبیلے سے دو دو تین تین زبان آور اسپیکر جمع کرکے اُس کی خدمت میں روانہ کیے جن میں قبیلہ بنی تمیم میں سے اکثم بن صیفی، حاجب بن زرارہ، قبیلہ بنو بکر میں سے حارث بن ظالم، قیس بن مسعود، قبیلہ بنو عامر میں سے خالد بن جعفر، علقمہ بن علاثہ، عامر بن طفیل وغیرہ جیسے بلند پایہ خطبا رشامل تھے۔

اُن میں سے ہر ایک نے نوشیرواں کے سامنے اپنی جادو بیانی اور سحر آفرینی کا ثبوت دیا اور اپنی زبان آوری اور فصیح البیانی پر خراجِ تحسین حاصل کیا جن کو علامہ احمد بن عبدربہ نے عقد الفرید جزء ثالث میں مفصل بیان کیا ہے۔

ڈیموستھینس، خطبائے یونان کا امام مانا جاتا ہے لیکن اُس کے کل خطبات "۶۱" سے زیادہ نہ تھے۔ مسلمانوں میں حضرت علی مرتضیٰ کے خطبات سینکڑوں کی تعداد میں ہیں جن کو شریف مرتضیٰ نے ایک کتاب کی شکل میں جمع کر دیا ہے جس کا نام "نہج البلاغہ" ہے۔

اِن خطبات میں جہاں ایک طرف سلاست و روانی پائی جاتی ہے وہاں دوسری طرف زورِ بیان اور ایسا جوش و اثر پایا جاتا ہے کہ سُننے والوں کے دِل لرز اُٹھتے ہیں۔ پھر زورِ خطابت کا عالم وہاں اور واضح ہوکر نظر آتا ہے جہاں حضرت علیؑ نے قوم کو جنگ پر اُبھارا ہے اور اُن کے دِلوں میں شجاعت و بہادری، اقتحامِ حرب اور اباءِ نفس کے شریف جذبات برانگیختہ کیے ہیں۔

نمونے کے طور پر آپ کا وہ مختصر خطبہ درج ذیل ہے جو آپ نے جنگ صفین میں اُس وقت دیا تھا جب موقع نہایت نازک تھا۔ سرفرازی و سربلندی کا تاج یا ذلت و رسوائی کا تاریک انجام تقریر کی تاثیر و عدمِ تاثیر پر موقوف تھا۔ وہو ھذا :-

معاشر المسلمین!

استشعروا الخشیة و تجلببوا
السکینة، وعضوا علی
النواجذ فانه انبی للسیوف
من الهام واکملوا
اللامة، وقلقلوا السیوف
فی اغمادها قبل سلها، و
الحظوا الخزر واطعنوا الشزر
ونافحوا بالظبآء.. وصلوا
السیوف بالخطآء واعلموا
انکم بعین الله ومع ابن
عم رسول الله صلعم فعاودوا الکر
واستحیوا من الفر، فانه
عار فی الاعقاب و نار
یوم الحساب. وطیبوا عن
انفسکم نفسا وامشوا
الی الموت مشیا سجحا،
وعلیکم بهذا السواد الاعظم
والرواق المطنب فاضربوا
بثجه. فان الشیطان کامن
فی کسره -

مسلمانو!

تم خوفِ خدا کو اپنے لئے شعار بنالو، اور تسکین و
اطمینان اپنی طرف کھینچ لو، اور دانتوں سے دانت
ملائے رکھو۔ اس لئے کہ یہ حالت دشمن کی تلواروں
کو کھوپڑی پر کارگر ہونے نہیں دیتی اور زرہ کو کامل
کرلو، اور تلواروں کو کھینچنے سے پہلے نیاموں میں
جنبش دے لو، اور چاروں طرف کنکھیوں
سے دیکھتے جاؤ اور دائیں بائیں نیزے بازی
کئے جاؤ اور دشمن کو تلوار کی باڑھ پر دھر لو اور
تلواروں کو دشمن کے قدموں سے ملائے رکھو، تم
خوب جان لو کہ تم خدا کی نظروں میں ہو اور ابن عم
رسول کے ساتھ ہو۔ دوبارہ دشمن پر پلٹ پڑو۔
بھاگنے سے شرم کرو۔ اس لئے کہ بدنامی اس کا
انجام ہے اور قیامت کے دن عذاب جہنم اس کا بدلہ
ہے اور اپنے نفس کو اس کی خواہشوں سے خوش کرو۔
اور بطیب خاطر موت کی طرف آسانی کے ساتھ
چلے چلو۔ تم اس زبردست جماعت اور طنابوں سے
کسے ہوئے خیمے پر ٹوٹ پڑو۔ اور اس کے اندر
بیٹھنے والوں پر تلواریں برسا دو۔ اس لئے کہ
شیطان اسی اطراف رواق میں چھپا
ہوا ہے۔

قد قدّم للوثبة يداً
واخّر للنكوص رجلا
فصمداً صمداً حتیٰ ينجلی
لكم عمود الحق وانتم
الاعلون والله معكم
ولن يتركم اعمالكم ۞

جو آگے بڑھنے کے لئے پیش دستی کرتا ہے
پھر واپس ہونے کے لئے پیر پیچھے ہٹاتا ہے۔
لڑو لڑو یہاں تک کہ قدرتی نشان
تمہارے لئے آشکارا ہو جائے۔ تم ہی کو
غالب رہو گے۔ خدا کی مدد تمہارے ساتھ
ہے۔ وہ تمہارے اعمال کو کم اور ضائع
نہیں کرے گا۔

(نہج البلاغہ ص۵۵)

ویدوں پر ایک سرسری نظر

وید ہندؤوں کی سب سے قدیم مقدس کتاب کا نام ہے۔ جو چار مجموعوں پر مشتمل ہے۔ (۱) رگ وید (۲) سام وید (۳) یجر وید (۴) اتھروید۔

رگ وید بہ لحاظ مضامین آریہ نسل کے قبائل کی سب سے قدیم کتاب ہے۔ گو کتابی صورت میں وہ بعد میں آئی ہوگی۔ کیونکہ فن تحریر کی ایجاد رگ وید کے بھجنوں کے منظوم ہونے کے صدیوں بعد ہوئی ہے۔ اس کتاب کی قدامت کا اس سے ثبوت ملتا ہے کہ یاسک نے ۵۰۰ ق م اس کی ایک شرح لکھی ہے۔ لیکن تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکتا اور جن مورخوں اور سنسکرت دانوں نے جو تاریخیں بتائی ہیں اُن میں سینکڑوں برس کا فرق ہے۔ سب سے زیادہ یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ رگ وید کا زمانہ ۸۰۰ ق م کے قریب ختم ہوا۔ یہ کتاب دس حصّوں پر منقسم ہے۔ ۲ سے ۷ تک یہ حصّے تو قدیم سمجھے جاتے ہیں لیکن آٹھویں حصّے میں ردّ و بدل ہے۔ اس کی زیادہ حیثیت نہیں۔ نواں، دسواں اور پہلا حصّہ، یہ بہت بعد کے ہیں کیونکہ ان تینوں حصّوں اور خصوصاً دسویں حصّے میں فلسفیانہ مضامین ہیں جو اوروں میں نہیں ہیں جن سے اُن کے مؤخر ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ اس لئے کہ فلسفیانہ خیالات بعد میں پیدا ہونے شروع ہوئے؛

رگ وید کا انداز شاعرانہ ہے اس میں ۱۰۲۸ گیت ہیں۔ اس کتاب کا کوئی خاص مصنف نہیں۔ طرز و انداز کے مختلف ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب لاکھوں ذی فہم دماغوں کی صدیوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔ رہا یہ امر کہ یہ کتاب کہاں تصنیف ہوئی۔ تو اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں۔ البتہ اس کے مطالعہ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعض حصّے افغانستان، بلوچستان کے علاقے میں لکھے گئے ہیں اور بعض حصّے

بیاس اور سرسوتی کے درمیان۔ کیونکہ اِن میں جو موسم کے حالات بیان کئے گئے ہیں وہ وہیں پائے جاتے ہیں۔ اور بعض حصّوں میں پنجاب کے میدانوں اور دریاؤں کا ذکر ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کچھ حصّے یہاں بھی لکھے گئے ہیں۔ مگر یہ یقینی نہیں۔

رگ وید میں جس مذہب کی تعلیم دی گئی ہے وہ فطرت پرستی سے موسوم کیا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ہمارے موجودہ تصورات سے مختلف ہے۔ آریہ قوم نے کائنات کی ان تمام قوتوں کو جن سے انسان اور انسانی زندگی کو فیض پہنچتا تھا دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش کو مذہبی شعار بنالیا تھا۔ اندر بادلوں پر سوار برق و رعد کا تازیانہ لئے ہوئے آریوں کا محبوب دیوتا تھا۔ وارن مِتر اور اگنی کی پوجا کی جاتی تھی۔ رگ وید کی بھجن ان دیوتاؤں کی تعریف سے لبریز ہیں۔ داسوں کو شکست دینے میں ان کا ہاتھ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ رگ وید کے کسی بھجن میں چار دل ورنوں (ذاتوں) کا حوالہ نہیں ملتا۔ اِس بنا پر یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ قیامِ پنجاب میں آریوں کا اجتماعی نظام سخت نہیں ہوا تھا۔ غالباً ذات پات کی تفریق بعد میں عمل میں آئی ہے۔

سام وید

وید کا دوسرا حصّہ سام وید ہے۔ یہ رگ وید کا اختصار ہے۔ اِس کے اندر زیادہ تر گیت ہیں جو پجاریوں کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور جن کو پجاری قربانی کے مختلف اوقات پر پڑھا کرتے ہیں۔

یجروید

تیسرا حصّہ یجروید ہے۔ یہ حصّہ تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اِس حصّے میں صرف قربانی کے متعلق ہدایتیں پائی جاتی ہیں۔ گویا کہ یہ حصّہ قربانی کے قواعد اور منتروں کا مجموعہ ہے۔ اِس میں اور سام وید میں منتر اور منتروں کے ٹکڑے ہیں جو رگ وید سے ماخوذ ہیں اور اِس طریقہ پر اُن کا سلسلہ رکھا گیا ہے کہ پوجا میں ہر حرکت اور ہر کام کے لئے ایک خاص منتر ہو۔ اور قربانیوں کے لئے بھی جن کی تعداد اِس قدر بڑھ گئی تھی کہ متعدد برہمنوں یہاں تک کہ بعض خاص اوقات

میں سترہ برہمنوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ برہمن مختلف درجوں کے تھے۔ اور ہر ایک کے فرائض مخصوص اور محدود تھے۔ سام وید کے جملہ منتروں کی تعداد ۱۵۴۹ تھی اور سوائے ۷۵ کے سب رگ وید سے ماخوذ تھے۔ یجروید کے منتر بھی رگ وید سے ماخوذ ہیں۔ مگر منتروں کے درمیان نثر کی عبارتیں بھی ہیں جن میں اِن برہمنوں کے لئے ہدایتیں درج ہیں جو اس کتاب کو استعمال کرتے ہیں۔

اتھروید

وید کے چوتھے حصہ کو اتھروید کہتے ہیں۔ اِس حصے کا اضافہ عرصہ دراز کے بعد ہوا۔ جس کی صحیح تاریخ کے متعلق کوئی قیاس نہیں ہو سکتا۔ یہ اضافہ بہت بعد میں ہوا ہے۔ بلحاظ مضامین اور تخیل اِن دونوں ویدوں میں بہت اختلاف ہے۔ اتھروید میں رگ وید کے منتر بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ اس کے جدید ترین حصوں میں سے ہیں۔ بعض بھجنوں میں محاسن شعر و شاعری ضرور ہیں۔ مگر زیادہ تر منتر جھاڑ پھونک سے متعلق ہیں۔ رگ وید کے درخشاں اور خوش طبع دیوتاؤں کے مقابلہ میں جنھیں رشیوں نے مخاطب کیا ہے اِس وید میں سیاہ اور ڈراؤنے بھوت ہیں۔ اِس وید میں ہر ایک بُری چیز کو خواہ وہ قحط ہو یا بخار یا خود انسان کے بُرے خصائل ہر ایک کو ایک دیوتا بنا دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح اُن کو خوش کیا جائے۔ یا جادو سے اُن کے اثر کو دور کیا جائے۔ یا دوسروں کو اُن کے ذریعے نقصان پہنچایا جائے۔ جس کی وجہ سے پوجا بجائے عبادت کے سحر سے مستبدل ہوئی اور برہمن پجاری سے ساحر بن گئے۔

ویدوں پر اِس مختصر تبصرے کے بعد اب ہمیں یہ بتلانا ہے کہ مختلف مذہبی عقائد کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے۔ اور اس زمانے میں متبعین کو کس چیز پر چلنے کی تلقین کی گئی۔

وید اور پوجا

ویدوں کے مذہب میں بیرونی اثرات سے متاثر ہونے کے قبل بت پرستی کا وجود

نہ تھا۔ اِس بارے میں ہندوستان کے آریہ اپنے ایرانی بھائیوں سے پیچھے نہ تھے۔ عالمِ کائنات اُن کا معبد تھا اور وہ انسان کے بنائے ہوئے مکانوں میں اپنے دیوتاؤں کو نہیں بٹھاتے تھے۔ اور اپنے شاعرانہ خیالات میں کبھی اپنے دیوتاؤں کو انسانی شکل اور خصائل کے ساتھ بیان کرکے خدا کو انسانی شکل وصورت دے دیتے تھے۔ مگر انھوں نے کبھی بُت نہیں بنائے ابتدائی زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کی پرستش ہوتی تھی۔ یعنی قدرت کی قوتوں کو بہ حیثیت جداگانہ ہستیوں کے پوجتے تھے۔

مختصر یہ کہ اِس عہد میں فطرت پرستی نہایت ہی مؤثر و دلکش شکلوں میں بڑی اعلیٰ و اکمل شان سے نظر آتی ہے۔ یہ آسمان جو ہمارے سروں پر ایک ہیبتناک جلال و جبروت سے جھکا ہوا ہے۔ یہ فرحت خیز و رُوح پرور ہوا جو کرۂ ارض کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہ شعلہ فشاں آگ جو ہمارے مطبخوں میں عجیب کیفیت سے جلتی ہے اور ہم کو گرمی و روشنی دیتی ہے۔ یہ نورانی صبح جو کسی حسین اور شرمیلی دلھن کے مانند ہم کو خوابِ غفلت سے چونکا کر دنیا کے کام کاج میں مشغول کردیتی ہے، یہی وہ سب دیوتا تھے جن پر قدیم زمانے کے ہندو شیدا ہی نہیں تھے بلکہ اُن کی پرستش دل سے کرتے تھے۔

وید کے دیوتا

رگ وید کے گیتوں میں مختلف دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے۔ معمولی دیوتاؤں کو چھوڑ کر رگوید میں تقریباً ۳۳ دیوتاؤں کا ذکر ہے۔ جن میں اِس زمانہ میں ۲۰ دیوتاؤں کی زیادہ عبادت کی جاتی ہے۔ بعض اُن میں کے حسبِ ذیل ہیں:۔

اُن میں سب سے پہلا دیوتا دیائوس ہے۔ اِس کا مادّہ دیو ہے جس کے لغوی معنی درخشاں ہونے کے ہیں۔ ایک گرم یا نیم گرم مُلک میں ایک قوم جس میں شاعری ودیعت تھی، آسمان کو سوائے نورِ درخشاں کے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ اور پھر درخشاں کہنا تھا کہ چشم زدن میں آسمان بھی ایک دیوتا ہوگیا۔ اور دیوتا بھی ایسا جس کو تمام آریہ اقوام اپنا دیوتا مانتی تھیں۔ یہ

دیوتا، آسمان کا دیوتا تھا۔ اس کی تعریف میں رگ وید میں متعدد بھجن ہیں۔

حصۂ ہفتم میں جو ایک رشی مسمّی وسشٹھ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا کم از کم اس کے خاندان میں محفوظ تھا وارن کی تعریف میں بہت سے بھجن ہیں۔ مختصر بیانیہ فقروں میں اس کو مخاطب کیا گیا ہے جن کو اگر ایک جگہ جمع کیا جائے تو اس دیوتا کی نہ صرف جیتی جاگتی تصویر مع اس کے جملہ جسمانی خصوصیات کے بن جائے گی بلکہ بہت سے مشاہداتِ قدرت سے بھی اس کا تعلق معلوم ہو جائے گا جو آسمان کے متعلق ہیں۔ وارن پہلے تو آسمان تھا، پھر آسمان کا دیوتا ہو گیا اور اس طور پر وہ جملہ کرشمہ ہائے قدرت میں جلوہ گر نظر آنے لگا جو آسمان پر نظر آتے ہیں۔ آفتاب اور ماہتاب اس کی آنکھیں ہیں۔ زمین کی سات ندیاں اس کی بہنیں ہیں بارش کا بھیجنے والا بھی وہی ہے۔ وارن کی تعریف کے بھجنوں میں سے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں جن سے وید کے اس عظیم الشان دیوتا کی خصوصیات ذہن نشین ہو سکیں گی۔

ایک رشی کا گیت ہے :-

"ایک بھجن گاؤ جس سے شاہ وارن خوش ہو جائے۔ یہ بھجن اس کی تعریف میں گاؤ جس نے زمین کو اس طرح پھیلایا ہے جیسے قصاب گھوڑے کے چمڑے کو دھوپ میں پھیلاتا ہے۔ وہی جنگلوں میں ٹھنڈی ہوائیں بھیجتا ہے گھوڑے (آفتاب) کو تیزی دیتا ہے۔ گایوں (بادل) کو دودھ دیتا ہے دماغ میں عقل پیدا کرتا ہے اور پانی میں آگ (بجلی) پیدا کرتا ہے۔"

(رگ وید حصّہ پنجم)

انسان کو جب اپنے معاصی پر پشیمانی ہوتی تھی تو وہ وارن ہی سے ترحم و عفو کا خواستگار ہوتا تھا۔ رگ وید میں کئی توبہ کے بھجن ہیں جو بہت پُر اثر ہیں جن میں کا ایک یہ ہے :-

"اے وارن ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ میں خانۂ گِلی میں داخل ہوں رحم، اے مہابلی رحم، اگر میں اِدھر اُدھر اِس بادل کی طرح بھٹکوں جیسے ہوا

پریشان کرتی ہے تو مجھ پر رحم کر، اے ذاتِ بے لوث میں نے
راہِ راست کو کمزور ہونے کی وجہ سے چھوڑا ہے رحم کر رحم کر، اے وارن
جب ہم آسمانی دیوتاؤں کے دیکھتے ہوئے گناہوں کے مرتکب ہوں اور
تیرے قوانین کی خلاف ورزی کریں تو رحم کر رحم۔"

اِس دیوتا کی زیادہ دِن تک پرستش نہیں ہوئی اور زمانہ مابعد کی افسانیات میں وارن، پانی کا دیوتا ہو گیا۔ اُس کی تمام آسمانی صفات غائب ہو گئیں اور اُس کی اخلاقی صفات میں سے بھی وہی لوگوں کے دِلوں میں جاگزیں رہیں۔ جو ڈرانے والی تھیں یعنی وہ صرف سزا دینے والا خیال کیا جانے لگا اور اِس رحیم اور انصاف پسند بادشاہ کو بے رحم اور بد طینت خیال کیا جانے لگا۔ جس کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ وہ گناہ گاروں پر بھی رحم کرتا ہے۔

اِس کے بعد اگنی کا ذکر آتا ہے۔ یہ آگ پاک کرنے والی اور انسان کی محافظ اور دوست ہے۔ اِس کے ساتھ ہندی آریاؤں کو بھی وہی محبت ہے جو ایرانیوں کو تھی جو اُس کی آتَر کے نام سے پرستش کرتے تھے۔ مختصر یہ کہ یہ آگ کا دیوتا ہے اور اِس کے سوائے کوئی دیوتا اور ایسا نہیں ہے جو انسان کے ساتھ اُس کا مہمان اور دوامی رفیق بن کر رہے۔ اور روزمرّہ کے گھر کے کاموں میں اُس کی مدد کرے۔

اِن دیوتاؤں کے بعد پرتھوی کا جو زمین کی دیوی ہے ذکر آتا ہے۔ اس کی شان میں اچھّے اچھّے گیت ہیں۔ پھر اندر کا جو کڑک اور بجلی کا دیوتا سمجھا جاتا ہے ذکر آنے لگا۔ سورج کے مختلف اوصاف کو مختلف دیوتاؤں کی صورت دی گئی۔ مثلاً قوّت، حیات، سوریا سوتری کی شکل دی گئی۔ پھلوں کو پکانے اور زرخیزی کی قوت کو پوشن کی صورت دی گئی۔ اُس کی تیز رفتاری کو وشنو کی شکل دی گئی جو آجکل بھی بڑا دیوتا مانا جاتا ہے۔ اِن کے علاوہ شیو بھی اُس وقت بڑا دیوتا شمار کیا جاتا تھا۔ اُس وقت اِس کا نام رگ وید میں رُدر تھا۔ یہ طوفان کا دیوتا تھا۔ اِس کے بعد طلوعِ آفتاب کی دیوی اوشس کا بہت ذکر آتا ہے۔ اِس کو انسانی صورت

دی جاتی تھی۔ چنانچہ سورج کو انسان اور وایُوس اور آندر کو بیل کی شکل دی جاتی ہے۔ رگ وید کے دیوتاؤں میں سب سے بڑی خوبی قوت و جبروت ہے۔ کوئی اخلاقی قوت نہیں، غرض وید کے بھی وہی دیوتا اور دیویاں تھیں جن کو ہمارے اسلاف اور بڑے بوڑھے تین چار ہزار برس ہوئے اندلس کے کنارے پر پوجا کرتے تھے۔ قدرت کے دیوتاؤں کا تصور اور وہ بے ریا اور جوانمردانہ سرگرمی جس سے وہ پوجے جاتے تھے ایک جری اور فاتح قوم کی قوت و بے لوثی کو ثابت کرتا اور ایک گروہ کی ترقی کو جس نے ابھی چند روز گذرے کہ تہذیب میں معقول حد تک پیش قدمی کی تھی، منکشف کرتا ہے،

وید اور وحدانیت

ویدوں میں وحدانیت کی تعلیم اور اُس عہد کے آریوں میں وحدانیت کا احساس تھا یا نہیں۔ یہ ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ جہاں تک ویدوں کا تعلق ہے اُن کے مطالعے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اِن ویدوں میں بہت سے دیوتاؤں کا ذکر ہے جس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ متعدد دیوتاؤں کے وجود کی تعلیم موجود ہے۔ متوفی آباؤاجداد کی پرستش کا بھی ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان پرستی بھی اُس کے خصائص میں سے ہے۔ ابتدائی زمانے سے یہ خیال بھی رائج تھا کہ خدا عالم کے ہر ذرے میں موجود ہے۔ جیسے اِس اشلوک سے ظاہر ہوتا ہے

"وہ خدا سمندر جس کی راہیں ہیں وہی پانی کے اِس زمانے میں بھی موجود ہے۔"

اِن خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ ہمہ اوست (وحدتِ وجود) کی طرف زمانۂ قدیم سے رجحان تھا۔ اِس کے علاوہ بہت سے ایسے اشلوک ملتے ہیں جن کا مفہوم یہ ہے کہ مختلف دیوتا صرف اُس ذاتِ واحد کے مختلف نام ہیں۔ چنانچہ اُس عہد کے آریوں کے جو اعتقادات تھے وہ وحدانیت سے بہت قریب تھے اور اُن کے جانشین یعنی برہمن بھی جن کی قوتِ متخیلہ حد درجہ تیز تھی اس کے قریب قریب پہنچے مگر حقیقت کو معلوم کرنے میں

ناکامیاب رہے، وید کے قدیم شعراء بھی وحدانیت کے قریب قریب پہنچ گئے تھے۔ کیونکہ جب وہ وارُن کی عبادت کرتے تھے جو گناہوں کی سزا دینے والا اور معاف کرنے والا ہے تو لوگوں سے کہتے تھے "ڈرو اُس سے جس کے ہاتھ میں چاروں پانسے ہیں قبل اس کے کہ وہ اُنھیں پھینکے، اُس شخص کا راستہ سیدھا اور بے خار ہے جو نیک کام کرتا ہے۔" مگر نشاۃ ذرا حفظا کر گیا اور رسوم نے ارتقاءِ رُوحانی کا خاتمہ کر دیا۔ اِس عہد کا ایک شاعر ہستی یکتا کی عظمت کی مدح سرائی کرتا ہے مگر جب وہ تناقض کو دیکھتا ہے تو پوچھتا ہے کہ کس دیوتا کے لئے ہم قربانی کریں یعنی ان دیوتاؤں میں جن کو ہم اپنے دیوتاؤں میں مخاطب کرتے ہیں یہ ہستی یکتا کون ہے جس کے لئے آج ہم قربانی کرتے ہیں، وہ بھجن یہ ہیں :-

۱- ابتداء میں سنہرا بچہ وجود میں آیا، وہ تمام موجودات کا واحد پیدا شدہ مالک تھا، اُس نے زمین اور اِس آسمان کو قائم کیا وہ دیوتا کون ہے جس کے لئے ہم قربانی کریں گے۔"

۲- "وہ سانس (حیات) دیتا ہے وہ طاقت دیتا ہے، اُسی کے حکم کی تمام دیوتا عظمت کرتے ہیں۔ اس کا پرتوِ حیات ازلی ہے۔ اُس کا سایہ موت۔ وہ دیوتا کون الخ"

۳- "وہ جس کے سبب سے آسمان درخشاں ہے اور زمین مضبوطی سے جمی ہوئی ہے اور وہ جس کے سبب سے آسمان بلکہ اعلیٰ ترین آسمان بھی قائم ہوا وہ جس نے ہوائی فضا کو ناپا وہ دیوتا کون الخ"

مندرجہ بالا نظم سے یہ اندازہ تو ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں وحدانیت کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ اپنے اس احساس میں ناکامیاب رہے اور وحدانیت کے پوری طور پر قائل نہ ہونے پائے۔

وید اور موت اور دیگر رسومات

کسی قوم یا قبیلے کے متعلق سب سے پہلے جو چیز ہم کو جاننا چاہیئے وہ یہ ہے کہ موت کے متعلق اُن کے کیا معتقدات ہیں اور مُردے کی لاش کے ساتھ وہ کیا سلوک کرتے ہیں اور کن رسوم کے ساتھ وہ لاش کو دفن کرتے ہیں۔

رگ وید کے دسویں حصہ میں بہت سے ایسے بھجن ہیں جن کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے آریہ ہندو اور اُن کے اسلاف گو زندگی سے محبت رکھتے تھے اور آرزو رکھتے تھے کہ اُن کی اور اُن کی اولاد کی حیات صد سالہ ہو مگر موت سے وہ ڈرتے نہ تھے اور گو وہ مُردوں کا احترام کرتے تھے اور اُنھیں محبت سے یاد کرتے تھے مگر یاس و نا امیدی کے ساتھ اُن کا ماتم نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ اُن کا عقیدہ تھا کہ مرنے والا اپنے آبا و اجداد اور بزرگانِ قوم کے ساتھ خوشی و خرمی سے زندگی بسر کرتا ہے اور اپنی اولاد کے آنے کا منتظر رہتا ہے۔

رگ وید کے دسویں حصے کے مختلف بھجنوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتداءً لاش کو دفن کرنے کا رواج تھا۔ سب سے پہلے وہ لاش کو کسی متبرک مقام پر رکھتے تھے، متوفی کی کمان اُس کے ہاتھ میں ہوتی۔ اُس کی بیوی اُس کے سر کے قریب بیٹھی ہوتی۔ اور اعزا و اقربا ایک وسیع حلقے میں کھڑے ہوتے تھے، پجاری لاش سے کچھ دور اِس حلقے میں ایک پتھر رکھ دیتا۔ یہ پتھر حدِ فاصل تھا جس کے اِس طرف زندہ لوگ نہیں جا سکتے تھے اور عورت سے بھی یہ التجا کی جاتی تھی کہ اُس کے آگے نہ آئے۔ اِس کے بعد پجاری مُردے اور ماتم کرنے والوں سے کچھ کہتا، پھر متوفی کا بھائی یا کوئی اور قریبی رشتہ دار بیوہ کا ہاتھ پکڑ کر کہتا۔

" اُٹھ اَے عورت اور عالمِ حیات کو دیکھ، جس کے پاس تو بیٹھی ہے اور جس نے تیرا ہاتھ ایک دِن اپنے ہاتھ میں لے کر تجھ سے بیاہ کیا تھا وہ

مر چکا ہے اور اب تیرا نکاح ٹوٹ چکا۔ "

پھر یہی شخص، بے جان ہاتھوں سے کمان لے کر کہتا ہے:۔

"مُردے کے ہاتھ سے میں نے کمان لے لی ہے تاکہ اِس سے ہمیں مدد ملے اور ہمیں قوت و شہرت حاصل ہو، تم یہیں ٹھہرے رہو۔ ہم بہادر لوگ جنگ میں دشمن کو زیر کریں گے۔ "

اِس کے بعد تدفین شروع ہوتی ہے۔ یعنی لاش زمین میں رکھ دی جاتی ہے اور اس پہ مٹی ڈھیر کر کے ایک تودہ بنا دیا جاتا ہے جسے موت کا مسکن کہتے تھے۔

مُردوں کو صبر و استقلال کے ساتھ بغیر کسی بیہودہ گریہ وزاری کے رخصت کرنے کی یہ رسم نہایت قدیم تھی۔ مُردوں کو جلانے کی رسم جب جاری ہوئی تو اس کے ساتھ دوسری رسوم کو بھی بدلنے اور دوسری عبارتوں کی تلاش کی ضرورت ہوئی جو سب دسویں حصے میں موجود ہیں۔ گیرہیا ستر (تمدنی قوانین) میں زمانہ ما بعد کی رسوم کو حسب ذیل طریقے پہ بتایا گیا ہے اور یہ رسوم کم از کم اُن میں اُس وقت تک جاری تھیں جب وہ گنگا اور جمنا کے کناروں پہ پہنچے جہاں ویدک تمدن کے بعد برہمنوں کے تمدن کا آغاز ہوتا ہے،

مکانات سے دور چند خاص ہدایات کے بموجب ایک منتخب مقام پر تمام اعزہ جمع ہوتے ہیں۔ بارہ سنگھے کی کھال چتا پر بچھائی جاتی ہے جس پہ قربانی کی گھاس بچھا دی جاتی ہے۔ اور کھال کے اوپر لاش رکھی جاتی ہے اور بیوہ اُس کے سرہانے بیٹھتی ہے اور قربانی کی ضروری اشیاء متوفی کے جسم پہ ایک خاص ترتیب سے رکھی جاتی ہیں اور مختلف طویل رسموں کے ادا کرنے کے بعد جلانے کی رسم ادا کی جاتی ہے جسم کے خاکستر ہونے سے کچھ قبل، پجاری کچھ پڑھتا ہے اور لوگ اِس مقام سے چلے جاتے ہیں۔ راستے میں وہ صاف پانی میں نہاتے ہیں اور صاف کپڑے پہن کر شام تک وہیں رہتے ہیں۔ دس روز کے بعد متوفی کی جمع کی ہوئی ہڈیوں پر مٹی ڈالی جاتی ہے اور سنگ لوح رکھ دی جاتی ہے۔

حیاتِ مستقبل

ویدک عہد کی آریہ قوم کو حیاتِ مستقبل پر پورا اعتقاد تھا، موت کو وہ ختم کرنے والا کہتے تھے۔ مگر اس سے مراد صرف دنیاوی زندگی کے ختم کرنے والے سے تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان میں ایک جزو ہے جو نہ پیدا ہوتا ہے نہ مرتا ہے اور جسم خاکی سے الگ ہوکر اپنے اصل مسکن کو چلا جاتا ہے اور ان دوستوں کے ساتھ مِل کر جو پہلے وہاں چلے گئے ہیں حیاتِ ابدی حاصل کرکے شادمانی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ زندگی کیسی تھی۔ وہاں لوگوں کے کیا مشاغل رہتے تھے۔ تو اس کا جواب صرف مبہم تخیلات میں ملتا ہے۔ جیسے اس گیت میں :-

"نیکی بابرکت مرد سے دونوں بادشاہوں وارُن اور یاما کی عظمت کا ذکر کرتے ہیں۔ اور خوبصورت پتّے والے درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے مزے مزے کے کھانے کھاتے ہیں۔ اور سوما پیتے ہیں۔ "

خدا ترس لوگوں کا تو یہ صلہ تھا کہ وہ نہایت آرام و آسایش کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مرنے کے بعد مزے اڑاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ دوسرے گنہگاروں کا کیا حشر ہوتا ہے اور ان کے متعلق ان کا کیا عقیدہ تھا؟ چونکہ گنہگاروں کے حشر کے متعلق آریوں کے خیالات حد درجہ مبہم ہیں اس لئے اس کا جواب دینا دشوار ہے، آریوں کی ہر چیز میں دوئی تھی۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر نیک لوگ نورِ ازلی میں رہتے تھے تو بدکاروں کی جگہ دوامی تاریکی میں تھی۔ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وارُن کو سزا دینے والا دیوتا بتایا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ یہ دیوتا گنہگاروں کو غار میں ڈال دیتا ہے، مختصر یہ کہ خواہ خدا ترس انسان ہوں یا گنہگار، ان کے لئے ویدک عہد میں حیات بعد الممات ہے۔

وید اور ذات پات

ذاتوں کی تقسیم کا زمانہ رگ وید کے بعد کا زمانہ ہے۔ رگ وید کے عہد میں ذاتوں کی تقسیم بالکل نہیں تھی۔ اور منتروں کے ایک ایسے ضخیم مجموعے (رگ وید) میں جس کی تصنیف و تالیف میں ایک مُدت صرف ہوئی ہو اور جمہور کی عادات و روش اور دستور و رواج سے بھرا ہوا ہو ہمیں کوئی ایک فقرہ بھی ایسا دکھائی نہیں دیتا کہ اس عہد کے لوگ موروثی ذاتوں میں علیحدہ علیحدہ ہو گئے تھے۔ اور رگ وید کی دس ہزار رچاؤں میں برادری کے ذاتی اصول کی نسبت جھوٹ کو بھی ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے تقسیم ذات کا پتہ چلے۔ اگر اس کا وجود ہوتا تو رگ وید میں اس کا کسی نہ کسی طرح پر اظہار ضرور ہوتا جس میں اس زمانے کے تمدن کا پورا عکس موجود ہے صرف ایک مقام حصہ دہم میں جسے پُرش کا بھجن کہتے ہیں اس کا ذکر ہے۔ مگر یہ بھجن نہایت مبہم اور اس کا مضمون نہایت غیر واضح ہے۔ البتہ یہ ضرور تھا کسی نے پوجا، کسی نے جنگ جدال، کسی نے تجارت وغیرہ اور کسی نے خدمتگذاری ہی کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا اور غالباً اسی وجہ سے بعد میں اسی صورت کو تقسیم ذات کی صورت دے دی گئی۔ اور غالباً یہ وہ وقت تھا جب شام وید، یجروید اور اتھروید اور دیگر مقدس کتابیں مرتب کی گئیں۔ چنانچہ سب سے پہلے منو کے دھرم شاستر میں ان چاروں ذاتوں کے فرائض اور باہمی تعلقات کو حسب ذیل طریقہ پر بیان کیا گیا ہے:۔

۱۔ برہمنوں کے اس (برہم) نے یہ فرائض قرار دیئے ہیں، ویدوں کا پڑھنا اور پڑھانا، اپنوں اور دوسروں کے لئے قربانی کرنا، خیرات لینا اور دینا۔"

۲۔ چھتریوں کو اس نے حکم دیا ہے کہ لوگوں کی حفاظت کریں، انعام و اکرام دیں قربانی کریں، وید پڑھیں۔ شہوت پرستی سے پرہیز کریں۔

۳۔ ویش ذات کا کام یہ ہے مویشی کی پرداخت کرنا، انعام دینا۔ قربانی کرنا، وید پڑھنا، تجارت کرنا، قرض دینا اور کاشت کرنا۔

۴۔ سشُدروں کے لئے برہمہ نے صرف ایک فریضہ مقرر کیا ہے یعنی دوسری تینوں ذاتوں کی بلا چون وچرا خدمت گذاری کرنا۔

ویدوں کی اخلاقی تعلیم

ویدوں کے بعض منتروں کے شاندار تناسب اور ٹھیک اُنیسویں صدی کے سے خیالات نے بڑے بڑے (میکس مولر، گریفتھ) مستشرقین کو مبہوت کر دیا ہے۔ جیسے جیسے ویدک تحقیقات میں ترقی ہوگی اور مطلب فہمی کے بہتر طریقے وجود میں آئیں گے، ویدوں کی عظیم الشان روحانی معنویت اور اُن کے اخلاقی مباحث کی بے نظیر کثرت ضرور آشکارا ہو کر رہے گی۔ خود اِن اصحاب کو بھی جو اِس خیال کے مؤید ہیں کہ تدریجی ترقی کا نظریہ دنیائے اخلاقیات پر حاوی ہے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ویدوں کی تعلیم فی الحقیقت عظیم الشان اور ملہمانہ ہے۔ یہ مقدس کتابیں صفائی قلب اور قول و فعل میں صداقت اور شرافت پیدا کرنے والے خیالات پر مشتمل ہیں۔ ویدوں میں خدا کو صداقت، انصاف و کرم اور رحم، اِن جملہ صفات کا مخزن خیال کیا گیا ہے اور انسان کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی دُعاؤں میں بار بار اِن اُمور کا خیال رکھے اور پھر اپنے اعمال کو ان کے مطابق بنائے۔ یہاں ہم صرف چند اشلوک درج کرتے ہیں، جن سے ویدوں کی اخلاقی تعلیم کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔

۱۔ تمام اشیاء مجھے دوست خیال کریں۔ میں بھی تمام اشیاء کو دوست سمجھوں۔ یجروید

۲۔ آؤ ہم سب ایک دوسرے کی حفاظت کریں۔ سب مل کر کھائیں پئیں۔ مل جل کر بہادرانہ کام کریں۔ اور ایک دوسرے سے نفرت نہ کریں۔

۳۔ خواہ میں زمین پر ہوں یا آسمان پر خدا کرے صداقت کا فرشتہ ہمیشہ ہمارا نگہبان ہو۔

۴۔ اے قادرِ مطلق تمام امراض اور ناپاک خیالات کو نکال۔ دشمنی کے تمام

خیالات کو ہم سے دور رکھ۔ رگ وید

۵۔ میں ہر بشر سے محبت کروں خواہ وہ رذیل ہو یا شریف۔ اتھروید

۶۔ ایکدوسرے سے ایسے جوش محبت سے پیش آؤ جیسے ایک گائے اپنے بچھڑے سے۔ ؍؍

۷۔ اے بیٹی! اپنے والدین کی مطیع ہو۔ اپنے خاوند سے ہمیشہ لطف آمیز کلمات میں کلام کر۔ ؍؍

۸۔ بھائی اپنے بھائی سے نفرت نہ کرے۔ بہن، بہن پر نامہربان نہ ہو۔ نیک نیتی کے ساتھ ایک دوسرے سے گفتگو ہو۔

۹۔ پہلے مہمان کو دے تو۔ اس کی مہمان نوازی کرلو تو خود کھاؤ۔

۱۰۔ طمانچے کا جواب طمانچے سے نہ دو، سراپ کے بدلے سراپ نہ دو، بلکہ طمانچوں اور بددعاؤں کے بدلے دعاؤں کی بوچھار کر دو۔ رگ وید

۱۱۔ نکشن اجسام میں امن ہو، بحر، خشکی، تری، دنیائے نباتات وحیوانات میں امن ہو، ہر جگہ شانتی ہی شانتی ہو، ہر جگہ سکون ہی سکون ہو!

یہ ہیں ویدوں کے وہ چند اشلوک جو ہمارے سامنے علم الاخلاق کے اعلےٰ اصول پیش کرتے ہیں۔ نسل انسانی کی تاریخ کے ایک نہایت قدیم باب کے اقتباسات میں اس قسم کے اصولوں کو دیکھ کر کہ جو تم کو بد دعا دے اس کو دعا دو، سب سے محبت کرو، ماں باپ کا کہنا مانو، بھائی بہن کی عزت کرو، ایماندار اور راستباز بنو۔ پہلے مہمانوں کو کھلاؤ پھر خود کھاؤ، دنیا میں امن وسکون کے متلاشی بنو، پروفیسر میکس مولر اور گرفتھ جیسے مشاہیر علماء بھی ویدوں کی بلند پایہ معنویت کے مقر ہیں۔

سچائی کی جھلکی

اشخاص

طاہر	تیس سالہ خوبصورت نوجوان۔ مغربی تہذیب کا دلدادہ
زہرہ	طاہر کی نہایت حسین فیشن ایبل پچیس سالہ بیوی۔
نسیم	طاہر کا ستائیس سالہ نوجوان بھتیجا۔ اسی کے قدم بقدم
کلّو	مضبوط کاٹھی کا ساٹھ سالہ باورچی۔
نرگس	نوجوان طرحدار خادمہ۔

منظر

طاہر کے مکان کا ایک حصّہ

کمرہ نہایت ہی نفاست اور سلیقے کے ساتھ مغربی طرز پہ آراستہ کیا گیا ہے۔ دو دروازے ہیں۔ اُن کے بیچ میں آتشدان ہے۔ آتشدان پہ طاقچہ۔ مقابل میں ایک بڑی کھڑکی۔

جب پردہ اُٹھتا ہے تو مسٹر طاہر آتشدان کے پاس کھڑے نظر آتے ہیں۔ کلّو میز کے پاس کھڑا ہے۔ میز پہ خالی برتن چُنے ہوئے ہیں۔

کلّو۔ سرکار وہ چاندی جو چوری ہو گئی تھی میرے خیال میں کسی ملازم ....

طاہر۔ (غمگین لہجہ میں) اُنھ! جانے بھی دو کلّو۔

کلّو —— نہیں سرکار ......

طاہر —— (بات کاٹ کر اسی لہجہ میں)، تم ابّا جان کے پاس بھی رہے ہو نہ ؟

کلّو —— جی ہاں سرکار۔

طاہر —— اور دادا جان کے پاس بھی ؟

کلّو —— جی حضور۔

طاہر —— اور میرے ......

کلّو —— (جلدی سے) جی نہیں سرکار۔

طاہر —— کلّو! میں نے تم کو ہمیشہ خیرخواہ پایا۔ آج کل میں ذرا پریشان ہوں۔

کلّو —— (ہمدردانہ لہجہ میں) کیا بات ہے حضور !

طاہر —— کلّو آجکل ایک عجیب قسم کا درد میرے ہوتا ہے۔

کلّو —— کہاں حضور ؟

طاہر —— (ٹھنڈی سانس لے کر) آہ ! نہ پوچھو !

کلّو —— نہیں سرکار کچھ تو فرمائیے۔

طاہر —— کیا بتاؤں کلّو۔ تمھاری بیگم صاحبہ کی وجہ سے ناک میں دم ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ تمھاری بیگم صاحبہ تمام دن کہاں غائب رہتی ہیں؟ کبھی میرے ساتھ کھانا نہیں کھاتی ہیں۔

کلّو —— غریب پرور مجھے کیا معلوم۔ میں تو اپنے دھندوں میں لگا رہتا ہوں۔

طاہر —— مجھے خوب معلوم ہے۔ (جیب سے ایک پُڑیہ نکالتے ہوئے) اچھا اب میں ان تمام باتوں کا آج ہی تصفیہ کیے دیتا ہوں۔ یہ ایک چینی دوا ہے۔ اس کا نام "سچائی کی پھنکی" ہے۔ میرے ایک دوست نے پیکن سے بھیجی ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ جو کوئی اس کی ایک خوراک استعمال کرلے تو وہ مجبور ہوجاتا ہے کہ

ایک گھنٹے تک سچ بولے۔

کلو —— تو حضور یہ تو اچھی دوا نہیں ہے۔

طاہر —— چاہے کچھ ہو میں اس کو آزماؤں گا ضرور۔

کلو —— مگر حضور مجھ پر نہیں۔

طاہر —— نہیں۔ میں اس کی ایک خوراک تمہاری بیگم صاحبہ کو دوں گا۔ (ڈبیہ میں کی ہدایات کے پرچہ کو نکال کر دیکھتے ہوئے) یہ دوا شربت کے ایک گلاس میں دینی چاہیے۔ تو اس کے ذائقہ کا احساس نہ ہوگا۔ اب ہم کو سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ اچھا ذرا شربت انار کی بوتل تو دو (بوتل میں سے تھوڑا سا شربت لے کر اس میں دوا ڈال کر پھر بوتل میں ڈال دیتا ہے) مگر ہاں دیکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔

کلو —— کہیں ایسا ہو سکتا ہے حضور۔

زہرہ کی آواز سنائی دیتی ہے

طاہر —— کون زہرہ ؟

کلو —— جی ہاں سرکار۔ بیگم صاحبہ ہی ہیں۔

کلو جاکر دروازہ کھولتا ہے۔ زہرہ داخل ہوتی ہے

زہرہ —— معاف کرنا طاہر بہت دیر ہو گئی۔ مگر میں مجبور تھی۔ تمہاری ضرورت کی تمام چیزیں دکان کی اوپری منزل پر تھیں۔ میں لفٹ کے ذریعہ اوپر گئی تو بیچ میں یکایک لفٹ رک گیا۔ مجھے بہت زور کا جھٹکا لگا اور لفٹ مین کی بھی بہت زور کی ٹکر ہوئی۔

طاہر —— ارے ! زہرہ تم ....

زہرہ —— اب آپ لکچر بازی فرمائیں گے۔

طاہر — نہیں فی الحال تو ارادہ نہیں ہے۔ ہاں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ذرا سا شربت پی لو۔ تمہارے چہرہ پہ زردی چھائی ہوئی ہے۔ تکان وغیرہ سب رفع ہو جائے گی

زہرہ — نہیں اب تو تکان نہیں ہے (دستی بیگ میں سے آئینہ نکال کر دیکھتے ہوئے) اور نہ میرا چہرہ زرد ہے۔

طاہر — نہیں! نہیں! ہے۔ کیسے نہیں۔ دیکھو شربت پی لو۔ تکان رفع ہو جائے گی۔

زہرہ — لیکن جی نہیں چاہتا۔

طاہر — نہیں نہیں زہرہ ادھر آؤ۔ کم از کم میرے اصرار ہی سے سہی (شربت سے گلاس بھر کر اور کلو کی طرف دیکھ کر جو تمام باتیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا) کلو!

کلو — حضور۔

طاہر — تم جاؤ۔

کلو سلام کر کے چلا جاتا ہے

زہرہ — مجھے تمہارے اس کھوسٹ باورچی پر ذرا بھی بھروسا نہیں ہے۔ تم نے اُس سے پوچھا نہیں۔ شاید اُس کو معلوم ہو کہ چاندی کیا ہوئی۔

طاہر — کیسی احمق ہو۔ جس نے لی ہوگی کیا وہ بتا بھی دے گا؟ ادھر آؤ یہ پی لو۔

زہرہ — خیر اگر تم اصرار کرتے ہو تو پئے لیتی ہوں (گلاس لیتی ہے ویسے ہی کلو داخل ہوتا ہے)

کلو — حضور ٹیلیفون آیا ہے۔

طاہر — (زہرہ سے) ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔

جاتا ہے۔ جیب سے دستی نکالتے ہوئے ترکیب استعمال دوا کا پرچہ گرا دیتا ہے۔ کلو بھی ساتھ چلا جاتا ہے۔ زہرہ پرچہ اُٹھاتی ہے۔ پڑھتی ہے اور کچھ سوچنے لگتی ہے،

زہرہ—— (خود ہی) " سچائی کی پھنکی " ہوں ! یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے اِس کے پینے پر اصرار کر رہے تھے۔ (شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) اُفوہ ! کس قدر ذلیل حرکت ہے۔ بدگمانی کی بھی انتہا ہو گئی۔ اچھا اب میں ابھی حضرت کو سبق دوں گی۔ (کاغذ کو اپنے کپڑوں میں چھپا لیتی ہے) اب مجھے کیا کرنا چاہئے ؟ اچھا کہیں سے فرضی خطوط ملنے چاہئیں۔ خوب یاد آیا (طاقچہ تک جاتی ہے) یہ بِل خطوط کا کام اچھی طرح دے سکیں گے۔ ان کو اچھی طرح خوبصورت فیتہ میں باندھنا چاہئے (بیگ سے فیتہ نکالتی ہے اور بلوں کو باندھتی ہے پھر شربت کے گلاس کی طرف دیکھتی ہے) لاؤ اِسے پھینک بھی دوں۔ نہیں یہ کسی کو پلانا چاہئے۔ اچھا تو پہلے اِس بوڑھے کھوسٹ ہی کو کیوں نہ پلاؤں۔

گھنٹی بجاتی ہے۔ کلّو داخل ہوتا ہے

کلّو—— کیا حکم ہے حضور ؟

زہرہ—— یہ لو شربت بچ گیا ہے۔ ابھی پی لو۔

کلّو—— مگر غریب پرور مجھے شربت سے نزلہ ہو جاتا ہے۔

زہرہ—— نہیں تم کو پینا پڑے گا۔

کلّو—— لیکن............ حضور ....

زہرہ—— لیکن ویکن کچھ نہیں .... اچھا بیٹھ جاؤ

کلّو بیٹھ جاتا ہے

زہرہ—— اپنا منہ کھولو۔

کلّو—— لیکن غریب پرور میں ....

زہرہ—— (بگڑ کر) تم منہ کھولو (یہ کہہ کر اُس کی ناک پکڑ کر اُس کے منہ میں تھوڑا سا شربت ڈال دیتی ہے) ہاں اب تم جاؤ۔

کلو جاتا ہے۔ لیکن جاتے ہوئے زہرہ پر گھونٹ تاناتا ہی جس کو وہ نہیں دیکھتی ہے اور اپنا منہ آستین سے رگڑتا ہے اور چلا جاتا ہے۔

زہرہ ـــــ (خود ہی) اچھا اب میں اپنے کمرے میں چلی جاؤں اور ذرا سا پوڈر لگا لوں تاکہ چہرہ زرد نظر آنے لگے۔

ہنستی ہوئی چلی جاتی ہے۔ نرگس خادمہ داخل ہوتی ہے

نرگس ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ابھی بیگم صاحبہ آئی تھیں (چاروں طرف دیکھتی ہے) کلو کی طرف سے لاپروا ہو کر شربت کی بوتل اسی طرح چھوڑ گئی ہیں۔ اب اگر ملازم نہ پئیں تو بے وقوف ہیں۔

تھوڑا سا شربت لے کر پیتی ہے۔ اتنے میں طاہر داخل ہوتا ہے۔ نرگس جلدی ہی بوتل میز پر رکھ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دروازے سے زہرہ داخل ہوتی ہے۔

طاہر ـــــ پیاری تم پھر زرد نظر آرہی ہو۔ کیا تم نے شربت نہیں پیا۔

زہرہ ـــــ (خالی گلاس دیکھ کر) دیکھو نہ اب ختم ہو گیا ہے

نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم ـــــ چچی جان تسلیم۔ آداب عرض ہے چچی جان

زہرہ ـــــ اہا نسیم! کہو اچھے رہے تمہارے چچا جان آج صبح کہتے تھے کہ کل وہ تم کو سیر کرانے لے گئے تھے۔

طاہر اثبات میں کہنے کا اشارہ کرتا ہے۔

نسیم ـــــ جی .... جی ہاں .... ہاں کل ہی تو۔

طاہر ـــــ کیوں نسیم کل شام کو کلب میں کتنی دلچسپی رہی؟

زہرہ ـــــ خوب (نسیم سے) کیا تم کو شربت دوں؟

نسیم ـــــ ضرور .... شکریہ

طاہر —— (پریشان ہوکر) اگر میں تمھاری جگہ ہوتا تو کبھی نہ پیتا۔

زہرہ —— کیوں طاہر کس وجہ سے آخر ؟

طاہر —— کچھ نہیں۔ یوں ہی ......

زہرہ —— لیکن ابھی تو تم ہی تعریف کر رہے تھے۔

طاہر —— ہاں لیکن ....

زہرہ —— (گلاس نسیم کو دیتے ہوئے) نسیم یہ لو۔

نسیم —— شکریہ چچی جان (گلاس لے کر پی لیتا ہے)

طاہر —— نسیم تم نے بہت جلدی کی (نسیم کو ٹالنے کی غرض سے) دیکھو نسیم تم ذرا لائبریری میں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں۔

زہرہ —— اس میں جلدی کی کیا بات تھی؟ میرا ارادہ تھا کہ میں کل شام کی دلچسپی کے بارے میں کچھ پوچھتی۔

طاہر —— نہیں پیاری اب اس وقت نہیں

زہرہ —— (طاہر کی بات کا خیال نہ کرتے ہوئے) کہو نسیم تمہارے چچا جان نے کل تم کو کہاں کہاں پھرایا۔

طاہر نسیم کو اشارہ کرتا ہے

نسیم —— (طاہر سے) چچا جان میں مجبور ہوں مجھے سچ سچ کہنا پڑے گا۔

طاہر —— (الگ) لعنت ہے ایسی دوا پر۔

نسیم —— (زہرہ سے) چچا جان نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں آپ سے یہ کہوں کر میں ان کے ساتھ تفریح کو گیا تھا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ ایک نوجوان لڑکی کے ....

طاہر —— (غصہ میں) نسیم تم کو غلط واقعات بیان کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ فوراً

کمرے سے نکل جاؤ۔

نسیم —— چچا جان میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ آپ نے ایسا کیا ہے۔ بلکہ آپ نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ کمبخت وہ لڑکی ہی ذرا بڈھب.....

طاہر غصہ میں آکر نسیم کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے باہر کر دیتا ہے

زہرہ —— یہ کیا قصہ ہے ؟

طاہر —— میری خود سمجھ میں نہیں آتا معلوم ہوتا ہے شربت کی تیزی کا اثر دماغ پہ ہو گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اُس کی باتوں کا کوئی اثر نہ لوگی۔

زہرہ —— یقیناً نہیں۔

ایسا ظاہر کرتی ہے گویا دوا نے اُس پر اپنا اثر کیا

زہرہ —— پیارے طاہر۔

طاہر —— کہو پیاری

زہرہ —— میری عجیب کیفیت ہو رہی ہے

طاہر —— (الگ) ہوں! دوا نے اثر کیا

زہرہ —— مجھے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ گویا مجھے تمام باتوں کا اقرار کرنا پڑے گا۔

طاہر —— (انجان بن کر) کیا مطلب ؟

زہرہ —— (رازدارانہ طور پر آہستہ سے) پیارے طاہر اپنے پچھلے گناہوں کا اقرار۔

طاہر —— کیا ؟

زہرہ —— میں نے تم سے ابھی کہا تھا کہ مجھے لفٹ میں جھٹکا لگا ....

طاہر —— تو پھر ؟

زہرہ —— اور لفٹ مین سے ٹکر بھی ہوئی ....

طاہر —— ہاں ہاں تو پھر ؟

زہرہ ـــــ تو سب غلط تھا۔ لفٹ وغیرہ کا کوئی قصہ پیش نہیں آیا۔
طاہر ـــــ اور نہ اوپری منزل ہی پر گئی تھیں؟
زہرہ ـــــ ہاں۔
طاہر ـــــ تو پھر کیوں دیر ہوئی؟
زہرہ ـــــ میں تم سے اپنی خواہش کے خلاف کہنے پر مجبور ہو رہی ہوں۔ ہائے میرے اللہ .... (اپنا سر کھجلاتی ہے)
طاہر ـــــ پیاری مجھ سے سب کہدو۔
زہرہ ـــــ میں ممتاز کے پاس گئی تھی۔
طاہر ـــــ (غصہ سے) کون ممتاز؟ .... وہ آوارہ، لُچا، بدمعاش ......
زہرہ ـــــ (بات کاٹ کر) نہیں ممتاز مصور۔
طاہر ـــــ تم اس کے اسٹوڈیو (نگار خانے) میں گئی تھیں؟
زہرہ ـــــ ہاں پیارے طاہر۔ اس کا بہت اصرار تھا کہ میں اس کی نئی تصویر کے لئے نمونہ بنوں۔
طاہر ـــــ (غضبناک ہو کر) اور تم .... لاحول ولا قوۃ، لاحول ولا قوۃ ....
زہرہ ـــــ ہاں اس نے کہا کہ میرے جسم کی ساخت بہت اچھی ہے۔ کمر بہت پتلی ......
طاہر ـــــ میں اس بدمعاش کو مار ڈالوں گا۔ (چیخ کر) میں ابھی جاتا ہوں۔

کلو دروازے سے داخل ہوتا ہے

کلو ـــــ سرکار۔
طاہر ـــــ (اپنے دونوں ہاتھوں میں اپنے منہ کو چھپا کر) نکل جاؤ، میرے سامنے سے نکل جاؤ
کلو ـــــ حضور وہ چچے جو غائب ہوئے تھے ....
زہرہ ـــــ (الگ) کتنی عجیب دعا ہے۔

طاہر —— (آگے بڑھتے ہوئے) تم نہیں جاؤ گے؟
کلّو —— حضور۔

طاہر کلّو کے پاس تک جاتا ہے لیکن وہ فوراً باہر چلا جاتا ہے

طاہر —— تو یہ قصے ہیں۔ اور کچھ گُل افشانی فرمائیے۔
زہرہ —— اَب مجھ سے مزید تفصیل نہ پوچھو۔
طاہر —— (چیخ کر) نہیں تمھیں کہنا پڑے گا۔
زہرہ —— نہ پوچھو۔ گذری ہوئی باتوں کو جانے ہی دو۔ ابھی اور کچھ کہوں گی تو نہ معلوم تمہاری کیا کیفیت ہوگی۔
طاہر —— یا میرے خدا ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے۔
زہرہ —— بہت کچھ۔

کلّو داخل ہوتا ہے

کلّو —— حضور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے سب سچ سچ کہنا پڑے گا..... حضور وہ .... شربت کی بوتل جو غائب ہوگئی تھی وہ اور دوسرے کسی ملازم نے نہیں بلکہ میں ....
طاہر —— (ایک چمچہ کھینچکر مارتا ہے) نکل جاؤ۔
کلّو —— بہتر ہے حضور۔
زہرہ —— معلوم ہوتا ہے کہ اس بڈّھے کھوسٹ نے شراب پی ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔
طاہر —— خیر وہ تو وہ مجھے تم پر سب سے زیادہ اعتبار تھا لیکن تم نے ہی مجھے دھوکا دیا۔ سچ ہے دنیا میں کوئی اعتبار کے قابل نہیں۔ معلوم نہیں تم کن کن لوگوں کے پاس گئی ہو۔

زہرہ ـــــ کیا ؟ میں نے تو صرف ایک بے چارے کا نام لیا تھا ...... ابھی تک .....

طاہر ـــــ کیا ایک کافی نہیں ہے ؟

زہرہ ـــــ ممکن ہے بعض کے لئے کافی ہو لیکن میرے لئے تو نہیں۔

طاہر ـــــ للہ۔ تم اپنے عشاق کا ذکر اس طرح مجھ سے نہ کرو۔ اے عورت تو نے میرا دل توڑ دیا۔

زہرہ ـــــ اگر میرے امکان میں ہوتا تو تم سے علیحدگی اختیار کر لیتی لیکن افسوس کہ میں مجبور ہوں۔ (طاقچے تک جاکر کاغذ کا بنڈل لاتی ہے) یہ لو چند خطوط ہیں ان کو پڑھو۔

طاہر ـــــ ممتاز کے ؟

زہرہ ـــــ (لاپروائی سے) ہاں اور دوسروں کے بھی۔

طاہر کاغذات کھینچ کر پڑھنا ہی چاہتا ہے کہ کلو داخل ہوتا ہے

کلو ـــــ حضور، میرا قصور معاف کریں۔ میں اس وقت اُن ہیروں کے بٹنوں کے متعلق کہنا چاہتا ہوں جو کھوئے گئے تھے۔ حضور وہ میرے ہی پاس تھے لیجئے یہ حاضر ہیں۔ (بٹن میز پر رکھ دیتا ہے)

زہرہ ـــــ وہی غائب شدہ بٹن ....

طاہر ـــــ (کلو سے) چلے جاؤ ورنہ میں ....

میز پر سے چھری اٹھاتا ہے۔

کلو ـــــ بہتر ہے حضور۔

دوڑ کر باہر چلا جاتا ہے۔ طاہر دروازہ میں سٹکنی لگا دیتا ہے۔

طاہر ـــــ اُف ! (چھری پھینک دیتا ہے) اُف کیا ہو سکتا ہے ؟ آخر ہو کیا سکتا ہے ؟

زہرہ ـــــ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ پیارے ان چیزوں کا خیال ہی نہ کرنا چاہئے۔

طاہر ـــــ مشیطان !........

دروازے تک جاتا ہے۔

زہرہ ـــــ کہاں جا رہے ہو ؟

طاہر ـــــ اپنے مشیر قانونی کے پاس۔ ابھی فوراً طلاق کا انتظام کرتا ہوں۔

زہرہ ـــــ ٹھہرو طاہر ٹھہرو۔ (اپنے جیب سے کاغذ نکالتی ہے) پہلے اسے تو پڑھ لو۔

(کاغذ لیتے ہوئے) تحریری اقبال ...... (کاغذ کو رکھتے ہوئے) آہ !

یہ ...... کیا........ ہے۔

زہرہ ـــــ جب تم ٹیلیفون پر گئے تھے تو یہ تمھاری جیب سے گر گیا تھا۔

طاہر ـــــ تو تم نے شربت ....

زہرہ ـــــ بے وقوف تو نہیں تھی۔ ہاں کلّو اور نسیم نے ضرور پیا۔

طاہر ـــــ اور تم نے نہیں ؟

زہرہ ـــــ یقیناً نہیں میرے پیارے بے وقوف طاہر۔

طاہر ـــــ اور (کاغذات کو دیکھتے ہوئے) یہ کیا ہیں ؟

زہرہ ـــــ یہ بل ہیں جن میں سے اکثر ابھی ادا نہیں ہوئے ہیں۔

طاہر زہرہ کو سینہ سے لگا لیتا ہے۔ ویسے ہی نسیم داخل ہوتا ہے۔

نسیم ـــــ ارے معاف کیجئے گا۔ میں سمجھا تھا ....

زہرہ ـــــ خیر کوئی بات نہیں۔

نسیم ـــــ میں آپ سے شب گذشتہ کے متعلق اور کچھ کہنے آیا تھا۔

طاہر ـــــ (چلّا کر) تم خاموش نہیں رہو گے !

نسیم ـــــ لیکن میں ....

نرگس داخل ہوتی ہے

نرگس ——— سرکار میں کچھ عرض کر سکتی ہوں۔

زہرہ ——— ہاں ہاں ضرور لیکن ذرا ٹھہرو۔ تھوڑی دیر کے بعد۔

نرگس ——— لیکن بیگم صاحبہ مجھے اندر سے کوئی چیز مجبور کر رہی ہے کہ میں کہوں۔

زہرہ اور طاہر دونوں شربت کی بوتل کی طرف دیکھتے ہیں

زہرہ ——— (الگ) معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بھی استعمال فرمایا ہے۔ (نرگس سے) اچھا نرگس کہو کیا کہتی ہو۔

نرگس ——— حضور میں چھوٹے سرکار نسیم میاں کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

نسیم کے چہرے پر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے ہیں

زہرہ ——— ہاں ہاں کہو۔

نرگس ——— حضور روزانہ صبح کو جب میں نسیم میاں کے کمرے میں چھوٹی حاضری لے جاتی ہوں تو ....

کلو کھڑکی کے پاس آکر کہتا ہے :-

کلو ——— حضور میں کھوئی ہوئی چاندی لے آیا ہوں۔

چاندی کی تھیلی میز کے اوپر خالی کر دیتا ہے

پردہ

تنقید و تبصرہ

رباعیات سحابی | مولفہ جناب مولوی علی اوسط صاحب اعظم گڈھی۔ ڈسٹرکٹ وسشن جج صوبہ متحدہ (ریٹائرڈ)، لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی۔ حجم ۲۳۲ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ/
ملنے کا پتہ:۔ دفتر اخبار سرگذشت۔ علی گڑھ

مولوی علی اوسط صاحب ایک مشہور علمی خاندان کے فرد ہیں۔ باوجود اعلیٰ عہدوں پر رہتے اور قانونی مصروفیتوں کے بھی ان کا علمی ذوق قائم رہا۔ اور انھوں نے سحابی متوفی سنہ ۱۰۱۰ء کی رباعیات فراہم کر کے طبع کرائیں۔ متعدد قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد نوسو رباعیاں ان کے نزدیک سحابی کی ثابت ہوئیں۔ اور انھیں کو انھوں نے جلی قلم سے لکھوا کر چھپوایا۔

عمر خیام اور سحابی کا مقابلہ کرتے ہوئے قابل مولف نے لکھا ہے کہ "جس زمانے میں حکیم عمر خیام تھے وہ زمانہ مسلمانوں کی سلطنت کے عروج کا تھا۔ عیش و عشرت کے سب سامان مہیا تھے۔ لہذا شراب، کباب معشوق کے خیالات دل میں آتے تھے .... سحابی گوشۂ عزلت میں رہتا تھا۔ چالیس برس تک اس نے نجف اشرف کے احاطے سے قدم باہر نہیں رکھا۔ اس غریب نے تو شراب بھی نہ دیکھی ہو گی۔ لہذا اس کی رباعیوں میں اس کا ذکر تک نہیں"

دراصل اسی میں عمر خیام کی مقبولیت اور سحابی کی گمنامی کا راز مستتر ہے۔ یعنی شاعری جس قسم کے خیالات چاہتی ہے وہ خیام کے یہاں موجود تھے۔ برخلاف اس کے سحابی نے مذہبی جذبات اور پند و نصائح کو اپنا موضوع بنایا جو کبھی کبھی تو لطف دیتے ہیں۔ لیکن دن رات کا مشغلہ نہیں بن سکتے۔ بے شک سحابی کا انداز بیان صاف اور تشبیہات بھی کہیں کہیں نادر ہیں لیکن جدت اور تنوع نہیں ہے۔ ایک ہی موضوع ہے جس پر اس نے عمر بھر رباعیات کہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا کلام کیوں کر مقبول ہو سکتا تھا۔ مولف کا خیال ہے کہ رباعیاں عمر خیام سے شروع ہوئیں۔ اور سحابی پر ختم ہو گئیں۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے

خیام سے پہلے ابوسعید ابوالخیر نے رباعیاں لکھی ہیں جو اگرچہ صوفیانہ ہیں مگر زبان اور انداز بیان کے لحاظ سے سحابی سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کا مجموعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے عرصہ ہوا شائع کیا ہے بہرصورت مولف کی یہ علمی کوشش قابل داد ہے۔

البینات | مولفہ مولوی محمد سلیم صاحب۔ تقطیع خرد۔ ضخامت ۔ ۳۳ صفحے۔ لکھائی، چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ دفتر البینات۔ امراؤتی برار۔

اس کتاب میں مولف نے قرآن کی تعلیمات کو چھ مختلف عنوانات، مذہبیات، جسمانیات معاشرت، معاشیات، اخلاقیات اور اجتماعیات کے تحت میں لکھا ہے۔ پھر ان میں سے ہر ایک کے تحت میں ذیلی عنوانات قائم کرکے ان کے متعلق قرآنی آیات مع سلیس اردو ترجمہ کے درج کر دی ہیں اپنی طرف سے بجز اس کے کہ کہیں کہیں چند جملے توضیح کے لئے لکھ دیئے ہیں اور کچھ نہیں لکھا ہے ہمارے نزدیک اس قسم کی کتابیں مسلمانوں کے لئے زیادہ مفید ہیں۔ اور ان کو بہ نسبت تفسیروں اور ترجموں کے قرآن سے زیادہ قریب کرنے والی ہیں۔ ہم کو خوشی ہوتی ہے کہ قرآن کی خالص تعلیم کی طرف اب عام رجحان ہو رہا ہے اور توجہ بڑھ رہی ہے جو ہمارے خیال میں اسلامی روح کی بیداری کی علامت ہے

الخیر الکثیر | حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نایاب تصنیف جو اب تک غیر مطبوع تھی دیوبند کی مجلس علمی کی کوشش سے پہلی بار چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب فلسفہ اسلام اور اسرار شریعت کے متعلق نادر تصنیف ہے۔ اس کو شاہ صاحب موصوف کا ایک بلند پایہ علمی اور دماغی کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ ارکان مجلس علمی اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے نہایت کوشش سے متعدد قلمی نسخوں کا مقابلہ کرکے اس کو عمدہ کتابت کے ساتھ اچھے کاغذ پر طبع کرایا۔ ضخامت ۲۰۲ صفحات ہے۔ قیمت فی نسخہ عہ ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس صاحب صدر مدرس مدرسہ صدیقیہ۔ پھاٹک حبش خان دہلی۔

خاتم النبیین | مصنفہ مولانا انور شاہ صاحب مرحوم۔ بزبان فارسی ضخامت ۶ جزو تقطیع ۲۰×۳۰
کتابت وطباعت اچھی اور کاغذ اعلیٰ۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ مولانا محمد ادریس
صاحب مدرس مدرسہ صدیقیہ پھاٹک حبش خاں۔ دہلی۔

مولینا انور شاہ صاحب مرحوم نے یہ کتاب قادیانیوں کی تردید میں لکھی ہے جو ختم نبوت کے مسئلے میں قرآن سے مخالفت کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے عقلی اور نقلی دلائل سے اس فرقے کی غلطیاں واضح کی ہیں۔ چونکہ اُن کا مقصد یہ تھا کہ باشندگانِ کشمیر و بلوچستان خصوصیت کے ساتھ اس فتنے میں پڑنے سے محفوظ رہیں اس لئے انھوں نے اس کتاب کو فارسی زبان میں لکھا۔ یہ اُن کے آخر عمر کی تصنیف ہے۔ جس کو وہ خود اپنی طرف سے چھپوانا چاہتے تھے۔ مگر زندگی نے وفا نہ کی اس لئے ان کے بعد دیوبند کی مجلسِ علمی نے نہایت عمدگی کے ساتھ اس کو شائع کیا ہے۔ چونکہ یہ فارسی میں ہے اور اب فارسی کا رواج ہندوستان سے اٹھتا جارہا ہے اس لئے مجلسِ علمی نے اس کے مقدمہ میں یہ اعلان کر دیا ہے کہ عام مسلمانوں کے لئے وہ عنقریب اس رسالے کی شرح اردو زبان میں شائع کردے گی۔ مجلسِ علمی کا یہ کام قدر کرنے کے قابل ہے۔

نگارستانِ کشمیر | مصنفہ قاضی ظہور الحسن صاحب ناظم سیوہاروی، کتابت وطباعت اچھی
کاغذ عمدہ۔ ضخامت ۴۰۱ صفحے تقطیع ۲۰×۲۶۔ قیمت فی نسخہ عہ
ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد ادریس میرٹھی۔ مکتبہ شرفیہ۔ دہلی۔

قاضی صاحب موصوف نے اس کتاب میں کشمیر کا جغرافیہ اور آغاز عہد سے لے کر آج تک کی اس کی تاریخ نہایت معتمد ماخذوں سے جو مل سکتے تھے لے کر لکھی ہے۔ وہاں کے راجاؤں اور بادشاہوں کے علاوہ امراء، شعراء، فضلاء اور صوفیہ وغیرہ کے حالات اور اُن کے کارنامے بھی بیان کئے ہیں جن کے ذیل میں بہت سے علمی، ادبی، تاریخی اور مذہبی مسائل بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ قاضی صاحب کا زاویہ نگاہ خالص اسلامی ہے۔ اور تحریر کا انداز کہیں محققانہ ہے

اور کہیں مناظرانہ۔ مخالفوں کے جوابات خود انھیں کی کتابوں سے دئے ہیں۔
کتاب شروع سے آخر تک دلچسپ ہے اور نہایت محنت سے لکھی گئی ہے۔

دستور پہلوی | مصنفہ جناب دین محمد صاحب ایم اے۔ بزبان فارسی۔ صاف ٹائپ میں اچھے کاغذ اور بڑی تقطیع پر بمبئی میں چھاپی گئی ہے۔ ضخامت ۴۴۴ صفحے۔ قیمت فی نسخہ عہ/

ملنے کا پتہ:۔ دین محمد صاحب بی اے۔ الریاض ہال بازار۔ امرت سر۔ پنجاب۔

ایران کی قدیمی زبان فرس باستانی کے نام سے مشہور ہے جو ہخامنشی بادشاہوں کے عہد میں بولی جاتی تھی (سنہ ۵۵۰ء سے سنہ ۳۳۰ ق تک) جس کی یادگار اب سوائے چند پرانے کتبوں کے جو پرسی پولس (تخت جمشید) بہستان (بے ستون) میں پائے گئے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ پھر اسکندر مکدونی کی تاخت وتاراج کی وجہ سے ایران میں طوائف الملوکی پھیل گئی۔ جو تقریباً سو سال تک رہی سنہ ۲۲۶ ق م میں اردشیر بابکان نے ساسانی حکومت کی بنیاد ڈالی جو اسلامی فتوحات یعنی عہد یزدگرد تک رہی۔ اس دورہ اشکانی اور عہد ساسانی کی زبان پہلوی کہی جاتی ہے جو رسمی دینی اور ادبی حیثیت سے مستعمل تھی۔ یہ کتاب اسی زبان کے رسم الخط اور صرف ونحو کے متعلق ہے جو نہایت کدوکاوش اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس کے مخاطب عوام نہیں ہیں بلکہ یہ ان خواص کے لئے ہے جو ایران کی قدیم لسانی تحقیقات سے ذوق رکھتے ہیں۔ زردشت کی کتاب اوستا کے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ ہخامنشان کے عہد میں اس کے صرف دو ہی نسخے ایران میں تھے جب اسکندر نے استخر (پایۂ تخت) ایران کو جلا دیا تو ایک نسخہ جل گیا دوسرا نسخہ وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ جس میں سے طب، نجوم فلسفہ، اور جغرافیہ کے متعلق جو حصہ تھا اس کو یونانی میں منتقل کرا کے بقیہ کو برباد کر دیا۔ اوستائے قدیم بہت بڑی کتاب تھی جو ۱۰۰۰ فصلوں پر تمام ہوئی تھی۔ اور مورخین قدیم کے بیان کے مطابق گائے کے بارہ ہزار چرم کے پارچوں پر لکھی جاتی تھی۔ عہد ساسانی میں جب اولین شہنشاہ نے اس کو فراہم کرانے کی کوشش کی تو موبدوں نے اپنی یادداشتوں سے جو کچھ جمع کیا وہ صرف ۳۴۸ فصلیں

تیں ۔ وہ بھی دستبرد زمانے سے رفتہ رفتہ فنا ہوتی رہیں ۔ تاآنکہ اب جو کچھ حصہ اوستا کا رہ گیا ہے وہ دورۂ ساسانی کے اوستا کے چہارم سے زیادہ نہیں ہے ۔

مصنف نے پیشدادیوں کے عہد کی بحث کو غالباً اپنے موضوع سے خارج سمجھا مگر ہم اوستا کی طرح اس کتاب میں دساتیر کے متعلق بھی تاریخی بحث دیکھنا چاہتے تھے ۔

مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں نہ صرف مشرقی اور مغربی علما کی تحقیقات اور ان کی علمی اور تاریخی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے ۔ بلکہ بعض موجودہ اہل علم سے بھی استفادہ کیا ہے اس لئے ان کی یہ کتاب تحقیقاتی حیثیت سے بلند مرتبہ رکھتی ہے ۔ انھوں نے نہ صرف زبان اور اس کے قواعد سے بحث کی ہے بلکہ ایرانی زبان جن خطوط میں لکھی جاتی تھی ان کی تحقیقات بھی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے ۔ ہم اس کو اہل علم کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ سمجھتے ہیں ۔ (ا ۔ ج)

رسائل

شاہکار ۔ ماہوار | ایڈیٹر پروفیسر تاجور ۔ تقطیع ادبی دنیا کے برابر ۔ ضخامت ۲، صفحے ۔
قیمت سالانہ للعہ فی پرچہ ۸ر مقام اشاعت ۔ دفتر شاہکار ۔ لاہور

مولانا تاجور بہت کہنہ مشق اخبار نویس ہیں ۔ پہلے وہ مخزن کے دور ثانی کے ایڈیٹر تھے ۔ پھر انھوں نے اپنا رسالہ ادبی دنیا نکالا جس سے اب وہ قطع تعلق کر چکے ہیں ۔ لیکن وہ اب تک کامیابی سے جاری ہے ۔ اب اپریل سے انھوں نے شاہکار کے نام سے ایک اور شاندار اور بھاری بھرکم رسالہ ملک کے تعلیمی رہنماؤں اور افسران تعلیم کے مشورے سے جاری کیا ہے اس کے مقاصد میں ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طلبا کو خالص ادبی تعلیم دی جائے ۔ زیر نظر رسالہ جلد کا پہلا نمبر ہے اس میں شروع میں ہیڈ ماسٹر صاحبان کی خدمت میں ایک درخواست ہے ۔ تیسرے صفحے پر 'اداریہ' ہے جس میں جناب مولینا راشد صاحب نے رسالے کے مقاصد پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے ۔ یہ مقالہ افتتاحیہ تکلیف دہ حد تک طویل ہو گیا ہے پھر جناب تاجور صاحب کے شذرات ہیں

اس میں انھوں نے رسالے کا لائحہ عمل یا پروگرام بتایا ہے۔ اس کے بعد مرزا محمد سعید صاحب
ایلیائے کا مذہب اور باطنیت پر ایک علمی مضمون ہے۔ پھر مولانا عبداللہ تھانوی کی ایک فارسی نظم ہے، پھر
بزم تحقیق کے عنوان سے چند استفسارات اور مولانا احسن مارہروی اور جناب کیفی دہلوی کی جانب سے
ان کے جوابات ہیں۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کے قلم سے بہادر شاہ کی پوتی کی ایک غم انگیز داستان
ہے۔ تغلق نامے پر مقبول احمد صاحب صمدنی مصنف حیات جلیل کا ایک مضمون ہے۔ بہادر شاہ اور
مرزا غالب کے عنوان سے ہمیش پرشاد لیکچرر ہندو یونیورسٹی کا ایک دلچسپ مضمون ہے۔ پھر خیالات
کے عنوان کے ماتحت جناب تاجور نے اصول بیانی و اصول اختیاری، کیرکٹر، اور ہندو مسلم اتحاد پر
اظہار خیال فرمایا ہے۔ مشاہیر عالم کے تحت میں مشہور فرانسیسی محب وطن موسیو لو انکارے کے حالات
ہیں۔ غیر معرجز بلسٹ صاحب کا ایک دلچسپ افسانہ ہے۔ تعلیمات کے زیر عنوان دلی کی
تعلیمی کانفرنس اور دوسرے تعلیمی و علمی اجتماعات کی روداد یں اور ان پر اظہار رائے ہے جناب سید حسن
برنی صاحب نے چند نادر قلمی مصاحف کے عنوان سے ایک پر از معلومات مضمون لکھا ہے۔ پھر
ریحانہ کے عنوان سے ایک سبق آموز افسانہ ہے۔ تعلیمی ادارات کے تحت میں تقسیم اسناد کے خطبات
کی فہرست اور اُن خطبوں پر اظہار رائے ہے۔ اصطلاحات کے تحت میں عامل اور جوتشی کی خبر لی
گئی ہے۔ سینما کے تحت میں تماشائی صاحب نے صنعت فلم سازی پر خامہ فرسائی کی ہے۔ شخصیات کے
زیر عنوان مولانا ظفر علی، چودھری ظفر اللہ خاں و پنڈت و زنیبر کے حالات ہیں۔ تنویرات کے تحت میں
علمی اور کچھ سیاسی خبریں ہیں۔ مضامین کے بیچ بیچ میں نظمیں اور غزلیں بھی ہیں اور اکثر بلند معیار
ہیں۔ آخری منزل کے عنوان سے ایک ہندوستانی مصور کی سہ رنگی تصویر بھی ہے اور بہت خوب
ہے۔ رسالے کے بعض عنوانات مستقل ہیں۔ مثلاً بزم تحقیق خیالات، مشاہیر عالم، تعلیمات، تعلیمی
ادارات، اصلاحات، شخصیات، تنویرات۔ اس میں شک نہیں کہ رسالہ نہایت محنت اور سلیقے
سے مرتب کیا گیا ہے مضامین بھی کہنہ مشق اور مشہور اہل قلم حضرات سے حاصل کئے گئے ہیں مستقل عنوانات
کے تحت میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی بہت خوب ہے بحیثیت مجموعی یہ رسالہ طلبا اور عوام کے لئے

بہت مفید ہے البتہ اداریہ کے بارے میں اتنی گذارش ہے کہ یہ اس قدر طویل نہ ہونا چاہیے کہ پڑھتے پڑھتے طبیعت اکتانے لگے۔ مضمون نگاروں سے بھی مضمون مختصر اور دلچسپ لکھوائے جائیں۔ شخصیات کا عنوان بھی ہمارے خیال میں کچھ ایسا موزوں نہیں ہے اس میں کچھ تقلید کی بو آتی ہے۔ ویسے بھی اس میں فائدہ کم ہے۔ خرابیاں زیادہ۔ ٹائٹل ممکن ہے طلباء کے لئے جاذب نظر ہو تاہم بہت شوخ ہے۔ تقطیع کے بارے میں کچھ کہنا شاید بعد از وقت ہو۔

ادب لطیف (ماہوار) | ایڈیٹر چودھری برکت علی بی اے۔ تقطیع بڑی۔ ضخامت ۶۴ صفحات، کتابت وطباعت روشن۔ کاغذ متوسط۔ چندہ سالانہ ۵؍ فی پرچہ ۸؍۔ مقام اشاعت۔ لاہور

یہ پرچہ مارچ کے مہینے سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ ہمارے سامنے اس کا پہلا نمبر ہے۔ شروع میں نذر اولین کے عنوان سے ایڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ مضمون ہے۔ جس میں انھوں نے رسالے کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ پھر ادب لطیف کے عنوان سے جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی اے سابق ایڈیٹر ہزار داستان کا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ ادب لطیف صحیح معنوں میں کیا چیز ہے اور اس ادب لطیف (رسالے) کو کیسا ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرے مضامین نظم و نثر ہیں۔ مضمون نگاروں میں چند اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ مثلاً قاضی عبد الغفار صاحب۔ چودھری افضل حق صاحب ایم ایل سی۔ پروفیسر علم الدین صاحب، ایم اسلم صاحب، شاہد احمد صاحب مسز عبد القادر صاحبہ وغیرہ۔ رسالے کی ظاہری شان بھی اچھی ہے۔ شروع میں ایک تصویر بھی ہے بحیثیت مجموعی رسالہ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر ایڈیٹر صاحب کی کوشش اسی طرح جاری رہیں تو لاہور کے رسائل میں بہت جلد ایک خاص حیثیت حاصل کرے گا۔

رتن ماہوار | ایڈیٹر شانتی سروپ نشاط۔ سائز بڑا۔ ضخامت ۴۸ صفحات، لکھائی، چھپائی روشن کاغذ اچھا۔ قیمت سالانہ ۲؍ عہ، فی پرچہ ۳؍۔ مقام اشاعت دفتر رسالہ رتن۔ جموں۔

یہ رسالہ بچوں کے لئے ریاست جموں سے نکلتا ہے ۔ ایڈیٹر صاحب اسے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مضامین ، نظموں اور قصوں کے انتخاب میں بچوں کے فائدے کا خیال رکھا جاتا ہے۔ انعامی معمے اور دل چسپ لطیفے بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ رسالہ بچوں کے لئے مفید ہے ۔ اگر ایڈیٹر صاحب رسالے کی زبان اور آسان کردیں اور مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں تو اچھا ہو مثلاً زیر نظر پرچے میں "بچپن" والا مضمون بچوں کے لئے نہ مفید ہے اور نہ اس سے انھیں کچھ دل چسپی ہو سکتی ہے۔

سالنامہ پھول باغ (ماہوار) | ایڈیٹر صاحبزادہ کوشان سنگت پوری ، سائز بڑا ۔ ضخامت ۱۰۰ صفحے
قیمت سالانہ ۳ ر سالانہ نمبر کی عہ ۔ مقام اشاعت ریاست پٹیالہ ۔

یہ رسالہ نوجوانوں اور طلبائے مدارس کے لئے پٹیالہ سے ماہوار نکلتا ہے ۔ زیر نظر نمبر اس کا سالانہ نمبر ہے ۔ ایڈیٹر صاحب نے اچھے اچھے لکھنے والوں کے مضامین نظم و نثر جمع کئے ہیں رسالے میں مہاراجہ پٹیالہ ۔ افسران ریاست اور چند مضمون نگاروں کی تصویریں بھی ہیں۔ کتابت طباعت میں ترقی کی گنجائش ہے

اُمہات سالانہ نمبر | مدیرہ قمرالنسا بیگم صاحبہ تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ اور کتابت وطباعت معمولی ۔ قیمت سالانہ ۳ ر خاص سالانہ نمبر ۸ ر ۔ مقام اشاعت بھوپال ۔

یہ بھوپال کے مشہور زنانہ ہفتہ وار رسالے کا سالنامہ ہے ۔ اور محنت اور سلیقے سے ترتیب دیا گیا ہے ۔ مضامین نظمیں افسانے وغیرہ سب مفید اور نتیجہ خیز ہیں ، البتہ کتابت و طباعت میں بہت کچھ ترقی کی گنجائش ہے ۔ شاید بھوپال میں اس سے بہتر انتظام ممکن نہ ہوگا۔

اصول تعلیم | مصنفہ خواجہ غلام السیدین صاحب پروفیسر تعلیمات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ شائع کردہ ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد۔ حجم ۴۴۵ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ ، کاغذ، کتابت، طباعت اکیڈمی کی اور کتابوں کی طرح نہایت عمدہ۔ قیمت ۶ (چھ روپے)

واحد ایجنٹ :- کتابستان ۔ ۱۷ (الف) سٹی روڈ ۔ الہ آباد ۔

خدا کا شکر ہے کہ مدتوں کے بعد اردو میں ایک اعلیٰ درجے کی کتاب نظر آئی ۔ اصول تعلیم ان کتابوں میں سے ہے جنہیں دیکھ کر امید ہوتی ہے کہ اردو ہندوستان کی اور سب زبانوں پر بڑھ جائے گی اور ایک دن یورپ کی ترقی یافتہ زبانوں کا مقابلہ کرے گی

تعلیم کے متعلق اردو میں ابھی تک چند ترجموں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ تہذیب الاخلاق کے مضامین یا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے خطبہ ہائے صدارت میں جن کا ذکر اصول تعلیم کے فاضل مصنف نے اپنے دیباچے میں کیا ہے ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے عملی مسائل کے متعلق مفید معلومات موجود ہے ۔ لیکن نظری اور علمی بحث کا کہیں نام بھی نہیں ہے ۔ یہی کتاب ہے جس سے ہماری زبان میں علم تعلیم یا فلسفۂ تعلیم کی بنیاد پڑتی ہے اور اگر بنیاد سے عمارت کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے تو ہم بے تامل کہیں گے کہ انشاءاللہ ہمارا آیندہ نظریۂ تعلیم نہایت معقول اور مستحکم ہوگا ۔

فاضل مصنف نے کتاب کے تین حصے کئے ہیں ۔ پہلے حصے کا عنوان تعلیم و تمدن ہے ۔ اور اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تعلیم تمدنی زندگی میں کیا اہمیت رکھتی ہے اور اسے قوم کی 'معاشرت' معیشت اور سیاست سے کیا تعلق ہے ۔ دوسرے حصے میں جس کا عنوان 'درسی تعلیم' ہے ۔ ذہنی تعلیم کی ماہیت اور حقیقت اس کے وسائل یعنی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کی بحث ہے اور اسی کے ساتھ جسمانی تربیت کے مسئلے پر گہری نظر ڈالی گئی ہے ۔ تیسرے حصے میں جس کا عنوان ۔ اخلاقی اور معاشری تربیت ہے ۔ اخلاق کا مفہوم معین کرکے ذہنی اور اخلاقی تربیت کا تعلق اور ضبط و تادیب کا جدید نظریہ بیان کیا گیا ہے اور معلم کی شخصیت کو اخلاقی تربیت کا ایک اہم عنصر قرار دے کر طلبہ کی اخلاقی سیرت کی تعمیر کے اصول قائم کئے گئے ہیں ۔ مصنف کی فاضلانہ بحث کا لب لباب یہ ہے کہ تعلیم کوئی

[illegible] ہیں تمدنی اور معاشرتی زندگی میں پیوست ہیں جس سے جدا ہو کر اس کا پنپنا محال ہے ۔ اس لئے تعلیم کا حقیقی ذریعہ زندگی کو سمجھنا چاہیئے ۔ اور مدرسے کو بھی زندگی کا ایک چھوٹا سا نمونہ بنانا چاہیئے ۔ تعلیم محض ماحول کے اثرات انفعالی طور پر قبول کرنے کا نام نہیں بلکہ اس ماحول پر اثر بھی ڈالا جاتا ہے یعنی ہر قسم کی تعلیم خواہ وہ اخلاقی ہو یا ذہنی عمل سے گہرا تعلق رکھتی ہے اس لئے اس کی بنا عمل پر ہونی چاہیئے ۔ موجودہ زمانے میں دنیا کا تمدن جمہوریت کا رنگ اختیار کر چکا ہے اور ہندوستان پر بھی یہ رنگ چڑھتا جاتا ہے ۔ اس لئے تعلیم ابتدا سے جمہوریت کے سانچے میں ڈھالنا ضروری ہے تاکہ آیندہ نسل جمہوری معاشرت کے لئے طیار ہو جائے ۔

کتاب کے مضامین مصنف کی مہارت فن ، وسعت مطالعہ ، دقت نظر اور جدت فکر کی شہادت دیتے ہیں ۔ اور اس کی صاف ، سلیس ، شگفتہ عبارت ان کے ذوق ادب اور سلیقۂ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے ۔ ہم مصنف کو اور ہندوستانی اکیڈمی کو اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہیں ۔

قطعۂ استقبالیہ!

(مسلم یونیورسٹی کے اس جلسہ میں پڑھا گیا جو سیّد سجاد حیدر صاحب کی صدارت میں منعقد ہوا تھا)

ادیبِ نکتہ شناس و خطیبِ خوش تقریر
زباں میں اُن کی حلاوت بیاں میں لذت ہے

فصیح و شُستہ و برجستہ ہی سخن اُن کا
نیا خیال ہے، طرزِ ادا میں جدّت ہے

وہ جذبِ قلب کی لفظوں میں کھینچ دیں تصویر
کچھ ایسی خامۂ رنگیں پہ اُن کو قدرت ہے

وہ کون؟ خالدہ خانم، کہ جن کا ہر ہر لفظ
ادب کی جان ہی، سرمایۂ فصاحت ہے

جھلک رہی ہے مئے خوشگوار شیشہ میں
یہ حُسن و دل کشی و ندرتِ عبارت ہے

نہیں نگینے یہ الفاظ آبگینے ہیں،
حباب میں بھی نہیں اِن میں جو نزاکت ہے

وہ خالدہ جو ہیں ترکی کی زندہ اِک تاریخ
کچھ اپنی قوم سے اِس طرح اُن کو نسبت ہے

بلند فکر، مُدبّر، وزیرِ با تدبیر
حیات جن کی اِک عالَم کو درسِ حکمت ہے

وطن پرست و رضا کار و پیکرِ اخلاص
کہ جن کے صدق و وفا کی جہاں میں شہرت ہے

اگرچہ اُن کو تعلق ہے صنفِ نازک سے
کئے ہیں کام وہ مَردوں کو جن پہ حیرت ہے

وہ قوم ترک مجسّم ثبات و استقلال
ہے جن کے سینوں میں جرأت دلوں میں غیرت ہے

جو سر کو بیچ کے لیتی ہے مول آزادی
عزیز ایسی کچھ اِس کو متاعِ حرمت ہے

یہ ایسی قوم کا ہے اِک عزیز سرمایہ
یہ ایسی کان کا اِک لعلِ بیش قیمت ہے

زبانِ حضرتِ سجّاد سے سُنیں احباب
ادب میں قوم میں اپنی جو اُن کی عزت ہے

میں بے ہُنر ہوں کہوں کیا زراہِ استقبال
زباں میں زور نہ میرے قلم میں طاقت ہے

زبانِ حضرتِ غالب سے ہاں مگر یہ کہوں
”وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں!!“

نذرِ خالدہ

(یہ نظم خالدہ خانم صاحبہ کے استقبال کی تقریب میں مسلم یونیورسٹی میں پڑھی گئی تھی)

دل مسرت کی فراوانی سے دیوانہ ہے آج　　نورِ عشرت سے منور یہ سیہ خانہ ہے آج
کیفِ صہبائے طرب میں غرق میخانہ ہے آج　　ہر شجر ساقی ہے اور ہر پھول پیمانہ ہے آج

غنچہ و گل تھے یہی لیکن یہ رعنائی نہ تھی
اس گلستاں میں بہار اس دھوم سے آئی نہ تھی

نرگسِ مخمور ہے لذت کشِ خوابِ نشاط　　پھوٹ نکلا ہے گل و نسریں سے سیلابِ نشاط
اہلِ محفل کے لیے مشکل ہے اب تابِ نشاط　　آج پیمانوں سے چھلکے گی مئے نابِ نشاط

پرفشاں ہے جذبۂ پنہاں ابھرنے کے لئے
مضطرب ہے ذرہ ذرہ رقص کرنے کے لئے

پھر ادھر آئے نہ آئے یہ شمیمِ جاں فزا　　پھر میسر ہو نہ ہو ایسا سماں ایسی ہوا
چھیڑ اس انداز سے اے مضطربِ رنگیں نوا　　ٹوٹ جائے آج اک اک تار تیرے ساز کا

ذکر جس بت کا مہ و پرویں کے کاشانے میں ہے
اللہ اللہ آج وہ اپنے صنم خانے میں ہے

خالدہ! تو ہے بہشتِ ترکمانی کی بہار　　تیری پیشانی پہ نورِ حریت آئینہ کار
تیرے رخ سے پرتوِ حسنِ صداقت آشکار　　تیرے جلووں کی لطافت سے فرشتے شرمسار

گل پشیماں، قلبِ بلبل رشک سے دو نیم ہے
تیری باتوں میں خمارِ کوثر و تسنیم ہے

اے مقدس حور اے پروردۂ موجِ نسیم　　روحِ عشرت گاہ ساحل جانِ طوفانِ عظیم
تو نے ترکوں کو دکھائی ہے صراطِ مستقیم　　پھونک ڈالے ہیں تعصب کے حجاباتِ قدیم

ضعف دکھلایا کبھی گر فطرتِ احرار نے

آگ برسادی ہے تیرے نطقِ گوہر بار نے

رہ چکی ہے ہاتھ میں تیرے وہ تیغِ بے نیام　　جس کی جنبش نے بدل ڈالا حکومت کا نظام
ترک افتادہ کو تو نے ہی دیا اذنِ خرام　　تیرے ہی ہاتھوں نے چھلکائے ہیں آزادی کے جام
تو نے جو احساں کیے ہیں ملتِ احرار پر
نقش ہیں اب تک سمرنا کے در و دیوار پر

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روحِ اربابِ نیاز　　کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز
دل پہ کیوں کر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز　　چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ نعمت ہمارے دسترس سے دور ہے

محرمِ درد و مسرت راز دارِ صبح و شام　　خامشی محفلِ فطرت ہے تجھ سے ہم کلام
تیری ہستی آسمانِ ترک کا ماہِ تمام　　تو محبت ہر نفس تیرا محبت کا پیام
گلشنِ مشرق میں مانندِ صبا آئی ہے تو
صبحِ روشن کا پیامِ جانفزا لائی ہے تو

قربتِ گل کس قدر جاں بخش ہے خاروں سے پوچھ　　چاند کی تنویر میں کیا لطف ہے تاروں سے پوچھ
نشۂ صہبا میں کیا لذت ہے مے خواروں سے پوچھ　　چارہ سازی میں مزا کیا ہے یہ بیماروں سے پوچھ
روح و دل کو جگمگا دے جلوہ آرائی تری
کم سے کم اتنا تو کر جائے مسیحائی تری

کوئی دم میں اس گلستاں سے نکلنا ہے ہمیں　　فرشِ گل سے دور انگاروں پہ چلنا ہے ہمیں
خارِ راہِ عزم کو پیروں سے کچلنا ہے ہمیں　　جادۂ منزل پہ گرنا ہے سنبھلنا ہے ہمیں
درس ایسا دے کہ دل بیگانۂ منزل نہ ہو
فکر لاطائل نہ ہو اندیشۂ باطل نہ ہو

غزل

جو نظر ہے مدعا پرداز ہے — پھر بھی اپنا راز اپنا راز ہے
لطف میں اب جور کا انداز ہے — مژدہ اے دل ابتدائے ناز ہے
کچھ تو کہئے لن ترانی ہی سہی — ذرہ ذرہ گوش بر آواز ہے
کاروانِ دل بھی پیچھے رہ گیا — زندگی کتنی سبک پرواز ہے
اللہ اللہ شورشِ ضبطِ سکوت — ہم زبانِ حالِ دل کا راز ہے
پرتوِ حسن تبسم دیکھنا! — گلستاں دنیائے سوز و ساز ہے
درد کا انجام دیکھا چاہئے — ابتدا تو حشر کا آغاز ہے
کون اٹھا چاہتا ہے بزم سے — رنگِ محفل مائلِ پرواز ہے
ذرہ ذرہ آئنہ ہے حسن کا — پھر بھی رازِ حسن اب تک راز ہے
گفتگو تک راز تھا ایمائے دل — اب خموشی مدعا پرواز ہے

کوکب اپنا رہنما ہے نورِ عشق
ہر شعاعِ دل پرِ پرواز ہے

شذرات

پچھلے پرچے میں ہم تصدق احمد خاں صاحب شروانی مرحوم کی اندوہناک خبر شائع کر چکے ہیں مرحوم کا ماتم سارے ملک میں ہوا۔ اور اب تک ہو رہا ہے۔ جامعہ ملیہ میں اس سانحے کے دوسرے دن تعزیت کا جلسہ منعقد ہوا جس میں چھوٹے بڑے طلبا اور اساتذہ جمع ہوئے۔ کلام مجید کی تلاوت اور فاتحہ خوانی کے بعد شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب نے ایک موثر اور مختصر تقریر کی جس میں خاص طور پر چھوٹے بچوں سے خطاب تھا۔ مرحوم کی زندگی کے مختصر حالات بیان کر کے جناب شیخ الجامعہ نے ان کے خلوص اور جوش، سادگی اور ایثار، حق گوئی اور حق پسندی، بے خوفی اور بہادری کے اوصاف کو نمونے کے طور پر پیش کر کے خدا سے دعا کی کہ جامعہ کے ہر فرد کو ان کی تقلید کی توفیق دے۔ اس کے بعد چھٹی کا اعلان فرمایا۔ اور طلبہ کو ہدایت کی کہ اپنی اقامت گاہوں میں جا کر قران مجید کی تلاوت کریں اور مرحوم کے لئے مغفرت کی دعا مانگیں۔

جامعہ کی عمارت کے لئے چندے کا کام شروع ہو گیا ہے تجویز یہ ہے کہ جناب شیخ الجامعہ اور شفیق الرحمن صاحب قدوائی ناظم حلقہ ہمدردان جامعہ ۲۲ اپریل سے صوبہ متحدہ کا دورہ شروع کریں۔ سب سے پہلے میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور، بجنور، مراد آباد، بریلی، شاہجہاں پور کا ارادہ ہے۔ اس کے بعد مشرقی اضلاع کی باری آئے گی، ہر ضلعے کے سر برآوردہ اصحاب سے خط و کتابت ہو رہی ہے۔ جامعہ کی طرف سے یہ شرط ہے کہ جس ضلعے میں جامعہ کا وفد جائے وہاں سے کم سے کم ایک ہزار یکمشت اور پچیس روپے ماہوار کی مدد ملے۔ اکثر مقامات سے وعدہ کیا گیا ہے کہ اس سے بہت زیادہ چندہ ہو جائے گا خدا کرے یہ امیدیں بر آئیں اور یہ وعدے پورے ہوں۔

خدا کا شکر ہے کہ دہلی شہر جو جامعہ کا گھر ہے اپنی شان کے مطابق جامعہ کی مدد کر رہا ہے۔ یکم مارچ کے جلسے میں دہلی کی طرف سے پچاس ہزار کی مالیت کی جائداد اور اٹھارہ ہزار نقد کے وعدے ہوئے تھے وعدوں کی رقم وصول ہو رہی ہے اور اس کے علاوہ کم سے کم بارہ ہزار روپے کی مزید امداد کا اہل دہلی نے ذمہ لیا ہے۔ جناب حاجی محمد ابراہیم صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں شہر کے تمام معزز تاجر اور محبان ملت شامل ہیں۔ یہ حضرات چندے کی وصولی کا انتظام خود کر رہے ہیں اور انھوں نے جامعہ کے لوگوں سے کہہ دیا ہے کہ آپ باہر کام کیجئے گھر کا کام ہم پر چھوڑ دیجئے۔ جزاہم اللہ تعالےٰ۔ اگر ان باہمت اصحاب کی کوشش کامیاب ہوئی اور ان شاء اللہ ضرور کامیاب ہوگی تو دہلی کا مجموعی چندہ (پچاس ہزار کی جائداد کو ملا کر) اسی ہزار سے زیادہ ہو جائے گا۔ امید ہے کہ ہندوستان کے دارالسلطنت اور سب سے بڑے اسلامی مرکز کی یہ شاندار مثال اور مقامات کے لوگوں میں بھی فیاضی، علم دوستی اور ملت اسلامی کی محبت اور خدمت کے جذبات کو بیدار کر دے گی، اور جامعہ کا وفد ہر شہر اور ہر قصبے میں کامیاب ہوگا۔

ہم نے جنوری کے پرچے میں رسالہ جامعہ کے قارئین کرام سے اپیل کیا تھا کہ عمارت کے فنڈ میں اپنے حلقے کی طرف سے کم سے کم ایک ہزار روپے کی امداد عطا فرمائیں۔ آج ہم پھر اس کی یاد دہانی کرتے ہیں جامعہ کا ہر شعبہ اس سعی میں سرگرم ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس مبارک کام میں حصہ لے۔ رسالہ جامعہ نے آج تک کبھی چندے کا کوئی فنڈ نہیں کھولا، اور یہ چیز اس کے مقاصد میں داخل نہیں ہے۔ لیکن موقع ایسا ہے کہ ہم اس قسم کا اپیل کرنے پر مجبور ہو گئے۔ قارئین جامعہ سے التجا ہے کہ جب رسالے کا چندہ بھیجیں تو اس کے ساتھ عمارت کے فنڈ کے لئے بھی تھوڑی بہت رقم روانہ فرمائیں یا جب ان کے شہر میں جامعہ کا وفد پہنچے۔ تو رسالۂ جامعہ کے اپیل کا حوالہ دے کر حسب توفیق چندہ عطا فرمائیں۔

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم

کی

شرافت سے ناجائز فائدہ

حکیم صاحب مرحوم نہیں چاہتے تھے کہ دوا فروشی سے اپنی جیب پُر کریں۔ اُن کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ طب یونانی غیر ذمہ دار ہاتھوں سے تباہ ہو۔ اس احساس سے متاثر ہوکر ۱۹۰۳ء میں ہندوستانی دواخانہ جاری کیا اور اس کا کُل منافع آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کے لئے وقف کیا۔ اُن کے انتقال کے بعد بعض پست خیال لوگ ایسے اشتہار دے رہے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ ان دواخانوں سے حکیم صاحب کو کوئی نسبت تھی۔ ہم صاف بتا دینا چاہتے ہیں کہ بڑا دواخانہ، ہمدرد دواخانہ، ہندوستانی ہمدرد دواخانہ، دفتر حکیم اجمل خاں مرحوم، کارخانہ دواخانہ حکیم اجمل خاں فریدآباد، گڑگانوہ وغیرہ دواخانوں کا ہندوستانی دواخانہ یا اس کے سرپرستوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہندوستانی دواخانہ کی کوئی برانچ دہلی یا دہلی کے باہر نہیں۔

سَو روپیہ انعام

اُس شخص کو دیا جائے گا جو ایسے شخص یا اشخاص کو گرفتار کرائے جو دوا فروشی حکیم اجمل خاں مرحوم کے نام سے کر رہا ہو

ہندوستانی دواخانہ کی چند مخصوص دوائیں

مصفی	شربت صدر	اکسیر نسواں	روغن موم
خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے۔ کھجلی، داد، پھوڑے پھنسی حتیٰ کہ جذام اور آتشک تک اس کے استعمال سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ **ترکیب استعمال**۔ ایک ایک خوراک صبح، دوپہر، شام تھوڑے پانی میں ملاکر پئیں۔ قیمت فی شیشی ۲۴ خوراک ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/ ۱)	حلق اور سینے کے امراض کی مکمل دوا ہے۔ نزلہ، زکام، ذات الریہ، نمونیہ، کھانسی اور نفث الدم اور سل و دق جیسی خطرناک بیماریاں اس کے استعمال سے دور ہو جاتی ہیں۔ ہزاروں مریض اس کے استعمال سے اچھے ہو چکے ہیں۔ **ترکیب استعمال**۔ ایک ایک خوراک شربت صبح، شام دس دس تولہ گائے کے دودھ اور عرق گاؤزبان میں ملاکر پئیں۔ قیمت فی شیشی ۸ خوراک (۱۲/ ۲)	اکسیر نسواں سیلان الرحم (لیکوریا) کی بے نظیر دوا ہے۔ علاوہ ازیں ضعف رحم، ورم رحم، حیض کی تمام خرابیاں مثلاً حیض کے بے قاعدہ آنے اور تکلیف سے آنے وغیرہ کے لئے نہایت مفید اور کامیاب ثابت ہو چکی ہے۔ **ترکیب استعمال**۔ تین تین ماشہ دوا صبح و شام پاؤ سیر دودھ میں ملاکر پئیں۔ قیمت فی شیشی ۱۰ تولہ (ایک روپیہ عہ/ ۱)	ہر قسم کے دردوں خصوصاً گٹھیا، درد کمر، عرق النسا وغیرہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ چوٹ کے پرانے درد کو بھی دور کرتا ہے۔ **ترکیب استعمال**۔ درد کی جگہ نیم گرم مالش کرکے اوپر سے روئی باندھ دیں۔ قیمت ۸ تولہ کی شیشی دو روپیہ (عہ)

ہندوستانی دواخانہ دہلی پوسٹ بکس نمبر (۲۲)

رجسٹرڈ نمبر

جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم اے پی ایچ ڈی

قیمت سالانہ صہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

جلد ۲۴ | اپریل ۱۹۳۵ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن)، پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہندوستان کا تعلیمی نصب العین

(فلسفہ تاریخ و تمدن کی روشنی میں)

قبل اس کے کہ ہم ہندوستان کا تعلیمی نصب العین اس کے تمدن کی تاریخی روشنی میں متعین کرنے کی کوشش کریں ہمیں تعلیم کے متعلق مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کر دینا چاہیئے۔

تعلیم انسان کی فطری قوتوں اور خارجی اثرات کے تعامل سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ نتیجہ ہے داخلی اور خارجی دنیا، من تو انسان اور کائنات کے باہمی تاثرات کا۔ انسان کی فطری قوتیں دو قسم کی ہیں۔

۱۔ حیاتی مثلاً ناک، کان، آنکھ، ہاتھ، پیر وغیرہ۔ غرض انسان کا پورا جسم۔

۲۔ نفسی۔ جس میں انسان کی تمام ذہنی اور عقلی، معاشی اور سیاسی، جمالی اور اجتماعی، اخلاقی اور مذہبی قوتیں اور اس کے جذبات اور احساسات وغیرہ شامل ہیں۔

حیاتی اور نفسی قوے تعلیمی عمل کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر یہ نہ موجود ہوں تو تعلیمی عمل وجود ہی میں نہیں آسکتا۔ اس بنا پر علم النفس سے واقفیت تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسان کی بنیادی قوتیں ان کی ترقی و تنزل کے اسباب۔ ان کے باہمی تاثرات کے قوانین۔ ان کی نفسی نشو و نما کی مختلف اہمیت وغیرہ کا صحیح علم حاصل کر سکیں۔ روسو اور پستالوزی کا پیدا کردہ خیال اب ایک حقیقت مسلمہ ہے۔ جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

جہاں انسان ان قوے کے ذریعے خارجی دنیا کے اثرات قبول کرتا ہے۔ یعنی اُن کو اپنے نفسی قوی کے مطابق ڈھالتا ہے۔ وہاں خارجی قوتیں بھی اس پر اپنا اثر ڈالتی ہیں۔

ان خارجی قوتوں پر ہم تین مختلف عنوانوں کے تحت میں غور کریں گے۔ یعنی

۱۔ تمام کائنات بحیثیت مجموعی۔

۲۔ انسانی تمدن
۳۔ اور ان دونوں کے تحت میں مرتب کردہ ایک مخصوص نظام تعلیم

۱۔ کائنات بحیثیت مجموعی انسانیت کی تعلیم و تربیت میں مصروف عمل رہتی ہے۔ کائنات کا ہر فعل انسانی نفس پر اثر پذیر ہوتا ہے جس سے انسان اپنے آپ کو مطلق آزاد نہیں کر سکتا۔ ستاروں کی گردش، چاند کی چمک آفتاب کا طلوع و غروب۔ زمین کی حرارت و برودت، موسموں کی تبدیلی، فصلوں کی نشو و نما، غرض فطرت کی ہر نیرنگی اور ہر تغیر انسان کے جسم اور نفس پر اثر ڈالتا ہے۔

انسانی نفس اُن تاثرات کو ساکت و جامد قبول نہیں کر لیا کرتا بلکہ انہیں اپنے تخلیقی عمل کے تحت میں لاتا ہے۔ اسی لئے مختلف نفوس پر نوامیس فطرت کے مختلف اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ عقلیت پسند طبیعتیں فطرت میں عقل کی کار فرمائی دیکھتی ہیں۔ اور وہ علت و معلول کا میکانکی سلسلہ ختم کرنا چاہتی ہیں۔ ثبوتیت صرف تجربے پر اکتفا کرتی ہے اور کسی نفس سے جو خود ہی آزادانہ عمل کر سکے انکار کرتی ہے۔ بخلاف اس کے عینیت تمام فطرت میں صرف مدرک کا جلوہ دیکھتی ہے اور مدرک یعنی خارجی دنیا کو ایک حقیر اور فانی چیز سمجھتی ہے۔

تصور کائنات صرف افراد ہی کا نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی اقوام کا بھی ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر قوم کے تمام تمدن کی بنیاد ہوتی ہے۔ یہ چیز کسی قوم کے مختلف تمدن کے عناصر میں ایک وحدت اور یگانگت پیدا کرتی ہے۔ وہ تمام قوم کی ذہنی زندگی میں ایک سر رشتہ کا کام دیتی ہے۔ یہ چیز اگر کسی قوم سے جدا کر دی جائے تو وہ اس قافلے کی طرح ہو جاتی ہے جس کا کوئی منزل مقصود نہ ہو اور جو صحرا میں آوارہ پھر رہا ہو اور بالآخر اپنی بے راہ روی کے باعث صحرا کے ہلاکت آفریں جھونکوں سے تباہ و برباد ہو جائے۔

موجودہ جرمن قوم کے تمام ایوان تمدن کی بنیادیں جرمن عینیت پر استوار ہیں۔ ان کے شعرا ان کے فلاسفہ، ان کے داعیان مذہب باوجود گوناگوں اختلافات کے اس مرکزی چیز پر متفق ہیں۔ اسی طرح اہل یونان و روما، اہل چین و جاپان، اہل عرب و ہند کا ایک مخصوص تصور کائنات رہا ہے۔ جب تک اس تصور میں اتحاد رہا وہ اقوام اپنا ایک مستقل وجود قائم رکھ سکیں۔ لیکن جوں ہی کہ یہ سلسلہ ہاتھ سے چھوٹ گیا

وہ انتشار وذلت کے گڑھوں میں جا گریں۔

فطرت کی نیرنگیاں چونکہ مختلف افراد اور اقوام پر مختلف اثرات مترتب کرتی ہیں اس لئے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں یہ تصور کائنات بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۔ دوسری خارجی قوت جو انسان پر اپنا اثر ڈالتی ہے اور اس کی تعلیم وتربیت میں حصہ لیتی ہے وہ انسانی تمدن ہے۔ اس قوت سے انسان مقابلۃً کسی قدر آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کلیتاً نہیں۔ تمدن انسان کے مختلف نفسی قویٰ کے خارجی دنیا میں اظہار کے باعث پیدا ہوتا ہے اور پھر یہ خود انسانی نفس پر اثر ڈالتا ہے اور اس کی تشکیل میں ممد یا مزاحم ہوتا ہے۔ انسان کے تمام سیاسی، اجتماعی، معاشی، اخلاقی اور مذہبی نظامات اسی لئے پیدا ہوئے ہیں کہ یہ قوتیں انسان میں موجود رہیں۔ انھیں داخلی قوتوں نے ان نظاموں میں خارجی صورت اختیار کر لی ہے جیسے بت۔ نازک ولطیف اشعار، رنگ برنگ کی تصاویر۔ عالی شان عمارتیں، روح پرور موسیقی کہاں ہوتی اگر انسان کا جمالی احساس مختلف طریقوں سے خارجی جلوہ اختیار نہ کر لیتا۔

یہ تمدن کا ورثہ انسان کی تعلیم میں مواد کا کام دیتا ہے۔ جس کے ذریعے انسانی قوتوں کی نشو ونما ہوتی ہے۔ جس طرح تصور کائنات مختلف ہوتے ہیں اسی طرح قوموں کے تمدن بھی۔ بعض اقوام پر جمالیاتی رنگ غالب ہوتا ہے۔ تو بعض پر اخلاقی۔ بعض پر معاشی اور سیاسی تو بعض پر مذہبی۔ اسی لئے دنیا میں تمدنوں کا یہ تنوع ہے۔ یونانی اور اہل ایران ایک جمالیاتی تمدن کے حامل تھے تو انگلستان اور اہل روم ایک سیاسی تمدن کے چینی ایک اخلاقی تمدن کے علمبردار ہیں تو اہل ہند کا مجموعاً ایک مذہبی تمدن ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ دوسرے عناصر مطلقاً کسی تمدن میں موجود نہیں ہوتے بلکہ اس کا صرف اس قدر مفہوم ہے کہ ایک عنصر دوسرے عناصر پر چھایا ہوا رہتا ہے۔ ہم ہندوستانی اپنی ہر معاشی، سیاسی اور اجتماعی چیز کو مذہب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے اہل یونان اپنی ہر چیز کو حتیٰ کہ مذہب کو بھی ایک جمالی نقطۂ نظر سے۔ ہمارا اٹھنا بیٹھنا بھی ایک مذہبی فعل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اہل یونان کا خدا کا تخیل بھی ایک متناسب ہم آہنگ اور حسین وجود کا تھا۔

غرض مختلف قومی خصائص کی بنا پر مختلف تمدن ہوتے ہیں اور انھیں کے سانچے میں اس قوم کی تعلیم وتربیت ہونی چاہیے۔ اگر اس کے خلاف کیا جائے تو اس کی مثال یہ ہوگی کہ ہم آم کا درخت سائبیریا کے

ہیجانی چٹانوں میں لگانا چاہیں جس کے لئے وہ محض نا۔ساز گار رہیں۔

لیکن کسی قوم کا موجودہ تمدن صرف تاریخِ ماضی کا ورثہ ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ حال کی تمام تحریکوں اور مستقبل کی تمام امیدوں سے متاثر ہوتا ہے

۳۔ کسی قوم کے تصورِ کائنات اور تمدن کی بنیادوں پر اس کا تعلیمی نصب العین تعمیر کیا جاتا ہے۔ یہ نصب العین اب اپنے لئے ایک محدود دائرہ عمل اختیار کر لیتا ہے۔ جہاں وہ اپنی تشکیل چاہتا ہے۔ یہ تعلیمی نصب العین اب بلا واسطہ تعلیمی اداروں کے ذریعے جو نظامِ تعلیم کا اہم جزو ہیں کسی قوم کی موجودہ بچوں کی جسمانی اور نفسی تربیت اس کے تمدن کے سلسلے میں کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ بعد میں تمدنی زندگی میں حصہ لے سکیں۔ اس کو ترقی کے منازل پر پہنچا سکیں اور اپنے لئے ایک تصورِ کائنات بنا سکیں۔

یہ ہے ہمارے نزدیک تعلیم کا مقصد جو ساکت و جامد طور پر تاثرات کا قبول کر لینا، معلومات کا فراہم کر لینا نہیں ہے بلکہ ایک تخلیقی فعل ہے۔ اور جو اپنی تخلیق کے لئے خارجی اشیا میں مواد تلاش کرتا ہے۔

اسی اصولی بحث سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ ہم ہندوستان کے بچوں کی تعلیم ان کے اپنے تصورِ کائنات اور قومی تمدن کی بنا پر کرنا چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان تمام مفید تحریکات سے بے نیاز نہیں ہونا چاہتے جو ان کے تعلیم و تمدن پر اثر انداز ہوتی ہیں قبل اس کے کہ ہم اس تعلیمی نصب العین کا صاف صاف تعین کریں ہم کو تلاش کرنا چاہیے کہ وہ کون سے تصورِ کائنات ہیں جن پر ہمارے ہندوستانی تمدن کی بنیاد استادہ ہے۔ ہمارے تمدن کے کیا عناصر ہیں؟ ان کے اوپر کون سا رنگ غالب ہے اس تمدن کے کون سے عناصر بحیثیت مجموعی انسانیت کے ارتقا میں مضر اور مفید ہیں۔

ہندوستان میں چند زبردست قوتیں کارفرما ہیں۔ جو ہندوستان کے تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں اس کا تعلیمی نصب العین متعین کریں گی۔ ان قوتوں کا تاریخی روشنی میں ہم مطالعہ کریں گے۔ ان کے مخصوص خصائص کا ہم ذکر کریں گے۔ ان کے متضاد عناصر کو دیکھیں گے اور ہم اپنے عصر کے لئے ایک تمدن اور تعلیمی نصب العین متعین کرنے کی کوشش کریں گے۔

ہماری یہ کوشش اس عقیدے پر مبنی ہے کہ جس طرح ہر قوم کا ایک علیحدہ تمدنی نصب العین ہوتا ہے

اسی طرح ہر عصر کا بھی ایک علیحدہ تمدنی اور تعلیمی نصب العین ہوتا ہے ۔ یہ نصب العین نتیجہ ہوتا ہے ماضی کی روایات حال کی ضروریات اور مستقبل کی امیدوں کا ۔

ہندوستان کی ابتدائی تاریخ میں جو آریاؤں کا تعلیمی نصب العین تھا وہ اب ہمارے لئے کافی نہیں ہے چونکہ وہ نتیجہ تھا خاص ضروریات اور مخصوص تخیلات کا ۔ عہد عباسیہ کا تعلیمی نصب العین بھی جو درس نظامی کی شکل میں اب تک ہمارے یہاں موجود ہے ہمارے لئے مفید نہیں ہے ۔ اس وقت ایک خاص طرز کی اسلامی حکومت قائم تھی اور اسلامی علوم اور یونانی علوم وفنون کا امتزاج ہو رہا تھا ۔ یونانی علوم وفنون بہت کچھ غلط ثابت ہو چلے ہیں اور ہم انہیں فرسودہ بنیادوں پر اپنے نظام تعلیم کی بنیاد نہیں رکھ سکتے ۔

یورپ کے اٹھارویں صدی عیسوی میں عقلیت چھائی ہوئی تھی ۔ نہ صرف فلسفہ بلکہ ہر مسئلہ کا حل عقل کے ذریعے ڈھونڈا جاتا تھا ۔ اور یقین کیا جاتا تھا کہ عقل تمام عقدہ ہائے کائنات کو سلجھا سکتی ہے ۔ مذہب عقلی استدلال کا نتیجہ تھا ۔ اس بناء پر وہاں کا تمدنی اور اس کے ساتھ تعلیمی نصب العین عقلیت پر رکھا گیا اور صرف عقل کی نشوونما تعلیمی اداروں کا مقصد قرار پایا ۔ انیسویں صدی عیسوی میں اس دور کی بجائے ایک نامی دور ظہور پذیر ہوا اب صرف عقل کی نشوونما پر بھی زور دیا جانے لگا مختلف صورتوں میں یہ خیال اب تک قائم ہے اس لئے وہی تعلیمی نصب العین گو کہ اس میں بہت کچھ تغیر اور گہرائی پیدا ہوگئی چلا جا رہا ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر دور میں خاص تحریکیں زور پکڑ جاتی ہیں اور انسانی نفس کے خاص عناصر کا غلبہ ہوتا ہے مثلاً کبھی شعوری عناصر کا تو کبھی غیر شعوری کا یعنی کبھی عقل کا تو کبھی مذہب کا ۔ کبھی اجتماعیت کا ۔ تو کبھی انفرادیت کا ۔ بقول ہیگل ہر اثبات ایک نفی پیدا کرتا ہے ۔ جو خود بخود امتزاج ڈھونڈھتی ہے ۔ ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے ۔ بہر صورت فلسفۂ تاریخ اب تک اس گتھی کو کماحقہٗ سلجھانے سے عاجز ہے ۔ انہیں تحریکات کے باعث جہاں تمدنی نصب العین تبدیل ہوتا ہے وہاں تعلیمی بھی ۔

جس طرح دنیا ہر لحظہ تغیر پذیر ہے نظامات تعلیم بھی ۔ اگر کوئی چیز نامی اور زندہ ہے تو یہ ضرور ہوگا ۔ ہمیں سکون اور استقلال کی اس طرح تلاش نہ کرنی چاہئے ۔ تاہم ایک عرصے کے لئے عام بنیادی خیالات زندگی کے لئے کافی ہوتے ہیں اور انہیں کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہئے ۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ تعلیم کا مقصد انسانی جسم و نفس کا کلی نشو و نما ہے۔ ہر وہ تحریک یا اس تحریک کے عناصر جو اس نشو و نما میں مدد پہنچائیں تعلیم کے لئے مفید ہیں اور باقی مضر۔ ہر زمانے کی تحریکات سے ہم کو تعلیم کے لئے تعمیری اجزا کو لے لینا چاہیئے اور تخریبی کو علیحدہ کر دینا چاہیئے۔

جس طرح ہر اعلیٰ نظام تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص تصور کائنات اور ایک مخصوص تمدن کا تخیل پیش نظر رکھے اس طرح ہر بڑی تحریک کا جو زندگی کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے، ایک مخصوص نظام تعلیم بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے تصور کے مطابق انسانیت کی اسی طرح تعلیم و تربیت کرنا چاہتی ہے۔ ہمیں ہندوستان کی موجودہ عظیم الشان تحریکوں سے ان کے تعلیمی عناصر اور اس کی تعلیمی تحریکوں میں سے اس کے تصور کائنات پیدا کر کے دکھانا ہے تاکہ ہم ایک مشترک ہندوستان کے تعلیمی نصب العین مرتب کر سکیں۔

ہندوستان میں اس وقت چار زبردست تحریکیں جاری ہیں یا بالفاظ دیگر چار اہم قوتیں ہیں جو ہمارے لئے تعلیمی عنصر کا کام دے سکتی ہیں۔ یعنی

۱. ہندویت

۲. اسلام

۳. قومیت اور

۴. انسانیت

ہمیں ان چاروں تحریکوں میں تلاش کرنا ہے کہ ان کے کون سے عناصر شخصیت کے ارتقا میں مفید ہیں اور کون سے مضر

۱. ہندویت۔ ہندویت ہندوستان میں سب سے زیادہ اب تک حاوی رہی ہے۔ اور اس وقت بھی ہے۔ ہمیں اس وقت اس ہندویت سے بحث نہیں ہے جو وہ گذشتہ زمانے میں رہ چکی ہے۔ بلکہ ہم اسے موجودہ ہندوستان کے ایک تمدنی عنصر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ہندویت کی توضیح کرنا بہت مشکل امر ہے۔ یہ کوئی خاص مذہب نہیں ہے کیونکہ اس میں بہت سے مذاہب شامل ہیں۔ توحید سے لے کر سینکڑوں بتوں کی پرستش اس میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اس میں ضخامت

اعلیٰ فلسفیانہ نظام ہیں وہاں اس میں نہایت لغو قسم کی رسوم بھی شامل ہیں جو فطرت کی توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ اس کی ابتدا آریاؤں نے کی تھی جو فاتحانہ طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ جنھوں نے نہ صرف اپنی حکومت قائم کی بلکہ اپنے مذہب کو بھی جو فطرت کی پرستش پر مبنی تھا یہاں رائج کر دیا۔ لیکن خود ان کا مذہب بھی مفتوحین کے عقائد سے اثر قبول کئے بغیر نہ بچ سکا۔ باوجود اس تاثر کے پھر بھی ہندو مذہب جس کو آریا مذہب کہنا زیادہ موزوں ہے ایک اشرافیت مذہب رہا جس نے اپنا سررشتہ ہمیشہ راجاؤں سے قائم رکھا اس نے اپنی یہ مذہبی اور نسلی اشرافیت اور ذات پات کی قیود برہمنوں کے علیحدہ طبقے کے قیام کی غرض سے قائم رکھیں۔

مابعد الطبیعاتی مسائل سے ہندو قوم کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ اور ان کے فلسفیانہ نظام عقل کی کوششوں کے بہترین ثمرے ہیں۔ باوجود اس فلسفیانہ شغف کے مذہب ان کی فطرت کا جز رہا۔ وہ مذہب جو عقلیات پر مبنی اور بہت کچھ مابعد الطبیعاتی غور و فکر کا نتیجہ تھا۔

ان خصائص کے جہاں اچھے نتائج مرتب ہوئے۔ وہاں بہت کچھ مضر بھی۔ مثلاً نسلی، علمی اور مذہبی تفوق کے جذبے نے عوام کو اونچے لوگوں کے طبقے سے بالکل بیگانہ کر دیا۔ اور ذات پات کی تفریق نے جو شروع میں معاشی ضروریات پر مبنی تھی منو کے قوانین کے مطابق ایک مذہبی شکل اختیار کر لی۔ بدھ مت کی تحریک ایک اعلان بغاوت تھی اشرافیت کے خلاف مگر وہ خود فنا ہو گئی اور اس کے پائدار اثرات نہ رہ سکے۔ بدھ مذہب کی اخلاقی جمہوریت کی بجائے دوبارہ شنکر اچاریہ کے فلسفے نے اپنا اثر جما لیا جو اشرافیت کی حمایت میں تھا۔

بدھ مت کے بعد دو تحریکوں کے اثرات ہندویت پر کسی قدر پائدار مترتب ہو سکے یعنی اسلام اور عیسائیت۔ اسلام سے تصادم کے باعث ہندویت کے لاشے میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ وہ قوم جو تمام دنیا کو الگ تھلگ گوشہ نشینی میں زندگی گذار رہی تھی پھر ذہنی غور و فکر کی طرف متوجہ ہوئی توحید کے دھندلے سے خیالات ہندومت میں مفقود نہ تھے۔ لیکن پہلے وہاں اس خیال نے ایک ہمہ اوست کے عقیدے کی شکل اختیار کر لی تھی ہندو دھرم یا بھگتی کی تحریک جو عقیدۂ توحید پر مبنی ہے اسلام کی مرہون منت ہے۔ اس کے بعد پھر تو بہت سی تحریکیں پیدا ہوئیں جو توحید کے عقیدے پر ہندومت اور اسلام کو ایک کرنا چاہتی تھیں مثلاً گرونانک

اور کبیر کی تعلیمات اور جدید زمانے میں رام موہن رائے کی تحریک برہمو سماج کا قیام ۔ برہمو سماج پر جس قدر اسلام کے اثرات مترتب ہوئے اسی قدر عیسائیت کے بھی ۔ آریہ سماج کی تحریک ہندو دھرم کو دوبارہ اس کی اصلی قدیم حالت میں دیکھنا چاہتی ۔ وہ اسلام کے خلاف جس کو وہ خارجی عنصر سمجھتی ہے پیدا ہوئی مگر اپنے احیا کے لئے اس نے اسلام کا نمونہ اپنے سامنے رکھا ۔ مثلاً ایک پرمیشور کا تخیل چاہے وہ حقیقی توحید سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو ۔ ایک کتاب اور ایک دھرم جو بغیر ذات پات کے ہو قائم کرنے کی کوشش ۔

نہ صرف اسلام کا ہندویت کے مذہبی تصورات پر بلکہ بحیثیت مجموعی اس کے تمام تمدن زندگی پر اثر پڑا ۔ اسلام کے بعد سب سے زیادہ اثر اس پر مغربیت کا پڑا ۔ مغربیت کے دو اہم عناصر تھے ۔ ایک عیسائیت دوم وہ تمدن جس نے وطنیت کے تخیل کے زیر سایہ نشو ونما پائی عیسائیت کا اثر اس قدر زیادہ نہیں پڑا ۔ جس قدر کہ وطنیت کا ۔ اس تخیل کے تحت میں ہندوستان میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو ہندوستان کو مغربی وطنیت کے رنگ میں رنگ دینا چاہتا تھا ۔ وہ اپنے ماضی کو فراموش کرکے صرف مستقبل کی طرف دیکھنا چاہتا ہے اور مستقبل کی کامیابی اس کے نزدیک مغرب کی تقلید میں مضمر تھی ۔ گو سطحی خیال کا اثر بہت جلدی کم ہو گیا اس کے بعد ایک ایسے خیال نے ہمہ گیر رنگ اختیار کرلیا جو وطنیت کا قائل ہے ، اس کو اپنے ماضی کی روایات پر قائم کرنا چاہتا ہے ، جو ہندو دھرم اور تہذیب کو برقرار رکھنا چاہتا ہے ۔ مگر وہ ہندویت جو وطنیت کے تخیل میں ممد ہو ۔ جس کی وطنیت کے قصر کی تعمیر میں بنیاد کا کام دیں ۔ ٹیگور اور گاندھی کے یہی بنیادی خیالات ہیں ۔ گو دونوں میں جزوی اختلافات موجود ہیں ۔ ٹیگور کی نظریں زیادہ تر مستقبل کی طرف اٹھتی ہیں بہ خلاف گاندھی کے جو بہت حد تک عہد ماضی کو زندہ کرنے کے درپے ہیں ۔ ٹیگور ہندوستان کے تمدنی نصب العین کو حال کی تحریکوں سے زیادہ متاثر کرنا چاہتا ہے ۔ مگر گاندھی کے نزدیک ہندویت اصلی مطمح نظر اور انسانیت کا تخیل ایک ہی چیز ہے ۔

اس مختصر سی تاریخی نظر سے واضح ہو گیا ہوگا کہ ہم ہندویت کو ایک مرکب گوناگوں تحریکوں کا سمجھتے ہیں ۔ جس میں کئی ہزار برس کے تاریخی اثرات بھی شامل ہیں اور جدید تحریکات بھی ۔ اس میں تعمیری عناصر بھی ہیں اور تخریبی بھی ۔

وہ تحریک جو ہندویت کو بعینہٖ آج سے ہزاروں برس پہلے کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہے اس بنا پر غلط ہے کہ وہ حال اور مستقبل کی قوتوں سے بیگانہ ہو جانا چاہتی ہے۔ وہ تحریک جو بلا کسی وطنی اور قومی امتیاز کے ایک عام سطحی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس بنا پر غلط ہے کہ وہ اپنے ماضی کو فراموش کر دینا چاہتی ہے۔ اور اس تمام تمدن کے قصر کو جو صدیوں کی کاوش کا نتیجہ ہو اور جو ہندوستان کے خاص خصائص کا مظہر ہے برباد کر دینا چاہتی ہے۔

اول الذکر تحریک کے باعث بحیثیت مجموعی انسانیت کے نشو و نما سے ہم محروم ہو جاتے ہیں دوسری تحریک کے باعث ہندو نفس کو اپنے مخصوص اور امتیازی کیفیات کے اظہار کا موقعہ نہیں ملتا جو انسانیت کے لئے اسی قدر ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک تیسری صورت جو دونوں کے امتزاج پر مبنی ہو صحیح ہو سکتی ہے یعنی ایک ایسا وطنیت کا تخیل جو ہندویت کے ان بہترین اخلاقی اور بحیثیت مجموعی ان تمام اعلیٰ تمدنی روایات پر مبنی ہو جو ہندوستان میں ایک قومیت کے قیام میں مدد ہو سکیں صرف یہی تحریکیں ہمارے موجودہ نصب العین میں ایک زبردست عنصر کا کام دے سکتی ہے۔

۲۔ اسلام :۔ دوسرا اہم عنصر ہندوستان کے تعلیمی نصب العین کے متعین کرنے میں اسلام ہے۔ وہ اسلام جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں چودہ سو برس کی تاریخ کا۔ دنیا کی ہر تحریک کی طرح اسلام بھی بہت سی تحریکوں سے متاثر ہوا اور مختلف ممالک میں مختلف تحریکوں سے امتزاج کے باعث اس نے مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔

اسلام بغاوت ہے بت پرستی اور شرک کے خلاف۔ اس نے صرف ایک خدائے واحد پر ایمان لانے کی تعلیم دی تھی اور اس کی مابعد الطبیعاتی تشریحات سے منع کر دیا تھا۔ وہ اخلاقیات کا ایک صاف اور سادہ نظام تھا اور اس کے احکامات کی بنیادیں جمہوریت پر رکھی گئی تھیں۔ یہ اس مذہب کی بنیادیں، ایمان و ایقان، عمل و جد و جہد پر رکھی گئی تھیں۔ فلسفیانہ غور و فکر اور گوشہ نشینی پر نہیں لیکن جونہی کہ اس دین کو ان اقوام نے قبول کیا جن کی سرشت میں فلسفیانہ غور و فکر تھا جن کو فطرت

نے ماوراء طبیعی مسائل پر غور کرنے کے لئے پیدا کیا تھا جن میں مذہبی عنصر کی بجائے عقلی عنصر غالب تھا اسلام میں بھی یہ عناصر شامل ہو گئے۔ ایک طرف یونانی علوم و فنون کے اثر سے عہد عباسیہ میں فلسفیانہ غور و فکر اسلام میں داخل ہو گیا۔ اب صرف خدا پر یقین کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ماہیت اور اس کی صفات کا بھی پتہ چلانا۔ ارسطو کے فلسفے سے جس کو مسلمان غلط سمجھے۔ اسلام میں عقلیت کی تحریک پیدا ہوئی اور اسلامی علم الکلام کا مقصد عقلی دلائل سے اسلامی احکامات کی حمایت کرنی تھی، اخوان الصفا کی تحریک اس سے بھی زیادہ عقلیت پر مبنی تھی۔ جن کے نزدیک تمام مذہبی احکامات کے لئے عقل معیار صداقت تھی۔

دوسری نوفلاطونی، ایرانی اور ہندی اثر سے تصوف نے بھی اسلام میں ایک مکمل نظام کی صورت اختیار کر لی۔ قرآن کی تعلیمات میں جس طرح عقلیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح تصوف کے بھی۔ جہاں شعوری طور پر عقلی قوانین کی بنا پر کائنات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں لا شعوری طور پر کائنات کو محسوس کرنے کا خیال بھی موجود ہے۔ بنیادی خیال ان سب میں مسئلہ توحید تھا۔ ایک خدائے واحد کا یقین۔ یعنی تمام کائنات کے لئے ایک واحد مقصد اور نصب العین کا خیال۔ چاہے اس کی مابعد الطبیعاتی تشریح انسانی عقل اور روشنی کے مطابق کچھ ہی کیوں نہ ہو اس کی فلسفیانہ تشریح ہر زمانے کے علوم و فنون کی ترقی پر منحصر ہے جن کی بنیادوں پر فلسفہ ایک تصور کائنات قائم کرتا ہے۔ جس قدر کہ علوم و فنون ترقی کرتے جاتے ہیں اس تصور میں وسعت اور جامعیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بقول کانٹ عقل کا یہ خاصہ ہے کہ وہ مابعد الطبیعاتی کی گتھیوں کو سلجھانے میں الجھے ، اور جب تک انسان میں عقل موجود ہے وہ اپنی کاوشوں سے باز نہیں آ سکتا۔ اسی لئے انسان ہمیشہ اپنی ذہنی تسکین کے لئے فلسفیانہ نظامات بناتا رہے اور بناتا رہے گا۔

اس کے علاوہ اسلام کی مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا عملی نمونہ یعنی رسول اللہ کا اسوۂ حسنہ مسلمانوں کے لئے ہمیشہ شمع ہدایت کا کام دیتا رہا۔ نہایت متضاد مابعد الطبیعاتی خیالات رکھنے والے ائمہ اسلام مثلاً ابن رشد جو عقلیت پسند تھے اور فلسفۂ ارسطو کے متبع اور امام غزالی جنھوں نے

اسلام کی بنیاد اسی تصوف پر استوار کی ہے۔ امام حنبل جنھیں قرآن کے ظاہری اور لفظی معنی پر ایمان لانے میں حد درجہ غلو تھا حتیٰ کہ خدا کی جسمانیت تک کے قائل تھے اور اخوان الصفا جو عقلیت پسند تھے اور بہت زیادہ تاویل کے قائل تھے۔ رسول اللہ کے اسوۂ حسنہ کے اتباع پر متفق ہیں۔

ہندوستان میں اسلام عقلیت کی تحریکوں سے زیادہ تصوف سے متاثر ہوا۔ جہاں کروڑوں ہندوستان کے باشندوں نے اسلام قبول کیا۔ وہاں انھوں نے اپنے خیالات بھی اس میں شامل کر لئے۔ اسلام میں بھی ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو دونوں مذاہب کو یک جا کرنا چاہتی تھیں جس میں خاص طور پر دکن میں ست نبتیوں کی تحریک ہے۔ لیکن مذہبی اعتبار سے ہندویت نے اسلام پر بہت ہی تھوڑا اثر کیا۔ بخلاف اس کے ہندویت خود اسلام سے بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ البتہ تمدنی اعتبار سے مسلمانوں کا اثر ہندوؤں پر کافی پڑا ہے۔ شعر و شاعری۔ موسیقی رسم و رواج غرضکہ ہر جگہ اسلام پر ہندویت کا اثر نظر آتا ہے

دوسرا اثر مسلمانانِ ہند پر اہل مغرب کا ہوا۔ اس تصادم سے مسلمانوں میں قومیت کا خیال پیدا ہوا۔ شروع میں تو یہ خیال سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ اسلام کو اس کے چودہ سو برس پہلے کے رنگ میں دوبارہ زندہ کیا جائے۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خیال مسلمانوں نے اہل مغرب سے لیا ہے کیونکہ رسول اللہ نے خود ایک عرب قوم کی تعمیر کی تھی مگر اس عصر جدید میں جو چیز حرکت کا باعث ہوئی۔ وہ یقیناً طوفان مغرب ہے۔ سر سید اور ان کے معاون اس خیال کے بانی مبانی ہیں۔ اور اس تحریک کو عموماً علیگڈھ کی تحریک سے موسوم کیا جاتا ہے۔ حالی اور اقبال کی شاعری میں اس کی ترجمانی کی گئی اور بحیثیت مجموعی یہ خیال اب تک مسلمانوں پر حاوی ہے۔

قومیت اور وطنیت کا دوسرا مفہوم یعنی یہ کہ اہل مغرب کی اندھی تقلید کی جائے خوش قسمتی سے مسلمانانِ ہند میں تقریباً کوئی جگہ نہ پا سکا۔ چاہے یہ خیال دوسرے ممالک اسلامیہ پر کتنا ہی مسلط کیوں نہ ہو گیا ہو اس معاملے میں مسلمانانِ ہند۔ ہندوؤں سے زیادہ صحیح اصولوں پر قائم رہے۔

تیسرا خیال جو مسلمانانِ ہند میں پیدا ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات اور روایات پر

قائم رہتے ہوئے ہندوستانی قوم کی تشکیل میں ممد ہوں۔ ماضی کو ہم بھلا نہ دیں۔ لیکن مستقبل کی طرف سے چشم پوشی بھی نہ کی جائے۔

ایک ادارے کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ ان خیالات کی حامی ہے جس کی تشکیل میں مولانا محمود الحسن اور حکیم اجمل خاں، مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام کا ہاتھ شامل ہے۔ اور جس کی باگ اس وقت ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو زمانے کی صحیح ضروریات کا احساس رکھتے ہوئے مسلمانوں کے بہترین رہبر ہیں۔

غرض وہ اسلام جس کو ہم اپنے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کا اہم جزو سمجھتے ہیں نتیجہ ہے بہت سے تاریخی اثرات کا۔ گو کہ بنیادی اصول وہی ہیں جو رسول اللہ نے بہ حکم وحی قائم فرمائے تھے۔

ہمارا نصب العین ہو کہ اسلام اور سب سے زیادہ شخصیت کی نشو و نما میں مدد پہنچا سکتا ہو اور اس چیز کی اجتماعی شکل یعنی قومیت کے قیام میں بھی ایک مخصوص قوم کو اس کے مخصوص ماحول کے مطابق نشو و نما دیتا ہو۔

۴۔ قومیت:۔ ہم نے اب تک قومیت کا ضمناً ہندویت اور اسلام کے سلسلے میں ذکر کیا ہے لیکن اب ہم اس پر ایک مستقل تمدنی تحریک کی حیثیت سے نظر ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں اس کا کس قدر گہرا اثر ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا تخیل کچھ نیا نہیں ہے۔ عہد قدیم سے ہندوستان کے شعرا فلاسفہ اور شہنشاہ اس کے خواب دیکھتے آئے ہیں۔ جس میں کبیر، نانک اور اکبر اعظم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن جدید زمانے میں جس چیز نے اسے قوت دی وہ مغربی اقوام سے تصادم تھا خاص طور پر انگریزوں سے۔ ہندوستان میں قومیت کے قیام کے لئے ضروری عناصر میں سے بعض موجود تھے اور بعض مفقود۔ ان سے بعض ایسی تحریکیں پیدا ہوئیں جو ہندوستان کی قومیت کے لئے مفید تھیں۔ مگر اس کے ساتھ بعض ایسی بھی وجود میں آئیں جو مضر تھیں

نسل، مذہب، زبان، تاریخ، معاشی اور سیاسی مفاد۔ اور سب سے آخر مگر سب سے اہم تر

باہم متحد ہونے کا جذبہ عموماً قومیت کی تعمیر میں اہم عناصر خیال کئے جاتے ہیں۔ مختلف تحریکوں نے مختلف عناصر پر زور دیا۔ چنانچہ مختلف قسم کی تحریکات پیدا ہوئیں جن کا ہم اجمالاً ذکر کر چکے ہیں۔ وہ تحریکیں یہ ہیں

۱۔ قومیت کی وہ تحریک جو بعض مغربی اقوام کی تقلید میں صرف معاشی اور سیاسی مفاد کو قومیت کی بنیاد قرار دینا چاہتی ہے۔

۲۔ قومیت کی وہ تحریک جو اپنی بنیاد صرف تاریخ ماضی پر رکھنا چاہتی ہے۔

۳۔ قومیت کی وہ تحریک جو مستقبل کے مقاصد کو پورا تو کرنا چاہتی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ گذشتہ تاریخ کی ان روایات کو لے لینا چاہتی ہے جو صحیح قومیت کی تعمیر میں ممد ہوں۔

ان مختلف تحریکوں کے اثر سے مختلف تعلیمی نصب العین اور ہر نصب العین کے تحت میں الگ الگ تعلیمی ادارے قائم کئے گئے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں انگریزی تعلیم کے رواج دینے میں اس سے زیادہ کچھ مقصد نہ تھا۔ کہ وہ اپنی حکومت کے مشین کے لئے پرزے بہم پہنچائیں۔ لیکن اس انگریزی تعلیم کے ذریعے ہندوستانی نوجوان مغربی علوم وفنون سے واقف ہو گئے اور ان میں مغربی انداز پر ہندوستان میں ایک قوم پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ انگریزی نظام تعلیم کے تخریبی پہلو کو نظر انداز کر کے صرف تعمیری پہلو پر نظر ڈالی جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہاں سے ایسے لوگ پیدا ہوتے جو ہندوستان میں مغربی وضع کی قومیت کا قیام چاہتے تھے۔ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم نے سرسید کی کوششوں کے باعث رواج پایا۔ سرسید کے پیش نظر تقریباً ایک صحیح تعلیمی نصب العین تھا جو مذہب اور مغربی علوم کے صحیح امتزاج پر مبنی تھا۔ مگر نہ وہ نہ اور ان کے بعد آنے والے زمانے کی رو کا مقابلہ کر سکے اور مسلمانوں کی تعلیم بھی صرف اس زمانے کے انگریزی نظام تعلیم کی اندھی تقلید ہو کر رہ گئی۔

دوم قومیت کی وہ تحریک جو ماضی پر اپنی بنیادیں رکھنا چاہتی ہے اس نظام تعلیم کا باعث ہوئی جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات کو اور بڑھا دیا۔ حقیقتاً اس تحریک کو ہم ہندوستانی قومیت کی تحریک کہہ نہیں سکتے۔ مگر لفظ قوم کا ہمارے یہاں استعمال بہت مختلف فیہ ہے اور اب تک یہ لفظ اس معنی کے لئے مخصوص نہیں ہوا ہے جس میں ہندو اور مسلمان ایک متحدہ قومیت کے عناصر سمجھے جائیں۔

ہندوؤں میں آریہ سماجیوں نے آریہ ورت کے پرانے نظام تعلیم کو زندہ کیا۔ اور مسلمانوں نے اس نظام تعلیم کا دوبارہ احیا کیا جو ان کے مخصوص تمدن کی پیداوار تھا اور ان کے مخصوص مذہبی ضروریات کو پورا کرتا تھا اس تحریک کو ہم عموماً دیو بندی تحریک سے موسوم کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ یہ متضاد چیزیں تھیں۔ اس سے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خیال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔

پہلے اور دوسرے تعلیمی نصب العین کے جو مضر نتائج مرتب ہوئے ان سے ایک نئے اور جامع نصب العین کی طرف توجہ دلائی۔ ایک طرف تو مغرب کی اندھی تقلید کے باعث ہماری نسلیں ہندوستان کی بہترین روایات سے بے پروا ہو گئیں۔ دوسری طرف صرف یکطرفہ مذہبی فرقہ وارانہ تعلیم کے باعث متعصب اور کوتاہ نظر، تیسرا تعلیمی نصب العین ان خامیوں کو دور کرنا چاہتا ہے۔ جہاں وہ ایک متحدہ تمدنی نصب العین کا مظہر ہے۔ وہاں اس تمدن پر اثر ڈال کر اس کو اور زیادہ موثر بھی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے باعث ہندوستان میں مختلف قومی مدارس قائم ہوئے۔ ظاہر ہے ان مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کی بہترین روایات کی حفاظت اور تعلیم ہونی چاہئے۔ لیکن اسی طرح کہ وہ ایک متحدہ ہندوستان کی قومیت میں مفید ثابت ہوں مضر نہ ہوں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلام کی بنیادی روح اور ارکان ہندوستان کی قومیت میں ممد ہیں مضر نہیں۔ یہ ہندوستان کے قصر قومیت کو اور زیادہ حسین اور دل کش بنانے کا باعث ہوں گے۔ خدائے واحد کا تخیل، جمہوریت اور عالم گیر برادری کا خیال۔ صاف اور سادہ اخلاقی تعلیمات توہم پرستی کی مخالفت اور حقیقت پسندی کا ذوق، نظام اجتماعی وغیرہ۔ اسلام تعلیم کے وہ بے بہا جواہر ہیں۔ جو ہندوستانی قومیت کی تعمیر میں بہترین عناصر ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ہندوؤں کی فلسفیانہ نظر ان کے غور و فکر کی گہرائی، ان کی ریاضی، ان کا جمالی احساس۔ جس کا اظہار ہندوستان کے فنون لطیفہ میں ہوتا ہے۔ ہمارے لئے بیش بہا اجزا ہیں جن کے بغیر ہمارا آئندہ قومی تمدن محض ایک بے جان چیز ہوگا۔

ایسے قومی مدارس میں ہندو اور مسلمانوں کو اس طرح تعلیم ہونی چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کے

اچھے پہلوؤں سے واقف ہوسکیں۔ قومی تعلیم کے خیال کے ساتھ مشترک زبان کا خیال پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اور وہ مشترک زبان صرف وہی ہوسکتی ہے جو کسی قوم کے تمام ارکان کی نہیں تو کم از کم اکثریت کی زبان ضرور ہو۔ ہر قوم اپنے عمیق ترین جذبات اور احساسات کا اظہار صرف اپنی مادری زبان میں کرسکتی ہے۔ جس طرح جسم بغیر روح کے زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح کسی قوم کی ذہنی زندگی اس کی اپنی زبان کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی ہر قوم اپنا تصور کائنات صرف اپنی زبان میں بدرجہ اتم ظاہر کرسکتی ہے۔ زبان کے متعلق میکانکی نقطۂ نظر غلط ہے۔ زبان ایک نامی چیز ہے جہاں وہ ذہنی زندگی کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ وہاں وہ خود ذہنی زندگی کی پیداوار بھی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں قومیت کے خیال کے ساتھ قومی زبان کا خیال بھی پیدا ہوا، اور قومی تعلیم صرف قومی زبان یعنی ہندوستانی ہی کے ذریعے ممکن ہوسکتی ہے۔ دوسرا اہم مسئلہ اس کے ساتھ لازمی ابتدائی جبریہ تعلیم کا پیدا ہوتا ہے۔ قومیت کا صحیح ارتقا ممکن نہیں ہے جب تک کہ کسی قوم کے تمام ارکان بغیر کے اپنی نشوونما کے موقع نہ پائیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر مفت اور عام ابتدائی تعلیم کے نہیں ہوسکتا جو پورے تعلیمی قصر کی بنیاد ہے اور قوم کی تعمیر میں غالباً سب سے اہم ضرورت۔

ہم جب اس قدر متحدہ قومیت پر زور دے رہے ہیں تو اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پھر کیوں تعلیم ایک نہ کردی جائے تاکہ یہ تفریق ہی مٹ جائے۔ لیکن ہمارا مقصد مختلف اقوام کے مخصوص خصائص کو فنا کرنا نہیں ہے بلکہ اُن کے بنیادی امتیازات کو باقی رکھنا ہے۔ لیکن اس طرح کہ وہ متحدہ عمارت کے لئے باعث خوش نمائی ہوں۔ ہندو قوم۔ زیادہ تر فلسفہ اور عقلیات سے دلچسپی رکھتی ہے بخلاف اس کے مسلمان ایمان و ایقان سے شخصیت کے یہ دونوں اہم پہلو ہیں۔ اور دونوں اقوام نے اپنے مخصوص رنگ میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ان کا تلف کرنا گویا کہ انسانیت کی ایک اہم قوت کو نشوونما سے روکنا ہے۔ ہم مشین کی طرح ایک ہی قسم کی اینٹیں بنانا نہیں چاہتے بلکہ شخصیتیں پیدا کرنا چاہتے ہیں جو نامی اور زندہ ہوں۔ خدا اپنی خدائی کا مظاہرہ یکسانیت سے زیادہ تنوع میں کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کے باغ میں بہت سے رنگ برنگ کے پھول اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ تاکہ اس کی خوش نمائی اور حسن دوبالا ہو۔ ہندو اور مسلمان باوجود اپنے اختلافات کے ایک اور اعلیٰ مرکز پر متحد ہوسکتے ہیں یعنی یہ کہ دونوں میں ایک۔ مافوق الطبعی جذبہ پایا جاتا ہے

جو ایک مذہبی شکل اختیار کر لیتا ہے گو کہ ایک تشفی قلب ایمان کے ذریعے چاہتا ہے۔ اور دوسرا فلسفیانہ فکر کے ذریعے سے۔

مختصر یہ کہ ہندوستان کی قومیت کے تخیل اور اس کے تحت میں اس کا قومی تعلیم کا نصب العین مندرجہ ذیل عناصر پر استوار ہونا چاہیے۔

۱۔ اس تصور پر جو کائنات میں ایک مقصد اور وحدت دیکھتا ہے جس کو ہم مذہبی اور مافوق الطبیعی جذبے سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲۔ ہندوستانی تمدن کی بنیادوں پر۔

۳۔ قومیت کے تخیل پر جو ہندویت اور اسلام کو یکجا کر سکے اور اس طرح ہندوستان میں ایک قوم پیدا کر سکے۔

ان بنیادی اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے ہم دنیا کے دوسرے تمام تمدنوں کے مفید اثرات ان کے علوم و فنون۔ ان کی صنعت و حرفت وغیرہ لینے کے لئے آمادہ ہیں۔ لیکن اس طرح کہ ہم ان کو اپنا لیں جو ہماری تہذیب میں جذب ہو سکیں اور جو ہمارے ارتقا میں ممد ہوں۔ اہل مغرب کے علوم و فنون، ان کی صنعتی و حرفتی ترقی عہد جدید میں مسلم ہے اور ہم اپنی قومیت کی تعمیر میں ان سے بہت کچھ مدد لینا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر سائنس اور صنعت میں ہمیں ان سے بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اور ہمارا انتظام تعلیم بغیر ان چیزوں کے بالکل نامکمل رہے گا۔ اور ہمیں کبھی اس قابل نہیں بنا سکے گا کہ ہم دنیا کی تگ و دو میں اپنا وجود قائم رکھ سکیں۔

چوتھا عنصر ہمارے تعلیمی نصب العین کے تعین کرنے میں انسانیت کا ہے۔ یہ انسانیت کا تخیل بھی مختلف قسم کا ہو سکتا ہے ایک تو ایسا کہ جو صرف معاشی مفاد پر مدنظر ہو۔ مثلاً موجودہ زمانے کی اجتماعیت کی تحریک ایک خالص مادی تحریک ہے۔ کارل مارکس تاریخ کی مادی تاویل کرتا ہے اس کے نزدیک تمام تمدن صرف انسان کے معاشی جدوجہد کی پیداوار ہے۔ مذاہب کے قیام میں وہ سرمایہ داری کا ہاتھ دیکھتا ہے حقیقتاً اس کا نظریہ انسانی نفس کے دوسرے عناصر کی حقیقت نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ جس طرح معاشی جذبہ انسان میں بالذات اپنی جگہ رکھتا ہے اسی طرح جمالی اور مذہبی جذبہ بھی۔ انسانیت کا یہ

یہ تخیل جو گذشتہ تمام تمدن کو برباد کر کے انسان کو صرف پیٹ کا بندہ کر دے ہماری قوم کی بنیادی خصوصیت کے خلاف ہے جس میں اسلام اور ہندویت مشترک ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم عوام کی اس تباہ حالی اور بربادی کو نظرانداز کر دینا چاہتے ہیں۔ جو سرمایہ داری کے ہاتھوں ہو رہا ہے۔ اور اس فلاکت کے دور کرنے کے لئے اگر ضرورت ہو تو ہم اجتماعیت کا تمام نظام معاشی قبول کر لینے کے لئے اور اپنے نظام تعلیم میں زراعت اور صنعت و حرفت کو بہت اہمیت دینے کے لئے آمادہ ہیں لیکن تمدن کا وہ نصب العین جو مکمل طور پر مادیت پر مبنی ہو۔ ہمارے تعلیمی نصب العین کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا

دوسرا انسانیت کا نصب العین بھی جو صرف اخلاقیات پر مبنی ہو۔ اور مذہب سے واسطہ نہ رکھے۔ ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا اس لئے کہ ہم فطرۃً مجبور ہیں کہ ایک ہستی پر ایمان رکھیں جو ہماری دعاؤں کو سننے والی ہو، جس کا باطنی اعتقاد مصیبت کی گھڑیوں میں ہمیں سہارا اور امید دے۔ ہم اپنی قوم کے اس بنیادی خصوصیت کو جسے ہم نہایت عزیز رکھتے ہیں اور جس پر ہمارے تمام تمدن کا قصر استادہ ہے ترک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ ہم بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح بے راہ و منزل ہو جائیں گے۔ اور اپنی زندگی کی اس باطنی قوت کو کھو بیٹھیں گے جو قوموں کی زندگی کا باعث ہوتی ہے۔

اب صرف یہی باقی رہ جاتا ہے کہ ہم ایک ایسی انسانیت کے قائل ہوں جو عالم گیر برادری اور ایک واحد ہستی کے تصور پر قائم ہو یہ اسلام کا ہمیشہ سے بنیادی خیال رہا ہے اور ہندویت کا ارتقا بھی اسے اسی طرف لے جا رہا ہے۔

ہم نے اس وقت تک ہندوستان کے نصب العین کا تعین کرنے میں صرف ہندویت ر اسلام کا ذکر کیا ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے فرقوں مثلاً سکھ، پارسی یہودی عیسائی ہ وغیرہ کے بہترین اثرات قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ہم ان کا اسی طرح حق وجود تسلیم رتے ہیں۔ اور ہمارا یقین ہے کہ وہ بھی ہندوستان کی قومیت کی تشکیل میں ممد ثابت ہو سکتے ں۔ اور ہمارے ہندوستانی قومی تمدن کی تمام بنیادوں پر ہم سے آ کر مل سکتے ہیں۔

غرض ہمارے تمدن کی تاریخی روشنی میں ہمارا تمدنی نصب العین اور اس کے تحت میں

ہمارا تعلیمی نصب العین یہ قرار پایا کہ ہم اپنے نوجوان نسلوں کی جسمانی اور نفسی تربیت جس میں معاشی سیاسی، اجتماعی، جمالی، اخلاقی، مذہبی قویٰ شامل ہیں۔ ان کے تمدن کی بہترین روایات پر اس طرح کریں کہ وہ ایک تمدن قومیت کے قیام کا باعث ہو وہ قومیت جو انسانیت کے لئے مفید اور کارآمد ثابت ہوسکے۔

انسانیت مقصود بالذات نہیں ہے۔ وہ بھی ایک عالم ہے بہت سے عالموں میں سے جن کا تصور انسانی عقل کے خلاف نہیں ہے لیکن جن کا احصا اور ادراک انسانی عقل وفکر سے باہر ہے چونکہ عقل اپنی قوتوں میں محدود ہے۔ اس کی رسائی حقیقت کی تلاش میں صرف ایک خاص زینے تک ہوسکتی ہے۔ اس کے بالعکس بحیثیت مجموعی جس میں شعوری اور غیر شعوری عناصر دونوں شامل ہیں حقیقت کا بہت حد تک ادراک کرتا ہے کلیتاً تو حقیقت کا ادراک اسی وقت ہوگا جب انسان انسان نہ رہے بلکہ خدا ہو جائے۔

جس طرح تمدن مظہر ہے انسانی نفس کا۔ اس طرح تمام کائنات مظہر ہے ایک نفس واحد کی جو اپنے اظہار کے لئے مختلف جلوے اور مختلف رنگ و بو ڈھونڈھتا ہے۔

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں۔ (غالب)

یہ حسن کی خود بینی نئے اسلوب سے ہر وقت، ہر زمانے اور ہر عصر میں جاری ہے۔ اسی تخلیقی فعل میں مدد پہنچانے کا نام تعلیم ہے۔ اور یہ فعل جس خاص اسلوب اور رنگ سے کسی زمانے اور کسی قوم میں ظاہر ہوتا ہے اس کو سمجھنے کا نام اس زمانے کے تمدنی اور تعلیمی نصب العین کو سمجھنا ہے۔

کس قدر عظیم الشان اور روح پرور ہے یہ خیال کہ ہم کائنات کی ایک کڑی ہونے کے باعث تمام ابدی سلسلے پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ آرزوؤں کی اس بلندی کے ساتھ ہم اپنے ماحول کو دیکھتے ہیں تو دل بیٹھا جاتا ہے۔ ہر طرف نفاق کی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ نہ صرف ہندو اور مسلمان بلکہ ایک ایک فرقہ اور ایک ایک جماعت میں جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ ہر شخص اور ہر جماعت اپنی بقا اور برتری کی

کوشش میں ہے اور دوسرے کو نیست و نابود کر دینا چاہتی ہے ان واقعات کو ان مایوسانہ نظر وں سے دیکھنا حقیقتاً ہمتوں کی پستی ہے۔ یہ زندگی کی قوتیں ہیں جو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں بعض تحریکیں ختم ہو جانے سے پہلے اب گویا سانس توڑ رہی ہیں بعض نئی قوتیں پیدا ہو رہی ہیں جو اپنا حق وجود ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ اکثر جگہ ان میں سخت جنگ چھڑی ہوتی ہے۔ اور اکثر جگہ ایک امتزاج پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان اس لحاظ سے کہ فطرت یہاں تمام دنیا کی نسلی، مذہبی اور مقامی اختلافات کا ایک امتزاج چاہتی ہے سب سے زیادہ کشمکش کا آماجگاہ ہے۔ یہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان آباد ہیں بلکہ دنیا کے ہر مذہب کے پیرو۔ یہاں نہ صرف آریہ اور سامی نسل کے لوگ بستے ہیں بلکہ تقریباً تمام دنیا کی نسلوں کے۔ انسانیت کے ہم آہنگ امتزاج سے فطرت ایک نئی انسانیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جو دنیا کے لئے ایک نمونہ ہو۔

اس عظیم الشان مشن پورا کرنے کے لئے ہم بھیجے گئے ہیں۔ خدا ہم ہندوستانیوں کے ہاتھ سے جو اس وقت سب سے زیادہ مظلوم اور بے بس ہیں اپنا کام کرانا چاہتا ہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ثابت کریں کہ ہم کس حد تک اس عظیم الشان امانت کا بار اٹھانے کے قابل ہیں۔

اب رہی یہ کشمکش، یہ جد وجہد، یہ اختلافات، یہ موت کی نہیں زندگی کی دلیل ہیں

اس کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام۔

آزادی

آزادی کا مفہوم آزاد ہونا یعنی پابند نہ ہونا، مجبور نہ ہونا، محکوم نہ ہونا بلکہ مختار، حاکم اور قادر ہونا۔ یہ صفتیں اپنی انتہائی تکمیل کے ساتھ، اپنی مطلق اور غیر اضافی شکل میں، تو صرف اسی ذاتِ بے ہمتا اور لاثانی میں جمع ہو سکتی ہیں جسے مذہبی عقیدے والے خدا کہتے ہیں۔ لیکن جب مجبور اور معذور افرادِ نوعِ انسان کے ساتھ آزادی کی صفت کو منسوب کیا جاتا ہے تو اس وقت آزادی کا جو مفہوم ہمارے پیشِ نظر ہوتا ہے اس میں کم و بیش پابندی کا پایا جانا ناگزیر ہے، ہر چند یہ ممکن ہے کہ مثالی حالات میں ان پابندیوں کا احساس معدوم ہو جائے۔

تصوف اور مذہب کی اصطلاح میں آزادی کی انتہائی معراج یہ سمجھی جاتی ہے کہ جزو، کُل میں مل جائے، مخلوق، خالق کی مرضی اور مشیت کو اپنی خواہش اور تمنا کے عین مطابق پانے لگے۔ جب تسلیم و رضا کے اس مرتبے پر کوئی شخص پہنچ جاتا ہے کہ مذہب کی کوئی پابندی اس کے لئے خارجی پابندی باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی طبیعت اپنے اندرونی میلان سے وہی کام کرنے لگتی ہے جو اس کے خدا اور رسول کا فرمان ہے یا جب جسم کی قیود اور آلودگیوں سے بے نیاز ہو کر آدمی روحِ کائنات سے ہم کلام بلکہ اس میں جذب ہو جاتا ہے تو ایسی حالت کو مذہب اور تصوف کی اصطلاح میں آزادی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔

اسی طرح اخلاقیات میں جب ایک شخص ان پابندیوں کو جو عقل و تمیز، نفسِ لوّامہ یا اجتماعی نفس اس پر عائد کرتے ہیں پابندی سمجھنا ترک کر دیتا ہے اور بے عقلی، جہالت اور نفسِ امّارہ کی سرکشی پر اس قدر قابو حاصل کر لیتا ہے کہ اس کے اندر ادنیٰ خواہشات اور اعلیٰ خواہشات کی ہر قسم کی کشمکش ختم ہو جاتی ہے اور صراطِ مستقیم پر چلنا اس کے لئے دشوار نہیں رہتا تو ایسی حالت کو اخلاقی آزادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں بھی آزادی کا نصب العین اِسی نوعیت کا متعین کیا جا سکتا ہے جب افراد اور حکومت کے باہمی تعلقات ایسے ہو جائیں کہ جماعت کا ہر فرد یہ سمجھنے لگے کہ حکومت جو کچھ کر رہی ہے وہ بالکل وہی ہے جو وہ خود کرتا تو ایسی حکومت کو مکمل آزاد حکومت سمجھنا چاہیے۔ ایسی حالت میں حکومت کے احکام خارجی نہیں رہتے۔ اُس کی اطاعت مجبوری کی اطاعت نہیں ہوتی سزا کے ڈر سے لوگ قوانین کی پابندی نہیں کرتے بلکہ خود اپنے اوپر اپنی ذات کی حکومت ہو جاتی ہے۔ قوانین، اصولِ زندگی کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں جس پر عمل کر کے خوشی اور اطمینانِ قلب حاصل ہوتا ہے۔ راجیہ، سوراجیہ ہو جاتا ہے۔ جس وقت یہ بات پیدا ہو جاتی ہے تب ہی قوائے جسمانی اور دماغی کو تربیت دینے اور مکمل کرنے کا لوگوں کو حوصلہ اور موقع ہوتا ہے۔ علم۔ ادب اور فنون، ترقی کرتے ہیں۔ تہذیب و تمدن پھولتے پھلتے ہیں۔ مادی۔ اخلاقی اور روحانی ترقیاں ہوتی ہیں۔ ہم آہنگی اور مسرت سے فضائیں معمور ہو جاتی ہیں۔

آزادی کے اِس مفہوم کے متعلق یہ خیال کرنا کہ انسانی ذہن نے اِسے اپنی تاریخ کے ابتدائی عہد ہی میں سمجھ لیا ہوگا صحیح نہیں ہے۔ دنیا کے مفکروں اور مصلحوں نے نسل بعد نسل بتدریج اِس تخیل کو ترقی دی ہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اِسی طرح اِس مطمحِ نظر کے حاصل کرنے کی کوششیں بھی ناکام اور کامیاب ہو ہو کر رفتہ رفتہ زیادہ صحیح، ہمہ گیر، مضبوط اور مؤثر ہوتی جا رہی ہیں۔ آزادی کی جنگ کا محاذ مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں میں بدلتا رہا ہے۔ کبھی آزادی کا ایک رُخ لوگوں کی نگاہ کے سامنے نمایاں رہا ہے کبھی دوسرا۔ لیکن آزادی کی روح ایک عرصہ سے کام کر رہی ہے۔ اور اس کا حلقۂ اثر روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔

آزادی کی شکلیں روسو نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "معاہدہ معاشری" کی ابتدا اِس جملہ سے کی تھی کہ "انسان آزاد پیدا ہوا لیکن وہ ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے" تاریخ کے مطالعہ سے روسو کے اس بیان کی تائید نہیں ہوتی بلکہ ہم مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُس کے اِس مشہور جملے کی تصحیح یوں کریں کہ انسان، غلام پیدا ہوا لیکن وہ آہستہ آہستہ آزاد ہوتا جا رہا ہے۔" انسان نے آزادی کی منزلِ مقصود کو

جن جن مدارج سے رفتہ رفتہ تسخیر کرنے کی کوشش کی ہے اُن میں سے زیادہ اہم کو اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

مدنی آزادی | تاریخی اعتبار سے آزادی کے لئے جو انتہائی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ مطلق العنان فرماں رواؤں کی دراز دستیوں سے افراد کو محفوظ کیا جائے۔ اور یہ اس طرح کہ رعایا کی طرف سے مطالبہ کیا گیا کہ اُن پر حکومت، قانون اور دستور کے مطابق کی جائے۔ اس کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ کے اختیارات محدود ہو جائیں اور ہر شخص کو یہ بات ٹھیک ٹھیک معلوم ہو جائے کہ اس کی پابندی کی حد کس قدر ہے۔ منطقی حیثیت سے بھی یوں ہی ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ جب ایک شخص کو کسی دوسرے شخص کے خلاف کوئی قانونی حق حاصل نہیں ہوتا تو وہ بالکل اُس کی مرضی اور طبیعت کے تلون کا پابند ہوتا ہے اور غلاموں کی طرح اس کے اشاروں پر چلنے کے لئے مجبور ہوتا ہے۔ اس لئے ہمہ گیر آزادی کی اوّلین شرط ہمہ گیر پابندی ہے۔ اگر اس قسم کی پابندی نہ ہو تو کچھ لوگ آزاد رہیں گے جو چاہیں گے کر سکیں گے اور کچھ پابند ہوں گے اور وہی کر سکیں گے جس کی آزاد لوگ اُنھیں اجازت دیں گے۔ مگر جب قوانین مقرر ہو جائیں گے اور حکمران بھی اُس کے اسی طرح پابند ہو جائیں گے جیسے محکوم تو من مانی حکومت باقی نہ رہے گی۔ قوانین سے اس میں شک نہیں کہ ایک فرد کی آزادی محدود ہو جاتی ہے، اور وہ دوسروں کے ساتھ جس قسم کا چاہے اپنی مرضی کے مطابق برتاؤ نہیں کر سکتا لیکن اُسے فائدہ یہ حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے بھی اُس کے خلاف اپنے غیر محدود اختیارات استعمال کرنے سے معذور ہو جاتے ہیں۔ جس طرح ایک فرد کو قانون پابند کرتا ہے اُسی طرح اُس جماعت کے جملہ افراد کو جس میں حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ، امیر و غریب، گورے اور کالے، مسلمان اور کافر سبھی شامل ہیں، بلا تفریق مساوی انداز سے پابند کرتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو من مانے احکامات اور زور آور زبردستی سے لوگوں کو نجات مل جاتی ہے۔ معاشری زندگی میں آزادی کی یہی ایک صورت قابلِ عمل ثابت ہوئی ہے۔

انگریزی پارلیمنٹ نے سترھویں صدی میں آزادی کی جنگ اسی مورچے پر شروع کی تھی۔ پٹی شن آف رائٹ اور ہے بیس کارپس ایکٹ اسی مدنی آزادی کے حصول کے ذرائع تھے قانون کی

عملداری قانون کی نگاہ میں مساوات، غیر جانب دار عدالتیں؛ یہ مطالبے تھے جو اُس وقت پیش کئے گئے تھے۔ حکومت اپنی مرضی کے مطابق لوگوں کو جب چاہے گرفتار اور قید نہیں کرسکتی، نہ سزا دے سکتی ہے نہ اُن کے مال و جائداد پر قبضہ کرسکتی ہے۔ اِس قسم کے تمام کام قانون کے مطابق ہونے چاہئیں۔ عدالت کو حکومت کے اثر سے آزاد ہونا چاہئے۔ صفائی کی ہر شخص کو سہولت ملنی چاہئے۔ عدالت تک ہر شخص کی رسائی آسان ہونی چاہئے۔ مقدمے کی پیروی اِس قدر گراں نہ ہونی چاہئے کہ نادار لوگ عدالت کے منافع سے محروم رہیں۔ پڑھے لکھے باعزت اور ذی مرتبہ لوگوں کو جاہلوں اور کم حیثیت لوگوں کے مقابلے میں اپنی علمیت، وقار، مذہبی یا نسلی تفوق سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے کا موقع نہ دینا چاہئے۔ یہ مدنی آزادی ہے۔

مالی آزادی اِس سے قریبی طور پر وابستہ مالی آزادی کا مسئلہ ہے جس کو آسانی سے اِس لئے سمجھ سکتے ہیں کہ اِس سے لوگوں کے روز مرہ کے کاروبار پر براہِ راست اثر پڑتا ہے جب حکومت من مانے طریقوں سے محاصل عاید کرتی ہے اور اُس کے اختیار پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی تو لوگ عاجز ہوکر انقلاب کے خواہشمند ہوجاتے ہیں۔ انگلستان میں اسٹوارٹ بادشاہوں نے امریکہ میں جارج سوم نے اور فرانس میں لوئی شانزدہم نے اپنے محاصل کے خراب انتظام سے لوگوں میں بدظنی اور بے اطمینانی کی کیفیت پیدا کردی۔ رعایا کا مطالبہ یہ تھا کہ حکومت کو اُس وقت تک محاصل عائد کرنے کا حق نہیں ہے جب تک وہ نمایندگی کے حق کو تسلیم نہ کرلے یعنی اُن لوگوں کے نمایندوں سے جن پر محاصل عائد کئے جارہے ہیں اِس بارے میں استصواب نہ کرلے اور اُن کے اعتراضات کا تشفی بخش جواب نہ دے لے۔ یہ مالی آزادی ہے۔

ذاتی آزادی یہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ آزادی کا امکان اُسی وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمیوں کے بجائے اصول و قوانین کی حکومت ہوتی ہے۔ اور اُن کی اطاعت، جماعت کے تمام افراد پر لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اِس سے مسئلے کا پورا حل نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ قوانین موجود ہوں اور حکمران اُن قوانین کی خلاف ورزی بھی نہ کرتے ہوں لیکن پھر بھی (۱) قوانین بنانے والے یا تو ایک مطلق العنان

بادشاہ اور اُس کے تنخواہ دار مشیر ہوں یا اُمرا، اور حکّام کی ایک مختصر جماعت اِس کام کو انجام دیتی ہو (۲) قوانین بذاتِ خود انصاف اور مساوات پر مبنی نہ ہوں بلکہ اُن سے آبادی کے کچھ حصّے یا اکثر حصّے یا قوانین بنانے والوں کو چھوڑکر باقی اور تمام لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ اِس لئے ضرورت اِس بات کی ہے کہ ایک طرف تو قوانین بنانے والی مناسب ترین جماعت کا تعین کر دیا جائے اور دوسری طرف اِس امر کی صراحت کر دی جائے کہ کن کن صورتوں میں محض قانون کو حکم بنانے سے آزادی کے حصول کا مسئلہ حل نہیں ہوجاتا بلکہ ایسے موقعوں پر خراب اور ظلم پرور قوانین کی تنسیخ کا مطالبہ نہایت ضروری ہوجاتا ہے۔ اِس مسئلہ کا اول الذکر حصّہ سیاسی آزادی سے متعلق ہے جس پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ فی الحال اِس مسئلہ کے دوسرے حصّے سے جسے "ذاتی آزادی" کے نام سے موسوم کرنا مناسب ہے، بحث کی جاتی ہے۔

اِس ذیل میں بنیادی حیثیت خیال کی آزادی کو حاصل ہے یعنی اپنے ذہن میں ایک رائے قائم کرنے کے لئے ہر شخص آزاد ہے اور اپنی اِس ذہنی رائے کی وجہ سے وہ کسی سزا کا مستحق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اِس حق سے انکار انتہائی ظلم ہے کیونکہ خیال کا قلعہ تو کم از کم ایسا ہونا چاہئے جو اغیار کی دستبرد سے قطعاً محفوظ ہو۔ لیکن خیال چونکہ معاشرتی روابط کا نتیجہ ہوتا ہے اِس لئے اس کی آزادی اِس وقت تک بے کار ہے جب تک مبادلۂ خیال کی آزادی بھی نصیب نہ ہو۔ اِس لئے تقریر، تحریر، طباعت اور مباحثے کی آزادی بھی ضروری ہے۔ مگر یہاں مسئلہ نازک اور پیچیدہ ہوجاتا ہے کیونکہ ایک ایسا نقطۂ اتصال بھی ہوتا ہے جہاں قول و فعل کا فرق اِس قدر دھندلا ہوجاتا ہے کہ آزاد تقریر اور لوگوں کو بدامنی اور بغاوت پر اُبھارنا مترادف مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اس کے مقابلے میں آزادی کھڑی ہوتی ہے اور انتخاب نہایت دشوار ہوجاتا ہے۔ مذہبی آزادی کے مسئلے میں بھی بعض اوقات اِس قسم کی دشواریوں کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً بعض مذاہب میں آدم خوری، انسانی قربانی اور جادوگرنیوں کا جلا ڈالنا جائز ہے لیکن کوئی جدید حکومت اِن رواجوں کی کبھی بھی روادار نہیں ہوسکتی۔ ہندوستان میں تعددِ ازدواج کو برطانوی قانون جائز قرار دیتا ہے لیکن

اگر ہندو اور مسلمان انگلستان میں ایک سے زائد شادی کرنا چاہیں تو شاید نہیں کر سکتے۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر مذہبی آزادی کا کیا مفہوم ہے؟ اِس کے مفہوم پہ خارجی اور باطنی دو حیثیتوں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ خارجی حیثیت سے تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ مذہبی خیالات اور اُن کے اظہار میں ہر شخص کو آزادی حاصل ہو۔ مزید برآں ہر شخص کو اِس بات کی بھی آزادی ہو کہ جس شکل میں چاہے عبادت کرے۔ لیکن اِس شرط کے ساتھ کہ اُس کے ایسا کرنے سے دوسرے کو نقصان نہ پہنچے اور امنِ عامّہ میں خلل واقع نہ ہو۔ اِس شرط میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ مذہبی خیالات کے اظہار میں متانت، اعتدال اور ضبط سے کام لیا جائے تاکہ دوسروں کے احساسات کی توہین نہ ہو۔ اِس کے علاوہ مذہبی آزادی اُس وقت تک ناقص سمجھی جائے گی جب تک کسی شخص کو بھی مذہب کی وجہ سے عہدوں یا تعلیمی منافع سے محروم رکھا جائے گا۔ مکمل آزادی کے معنی یہاں بھی مکمل مساوات کے ہیں۔ باطنی طور پر مذہبی آزادی سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو دوسرے شخص کو تبلیغ کے ذریعے سے اپنا ہم مذہب بنانے کا حق حاصل ہے۔ لیکن شرط پھر وہی ہے کہ ایسا کرنے سے دوسروں کے مساوی حقوق پامال نہ ہوں۔ اور امنِ عامّہ میں خلل واقع نہ ہو۔

معاشری آزادی | زندگی کے روحانی رُخ کے بعد اب ہم اُس کے عملی رُخ کی طرف متوجّہ ہوتے ہیں۔ یہاں آزادی کو اُن رُکاوٹوں سے جنگ کرنی پڑتی ہے جو سوسائٹی کے درجہ بہ درجہ طبقوں میں تقسیم ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طبقے کو دوسرے پر فضیلت ہوتی ہے اور یہ امتیازات مستقل ہو کر ترکہ اور وراثت کے ذریعہ سے منتقل ہونے لگتے ہیں۔ اوپر کے طبقہ والے نیچے طبقہ والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور اُن سے معاشری تعلقات رکھنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ طبقوں کی اِس تفریق نے ذات پات کی شکل میں ایسی انتہائی صورت اختیار کی ہے کہ نیچی ذات کے لوگوں کا سایہ بھی جس جگہ پڑ جاتا ہے وہ ناپاک سمجھی جاتی ہے۔ نیچی ذات والوں کو اجازت نہیں ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کے مندروں میں عبادت کر سکیں۔ اُن کے کنوئیں سے پانی بھر سکیں یا اُن کے بچّوں کے ساتھ بیٹھ کر اسکولوں میں تعلیم پا سکیں۔

اونچی ذات کے ساتھ کھانے پینے میں شرکت اور شادی بیاہ کے امکانات تو قطعی طور پر بعید از قیاس ہیں۔ انھیں صرف ذلیل ترین پیشوں کے اختیار کرنے کی اجازت ہے اور ترقی کے تمام امکانات اُن کے لئے اور اُن کی آئندہ نسلوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے واسطے مفقود ہیں۔ یہ تفریق یہاں کے مذہب، رواج اور قانون کے نزدیک بھی جائز ہے۔ یورپ میں بھی اِس شدید شکل میں تو نہیں لیکن کم و بیش اِسی قسم کے امتیازات مختلف زمانوں میں پائے گئے ہیں جن کے خلاف جدّوجہد کر کے اُنھیں توڑنے کی وقتاً فوقتاً کوششیں کی گئی ہیں۔ مثلاً بعض عہدے ہوتے تھے جو صرف موروثی اُمراء اور لاٹ پادریوں کے لئے وقف ہوتے تھے یا بعض پیشے تھے جن کا اجارہ بعض مخصوص جماعتوں کو حاصل تھا۔ یا تعلیم کی سہولتیں تھیں جن سے غیر دولتمند لوگ فطری اہلیت کے باوجود فائدہ نہیں اُٹھا سکتے تھے۔

معاشری آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ اِن بندشوں کو توڑ کر مساوات قائم کی جائے اور ہر شخص کو ترقی کے لئے مساوی مواقع فراہم کئے جائیں۔ لیکن اِس مسئلہ میں بھی بعض نازک دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر ایک طرف انفرادیت کی ترقی کے لئے جماعت بندی کو توڑنا ضروری ہے تو دوسری طرف فرقہ بندی اور جماعت سازی مثلاً ٹریڈ یونین وغیرہ کی مشترکہ کوشش سے افراد کے حقوق کی اِس طرح نگہداشت ہوتی ہے اور بعض ایسے دوسرے معاشری منافع پیدا ہوتے ہیں جنھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اِس قدر بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ معاشری آزادی کا اِن حالات میں یہ مقصد ہونا چاہیے کہ ایسی جماعتوں کی رکنیت میں وراثت کے اصول کو جاری نہ ہونے دیا جائے۔ نیز اِن جماعتوں میں داخل ہونے کے واسطے مصنوعی پابندیاں حائل نہ کی جائیں یعنی ایسی کوئی دشواری پیدا نہ کی جائے جس کا منشا یہ ہو کر برادری میں نئی بھرتی کا سلسلہ مسدود ہو جائے اور جماعت بندی سے جو فائدے حاصل ہوتے ہیں اُن پر صرف ایک محدود حصہ آبادی کا اجارہ رہے۔

اِسی ضمن میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ جنسی قیود بھی فرقہ بندی کی قیود سے بہت مشابہ ہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ بعض پیشے ایسے ہوتے ہیں جن کے لئے عورتیں طبعاً موزوں نہیں ہوتیں۔ ایسی صورتوں میں

اہلیت کے جو امتحانات ہیں اُن کے فیصلوں کو کافی سمجھنا چاہئے اور عورتوں کو محض عورت ہونے کی وجہ سے آزاد مقابلے میں شرکت سے محروم رکھنا مناسب نہیں ہے۔

معاشی آزادی | معاشرتی آزادی ہی کی ایک شاخ معاشی آزادی بھی ہے۔ لیکن اِس کے مسائل اِس قدر پیچیدہ ہیں اور افراد اور جماعت کے حقوق و فرائض یہاں باہم اِس درجہ دست و گریباں نظر آتے ہیں کہ ایک قطعی رائے کا اظہار بہت دشوار معلوم ہوتا ہے۔ معاہدے کی آزادی، اپنے تمام افعال کے لئے افراد کا ذاتی طور پر ذمہ دار ہونا، تجارتی انجمنیں بنانے کی آزادی، آزاد تجارت۔ اُن کے حامیوں اور مخالفوں میں سالہا سال سے مستقل کشمکش کا سلسلہ جاری ہے۔ اِس گتھی کو سُلجھانے کے لئے بھی مساوات کے گُر کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ ایسی تمام جماعتی پابندیاں جو مساوی سطح پر لانے کے بعد آزادی کے فوائد حاصل کرنے کے امکانات پیدا کرتی ہیں، افراد کی اُن تمام غیر محدود آزادیوں سے بہتر ہیں جن کی وجہ سے غیر مساوی اور ناموافق حالات میں وہ اپنے ہاتھ سے اپنی ذات کو نقصان پہنچاتے ہیں یا اپنے ذاتی اور عارضی فائدے کی خاطر کُل جماعت اور خود اپنے مستقل فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ مثلاً آزاد معاہدہ جب ایک بڑے سرمایہ دار اور نادار مزدور یا کسان کے درمیان ہوتا ہے تو ایسے معاہدے کو آزاد کے نام سے موسوم کرنا اور اُس کے لئے مزدور کو ذاتی طور پر ذمہ دار قرار دینا ستم ظریفی ہے۔ بڑا سرمایہ دار انتظار کر سکتا ہے اور مزدور کی خدمات سے مستغنی ہوتا ہے لیکن مزدور کی نگاہ کے سامنے اپنی معصوم اولاد کے فاقہ زدہ چہرے ہوتے ہیں۔ اور جن شرائط پر بھی ممکن ہو وہ فوراً کام کر کے اُجرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ایسا معاہدہ آزاد معاہدہ نہیں کہلایا جا سکتا۔ اسی طرح اصولِ انجمن سازی کی اِس وجہ سے مخالفت کرنا کہ اِس سے افراد کی آزادی ختم ہو جاتی ہے، غلطی ہے۔ انجمن چاہتی ہے کہ آزادی کے ایک خاص معیار کے حصول کے لئے اُس کے ارکان مشترکہ کوشش کریں۔ اب اگر اِس کی وجہ سے زندگی کے خود غرضانہ اور ناعاقبت اندیشانہ معیاروں کی قربانی ہوتی ہے تو یہ اعلیٰ آزادی کی خاطر ادنیٰ آزادی کی قربانی ہے جسے جائز سمجھنا چاہئے۔ مثلاً مزدوروں کے مکانوں کا مسئلہ، بیماری اور بڑھاپے کی حالت میں

اُن کی خبرگیری، اُن کے لئے مستقل طور پر مزدوری فراہم کرنے کی ذمہ داری، بچوں کی تعلیم اور اور انھیں کھانا کھلانا، بچوں اور عورتوں کی ملازمت کے متعلق خاص قوانین بنانا۔ ان اغراض کے حصول کے لئے جب افراد مشترکہ طور پر انجمن بنا کر کوشش کرتے ہیں اور اِس کوشش سے افراد کے انفرادی اختیار کو عارضی نقصان پہنچتا ہے تو اس کی تلافی، جماعتی اور مستقل فائدوں سے ہو جاتی ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ انجمن کے مطالبات حدود سے متجاوز ہو جائیں اور اتنی قربانی طلب کریں کہ جس کے لئے افراد طیار نہ ہوں۔ ایسی صورت میں افراد کی آزادی کی حفاظت ضروری ہو جاتی ہے اِس قسم کی دلیل آزاد تجارت کے خلاف بھی استعمال کی جا سکتی ہے۔ آزاد تجارت ایسے دو ملکوں کے درمیان تو نہایت موزوں اور مناسب ہے جو صنعتی حیثیت سے مساوی سطح پر ہوں۔ لیکن ایسے دو ملکوں کے درمیان جن میں سے ایک صنعتی حیثیت سے بہت ترقی یافتہ ہو اور دوسرا قدرتی وسائل کے باوجود نہایت پس ماندہ، جب آزاد مقابلہ ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پس ماندہ ملک آزاد تجارت کی حالت میں کبھی اپنی صنعتوں کو ترقی نہیں دے سکتا۔ ایسی حالت میں جماعت کے مستقل مفاد کو پیش نظر رکھ کر آزاد تجارت سے عارضی کنارہ کشی ضروری ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ مسائل اِس کے بعد بھی پوری طرح صاف نہیں ہوتے اور بعض اوقات معاشی آزادی کے نام پر ایک طرف یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ قیمتوں، مزدوروں کی شرائط ملازمت اور آمد و برآمد کے محاصل اور باقی تمام دوسرے معاشی معاہدوں سے ہر قسم کی بیرونی پابندیاں ختم کر دی جائیں اور دوسری طرف دعوت دی جاتی ہے کہ ہر جزئی معاشی مشغلے کو حکومت کی نگرانی اور انتظام کے ماتحت لایا جائے اور دونوں نظریوں کے حامی وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ صرف انھی کی تجویزوں سے معاشی آزادی کے امکانات محفوظ کئے جا سکتے ہیں اِس کے متعلق مفصل بحث آئندہ کسی باب میں کی جائے گی۔

خانگی آزادی | جماعت میں جتنی انجمنیں بھی پائی جاتی ہیں اُن میں سب سے زیادہ اہم، ہمہ گیر اور بااثر تنظیم خاندانی ادارے کی ہے جس زمانے میں ریاستیں مطلق العنان ہوتی تھیں خاندانی زندگی میں بھی استبدادیت اور مطلق العنانی کا دور دورہ تھا۔ اور شوہر اپنی بیوی اور بچوں کے جان و مال کا بہت بڑی

حد تک مختار کل ہوتا تھا۔ آزادی کی تحریک نے جب خاندانی محاذ سے حملہ کیا تو اس کے پیش نظر تین مقاصد تھے (۱) بیوی کو مساوی طور پر مختار اور ذمہ دار قرار دیا جائے۔ اُسے جائداد کی ملکیت اپنے طور پر کاروبار کرنے، فریق مقدمہ بننے اور شوہر کے مقابلے میں پوری طرح محفوظ ہونے کے حقوق دیئے جائیں (۲) شادی کو جہاں تک قانون کا تعلق ہے دو ہم رتبہ فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ سمجھا جائے (۳) اولاد کی جسمانی، دماغی اور اخلاقی تربیت کے لئے کچھ تو والدین کو پابند کیا جائے اور کچھ سرکاری طور پر تعلیم اور حفظانِ صحت کے انتظامات کر کے بندوبست کیا جائے خاندانی زندگی کے اوّل الذکر دو مقاصد سے تو مساوات کے اصول کی توسیع ہوتی ہے لیکن تیسرے مقصد کے سمجھنے میں ذرا دشواری معلوم ہوتی ہے۔ اِس مسئلے پر غور اگر اِس نقطۂ نگاہ سے کیا جائے کہ بچوں کے حقوق کی نگہداشت مستقبل کے شہری ہونے کی حیثیت سے کی جاتی ہے اور مساوی مواقع کا انھیں اتنا ہی مستحق سمجھنا چاہیے جتنا کہ موجودہ شہریوں کو اور چونکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ خود کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے اِس لئے اُن کے حقوق کی نگرانی قانون اور حکومت کے ذریعہ سے ضروری ہے تو شاید یہ مسئلہ سمجھ میں آجائے اور یہاں بھی آزادی کا مفہوم مساوات قائم کرنا ہو جائے۔

مقامی نسلی اور قومی آزادی مختصر ترین جماعتی ادارے یعنی خاندان کے بعد اب ہم بزرگ ترین ادارے یعنی قوم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔ تحریک آزادی کا ایک بڑا حصہ اُن مساعی پر مشتمل ہے جن کے ذریعے اقوام نے بصورتِ مجموعی غیروں کی حکومت سے آزاد ہونے کے لئے جد وجہد کی۔ نپولین کی شہنشاہیت کے خلاف یورپ کی تمام اقوام کی بغاوت، اٹلی کی آزادی کے لئے کوشش، ترکی کی عیسائی رعایا کی اپنے بیرونی ہم مذہبوں سے امداد طلبی، حبشی اقوام کی غلامی سے رہائی، آئرلینڈ اور ہندوستان کی قومی تحریک، یہ سب اِسی جذبے کے مظاہر ہیں۔ بظاہر یہ مسئلہ بہت سہل معلوم ہوتا ہے ان تحریکوں کا مقصد عموماً یہ ہوتا ہے کہ کمزور فریق کو طاقتور فریق کی گرفت سے نکال کر اُسے خود مختار اور ہم رتبہ بنادیا جائے۔ لیکن اِس کی اِس سطحی شکل کا جب ذرا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو معاملہ اتنا صاف نہیں رہتا۔ قومیت کسے کہتے ہیں اور یہ ریاست سے کس حیثیت سے مختلف ہے؟ کس قسم کا خاص

اتحاد قومیت کے احساس سے پیدا ہوتا ہے اور اس کے کیا مخصوص حقوق ہیں؟ اگر آئرلینڈ ایک قوم ہے تو کیا السٹر بھی ایک قوم ہے؟ اگر السٹر کو برطانوی اور پروٹسٹنٹ کہہ کر برطانیہ کا جزو بنانے کا مطالبہ کیا جاتا تھا تو السٹر کی نصف کیتھلک آبادی کے حقوق کو پیش نظر رکھا جاتا تھا یا نہیں؟ ان میں سے بعض مسائل کے عملی جوابات تو واقعاتِ تاریخ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کنیڈا کی تاریخ کے مطالعے سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانس اور برطانیہ کے رہنے والے دو مختلف عناصر کس طرح کنیڈا میں ایک ساتھ بسنے اور خود مختار طرز کی حکومت پانے کے بعد "عقاید" "زبان" معاشرتی تنظیم اور تاریخی روایات کے اختلاف کے باوجود باہم شیر و شکر ہو کر ایک قوم بن گئے ہیں۔ جرمنی کے ایک قوم ہونے کے دعوے کو بھی تاریخ نے صحیح ثابت کر دیا ہے۔ آسٹریا کے وزیر میٹرنک نے اٹلی کے متعلق طنز آمیز طریقہ پر جو یہ فقرہ کہا تھا کہ "اٹلی صرف جغرافیائی اصطلاح ہے" اس کی بھی تاریخ نے تردید کر دی ہے۔ لیکن تاریخ کے نتائج کی پیشین گوئی کس طرح کی جائے۔ ان تمام لوگوں کے مطالبوں کو جو قومی وحدت کی بنا پر خود اختیاری حکومت کا مطالبہ کرتے ہیں کن شہادتوں کی بنا پر منظور یا مسترد کیا جائے؟ تحریک آزادی کا اولین مقصد اس میں شک نہیں قومی خود اختیاری کو تسلیم کرنا ہے لیکن جب تقسیم اور جزوی تقسیم پر نظر کی جاتی ہے اور فرقوں کے اندر فرقے نظر آتے ہیں تو اس وقت خود اختیاری طرز کی حکومت کے کون سے حدود مقرر کئے جائیں؟ ان پیچیدہ مسائل کو تاریخ کی زندہ مثالیں اور مدبّروں کی عملی بصیرت ہی حل کر سکتی لیکن ایک اصول ہے جسے تجربے کی بنا پر ہر جگہ آزمایا جا سکتا ہے۔ جب ایک کمزور قوم، ایک بڑی اور طاقتور قوم کے ساتھ شامل رہ کر ایک ہی قانون کے ماتحت آزادی کے جملہ حقوق سے مستفید ہو سکتی ہو تو ایسے اتحاد کو دونوں فریقوں کے لئے مناسب سمجھنا چاہئے۔ لیکن جہاں یہ انتظام ناکام رہے، جہاں حکومت مستقل طور پر ہنگامی اور غیر معمولی قوانین بنانے یا اپنے اداروں کی آزادی ختم کرنے پر مجبور ہو تو ایسی صورت میں اس اتحاد کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے۔ ورنہ اگر یہ صورت جاری رہی تو نہایت آزاد خیال جمہوریت بھی اپنے اصولوں کی بیخ کنی پر مجبور ہو جائے گی اور اپنا اقتدار صرف اپنی آزادی قربان کر ہی کے قائم رکھ سکے گی۔

اِسی قسم کے سوالات نسلی آزادی کے متعلق بھی پیدا ہوتے ہیں۔ تجربے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ محض نسل کا اختلاف کسی شخص کو آزادی کا کم یا زیادہ مستحق نہیں بنا دیتا۔ رنگ کے کالے یا گورے ہونے سے حکومت خود اختیاری کی طبعی اہلیت یا نااہلیت میں اضافہ نہیں ہو جاتا۔ اِس بُنیاد پر جو امتیازی حقوق لوگوں کو دئیے یا جو فرائض عاید کئے جاتے ہیں اُنھیں جس قدر جلد مٹایا اور تمام انسانوں کو مساوی سطح پر لا کر آزادی کے منافع میں برابر کا شریک کیا جائے اتنا ہی مناسب ہے۔

بین الاقوامی آزادی | بین الاقوامی معاملات تحریک آزادی کا مطالبہ یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عدمِ مداخلت کے اصول پر عمل کیا جائے اور اس کے لئے تین دلیلیں پیش کی جاتی ہیں (۱) آزادی کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ طاقت کے استعمال کی جو ظلم کا سرچشمہ ہے مخالفت کی جائے (۲) اسلحہ اندوزی کی لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔ کیونکہ اِس سے کبھی تو براہِ راست اور کبھی بالواسطہ نہایت ہشیاری اور چالاکی کے ساتھ آزاد اداروں کو دبایا اور محاصل سرکاری کے بیشتر حصّہ کو فوجی مصارف پر صرف کیا جاتا ہے (۳) جس قدر دنیا آزاد ہو رہی ہے اُتنا ہی قوت کا استعمال سہل ہوتا جاتا ہے۔ اگر مقصد دوسری قوم کو فتح کر کے اُس کے جائز حقوق پر تصرف کرنا نہیں ہے تو حملہ کرنا سخت خام خیالی ہے۔

سیاسی آزادی اور عوام کا اقتدارِ اعلیٰ | مندرجہ بالا تمام آزادیوں کے حصول اور قیام کا طریقہ کیا ہو یہ آخری سوال ہے جس سے اب ہمیں بحث کرنی ہے۔ عام طور پر جواب یہ دیا جاتا ہے کہ اگر عاملہ اور مقننہ کو کُل جماعت کا جواب دہ بنا دیا جائے تو اِس مسئلے کا حل ہو جائے گا اور پیشِ نظر یہ انتظام ہوتا ہے کہ عوام کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو اور ہمہ گیر حق رائے دہندگی کے ذریعے سے وہ اپنے اِس اقتدار سے فائدہ اٹھائیں۔ لیکن اِس جواب سے مسئلے کی تمام دشواریوں کا حل نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ عوام اپنے حقوق کی طرف سے لاپروائی برتیں اور انتظام کرنے کی اہلیت نہ رکھتے ہوں یا دوسرے ممالک کی تسخیر کا نشہ اُن پر سوار ہو جائے یا اُمراء کی جائداد کی ضبطی یا اِسی قسم کے کسی اور مجموعی ظلم پر آمادہ ہو جائیں۔ اِس بات کا بھی آسانی سے امکان ہو سکتا ہے کہ وسیع حق رائے دہندگی کے مقابلے میں محدود حق رائے دہندگی سے عام آزادی کی زیادہ ضمانت ہو اور جماعتی ترقی کے زیادہ بہتر نتائج پیدا ہو سکیں۔

ان حالات میں عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریے کے لئے وجہ جواز کیا ہے اور اس کی صحت کے کیا حدود ہیں؟ کیا یہ نظریہ آزادی اور مساوات کے عام اصول پر مبنی ہے یا دوسرے کوئی خیالات اس کی تائید کے لئے موجود ہیں؟ پھر خیالات اور اداروں کے جدید ارتقا نے پارلیمنٹری حکومت کے مقابلے میں ڈکٹیٹر شپ کو لا کھڑا کیا ہے اور اب ایک نیا سوال یہ پیدا ہونے لگا ہے کہ کیا واقعی نمائندگی پر منحصر حکومت کے مقابلے میں عام طور پر مقبول اور پسندیدہ ڈکٹیٹر شپ عوام کے اقتدار اعلیٰ کے اظہار کا زیادہ مناسب، مؤثر اور مفید ذریعہ ہے؟ ان سوالات کا قطعی طور پر جواب دینا تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں اختصار کو پیش نظر رکھتے ہوئے جمہوریت کی تائید میں چند دلیلیں پیش کرنے پر اکتفا کی جائے گی۔

آزادی کا مقصد یہ نہیں ہے کہ لوگوں کو بچوں کی طرح دوسروں کے ہاتھ سے کھانا کھلا کر خوش رکھنے کی کوشش کی جائے بلکہ یہ ہے کہ اُن میں احساس ذمہ داری پیدا کر دیا جائے۔ اُن کی سیرت کی تربیت کی جائے اور اُن کی انفرادیت کو ترقی کا موقع دیا جائے۔ اگر انھیں اپنی نجات خود حاصل کرنا ہے تو اُنھیں مشترکہ زندگی کے انتظام کی ذمہ داری میں شریک ہونا چاہیئے۔ انتخاب کنندگان کی جہالت یا غیر ذمہ داری کے عذر پر حق رائے دہندگی کو محدود کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مشق ہی سے آدمی کام کرنا سیکھتا ہے۔ لوگوں میں اگر احساس ذمہ داری پیدا کرنا ہے تو اُن پر بھروسا کر کے انھیں ذمہ داری تفویض کرنا چاہیئے۔ ایسا کرنے میں خطرات ضرور ہیں لیکن خطرات اُس وقت اور بھی زیادہ ہوتے ہیں اور صورت حال سخت یاس انگیز ہوتی ہے جب عوام کی اکثریت کو حقوق اور ذمہ داری سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ایک شخص واحد کو حاکم مطلق بنانے میں علاوہ مندرجہ بالا اعتراضات کے ایک دوسرا خطرہ اور بھی ہے۔ ایک طرف تو یہ کہ اس کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر اپنے ذاتی اقتدار کے غیر ضروری استحکام میں مدد نہ لے گا۔ دوسری طرف اس کے جانشین کا مسئلہ حل طلب رہ جاتا ہے اس لئے جمہوری نظام اپنے تمام نقائص کے باوجود بہترین نظام ہے۔ البتہ اس کی جو نمایاں خرابیاں ہیں اُن کے ازالے کی کوشش ضروری ہے۔ مثلاً

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت، عوام کو بعض اہم معاملات میں نمایندے منتخب کرنے کے بعد بھی اپنی رائے کے اظہار کا موقع دینا اور بعض دوسرے معاملات میں اس کے برخلاف ماہرین کی رائے پر زیادہ اعتماد کرنا ایسی راہیں ہیں جن کو اختیار کرکے اصلاح کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

آزادی کو جن جن راہوں سے اور جن جن شکلوں میں مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر حاصل کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں انھیں اب ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں معلوم ہوا کہ تحریک آزادی تمام انسانی زندگی پر حاوی ہے۔ اس کا تعلق افراد سے بھی ہے خاندانوں سے بھی اور ریاست سے بھی۔ اس کا اثر صنعت پر بھی پڑتا ہے اور قانون، مذہب اور اخلاقیات پر بھی۔ اگر گنجایش ہوتی تو اس کا جو اثر ادب اور فنونِ لطیفہ پر ہوتا ہے اس کے دکھلانے کی بھی کوشش کی جاتی کہ کس طرح تحریک آزادی کے زیر اثر قدامت پرستی، تصنع، عدمِ اخلاص اور مربیوں کے ذوق کی پابندی کے خلاف جنگ اور انفرادیت، واقعیت اور صناع و ادیب کی حقیقی روح کو نمایاں کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ غرض جدید دنیا کی تعمیر میں تحریک آزادی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

دوسری بات جو اس ذیل میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ تحریک آزادی کا کام ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے اور ترقی پر ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں بیان کیا گیا تھا، جب تک فرد اور جماعت میں وہ ہم آہنگی پیدا نہ ہو جائے جس سے جماعت کی ہر پابندی کو فرد ایک خارجی اور تہدیدی پابندی نہیں بلکہ اپنے اجتماعی نفس اور ضمیر کی پابندی سے تعبیر کرنے لگے یہ سلسلہ جاری رہے گا تا آنکہ جماعت کی اطاعت اور آزادی میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا ؛

~ ~ ~ ~ ~ ~

ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل

(پروفیسر محمد مجیب صاحب کا لکچر جو انھوں نے ۱۳ اپریل کو
جامعہ کے کالج کے طلبہ کے جلسے میں دیا تھا۔)

برادرانِ جامعہ !

میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں کہ آپ سے چند مسائل پر گفتگو کروں جن میں میرا جی لگا رہتا ہے اور جن پر میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب کو بھی غور کرتے رہنا چاہیے۔ میرا مقصد لکچر دینا یا نصیحت کرنا نہیں ہے، میں صرف اپنے خیالات بیان کرکے آپ کی رائے لینا اور یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کہاں تک اتفاق ہے اور یہ اتفاق ہم آہنگی اور اتحادِ عمل پیدا کر سکتا ہے یا نہیں۔ ہماری چھوٹی سی جماعت کو اس کا موقع دیا گیا ہے کہ ایک انتشار زدہ ملت کے سامنے یک جہتی اور اتحاد کا نمونہ پیش کرے اور اگر ہم سچے دل سے ایسے مسلک کی تلاش میں لگے رہے جو سب کا مسلک بن سکے تو ہم کو ایک بڑی خدمت انجام دینے کا شرف حاصل ہوگا۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم آپس میں آزادی سے اپنے خیالات کا چرچا کریں۔ اور جو کچھ صحیح سمجھیں اُسے فقط زبان سے تسلیم نہ کریں بلکہ جہاں تک ممکن ہو عمل کے ذریعے اُسے آزماتے بھی رہیں۔ اُتنا ہی ضروری یہ بھی ہے کہ ہم دنیا کی تمام بڑی ذہنی اور معاشرتی تحریکوں کا مطالعہ کرتے رہیں اور اُن میں جو کچھ ہمیں قابلِ قدر معلوم ہو اُسے اپنے ذہنی اور اخلاقی سرمایے میں شامل کرتے رہیں۔ میں آج آپ کے سامنے اس مسئلے پر بحث کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا کی عام روش کو دیکھتے ہوئے ہمیں کون سی روش اختیار کرنی چاہیے اور ہم اس دولت کو جو مسلمان اور ہندوستانی ہونے کے سبب سے ہمیں ملی ہے کس طرح استعمال کر سکتے ہیں کہ ہمیں فائدہ بھی ہو اور ہمارا اصل سرمایہ بھی بڑھتا رہے۔

اس بحث کو میں اسی سوال سے شروع کروں گا جو باہر کے لوگ جامعہ والوں سے ہمیشہ پوچھتے ہیں کہ جامعہ کے طالب علم فارغ ہو کر کیا کر سکتے ہیں۔ جامعہ کے اساتذہ کے لئے اس کا سب سے آسان جواب یہ ہے کہ تعلیم گاہ کا یہ مقصد نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو نوکریاں دلوائے لیکن اس جواب سے ہماری ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے اور آپ کی مشکل آسان نہیں ہوتی۔ ہم نے ایک رسم کو جس کی لوگ ناعاقبت اندیشی مگر اطمینان سے پیروی کر رہے تھے غلط اور مضر ٹھہرا کر چھوڑ دیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کی جگہ ایک نیا نظامِ حیات تجویز کریں جو صحیح اور مفید ہو اور کوئی ایسا طرزِ عمل اختیار کریں جسے ہم اپنے دینی، اخلاقی اور سیاسی عقائد سے ہم آہنگ ثابت کر سکیں جو ہمارے علم میں جان ڈالے اور ہماری تعلیم گاہ میں سچائی اور مردم دوستی کی رونق پیدا کرے۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ ہونا چاہئے کہ تعلیم سے فارغ ہو کر آپ دنیا میں اجنبی بن کر نہ داخل ہوں بلکہ ہر لمحہ محسوس کریں کہ یہ وہی دنیا ہے جس کے لئے آپ جامعہ میں تیار کئے گئے ہیں اور اس میں وہی روش کامیاب ہوگی جس پر چلنا آپ کو جامعہ میں سکھایا گیا تھا۔

لیکن میں محض فرضی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ میں یہ بہت ضروری سمجھتا ہوں کہ نیا راستہ تلاش کرنے سے پہلے ہم کو پورا یقین ہو جائے کہ پرانا راستہ ہمیں منزلِ مقصود تک نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ راہ رو کے لئے ثابت قدمی شرط ہے، منزل خواہ دور ہو یا قریب، اور تھوڑی تھوڑی دور چل کر واپس آنا بھٹکنے کی سب سے زیادہ قابلِ افسوس کیفیت ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ جامعہ کے وجود اور یہاں اپنی موجودگی کو دم بھر کے لئے بھول جائیے اور اپنے ملک کی حالت پر غور کر کے سوچئے کہ آپ کے لئے کسبِ معاش کی کون کون سی صورتیں ہیں، اور اگر کسبِ معاش کے علاوہ آپ اور کوئی حوصلے رکھتے ہیں تو ان کے پورے ہونے کا کس قدر امکان ہے۔

سب سے پہلی صورت تو یہ ہے کہ آپ ملازمت کے لئے کوشش کریں۔ ملازمت کا میدان بہت وسیع ہے۔ مگر کسی ایک وقت میں دیکھئے تو اس میں گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ اور اس ذرا سی جگہ میں اتنے لوگ گھس جانے کو تیار کھڑے رہتے ہیں کہ آپ کی باری خدا جانے

کب آئے۔ اگر آپ کی قابلیت یا آپ کے خاندانی بزرگوں کا اثر یعنی خوشامد اور جوڑ توڑ کا، تو خیر ورنہ بہتر تو یہ ہے کہ آپ اِس طرف رخ ہی نہ کریں۔

نوکری کے لئے کوشش نہ کرنا آجکل کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ بہت سے نوجوان دو چار بار ٹھوکریں کھاکر یا ہوشیار ہوتے تو پہلے ہی سے ارادہ کر لیتے ہیں کہ ہم نوکری نہیں کریں گے۔ وہ تجارت، اخبار نویسی یا کبھی کبھی تصنیف و تالیف کو ذریعہ معاش بناتے ہیں۔ بعض اپنی قدرتی استعداد اور طبیعت کی مناسبت سے اِن پیشوں میں کامیاب ہوتے ہیں یا کم از کم ٹھکانے سے لگ جاتے ہیں۔ بہت سے ایسے بھی نکلتے ہیں جنھیں چند سال کے تجربے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے پیشے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ بہرحال نوکری سے آج کل اتنے لوگ مایوس ہو رہے ہیں اور ہماری تعلیم گاہیں اس مایوسی اور مصیبت کو بھگتنے کے لئے اتنے نوجوانوں کو تیار کر رہی ہیں کہ اور پیشوں میں بھی کامیاب ہونا خاصا دشوار ہو گیا ہے اور کسبِ معاش کی فکر اتنی بڑھ گئی ہے کہ اُس نے اور کسی فکر کے لئے جگہ نہیں چھوڑی ہے۔ ہم ایسے ناسمجھ نہیں ہیں کہ اِس قومی مصیبت کے اسباب سے واقف نہ ہوں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری موجودہ تعلیم ہم میں کوئی خاص استعداد پیدا نہیں کرتی۔ ہم ہر کام کو اناڑیوں کی طرح شروع کرتے ہیں۔ ہمارا تخیل اِس قدر کمزور اور پست ہے، ہمارا دِل اتنا چھوٹا کہ ہم صرف دوسروں کی نقل کر سکتے ہیں۔ تجربے سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور ضد اور حسد میں ایک دوسرے کا کام بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ ہماری زندگی میں اصلاح نہ ہوئی تو ہم طرح طرح کی نئی بلاؤں میں گرفتار ہوتے رہیں گے لیکن افراد میں اتنی ہمت، عاقبت اندیشی اور قابلیت نہیں ہے کہ وہ عام روش کے خلاف اصلاح کے خیال سے کوئی نئی وضع اختیار کریں یا کسبِ معاش کے نئے ذریعے دریافت کریں۔ حکومت کو ہماری ان دشواریوں سے کوئی مطلب نہیں اور ہمارے رہنما اتنے روشن خیال اور دور اندیش نہیں ہیں کہ اصلاح کی ایسی کوئی مہم سَر کرنے کا حوصلہ کریں۔

اِس لئے آپ جامعہ میں ہوں یا کہیں اور، اور آپ کو اپنے ذاتی اغراض کے سِوا اور کسی مسئلے سے سروکار ہو یا نہ ہو آپ ذرا بھی غور کریں تو ضرور اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آپ کا مستقبل کسی اعتبار سے اُمید افزا

نہیں ہے اور اس وقت کسی طرف سے اس کو بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے۔ اگر آپ ذاتی اغراض کی حد سے گذر کر ملک کی عام حالت پر نظر ڈالیں تو آپ کو اپنی دشواریاں ایک بڑے پیمانے پر دکھائی دیں گی اور وہی حیرانی جو آپ کو اپنے متعلق سوچنے سے پیدا ہوتی ہے آپ کو قوم کے مستقبل پر غور کرتے وقت ستائے گی۔ سب سے زیادہ تکلیف آپ کو غالباً اس بات سے ہو گی کہ ہم مجبور ہیں یا مجبور بن بیٹھے ہیں۔ تنکے کی طرح ایک دھارے میں بہے چلے جاتے ہیں۔ ہماری نظر میں نہ کوئی ساحل ہے جہاں ہم اپنے لئے ٹھکانا کرنے کی اُمید رکھ سکتے ہیں، نہ کوئی بے پایاں سمندر جس میں گم ہو جانا ہم اپنی حیات کی تکمیل قرار دے سکیں۔ اِس وقت ہم میں زیادہ تر لوگ ایسے ہیں جن کی سمجھ میں نہیں آیا ہے کہ ہماری زندگی میں کیسی تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور کیسی ہونی چاہئیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کا جو حصہ ملکی معاملات میں پیش پیش رہتا ہے اُس کے نزدیک ترقی اس میں ہے کہ ہمیں حکومت کے اختیارات ملیں، ملک میں بڑے بڑے کارخانے قائم ہوں جو ہمیں اِس لائق بنا دیں کہ ہم جاپان، امریکہ، اور انگلستان کی صنعت کا مقابلہ کر سکیں۔ ہماری رہائش میں وہ تمام آسانیاں اور روز مرّہ زندگی میں وہ تمام دلچسپیاں پیدا ہو جائیں جو مختلف آلات اور مشینوں اور فنونِ لطیفہ کی بدولت یورپ اور امریکہ میں پیدا کر لی گئی ہیں۔

لیکن یورپ اور امریکہ کی اندھی تقلید ہمیں راہِ راست پر نہیں لا سکتی۔ جب جماعت میں ربط اور اتحاد نہ ہو، افراد میں حکم دینے اور حکم بجا لانے کی استعداد اور عادت نہ ہو، وہ اجتماعی مقاصد کو ذاتی مقاصد نہ جانتے ہوں اور اُن کے لئے ایثار کرنے پر تیار نہ رہتے ہوں تو جمہوری حکومت، نعمت ہونے کی بجائے عذاب ہو جاتی ہے۔ ہم میں بے شک وہ اوصاف پیدا کئے جا سکتے ہیں جو جمہوری حکومت کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہیں۔ لیکن ابھی ہم نے اخلاقی تربیت کی طرف بالکل توجہ نہیں کی ہے۔ صرف حقوق اور امتیازات کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ہم میں بہت سے لوگ اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں۔ مگر ہم ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے ہیں کہ قوم اور قوم پرستی کا مفہوم کیا ہے۔ ہماری قوم پرستی اب تک ہماری اغراض کے مجموعے کا نام ہے جو اس وقت بالکل منتشر ہو جاتا ہے جب ہم اسے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ اب بھی دیکھ رہے ہیں کہ جوائنٹ

پارلیمنٹری کمیٹی کی تجاویز نامنظور کرنے میں تو خاصا اتفاق ہے۔ کمیونل اوارڈ پر مسلم اور مستند لیڈر بھی گفت گو کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ جب تک کوئی دشواری نہیں پیش آتی ہم خوشی خوشی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں، جب کوئی رکاوٹ دیکھتے ہیں تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔

یہی رویہ ہم نے معاشی معاملات میں اختیار کیا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ملک کی تجارت اور صنعت بالکل ہمارے ہاتھ میں آ جائے، اور ہمیں آہستہ آہستہ اس میں کامیابی ہو رہی ہے لیکن سرمایہ دار پیدا ہو جانے اور کاروبار کا پیمانہ بڑھ جانے سے افلاس اور بے روزگاری کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، کیونکہ آپ اس وقت دنیا میں ہر طرف بڑے پیمانے کی صنعت اور بے روزگاری کو پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ نظام سرمایہ داری کی بقا اور بہبود کا اپنا قانون ہوتا ہے، اور ایک مرتبہ اس کے جسم میں جان ڈال دی جائے تو پھر وہ اپنی اغراض اور اپنی سلامتی کے لئے لڑے گا اور ہم ایک اور جنجال میں پھنس جائیں گے۔

برادرانِ جامعہ!

میں یاس مشرب نہیں ہوں، اور آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ہم دنیا سے نرالے نہیں ہیں۔ ہماری جیسی حماقتیں اور بے پروائی دوسری قوموں نے بھی کی ہے، اور ایسی ہی مصیبتوں میں مبتلا ہو چکی ہیں۔ جماعتوں کا نقطۂ نظر، افراد کی ذہنیت ایک وقت میں نہیں بدلتی، اصلاح کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب ایک ساتھ سدھر جائیں اور سب ایک ارادے اور ایک طریقے سے کسی اصول پر عمل کریں۔ لیکن جماعتیں ترقی اسی وقت کرتی ہیں جب ان کے اندر ایسی چھوٹی جماعتیں قائم ہو جائیں جو اپنے اصول اور عمل کو باقی کے لئے ایک مثال بنائیں۔ جن مسائل پر دوسرے غور نہیں کرتے ان پر غور کریں، جو خطرے دوسروں کو نظر نہیں آتے ان سے سب کو آگاہ کریں اور اصلاح اور ترقی کی نئی تدبیریں کرتے رہیں۔ میرے خیال میں ہماری چھوٹی سی جماعت ہندوستانی مسلمانوں کے لئے، اور ہندوستانی مسلمانوں کو تمام ہندوستانیوں کے لئے یہ خدمت انجام دینے کا ارادہ کرنا چاہیے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم برتری کا دعویٰ کریں یا اپنے آپ کو برگزیدہ ہستیاں سمجھیں۔ جامعہ کی حالت نہایت نازک رہتی ہے۔ مسلمان

انتشار اور پستی کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ہر میدان سے اُن کے قدم اُکھڑ رہے ہیں۔ اپنی اصل سے جس قدر دور وہ ہیں ہندوستان کی اور کوئی ملت نہیں ہے۔ ہماری سلامتی کی میرے خیال میں اب یہی ایک تدبیر ہے کہ ہم اپنے حوصلوں کو ایڑ لگائیں اور فوری نقصان اٹھا کر بھی اپنا پورا اخلاقی اور دنیاوی سرمایہ قومی زندگی کی تعمیر میں لگا دیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں دنیا اور دنیاوی مفاد کو ٹھکرا کر بالکل اخلاقی اور دینی مقاصد میں محو ہو جانا چاہئے۔ ہم دنیا کو سمجھے بغیر دین کو نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس وقت اگر ہم اپنی ملی اور قومی ضروریات اور فرائض کا صحیح اندازہ نہ کر سکے تو ہم دنیا سے بھی جائیں گے اور دین سے بھی ہم کو اس زمانے کی تمام بڑی تحریکوں اور عالمگیر مسائل کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اَب آمد و رفت کے ذریعے ایسے ہو گئے ہیں کہ دنیا کا کوئی حصہ خارجی اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ پھر ہمیں دنیا کی عام روش اور دوسرے ملکوں کے تجربے کو سامنے رکھکر اپنے ملکی مسائل پر غور کرنا چاہئے اور یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارے اور آئندہ نسلوں کے لئے عزت اور فراغت سے زندگی بسر کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہم کس طرح سے دنیا میں اپنا اور اپنی قوم کا اعتبار قائم کر سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اِس دینی، اخلاقی اور تہذیبی دولت کا جو ہمیں ورثے میں ملی ہے کس طرح مستحق ثابت کر سکتے ہیں۔

برادرانِ جامعہ!

انسانی زندگی میں ہر وقت مختلف قوتیں اور تحریکیں برسرِ پیکار رہتی ہیں، اور اس زمانے میں بھی ایک دو رخی جنگ ہے جو دنیا کے ہر گوشے میں جاری ہے اور ہندوستان میں بھی اس کے لئے میدان تیار ہو رہا ہے۔ ایک طرف انسان اور مشین، پرانی تہذیبی حدود اور مشین پرستی کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ دوسری طرف مذہب اور لامذہبیت ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے ہیں۔ مشین پرستی اور لامذہبیت میں پورا اتفاق اور اتحادِ عمل ہے۔ تہذیب اور مذہب مجبور ہو کر ایک دوسرے سے ملے ہیں اور اُن کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے۔ اگرچہ دونوں کے علمبرداروں نے یہ اچھی طرح سمجھ لیا ہے کہ اُن میں سے کوئی ایک اکیلا سلامت نہیں رہ سکتا۔ کامیاب ہوں گے تو دونوں، تباہ ہوں گے تو دونوں۔ مشین پرستی اور لامذہبیت کے مرکز امریکہ اور روس ہیں، اور انھوں نے پرانی یورپی تہذیب پر قریب قریب فتح حاصل کر لی ہے۔ اَب ہم

کسی یورپی قوم کو انسانیت اور مذہب کا سچا حامی نہیں سمجھ سکتے۔ اُن کی پُشت و پناہ صرف افراد اور محدود حلقے ہیں۔ مشرقی دنیا پر مشین پرستی اور لامذہبیت کے حملے شروع ہو گئے ہیں اور بہت سی تعلیم گاہوں پر اُنھوں نے اپنا قبضہ جما لیا ہے۔ لیکن ہم وقت پر ہوشیار ہو جائیں تو اب بھی مقابلے کا بہت اچھا موقع ہے۔

سب سے پہلے تو ہمیں چاہئے کہ اپنے حریف کی خصوصیات کا بخوبی مشاہدہ اور مطالعہ کریں۔ مشین پرستی کی ابتدا اٹھارہویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے ساتھ ہوئی۔ جب لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ سائنس کی ترقی سے انسان، جو ہمیشہ مجبور سمجھا جاتا تمام مادّی قوتوں کو اپنے قابو میں کر لے گا اور اصلاح اور ترقی کے لئے عقیدے اور عمل کی درستی سے زیادہ ضروری نئی کلوں کی ایجاد اور کاروبار کی نئی سہولتیں ہیں۔ اِس وقت مشین پرستوں کی زندگی کا معیار کارخانے کا معمول ہے۔ اُن کے اخلاق کا معیار چالاک اور کامیاب تاجر کا طرزِ عمل ہے۔ اُن کے نزدیک حسین وہی چیز ہوتی ہے جو مشین سے بنائی جائے، اور وہی چیز قابلِ قدر ہے جس کی بدولت روپیہ کمایا جا سکے۔ اُنھیں اِس پر افسوس نہیں ہوتا کہ مشین کا رواج ہر قسم کے ہنر کے لئے مہلک ہے، کیونکہ وہ انسان کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیزوں کو بدنما اور بھونڈی سمجھتے ہیں اور اُنھیں کچھ پروا نہیں ہوتی اگر دولت پیدا کرنے کا خیال کسی قوم پر بھوت کی طرح سوار ہو جائے اور اُس کے افراد کے اور تمام حوصلے مر جائیں۔ اُن کے نقطۂ نظر سے دُنیا کو خوش اور آباد رکھنے کے لئے مشین اور اشتہار کافی ہیں اور جو اُن دونوں کے رموز سے واقف ہو اُسے کوئی اور علم، کوئی اور ہنر، کوئی اور حقیقت درکار نہیں۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مشین پرستی کے مسلک میں چند خوبیاں بھی ہیں جو اُسے نہایت دلکش بنا دیتی ہیں۔ انسان، رسم و رواج کا بندہ نہیں رہتا، رہائش میں ہزاروں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، دولت اور سامانِ عیش کی افراط ہوتی ہے اور غریب اور کم ترقی یافتہ قوموں کو معلوم ہوتا ہے کہ مشین پرست ملکوں میں سب خوش، تندرست اور دولتمند ہوتے ہیں۔

مشین پرستی کا دوسرا رُخ موجودہ فلسفۂ اشتراک ہے۔ روس میں جو اشتراکی نظام ۱۹۱۷ء کے بعد

قائم ہوا اُس کے خاکے بھی صنعتی انقلاب کے زمانے میں بنائے جانے لگے تھے۔ پہلے اُن میں مردم دوستی اور اخلاقی آئین کو زیادہ دخل تھا لیکن بعد کو اشتراکیت کا علومِ صحیحہ میں شمار ہونے لگا۔ اور کارل مارکس کی تعلیم میں جو اشتراکیت کا سب سے مکمل اور مؤثر نمونہ ہے علومِ صحیحہ کے سوا اور کوئی علم مادے کے سوا وجود کی کوئی اور شکل، اشتراکیت کے سوا زندگی کا کوئی اور نظام تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اشتراکی فلسفۂ حیات میں مذہب کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اوّل اِس وجہ سے کہ اشتراکیوں کے نزدیک مذہب، سرمایہ داروں کا سب سے زیادہ کارگر ہتھیار رہا ہے، اور اُسی کی بدولت کسان اور مزدور اپنے حق سے محروم اور اپنی غلامی سے مطمئن رکھے گئے ہیں۔ دوسرے اس لئے کہ انسان کا وجود بالکل مادّی ٹھہرایا گیا ہے اور انسان کے تمام عقائد، حوصلے، خیالات، احساسات اور خواہشیں مادی اثرات اور خارجی تحریکوں کا نتیجہ مانی گئی ہیں۔ ایسے نظریئے یورپ میں بھی پیش کئے گئے، اور وہاں وہ مجموعی طور پر دہریت کہلاتے تھے۔ روس میں یہ نظریوں کی حد سے گذر کر عقائد بن گئے ہیں، ان کی ہر طرح سے تبلیغ کی جاتی ہے، اور وہ ایک مذہب ہے جو تمام اور مذہبوں کے مٹانے کی فکر میں ہے۔ چونکہ باقی دُنیا کے تمدن اور تہذیب کا انحصار سرمایہ داری اور بڑے پیمانے کی صنعت پر ہے، اور کسان اور مزدور ہر جگہ اپنے حق سے کم و بیش محروم رکھے گئے ہیں، روسی اشتراکیت اپنے حریفوں کی جماعت میں بدنظمی اور فساد پیدا کرتی رہتی ہے، اور کوئی تعجب نہیں اگر اُسے آخر میں اُن پر فتح حاصل ہو۔

تہذیب، انسان کی دلچسپیوں کو اِس قدر بڑھا دیتی ہے کہ دولت جمع کرنا زندگی کا واحد مقصد نہیں بن سکتا۔ لیکن دولت کے بغیر تہذیب قائم نہیں رہ سکتی۔ یورپ کی مہذب قومیں امریکی صنعت کا مقابلہ نہیں کر سکیں، اس لئے جنگِ عظیم کے بعد سے امریکہ کی نقل ہونے لگی اور صنعتی کامیابی پر اور تمام حوصلے قربان کئے جانے لگے۔ دوسری طرف روسی اشتراک کو زور پکڑتے دیکھ کر سرمایہ دار اور خوشحال طبقوں میں فاشسٹ تحریک کی ابتدا ہوئی جس کا اِس وقت جرمنی اور اطالیہ میں دور دورہ ہے۔ اِن دونوں تحریکوں میں وہ ذہنی اور اخلاقی اُمنگیں، نوعِ انسانی اور عقیدے کا وہ احترام جو تہذیب کی جان ہے نظرانداز کیا گیا ہے، انسانوں کو انھوں نے بھی ایک بڑی مشین کے کل پرزے

بنا دیا ہے ۔ بس مشین کا نام دوسرا رکھ دیا ہے اِسی بنا پر میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یورپی تہذیب، مشین پرستی اور لا مذہبیت کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے ۔

ہندوستان میں مشین پرستی کے رواج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمارے یہاں جو رہی سہی صنعتیں ہیں وہ تباہ ہو جائیں گی، ہمارے سرمایہ دار اس فکر میں پڑ جائیں گے کہ ہر کام مشین سے کریں، اور اگر وہ اس میں کامیاب ہوئے تو ہمارے مزدوروں پر ہر پانچ دس سال کے بعد فاقہ کشی کی مصیبتیں نازل ہوا کریں گی۔ اگر زمین کی کاشت مشین سے ہونے لگی، اور کسان کو مقابلے سے محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر نہ کی گئی تو اور بھی طوفان برپا ہوگا۔ دوسری طرف روسی اشتراکیت کے رواج کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم انگلستان کی جگہ روس کے غلام بن جائیں گے، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو ہماری قوم ممکن ہے برسوں تک ایسے چارہ سازوں کا تختۂ مشق بنی رہے جو نہ ہماری سیرت کا خیال کریں گے نہ ہماری روایات اور ہمارے مذہب کا پاس لحاظ کریں گے اور جو اپنی پیاس بجھانے کے لئے خون کی ندیاں بہائیں گے۔

ان آفتوں سے بچنے کے لئے ہم کچھ نہیں کر رہے ہیں، کیونکہ جمہوری حکومت اور صنعتی خود مختاری جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں دونوں ہماری حفاظت کے لئے کام نہ آئیں گی۔

سیاسی آزادی دنیا کے بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر جمہوری طرزِ حکومت جو کبھی زمانے میں ہر مرض کا علاج سمجھا جاتا تھا، ہر جگہ بے وقعت ہو رہا ہے۔ معاشی آزادی بھی بہت سے ملکوں کو حاصل ہے مگر بڑے پیمانے کی صنعت اتنی مدت سے معاشرت اور تخیل پر چھائی ہوئی ہے اور اس نے قوموں کو ایسے جھگڑوں میں پھنسا دیا ہے کہ اب معلوم ہوتا ہے وہ سب کو اپنے ساتھ لے ڈوبے گی۔ اشتراکیت کے پہلے مجاہد یہ دعوے کرتے تھے کہ دنیا کی معاشی اور صنعتی کشمکش، اشتراکی نظام قائم ہوتے ہی غائب ہو جائے گی۔ مگر روس کی اشتراکی حکومت ہر طرح کے سرمایہ داری نظام کی نقل کر رہی ہے، اور اس میں ایک یہ شیطانی جذبہ اور ہے کہ ساری دنیا کے معاشی نظام کو درہم برہم کرکے ہر جگہ اتنا فساد برپا کرے کہ مزدور اور کسان، نظامِ حکومت پر قبضہ کر لیں اور سرمایہ داروں کو بے دخل کر دیں۔

ہمارے لئے یورپ اور امریکہ کی جمہوریت اور سرمایہ داری، روس کی اشتراکیت اور جنگ جوئی

مطالعہ کے لائق ہیں، تقلید کے لائق نہیں ہیں ہم کو اُن سے سبق لینا ہے اور اُن کی کمی پوری کرنا ہے اپنے ملک میں ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا ہے جو چُست اور مضبوط ہو۔ اپنے اندر ترقی اور نشو ونما کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنی بقا کے لئے کسی دوسرے کو ہلاک کرنے پر مجبور نہ ہو۔ ہمارے ملک میں نئی تہذیب، نئی سیاسی زندگی، نئی صنعت اور نئی معاشرت کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے۔ ہم کسی رستے پر اتنی دور نہیں نکل گئے ہیں کہ واپسی میں بہت زیادہ زحمت ہو۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہم ایک مذہب کے پیرو ہیں جو ایک نہیں ہزار تہذیبوں کی روح رواں ہو سکتا ہے، اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہمارا یقین پختہ ہو اور حوصلہ بلند تو ہم اس مہم میں کامیاب ہوں گے اور جہاں اس وقت دوسروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں وہاں شاید دوسروں کی رہبری کریں گے۔

برادرانِ جامعہ!

ہمارا ایک عام عقیدہ ہے کہ مذہب، زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔ اس لئے علم اور مذہب کو جُدا کرنا، سیاسیات اور مذہب کو ایک دوسرے سے بے تعلق سمجھنا، معاشرت اور معاملات میں مذہبی آئین کا لحاظ نہ رکھنا بالکل غلط ہے لیکن افسوس ہے ہم اس صحیح اور مفید عقیدے سے جو نتیجے نکالتے ہیں اُن سے منطق اور مصلحت دونوں کا خون ہوتا ہے، اور ہماری زندگی میں کوئی مذہبی اور روحانی شان پیدا نہیں ہوتی۔ اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کے شوق میں ہم علم دوستی کے آداب بھول جاتے ہیں۔ ہم ہر چھوٹی بڑی اور اچھی بُری معاشرتی رسم کو شرعی حکم ٹھہرا کر اپنی نشوونما کو روکتے رہتے ہیں لیکن ان مسائل سے یہاں بحث نہیں ہے۔ میں آپ کو خاص طور پر اس نقصان کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو اس عقیدے کی غلط تشریح سے ہماری سیاسی حیثیت کو پہنچا ہے۔ کیونکہ ہم ہر مسئلے پر غور کرتے وقت مسلمانوں کے فرائض کو نظر انداز کر کے صرف ان کی فوری اغراض کا خیال کرتے ہیں اور سیاسی اختلافات کو خواہ مخواہ مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔ ہمیں بے شک سیاسیات اور مذہب کو جُدا نہ کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ کبھی نہ کہنا چاہئے کہ فلاں کام سیاسی ہے، اسے ہم چاہیں کریں یا نہ کریں۔ لیکن فلاں کام دینی ہے اسے ہم ضرور کریں گے، ہمارا فرض ہے کہ اگر

سیاسی مفاد کے نام سے اخلاقی قانون کی خلاف ورزی کی جارہی ہو تو ہم اخلاق کی حمایت کریں، لیکن یہ سمجھ بیٹھنا کہ سیاسیات سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں، ہندوستان آزاد ہو یا نہ ہو ہندوستانی صنعت اور تجارت ترقی کرے یا نہ کرے ہمیں کوئی مطلب نہیں۔ یہ مصلحت اور میرے خیال میں ہماری مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم اپنے مذہب اور اپنی روایات کی صحیح ترجمانی کریں تو ہم کو قوم پرستوں اور آزادی کے مجاہدوں میں سب سے آگے ہونا چاہئے۔ ہم کو علوم وفنون، صنعت اور تجارت پر اپنا سکہ جمانا چاہئے، اور جن حقوق کے لئے ہم اس وقت ایک نہایت مضحک اور مہمل طریقے پر لڑ رہے ہیں انھیں سیاسی زندگی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر بغیر محبت اور مطالبے کے حاصل کرنا چاہئے۔ لیکن آزادی کے لئے قربانیاں کرنا، جمہوری حکومت کا ایک سُلجھا ہوا نظام قائم کرنا، اور اُسے خود مختاری اور فرماں برداری، آزادی اور ضبطِ نفس، خدمت اور ایثار کی نمایاں مثالیں پیش کر کے مستحکم کرنا درحصل ہمارے فرائض کا صرف ایک حصہ ہے۔ ہمیں اُن معاشرتی اصلاحوں کا ذمہ بھی اپنے سر لینا ہے جس کے بغیر ہماری جماعت لادینی اشتراکیت کے حملوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی، اور مذہبیت کی تخلیقی قوت کے اوصاف اور کارنامے دنیا پر ظاہر کر کے لا مذہبیت کے فساد کو دور کرنا ہے۔

برادرانِ جامعہ! ہر کام کے لئے موقع درکار ہوتا ہے۔ ہر اجتماعی عمل کے لئے ایک میدان چاہئے۔ دنیا کا ہر ملک ہمارا ملک ہے۔ اس لئے کہ وہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔ مگر کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم کو ہر جگہ پردیسی بن کر رہنا چاہئے۔ وہاں کی نعمتوں کو اپنے اوپر حرام کر لینا وہاں کی مشکلوں کو اپنی مشکلیں نہ سمجھنا چاہئے؟ اس وقت ہندوستان، ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں اور ہریجنوں میں تقسیم کیا جارہا ہے، اور سب کے دلوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہندوستان کا وہی حصہ اُن کا ہے جس میں اُن کی اکثریت ہے، اور سب جو چاہیں سمجھیں۔ مسلمان اب تک ہندوستان کو ایک مکمل سیاسی وجود مانتے آئے ہیں اور اس عقیدے سے اُن کی اپنی تعداد کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔ ہم کو شمالی ہندوستان میں ایک متحد مرکزی حکومت قائم کئے ہوئے چند ہی سال گذرے تھے جب تاتاریوں نے

آکر عالمِ اسلامی کو تہ و بالا کر دیا۔ ہماری کمزور نو عمر ریاست نے اُن کا بڑی جاں فشانی اور استقلال سے مقابلہ کیا، اور ہندوستان کو اُن کے مظالم سے محفوظ رکھا۔ یہ یقیناً جاں بازی اور حسنِ انتظام کا کرشمہ تھا۔ راجپوتوں کی حکومت کو چند حملوں نے ختم کر دیا۔ مرہٹوں کے حوصلوں کو ایک فیصلہ کن جنگ نے خاک میں ملا دیا۔ انگریز بھی غداری اور دغابازی کا سہارا لئے بغیر میدان میں آنے کی ہمت نہ کر سکے، اور انھیں بھی اگر پچہتر برس تک مسلسل تاتاروں جیسے بے باک دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تو خدا جانے اُن کا کیا حشر ہوتا۔ ہم ہندوستان کے لئے غیروں سے لڑے اور اپنے مذہب والوں سے لڑے، ہم نے اُسے فساد سے بچانے کے لئے اپنوں کا خون کیا۔ ہندوستان اگر ہمارا ملک نہیں ہے تو کس کا ہے۔ اس کا حق ہم پر نہیں ہے تو کس پر ہے۔ آپ اپنی تاریخ اور روایات پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ آج کل آپ اِس مُلک اور اِس مُلک کے دوسرے باشندوں سے کیسی غیریت اور بے اعتنائی برت رہے ہیں۔ آپ کے اجداد نے کس ہمت اور استقلال سے اندرونی مشکلات اور بیرونی دشمنوں کا سامنا کیا۔ اور اِس وقت آپ کس پست ہمتی سے اکثریت اور تحفظِ حقوق کا آسرا ڈھونڈھتے ہیں ہندوستان بے شک اِس اعتبار سے ہمارا مُلک نہیں ہو سکتا کہ ہم بغیر کسی کی شرکت کے اِس پر حکومت کریں۔ لیکن اِس اعتبار سے وہ ہمیشہ ہمارا ملک رہے گا کہ اس امن و عافیت اور بہبود کے لئے ہم نے اپنا خون بہایا ہے، ہم نے اُسے مقامی پستی اور تنگ نظری کی قید سے چھڑایا، ہم نے ایسی معاشرت کا نمونہ پیش کیا جس میں ذات اور نسل کا امتیاز نہیں تھا۔ اور ہم نے اُسے ایک آزاد مذہب کا پیغام سنایا۔ گذشتہ اور موجودہ زمانے میں میرے نزدیک ضرور اتنا فرق ہے کہ اب ہمیں اتحادِ عمل کا سبق پڑھنا اور پڑھانا ہے اور یہ ہمارے لئے ہر طرح سے مفید ہو گا۔

اِس وقت ہمارا سیاسی اور دینی فرض یہ ہے کہ ہندوستانی اتحاد کا جھنڈا کھڑا کریں۔ اور اتحاد کے ارادے کو اتنی تقویت پہنچائیں کہ وہ ہر ضروری انتظامی تفرلق پر غالب رہے۔ دوسرے اگر اس میں کمزوری بھی دکھائیں اور زبان یا نسل یا مصلحت کی آڑ لے کر اپنی اغراض اور اپنی دلچسپیوں، اپنے مقاصد اور حوصلوں کو محدود کرنا چاہئیں تب بھی ہمیں اتحاد اور وحدت کے شیدائی بنے رہنا چاہئے۔

سیاسی تفریق [illegible] گہری ہوگئی تو ہمارا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہماری ملت میں بھی انتشار پیدا ہوجائے گا۔ ایک خطے کے مسلمان، دوسرے خطے کے مسلمانوں کو بیگانہ سمجھنے لگیں گے، ہم میں ابھرنے اور ترقی کرنے کا جو مادہ ہے وہ آہستہ آہستہ زائل ہوجائے گا، اور ہم بالکل مقام کے غلام ہوجائیں گے مسلمانوں میں کسی قسم کی تفریق مذہب اور روایات کے رو سے مناسب نہیں ہے، اور جب وہ مصلحت اور عاقبت اندیشی کے خلاف ہو تب تو اسے کسی حالت میں گوارا نہ کرنا چاہیئے۔ ہندوستان کی دوسری ملتوں کو یگانگی اور اتحاد کا جذبہ بیدار کرنے میں بڑی مشکلیں پیش آرہی ہیں، اس وجہ سے وہ وطن پرستی اور قوم پرستی پر زور دیتی ہیں اور اسے ایک سیاسی مذہب بنانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہمیں اُن کی مجبوری دیکھ کر اُن پر اعتراض نہ کرنا چاہیئے۔ وہ بے شک چاہیں تو وطن پرستی کے گیت گائیں اور وطن کو دیوی بنا کر اُس کی پرستش کریں۔ ہماری خدا پرستی ہمارے لیے کافی ہے۔

اتحاد کے بعد نظامِ حکومت کا سوال آتا ہے۔ مسلمانوں میں جمہوری حکومت بھی رہی ہے اور خلافت کے نام سے غیر ذمہ دارانہ حکومت بھی ہوئی ہے۔ ہم میں نیک بادشاہ ہوئے ہیں اور ظالم بھی ہوئے ہیں۔ لیکن جو طرزِ حکومت ہمارے دینی اور اخلاقی آئین سے سب سے زیادہ قریب ہے وہ جمہوری حکومت ہے۔ جمہوری حکومت ہزاروں طرح کی ہوتی ہے اور اُس کا نظام قوم کی ضرورت اور مصلحت کے مطابق بدلا جاسکتا ہے۔ جمہوریت کی روح یہ ہے کہ قوم کا ہر فرد اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار سمجھے، حکومت کے ہر معاملے کو اپنا معاملہ جانے، اِس کی کامیابی میں اپنی کامیابی اِس کے عیب میں اپنا عیب دیکھے۔ آپ کے سامنے اِس دعوے کے ثبوت پیش کرنے کی ضرورت نہیں کہ اِس وقت ہماری قوم، حکومت کو غیروں کی حکومت سمجھتی ہے۔ اِس جمہوریت سے جس کے حاصل کرنے کی آج کل کوشش کی جارہی ہے، اِس کو کوئی لگاؤ نہیں ہے، اور انگریزوں کے طعنے سُن کر بھی ہمارے سیاسی رہنما کوئی دستور اور نظامِ حکومت متفقہ تجویز کے طور پر پیش نہیں کرسکے ہیں۔ اِس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہماری سیاسی تحریک دراصل بے بُنیاد ہے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ملے گی تو کیا کریں گے۔ ہماری سیاسی زندگی میں ارادے کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کہ ہوا میں اُڑتے ہوئے تنکوں کو۔

اس سے ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہمارا طرزِ عمل سراسر غلط ہے۔ ہم اپنی زندگی اور اپنے عمل میں ایک خلو پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ ہم مرکزی حکومت میں اختیار چاہتے ہیں جب ہمیں گاؤں میں کوئی اختیار نہیں، ہم قوم کے ارادے اور حوصلے کی قسمیں کھاتے ہیں جب قوم کے پچانوے فی صدی افراد ہماری باتوں کو سنتے نہیں اور سنتے بھی ہیں تو سمجھتے نہیں۔ ہماری سیاسی تحریک میں جان اُس وقت پڑے گی جب وہ کسان اور مزدور کے گھر سے شروع ہو، جب اس کے مقاصد قوم کے مشترک مقاصد ہوں، اور فقط ایک تعلیم یافتہ طبقے کی اغراض نہ ہوں لیکن سوا چند سرپھرے نوجوانوں کے ہمارے سیاسی رہنما کسان اور مزدور بلکہ ہر طرح کے غریب آدمی سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اور اُن کا یہ خوف بے جا نہیں ہے۔ اوّل تو حکومت برطانیہ اُسی وقت تک چشم پوشی کرتی ہے جب تک آزادی اور اختیاراتِ حکومت کی بحث تعلیم یافتہ طبقے کی دلچسپی ہی رہے۔ کیونکہ مزدور اور کسان تک بات پہنچ گئی تو اس کا کام بگڑ جائے گا، دوسرے یہ کہ ہمارے رہنما اور آزادی کے مجاہد، مزدوروں اور کسانوں کی شرکت سے گھبراتے ہیں، اس لئے کہ پھر وہ بھی اپنا حق مانگیں گے اور انھیں اُن کا حق دینے پر کوئی تیار نہیں ہے۔

لیکن ہم بہت دنوں تک کسانوں اور مزدوروں کو اپنی سیاسی معاشرتی تحریکوں سے بے خبر اور بے تعلق رکھ نہیں سکتے۔ ہمیں اُن کے پاس جانا ہوگا اور کچھ تحفے لے کر جانا ہوگا۔ آپ جانتے ہیں چند سال ہوئے ایک اشتراکی پارٹی قائم ہوئی تھی جو اس وقت کچھ کانگریس کے ساتھ ہے۔ کچھ اس سے علیحدہ مگر تھوڑے دنوں میں وہ یقیناً ایک جداگانہ حیثیت اختیار کرلے گی اور اس کے رہبر ہمت نہ ہارے تو اس کا اثر کانگریس سے کہیں زیادہ ہوگا۔ آج کل ہماری تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو بیشتر نوجوان خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، اپنے آپ کو اشتراکی بتائیں گے، اور اُن میں سے اکثر مذہب، روایات اور پُرانی تہذیب کو مٹانا چاہتے ہوں گے۔ ابھی تک اشتراکی پارٹی اور اشتراکیت پسند نوجوان اپنے عقاید کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ جب کوئی آزمائش کا موقعہ آئے گا یا وہ خود ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو اُن کی بہت بڑی تعداد اشتراکیت سے توبہ کرکے الگ ہو جائے گی، لیکن اس کا بھی امکان ہے کہ اُن میں

تھوڑے سے جاں باز پیدا ہو جائیں اور انھیں ذرا بھی مہلت مل گئی تو وہ ایسی آگ لگا دیں گے جو پھر کسی کے بجھائے نہ بجھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی رہبر اشتراکی پارٹی سے مصالحت کرنے میں ناکامیاب ہوئے ہیں، اور جب تک وہ ہندوستان کے سرمایہ داروں کا سہارا ڈھونڈھتے رہیں گے انھیں مصالحت کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ اس طرح سے اشتراکی پارٹی اُن لوگوں کے اثر سے آزاد ہو گئی ہے جو کسی قدر محتاط ہیں۔ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ہماری تعلیم گاہیں نوجوانوں کو کسی ایسے ڈھرّے پر لگانے سے قاصر ہیں جو اشتراکیت کی طرح اُن کے تخیل کو گرویدہ کر سکے، یا جو اُن کے عقائد میں گہرائی پیدا کر سکے۔ معلوم ہوتا ہے جس طرح ہمارے سیاسی حوصلوں کی کشتی بغیر ناخدا اور بغیر قطب نما کے چکر کھاتی کناروں سے ٹکراتی چلی جا رہی ہے اور کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کہاں جا کر ٹھہرے گی، ویسے ہی ہماری معاشی اور صنعتی اصلاح بد نظمی اور انتشار کا ایک عبرت انگیز نمونہ ہو گی۔

اس وقت بہت سے مسلمان نوجوان ہیں جو اشتراکیت کے بہت جوشیلے حامی ہیں، مگر اُن کے خیالات کا اثر ابھی تک ظاہر نہیں ہوا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مجموعی حیثیت سے مسلمان اشتراکیت کے مسئلے سے نہ واقفیت رکھتے ہیں نہ دلچسپی۔ اس معاملے میں اُن کی غفلت اُن کے اور ہندوستان کے لیے اتنی ہی نقصان دہ ہو گی جتنی کہ اتحاد اور جمہوریت کے مسائل میں، کیونکہ اُن کی فطرت سرشت اور عقائد میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اشتراکیت کی تحریک کو لامذہبیت، مشین پرستی اور اخلاقی بے لگامی کی آلائشوں سے پاک کر کے مساوات، انصاف اور حقوق و فرائض کی صحیح تقسیم کا حامل بنائیں۔ اشتراکیت کی تحریک ابتدا میں بس اس کی ایک کوشش تھی کہ مزدوروں کو وہ تمام حقوق دیے جائیں جو جماعت میں انصاف اور مساوات کے رو سے ہر شخص کے ہونے چاہییں اور کارخانوں میں اُن پر جو مظالم ہوتے تھے وہ بند ہو جائیں۔ لیکن سرمایہ داری کی اصلاح کا یہ طریقہ بے اثر ثابت ہوا، کیونکہ دوسری طرف سرمایہ داروں کو ہر قسم کے دباؤ سے محفوظ رکھنے کی فکر کی جا رہی تھی اور صنعتی کاروبار کا پیمانہ بڑھایا جا رہا تھا۔ آخر میں سرمایہ داری کا نظام اس قدر مستحکم ہو گیا کہ وہ ریاستوں کے قابو سے بھی باہر ہو گیا، اور اسی زمانے میں ہزیمت خوردہ اشتراکیت ایک نئے اور جامع

فلسفۂ حیات کی صورت لے کر کارل مارکس کی تعلیم میں نمودار ہوئی۔ کارل مارکس کے فلسفے میں سرمایہ دار اور مزدور کی کشمکش انسانی زندگی اور تاریخ کا لب لباب ہے۔ اس میں موجودہ عہد کی سرمایہ داری صنعتی ترقی کی منزلِ مقصود قرار دی گئی ہے اور یہ دکھایا گیا ہے کہ ساری دنیا کا صنعتی نظام آخر میں چند سرمایہ داروں کے قبضے میں آجائے گا۔ تب مزدوروں کو اس کا موقع ملے گا کہ وہ صنعتی دنیا کے ان چند بادشاہوں کو معزول کر کے اُن کی سلطنت پر قبضہ کر لیں اور حکومت جو اُن کا حق ہے اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ کارل مارکس کو یقین تھا کہ اگر مذہب اور مذہبی رہنما ملکیت کے حق کو دینی اور اخلاقی قانون بنا کر اہلِ سرمایہ کی مدد نہ کرتے اور مزدوروں اور کسانوں کو جنت اور روحانی تسلیوں کا فریب دے کر قناعت اور بردباری پر آمادہ نہ رکھتے تو وہ ہزاروں برس کی غلامی ہرگز برداشت نہ کرتے۔ اس وجہ سے کارل مارکس نے لامذہبیت کو اپنی اشتراکی تعلیم کا سنگِ بنیاد بنایا اور اسی سبب سے روسی اشتراکی جو کارل مارکس کی تعلیم کو عینِ حقیقت مانتے ہیں مذہب کے وجود کو مٹانا چاہتے ہیں۔

کارل مارکس کے تقریباً تمام نظریے غلط ثابت کئے جا چکے ہیں، اور روس میں بھی اُن پر برائے نام عمل ہو رہا ہے لیکن اب وہ ایک مذہب بن گئے ہیں جس کی نہایت جوش اور عقیدت کے ساتھ تبلیغ کی جاتی ہے، اور دُنیا میں جہاں کہیں بھی افلاس یا بے چینی ہے وہاں یہ مذہب بہت آسانی کے ساتھ پھیل جاتا ہے، ہم اس کا مقابلہ دلیلوں سے نہیں کر سکتے، اگر ہم اس سے نفرت ظاہر کریں گے اور اس کے پیرووں پر کسی قسم کا جبر کریں گے تو اُن کا عقیدہ اور مضبوط ہو جائے گا۔ اس سے ہم رواداری بھی نہیں برت سکتے، کیونکہ وہ خود رواداری کو غلط سمجھتا ہے اور جس طرح روس میں مذہب نیست و نابود کر دیا گیا ہے ویسے ہی ہندوستان میں بھی فنا کر دیا جائے گا۔ مذہبِ اشتراک کا توڑ صرف ایسی اصلاحیں ہو سکتی ہیں جو ہمارے مُلک کے افلاس کو دور کریں اور کسانوں اور مزدوروں کے لئے شکایت کا موقع نہ رکھیں

صحیح اشتراکیت کے معنی یہ ہیں کہ دولت کی قدر انسان کی قدر سے بڑھنے نہ پائے، اور

افراد کے حقِ ملکیت کو محفوظ رکھنے کی خاطر جماعت کے بہت بڑے حصّے کو فاقہ کرنے اور طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنے پر مجبور نہ کیا جائے۔ اشتراکی نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ زمین اور سرمایہ افراد کی جگہ جماعت کی مِلک قرار دیا جائے۔ اور جماعت کے ہر فرد کو اس سے مستفید ہونے کا موقعہ دیا جائے۔ سرمایہ کے استعمال کی ترکیب کیا ہوگی؟ یہ ہر جماعت کی معاشی حالت پر منحصر ہے۔ لیکن یہ ہرگز لازمی نہیں ہے کہ اشتراکیت کے اصولوں پر اُسی وقت عمل کیا جائے جب بڑے پیمانے کی صنعت کا رواج ہو جائے۔

اگر ہم امریکہ کی مشین پرستی اور روسی اشتراک کے فریب میں نہ آئے، اگر ہم نے کسان کے سر مالگزاری، زمیندار اور سود خوار کا بوجھ ہلکا کر دیا اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ دے سکے، اگر ہم نے شہروں میں وہی صنعتیں رائج کر دیں جنھوں نے کسی زمانے میں ہندوستان کو تمام دُنیا میں مشہور کر دیا تھا، اگر ہم نے اپنے تعلیم یافتہ طبقے کو ذہنی غلامی سے آزاد کر لیا تو ہم ہندوستان میں بھی بہت جلد ایک اشتراکی نظام قائم کر سکتے ہیں، اور ممکن ہے ہم انتظامات کی خوبی میں روسی اشتراک سے بازی لے جائیں۔

مشکل صرف یہ ہے کہ اور مُلکوں کی طرح ہندوستان کی اصلاح میں ہم اپنے عقیدے اور ملت کے سوا اور کسی سے مدد نہیں مانگ سکتے۔

میں نے یہ بحث اِس سوال سے شروع کی تھی کہ ہم ان دشواریوں کو جو کسبِ معاش میں پیدا ہوگئی ہیں کس طرح سے دور کر سکتے ہیں۔ یہ مشکل صرف چند افراد کو نہیں پیش آ رہی ہے بلکہ ہماری ملک کے بیشتر نوجوانوں کو، اور ضرورت ایسی تدبیروں کی ہے جو کم از کم چار نسلوں کے لئے فراغت اور عافیت سے زندگی بسر کرنے کا سامان کر دیں، اِسی خیال سے میں نے موجودہ زمانے کی عالمگیر تحریکوں پر جن سے ہندوستان متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، نظر ڈالی تھی، اور پھر یہ عرض کیا تھا کہ ہماری کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوسکتی جب تک ہم ملک کے اندر پورا اختیار حاصل نہ کر لیں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ دُنیا کی اور اپنے ملک کی حالت کو سامنے رکھ کر پھر اس مسئلے پر غور کریں۔

اب تک جو غلطی زیادہ تر نوجوان کرتے آئے ہیں وہ یہ ہے کہ سوا اُن ملازمتوں کے جہاں ایک خاص ہنر سیکھے بغیر کام نہیں چلتا انھوں نے اپنی اہلیت اور شوق کا بالکل خیال نہیں کیا، اور اس لئے آپ کو سب سے پہلے یہ معلوم کرلینا چاہئے کہ آپ کو کس کام کا شوق ہے یا کس کام کو آپ بغیر اپنی طبیعت پر خاص جبر کئے کر سکتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ کیونکہ آدمی کا بہت کچھ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اور اس کا تجربے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ وہ کیا کر سکتا ہے اور کیا نہیں کر سکتا۔ یہ تجربہ آپ کو بھی کرنا ہے، مگر اسے اس وقت نہ شروع کیجئے جب آپ تعلیم سے فارغ ہو جائیں بلکہ طالب علمی کے زمانے کو جہاں تک ہو سکے مشق کا زمانہ بنا لیجئے۔ اس کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ آپ اپنی ذاتی اور قومی ضروریات اور فرائض کو پیش نظر رکھئے۔ طرح طرح کے کاموں میں اپنی استعداد کو آزما کر دیکھئے، ان اوصاف کو پیدا کرنے کی کوشش کیجئے جو کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں، اور پھر جب آپ دنیا میں قدم رکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کی منزلِ مقصود کدھر ہے۔

اس وقت آپ کے دین، آپ کی ملت اور قوم کو جس طرح کی خدمت درکار ہے اس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اس خدمت کو انجام دینے کے لئے آپ کا لیڈر بننا مفید نہیں ہے، اور یہ اور بھی مضر ہوگا کہ آپ جو کچھ کریں اُسے ایثار یا جہاد سمجھیں۔ آپ جو کام اپنے ذمے لیں وہ آپ کا ذریعۂ معاش، آپ کا شوق اور آپ کے وجود کا دنیاوی مقصد ہونا چاہئے، اور ان تینوں نسبتوں سے آپ کو اس سے لگاؤ ہونا چاہئے۔ آپ کے تعلیم پانے کا ہرگز یہ نتیجہ نہ ہونا چاہئے کہ آپ پیشوں کے مدارج قائم کریں، اور چند پیشوں کے سوا اور سب کو اختیار کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھیں، بلکہ آپ کا نقطۂ نظر یہ ہونا چاہئے کہ ناکامیاب قومی لیڈر سے کامیاب گھسیارا بہت زیادہ قابلِ عزت ہوتا ہے۔ اپنا پیشہ منتخب کرتے وقت روشن خیالی، مصلحت، حوصلے سے کام لیجئے۔ جب ایک مرتبہ آپ انتخاب کرلیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی عزت آبرو کامیابی میں ہے۔

پیشے کا انتخاب کرتے وقت آپ کو قومی مفاد کا ضرور لحاظ رکھنا چاہئے صرف اس نیت سے نہیں کہ آپ اپنے دل کو مطمئن رکھ سکیں، بلکہ اس نیت سے بھی کہ اس میں آپ کا اور آپ جیسے بہت سے

افـــراد کا فائدہ ہے۔ آپ ملازمت کریں تو ایسے اداروں کی کیجئے جو نظامِ حکومت کے کَل کے پُرزے نہ ہوں، مگر جن کا مقصد قوم کی بہبود ہو جیسے تعلیمی ادارے۔ آپ کو کاروباری زندگی کا شوق ہو تو کوئی ایسا کام پسند کیجئے جس سے ملک کی سچی دولت میں اضافہ ہوتا ہو۔ اِس لئے کہ وہ تجارت جس میں مال ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیا جاتا ہے، کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی جاتی مگر مال پہنچانے والا منافع میں حصہ دار ہو جاتا ہے، دراصل نقصان دہ ہوتی ہے اور سرمایہ داری کی سب سے مضر خصوصیتوں میں سے ہے سب سے اچھا حوصلہ آپ کے لئے یہ ہوگا کہ آپ شہری زندگی کو چھوڑ کر گاؤں میں اپنا گھر بنائیں، وہاں اپنی روشن خیالی، خود داری اور تعمیری حوصلوں کا دیا جلائیں۔ اگر آپ کوئی ہنر سیکھ چکے ہوں تو ان صنعتوں میں جان ڈالیں جن پر گاؤں کی خوش حالی کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اگر کاشتکاری کر سکتے ہوں تو اس میں اصلاح اور جدت کر کے دوسروں کو نئی راہیں بتائیں۔ اِس سلسلے میں آپ ایک طرف زمینداروں کو اس پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ اپنے آپ کو لگان وصول کرنے کے ٹھیکے دار نہ سمجھیں بلکہ کاشتکار بن کر زمین پر اپنا حق ثابت کریں۔ دوسری طرف آپ دیہاتی آبادی کو سود خوار کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کر سکتے ہیں جو غالباً اِس زمانے کا سب سے اہم اصلاحی کام ہے اور جو اُسی وقت انجام دیا جا سکتا ہے جب آپ گاؤں میں اپنے قدم جمائیں اور سود خواری کو جڑ سے اُکھاڑنے کا تہیہ کر لیں۔ اِس زمانے میں گاؤں اور شہر کا سیاسی رشتہ بالکل ٹوٹا ہوا ہے اِسے دوبارہ قائم کیجئے۔ جمہوری حکومت کی راہ و رسم سے واقفیت اور لگاؤ پیدا کیجئے، اور اپنے ملک کی سیاسی زندگی کو مستحکم کیجئے۔

لیکن آپ گاؤں میں ہوں یا شہر میں آپ کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ آپ اپنی کامیابی کے ذریعے سے اِن اخلاقی اوصاف کا چرچا کریں جن پر آپ کی اور آپ کی قوم اور مِلت کی فلاح کا انحصار ہے۔ اس وقت ہمارا سب سے نمایاں عیب ہماری تلون مزاجی ہے۔ آپ کو چاہئے کہ صبر، محنت اور استقلال کا مادہ پیدا کریں اور اپنی ذات نہیں بلکہ اپنے کام اور اپنی کارگزاری کی بدولت بڑے بننے کا حوصلہ کریں۔ تلون مزاجی کی طرح آرام طلبی اور فضول خرچی بھی مسلمانوں کی سرشت میں داخل ہوگئی ہے جس کے سبب سے سادہ زندگی بلکہ سلامت روی خلافِ تہذیب سمجھی جانے لگی ہے۔ بہت سے نوجوان تعلیم اِسی لئے حاصل کرتے ہیں کہ

ٹھاٹھ سے رہیں، اور یہ غرض پوری نہ ہو تو ان کے لئے زندگی بے معنی اور بے لطف ہو جاتی ہے۔ آج کل کی بے روزگاری بڑی حد تک اسی ٹھاٹھ سے رہنے اور روپیہ اڑانے کی ہوس نے پیدا کی ہے۔ کیونکہ بیکاری کا آرام سب کو اچھا لگتا ہے۔ محنت کی جاں فرسا مشقتوں کے چاہنے والے بہت کم ہیں۔ ہماری یہ بری عادتیں دراصل اس طرح پڑی ہیں کہ ہمیں ایک زمانے سے ضبط کی تعلیم نہیں دی جا رہی ہے، اور ہمیں اپنے اوپر بہت کم اختیار رہ گیا ہے۔ ہمارا تخیل ہمیں ایک طرف کھینچتا ہے، تو عقیدہ دوسری طرف، ہمارا کام، محنت کا تقاضا کرتا ہے تو شوق آوارہ گردی اور گپ شپ کا۔ اسی کشمکش میں ہم کو نہ وقت کا خیال رہتا ہے نہ وعدے کا اور وہی کام جو ہم بڑے جوش اور بڑی امیدوں سے شروع کرتے ہیں ہمیں مایوس اور بیزار ہو کر چھوڑنا پڑتا ہے لیکن استقلال، سلامت روی اور ضبط قدرتی صفتیں نہیں ہیں، وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے سے پیدا کی جاتی ہیں اور آپ کا یہ حوصلہ ہونا چاہئے کہ طالب علمی کے زمانے میں اپنی شخصیت کو ان اوصاف سے آراستہ کریں۔

یہی اوصاف ہیں جو آپ کی اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے علاوہ آپ کو مذہب اور تہذیب کی خاطر مشین پرستی اور لامذہبیت سے لڑنے میں مدد دیں گے۔ وہ قومیں جن کے عقائد اور معیار میں مادی زندگی، انصاف اور مساوات کی اتنی قدر نہیں ہے جتنی کہ موجودہ زمانے کی مشین پرست اور لامذہب قومیں کرتی ہیں وہ مقابلے میں ضرور شکست کھائیں گی اور ہماری حالت یہی رہی جو اب ہے تو ہم بھی آہستہ آہستہ مشین پرست اور لامذہب ہو جائیں گے، اسی طرح جیسے انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کے اثر سے ہم یورپ پرست اور لامذہب ہو گئے ہیں۔ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ایک نئے، اور اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کے بہترین نظام معاشرت میں روح پھونک سکتا ہے، وہی ایسا مذہب ہے جس کے سائے میں ایک نئی تہذیب پرورش پا سکتی ہے، کیونکہ اس میں یہ صلاحیت ہے کہ مشین پرستی کے نظامِ حیات اور اشتراکیت کے بہترین عنصر جذب کر لے اور علم و عقل اور مادی زندگی کا احترام جو حقیقت میں مادیت اور لامذہبیت کا جوہر ہے مسلمانوں کے لئے کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اسلام کی سب سے قابل قدر صفت یہ ہے کہ وہ موجودہ زمانے کی تمام ذہنی اور معاشرتی تحریکوں میں توازن اور ہم آہنگی قائم کر سکتا ہے اور ایک معاشرتی انقلاب کو جو اب

ٹالے نہیں ٹل سکتا، اور جس کا ہنگامہ قیامت سے کم نہ ہوگا، وہ ارتقاء اور نشو و نما کی صورت دے کر فساد اور خون ریزی سے پاک کر سکتا ہے۔ اسلام سے ملی اور ملکی زندگی کو یہ فیض پہنچانا مسلمانوں کا فرضِ منصبی ہے، اور آپ کا مستقبل بہت ہی قابلِ رشک ہوگا۔ اگر آپ یہ خدمت انجام دے سکیں۔

غزلیاتِ جوششؔ عظیم آبادی

(مرسلہ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی)

روشن علی جوششؔ عظیم آبادی بارھویں صدی کے آخر میں پٹنہ کے نادرۂ روزگار شاعر گذرے ہیں۔ تذکرہ نویسوں نے اُن کی بلندیِ فکر، ندرتِ تخیل اور مہارتِ عروض کی بہت تعریف کی ہے۔ میر حسن دہلوی لکھتے ہیں:۔

"مردیست ساکن عظیم آباد خوش طینت و نیک اعتقاد، شاعرِ شیریں کلام صاحب دیوان، از خاصانِ آں دیار است کلامش شاعرانہ است شخصے می گفت کہ او در تالیف تذکرہ مشغول است" (تذکرہ شعرائے اردو ص۶۰)

گلشنِ بے خار میں ہے:۔

"از تازہ خیالانِ عظیم آباد است شعرش صاف و بے غش، فکرش دلپذیر و دلکش، شیوۂ گزیدہ اش گزیدہ و طرز پسندیدہ اش پسندیدہ درفنِ عروض بسیار مہارتِ دل خواہ داشت۔"

جوششؔ کے تذکرۂ شعرا کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ دیوان بھی بے حد نایاب ہے۔ خوش قسمتی سے جوششؔ کا نایاب دیوان صوبہ بہار کے مشہور شاعر اور محدث علامہ شوقؔ نیموی کے کتب خانے میں (علامہ موصوف کے والد مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا) موجود ہے۔ ہمارے خیال میں اِس کے سوا دیوانِ جوششؔ کا کوئی اور نسخہ کسی کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔ یہ نسخہ ۱۲۳۶ھ ف کا لکھا ہوا ہے۔ آخر کا زیادہ حصہ کرم خوردہ ہے۔ ۸۴ صفحات میں تمام ہوا ہے آخر میں چند رباعیاں بھی ہیں۔ ہندوستانی کتب خانہ پٹنہ سٹی کے زیر اہتمام اِس کا انتخاب عنقریب شائع ہو گا۔ چند غزلیں ناظرینِ جامعہ کے لئے ہدیۂ خدمت ہیں:۔

غزلیں

تعلقاتِ جہاں سے خبر نہیں رکھتا — ہزار شکر کہ میں دردِ سر نہیں رکھتا
بتوں کے دل میں جگہ کی نہ نالۂ نے نے — ہزار حیف یہ نالہ اثر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کھول روتا ہوں — تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا
نہ ہے نصیب کہ دلدار سے ہم اِس دِل کو — ہزار کہتے ہیں رکھنے کو پر نہیں رکھتا
دِل و جگر کو تو پوچھے ہے کون اے جوشش
حضور اس کے میں اپنی خبر نہیں رکھتا"

اگر منظور ہو اے عشق! دل کو پاک کر دینا — تو اسبابِ تعلق کو جلا کر خاک کر دینا
جنوں! فہمیدِ معنی میں تجھے گر دستِ قدرت ہو — گریبانِ تعلق بے تامل چاک کر دینا
تجلی تیری یارب برقِ عقل و ہوش ہے لیکن — مجھے تو روشناسِ شعلۂ ادراک کر دینا
یہ مشتِ استخواں باقی ہے اب اے چشمِ خوں گریہ — اسے بھی بحرِ غم کا تو خس و خاشاک کر دینا
اگر جوشش نہ روتا ہو ترے دردِ محبت سے
الٰہی خشک اس کا دیدۂ غمناک کر دینا

یاد کر تیرے لبِ مے گوں کا اے جاناں نمک — ڈال دیتے ہیں مے گلرنگ میں مستاں نمک
کیوں نہ گل کو دیکھ کر گلزار میں آوے ہنسی — مدتوں کھایا ہے تیرا اے لبِ خنداں نمک
اے مرے کانِ ملاحت کر نہ مرہم کی تلاش — یہ تو وہ داغِ جگر ہے جس کا ہے درماں نمک
آتشِ دوری میں اس مے خوار کے اے سوزِ عشق — بھن چکا ہے چاہتا ہے یہ دلِ بریاں نمک
یہ تو وہ زخمِ جگر ہے آہ جس کو دیکھ کر — مرہمِ زنگار حیراں ہووے اور گریاں نمک
تیرا لب جاں بخش ہے اور وہ مددگارِ حیات — تیرے آگے کب رکھے ہے چشمۂ حیواں نمک
ہونٹھ اب تک چاٹتا ہے دیکھ جوشش زخمِ دِل
آہ کیا رکھتا تھا اس کے تیر کا پیکاں نمک

دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے — مانندِ شمع حال ہمارا خراب ہے
دل سے ترے جو اشک نہ آوے عجب نہیں — بریاں ہو جب کباب تو کب اس میں آب ہے
دل کس طرح چمن میں لگے آج باغباں — نے ابر نے ہوا ہے نہ جامِ شراب ہے
غافل کر اس کی سیر تو عبرت کی چشم سے — ہستیِ بے ثبات خیالات خواب ہے
خالِ سیہ نہ ہووے یہ رخسارِ یار پر — دیوانِ حسن کا نقطِ انتخاب ہے
عالم خراب ہووے جو وہ بے حجاب ہو — ہے خیر کچھ اسی میں کہ منہ پر نقاب ہے
لذت ہے خاک عشق کی پیری میں ہمدما — معشوق خوب رو ہے اور عہدِ شباب ہے
اس میکدے میں کون ہو ساقی سے ملتجی — خونِ جگر شراب ہے اور دل کباب ہے

دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں
جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے

شیخ کو کعبے سے جو مقصود ہے — وہ کنشت دل ہی میں موجود ہے
میرے جلنے کی کسی کو کیا خبر — سوزشِ دل آتشِ بے دود ہے
نے حرم سے کام ہے نے دیر سے — خانۂ دل ہی مرا مسجود ہے
فرق مت کر عاشق و معشوق میں — خود ایاز اور آپ ہی محمود ہے
کیا پری کیا حور کیا جن و بشر — سب میں وہ شاہد مرا مشہود ہے
مشربِ عشاق میں اے زاہدو! — اس کا جو مخلوق ہی معبود ہے
سنگ و آہن کو یہ کرتی ہے گداز — آہ ہے یا نغمۂ داؤد ہے

کس سے اے جوشش کہوں میں دردِ دل
میرے اس کے بولنا مفقود ہے

روشن ہوا یہ خانۂ دل اس کے نور سے — موسیٰ ہمیں غرض نہیں کچھ کوہِ طور سے
آئینِ عاشقی میں ترقی کی آرزو — رہتی ہے میرے عجز کو اس کے غرور سے

اے غافلو یہ زندگی ناپائدار ہے
باور نہ ہو تو پوچھ لو اہلِ قبور سے

نقشِ حصیر اپنے بدن پر ہے پیرہن
سنجاب سے نہ کام نہ مطلب سمور سے

جز اشک کون دھووے مرے منہ سے گردِ غم
غربت زدہ ہوں آتا ہوں میں راہِ دور سے

آپ ہی میں جل بجھوں گا سحر تک برنگِ شمع
مجھ کو اٹھا نہ دیجیو اپنے حضور سے

پھنس جائے گا تو دامِ تعلق میں یک بیک
جوشش نہ تھی امید یہ تیرے شعور سے

اس ادا کا ہوں تیری دیوانہ
دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

کیوں نہ صد چاک ہووے دل میرا
ہاتھ ڈالے ہے زلف پر شانہ

شعلہ رو تجھ پہ کیوں نہ ہوں صدقے
شمع پر جل مرے ہے پروانہ

ہوں وہ دیوانہ ناصحو جس کو
ننگ ہے چاک جیب سلوانا

یار غیروں سے اس قدر کا ربط
اور عاشق کو دیکھ شرمانا

آج ہے جاں بلب ترا جوشش
جی میں آوے ترے تو آجانا

افکارِ پریشاں

خدا کی سب سے بڑی طاقت سبک رو نسیم ہے،
تیز و تند طوفان نہیں!

آفتاب کا لباس نورِ محض ہے،
بدلیاں زنگار رنگ پوشاک پہنتی ہیں۔

اگر ماہتاب کے لئے آنسو بہاتے ہو،
تو ستاروں کو بھی نہ دیکھ سکو گے!

اُس کا پیارا چہرہ میرے خواب میں اِس طرح آتا ہے
جیسے رات کی بارش!

ہم نے خواب دیکھا کہ ہم اجنبی ہیں!
ہم جاگ اُٹھے اور دیکھا کہ ایک دوسرے کے پیارے ہیں!

غم میرے دل میں اِس طرح آرام سے سو رہا ہے،
جیسے شام خاموش درختوں میں۔

اے سمندر تیری گفتگو کیا ہے؟
دائمی سوال۔
اے آسمان تیرا جواب کیا ہے!
دائمی خاموشی۔

زندگی کو بہار کے پھولوں کی طرح کھِلنے دو!
اور موت کو خزاں کی پتّیوں کی طرح مُرجھانے دو!

جڑیں شاخیں ہیں، زمین میں پھیلی ہوئی
شاخیں جڑیں ہیں ہَوا میں چھائی ہوئی۔

دنیا آرزو بھرے دِل کے تاروں پر دوڑتی ہے،
اور اِس سے غم کے سُر نکلتے ہیں۔

پانی میں مچھلی خاموش ہے۔
زمین پر جانور شور کرتے ہیں۔
ہوا میں چڑیاں گاتی ہیں۔
لیکن انسان میں،
سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہَوا کا نغمہ
سبھی کچھ ہے!

ننھی کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے اور چلا اُٹھتی ہے:
"پیاری دُنیا! جلدی سے ختم نہ ہو جانا!"

پانی کی چڑیوں اور موجوں کی طرح
ہم کچھ دیر ساتھ رہتے ہیں
چڑیاں اُڑ جاتی ہیں، موجیں بڑھ جاتی ہیں،
ہم ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں!

پرندے کی تمنّا ہے کہ وہ بادل ہو جائے!
بادل کو حسرت ہے کہ پرندہ نہ ہوا۔!

آج صبح میں کھڑکی میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں
دُنیا مسافر کی طرح آتی ہے
ردا روی میں سلام کرتی ہے اور چلی جاتی ہے!

خُدا بڑی سلطنتوں سے اُکتا جاتا ہے،
لیکن ننھے پھولوں سے نہیں!

ہر بچہ یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ:
"خدا ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا!"

پتی، پھول ہو جاتی ہے جب محبت کرتی ہے!
پھول، پھل ہو جاتا ہے جب عبادت کرتا ہے!

دنیا عاشق کے سامنے لامحدودیت کا نقاب اُٹھا دیتی ہے
اور اتنی مختصر رہ جاتی ہے جیسے ایک گیت یا ابدیت کا ایک بوسہ۔

یہ دُنیا کے آنسو ہیں جو اُس کے تبسم کو رنگین بنائے رکھتے ہیں

میری آرزوئیں نادان ہیں میرے مالک!
وہ تیرے گیت کے بیچ میں فریاد کرنے لگتی ہیں،
تو گائے جا اور مجھے سُننے دے!

خدا ہم سے پھولوں کا شکریہ چاہتا ہے،
زمین اور سورج کا نہیں!

روشنی جو ایک ننگے بچے کی طرح خوش خوش سبز پتّیوں میں کھیلتی ہے
نہیں جانتی کہ انسان جھوٹ بھی بول سکتا ہے!

حُسن! اپنی حقیقت کو محبت میں تلاش کر!
آئینے کے خوشامدانہ عکس میں مت دیکھ!

اے خدا تیرا شکر!
کہ میں طاقت کی پہیوں میں سے نہیں،
بلکہ اس مخلوق میں سے ہوں جو اس سے کچلے جاتے ہیں!

تمھارا بت ٹکڑے ٹکڑے ہوکر خاک میں مل گیا اور ثابت کر گیا کہ خدا کی پیدا کی ہوئی خاک تمھارے بت سے ارفع ہے!

زندگی ہمیں دی جاتی ہے —
ہم اسی کو دے کر اسے حاصل کرتے ہیں!

شیشے کا جھاڑ مٹی کے چراغ کو جھڑکتا ہے کہ مجھے بھائی کہہ کر نہ پکار۔ چاند نکل آتا ہے اور شیشے کا جھاڑ شرمائی ہوئی مسکراہٹ سے پکار اٹھتا ہے: میرے پیارے بھائی!

میرے دل ان سرگوشیوں کو سن جن کے ذریعے دنیا تجھ سے اظہارِ محبت کر رہی ہے! ...

حیدر علی

تمہید

اٹھارھویں صدی کا نصف آخر ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک تیرہ و تار ورق ہے ، اس وقت ہندوستان میں طوائف الملوکی کا دَور دورہ تھا۔ ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک لوٹ مار، غارت گری کا حشر برپا تھا، سیاسی بدنظمیوں، آئے دن کے انقلابات اور جنگ و جدل سے مُلک سے امن و امان اُٹھ گیا تھا۔ فضائے سیاست پر حوادث کی سیاہ گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اسلامی ہند کی عظمت و جبروت افسانہ ہو کر رہ گئی تھی۔ ہندوستان کا عصائے جہاں بانی ایسے ہاتھوں میں آگیا تھا جو اس کے بوجھ سے کانپ رہے تھے۔ سلطنت کی شمع عشرت پسند حکمرانوں کے محلات میں ٹمٹما رہی تھی شیر شاہ سوری اور اکبر کے پرشکوہ زمانے داستانِ پارینہ، شاہ جہاں اور عالمگیر کے قرونِ اقبال خواب و خیال ہو گئے تھے، سلطنتِ مغلیہ کی نبضیں سُست پڑ گئی تھیں۔ جنگِ صد سالہ میں فرانس کی حالت ہرچند بہت سقیم ہو گئی تھی اور عوام الناس کامیابی سے بالکل مایوس ہو چکے تھے، تاہم حکمران طبقے کے دِل میں حبِّ وطن کی آتشِ مردہ کا ایک شرارہ باقی تھا، اور بادشاہ کی ذات کو آفتابِ امید خیال کیا جاتا تھا۔ برخلاف اس کے سلطنتِ مغلیہ کی تباہی تدریجی ہوئی، مگر قطعی ہوئی صرف یہی نہیں تھا کہ بیرونی حملوں کا مقابلہ کرنے والے طبقات بالکل فنا ہو گئے ہوں بلکہ یہ مصیبت تھی کہ بیرونی حملہ آوروں کے چلے جانے کے بعد جسمِ سیاست کے زخموں کا لہو بند کرنے والوں کا وجود بھی نہیں رہا تھا۔ سلطنت کی حالت ایک نعش کی سی تھی۔ ملکیوں اور غیر ملکیوں کی لڑائی، چیلوں کوّوں کی لڑائی تھی جو ایک دوسرے کی نوچ کھسوٹ سے فرصت پاتے ہی اس نعش کی

بوٹیاں نوچنے لگتے تھے۔ یہ نظارہ کیا کم عبرت انگیز اور حسرت خیز تھا کہ ایسی وسیع اور شہرہ آفاق سلطنت ایک جسمِ مُردہ کی طرح ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑی ہو اور چیل کوتے اُس کی بوٹیاں نوچنے کے لئے لڑتے ہوں۔ گو یہ ضرور ہوتا تھا کہ کبھی کبھی امید کے کچھ آثار پیدا ہو جاتے تھے اور اتفاقاً کسی حکمران کی غیر معمولی استعداد سے کچھ توانائی بھی عود کر آتی تھی لیکن ازالۂ مرض نہ ہونے کی وجہ سے بہیئتِ مجموعی مستقل حالت دسدھرنی تھی نہ سدھری۔ دوسری طرف انگریز سوداگر جو اب تک چُپ چاپ اپنے بیوپار میں لگے ہوئے تھے جنھیں اہلِ ہند کے ساتھ زور آزمائی کرنے کی جسارت نہیں ہوتی تھی اپنی تجارتی کوٹھیوں سے نکل نکل کر ممالک ہند میں داخل ہونے لگے اور باہمی عداوتوں سے فائدہ اُٹھا کر ہندوستان کی رہی سہی ریاستوں کو تباہ و برباد کرنا شروع کر دیا۔ لڑائیوں میں قسمت نے ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیا اور آخر کار وہی چند سوداگر جو تجارت کی اجازت کے لئے معمولی حکام کی دربار داری کیا کرتے تھے کشورِ ہندوستان پر قبضہ جمانے کی فکر کرنے لگے۔

ایسے نازک دور میں قدرت نے ہمیں ایک اور سنہری موقع عنایت فرمایا۔ اُس نے ایک اولوالعزم جانباز سپاہی جس کی رگوں میں سپہگرانہ خون دوڑ رہا تھا اور جس کے دِل میں اولوالعزمی اور ناموری کے جذبات موجزن تھی میدان میں لا کھڑا کیا۔ جنوبی ہندوستان کے اِس نامور ہیرو نے جسے آج جنوبی ہند کا بچہ بچہ حیدر علی کے نام سے نہیں بلکہ بہادر کے لقب سے یاد کرتا ہے، اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی اور عزم بالجزم سے اپنے آپ کو ایک سپاہی کے درجے سے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچا دیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنی زبردست قوتِ ارادی استقلال، جُرأت اور لاثانی حکمتِ عملی سے تاج و تخت حاصل کر لیا۔ اُس کی جنگی تدابیر اور اس کی شمشیر آبدار نے ایک طرف اگر مرہٹوں کے مُلک اور نظام حیدر آباد کے قصرِ شاہی میں زلزلے ڈال دیئے تو دوسری طرف نواب کرناٹک اور انگریزوں کے گھروں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ اس نے جنوبی ہندوستان میں شاہانِ مغلیہ کی حشمت و جلال کی یاد تازہ کر دی۔ وہ ایسا زبردست اور عالی دماغ حکمران تھا جس کے

مدمقابل تاریخ میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس کا بے پناہ عزم واستقلال، اس کے شجاعانہ کارنامے، اس کی مذہبی بے تعصبی اور رواداری ایسی صفات ہیں جن کی بدولت اس کا نام دنیا میں اس آب وتاب کے ساتھ قائم رہے گا جیسے عالمِ بالا پر نجوم روشن ہیں۔ وہ جنوبی ہندوستان کا بیدار مغز، بالغ نظر اور غیور حکمران تھا۔ اس کی فطرت زندگی کے روشن نقوش کے ساتھ ساتھ چلتی تھی اور وہ اس فلسفے کی عملی صورت کا قائل تھا کہ زندگی اور عزت کی زندگی صرف بہادروں کا حق ہے اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ جنوبی ہند کے اس نامور ہیرو نے ایسے وقت میں جب ریاست میسور کی آزادی معرضِ خطر میں تھی اپنے ہم وطنوں کو زندگی کا پیغام دیا۔ حیدر علی مرہٹوں کے خلاف نہ تھا، نظام کی سلطنت اور اقتدار پر رشک نہیں کرتا تھا، فرانسیسیوں کے لئے خطرناک نہ تھا اور اس کے فلسفۂ سیاست میں انگریزوں کے جائز مفاد کے لئے بھی گنجائش تھی۔ اس کا پیغام زندگی کا پیغام تھا اور اس کا منشا صرف یہ تھا کہ ریاست کے باشندے اپنے گرد وپیش کے حالات کو دیکھیں یکجہتی اور تنظیم کے ساتھ دنیا کو یہ یقین دلا دیں کہ وہ زندہ ہیں۔ انھیں اپنی ریاست سے محبت ہے۔

حیدر علی کے ابتدائی حالات

حیدر علی ۱۷۲۲ء میں بمقام بودی کوٹہ پیدا ہوا۔ بودی کوٹہ ایک چھوٹا سا قریہ ہے جو ضلع کولار میں واقع ہے۔ حیدر علی کے والد شیخ فتح محمد سرا کے صوبے دار تھے اس لئے اس کا عہد طفلی نہایت آرام وآسائش سے گذرا۔ مگر یکایک زمانے نے پلٹا کھایا اور اس کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اس نامور ہیرو کی عمر قریب پانچ ہی سال کی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس کی خوش قسمتی کہئے کہ عین موقع پر اس کے چچازاد بھائی حیدر نے اس کی مدد کی اور اس خاندان کو اپنے پاس سرنگاپٹم بلا لیا، حیدر نے اس زمانے کی طرزِ معاشرت کے مطابق حیدر علی کی تعلیم وتربیت شروع کر دی اور دستور کے مطابق بجائے کسی مدرسے میں بٹھانے کے اسے فنونِ جنگ کی تعلیم دی جانے لگی اور چند ہی سال میں یہ یتیم بچہ اس وقت کے فن سپہ گری میں خاص ماہر ہو گیا، جس وقت حیدر علی

بڑا ہوا تو حیدر صاحب نے اُس کی ملاقات نندراج وزیر میسور سے کرائی۔ اس نے حیدر علی کو فوج کے ایک چھوٹے سے دستے پر مقرر کر کے سرنگا پٹم ہی میں رکھ لیا۔ نندراج کو اس کی کیا خبر تھی کہ یہ بچہ جو ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اپنے عزم و استقلال سے تختِ میسور پر قابض ہو کر کُل جنوبی ہندوستان پر حیدری جھنڈا لہرائے گا۔ اور اُس کی شہرت ہندوستان سے نکل کر فرانس اور انگلستان کی نشستِ قاہرہ تک پہنچے گی اور اس کی تلوار کی جھنکار ہندوستان کی ریاستوں اور سلطنتوں میں تو ایک طرف سات سمندر پار انگلستان کے سربفلک ایوانوں میں زلزلہ ڈال دے گی۔ حیدر علی نے سرنگا پٹم میں وہ سلامت روی اور خود داری اختیار کی کہ ہر شخص اس کا گرویدہ ہو گیا اور وہ اپنی نمایاں قابلیت کی وجہ سے تھوڑے سے ہی دنوں بعد باڈی گارڈ کا افسر مقرر ہو گیا اور اس کے بعد سے حیدر علی نے بہت جلد ترقی کی۔ سنہ ۱۷۵۲ء میں ریاست میسور کے علاقہ پائیں گھاٹ میں بغاوت ہوئی۔ وزیر نندراج حیدر علی کو ساتھ لے کر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اِن معرکوں میں حیدر علی سے ایسے ایسے کارنامے عمل میں آئے اور اُس نے اپنی بہادری، استقلال، اولوالعزمی، شجاعت اور بسالت کی دھاک کچھ اس طرح دشمنوں کے دلوں پر بٹھا دی کہ وزیر میسور نے اس کو گورنر ڈنڈیگل مقرر کر دیا اور اس کے منصب کو ترقی دے کر چار ہزار سپاہی اور ڈیڑھ ہزار سواروں کا افسر مقرر کر دیا۔ نیز اس زمانے کے رواج کے مطابق حیدر علی کو اپنی خاص فوج بھرتی کرنے کا حکم بھی ملا۔ اِس کے بعد وہ مختلف مقامات پر شورشوں کو فرو کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اُس نے نازک موقعوں پر اپنے راجہ اور محسن و مربی وزیر نندراج کی مدد کی اور آخر کار اُن کے دشمنوں کا صفایا کر دیا۔ حیدر علی کے اِن کارہائے نمایاں کو دیکھ کر راجہ بہت خوش ہوا۔ ۱۷۵۷ میں اُس کو سپہ سالار افواج میسور کے عہدے پر ترقی مل گئی اور اُس کو کامل اختیارات دے دیئے گئے کہ مرہٹوں سے جس طرح چاہے معاملہ طے کرے۔ اس نے بجائے صلح کرنے کے اُن سے مقابلہ ہی کرنا مناسب سمجھا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے اپنے حیرالعقول پیمانے پر فتح و کامیابی حاصل کر لی۔ راجہ اِن کامیابیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے حیدر علی کو "فتح حیدر بہادر" کا خطاب دیا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد حیدر علی نے ایک اور اہم کام انجام دیا جس سے راجہ بہت خوش ہوا

اس نے راجہ کے فائدے پر نہایت آسانی اور لطایف الحیل سے بتدریج استاد وزارت
لے کر راجہ کے حوالے کر دی اور اس کارگزاری کے صلے میں راجہ نے فرزندِ ارجمند کا خطاب حیدر علی کو
عطا کیا۔ اسی درمیان میں بسالت جنگ نظام حیدر آباد نے میدان پانی پت میں مرہٹوں کی شکست
کا حال سن کر صوبہ سرا فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ سرا اس وقت مرہٹوں کے قبضے میں تھا۔ چنانچہ
بسالت جنگ نے قلعہ ہوسکوٹہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن اس محاصرے نے نہایت طول کھینچا۔ بسالت جنگ
نے حیدر علی سے امداد طلب کی۔ چنانچہ حیدر علی اور بسالت جنگ میں ایک معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا
کہ ہوسکوٹہ اور اس کے مضافات حیدر علی کو ملیں گے، بسالت جنگ دربار دہلی میں صوبہ داری سرا
کے لئے حیدر علی کی سفارش کرے گا۔ قلعہ گرم کنڈہ جو اب تک حیدر آباد کے ماتحت رہا تھا آئندہ کو
حیدر علی کی ملکیت ہوگی۔ چنانچہ حیدر علی کی جرار فوجوں نے چند ہی دنوں میں ہوسکوٹہ فتح کر لیا اور بموجب معاہدہ
ہوسکوٹہ، اس کے مضافات اور قلعہ گرم کنڈہ حیدر علی کو ملا، شہنشاہ ہند کا سفیر حیدر علی کے نام
فرمان صوبہ داری سرا لے کر آیا اور اس کے ساتھ شہنشاہ کی جانب سے شمشیر مرصع کار، پالکی جواہر نگار
اور نقارہ و نشان مع خطاب نواب عنایت ہوئے۔ اس کے بعد حیدر علی نے مڑگ سرا، مدگیری
البس نگر اور سرا پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح تقریباً تمام صوبۂ سرا کا مالک ہو گیا۔

سنہ ۱۷۶۱ء میں جب فرانسیسیوں کی مدد کے لئے افواج حیدری پانڈیچری گئی ہوئی تھی کھانڈے
راؤ راجہ اور رانیوں نے سازش کی کہ نندراج کی طرح حیدر علی کو معزول کر دینا چاہئے۔ چنانچہ دربار پونا کو
ایک خط لکھ کر مدد طلب کی گئی۔ میدان خالی پا کر وہاں سے ایک فوج روانہ ہو گئی۔ حیدر علی کو اس کی مطلق
خبر نہ تھی۔ اسے اس وقت معلوم ہوا جب فوج سرنگاپٹن کے قریب آ پہنچی۔ حیدر علی نے اپنے دوستوں کو
مشورہ کرنے کے بعد رات کو فرار ہونے کا ارادہ کر لیا جس وقت رات زیادہ ہوئی وہ اپنے گھر سے
نکلا اور سیدھا دریائے کاویری پر پہنچا۔ ہمت کر کے دریا میں کود پڑا اور پار نکل گیا اور صرف بیس گھنٹے کے
عرصے میں بنگلور پہنچ گیا۔ جہاں اس کی فوج کا ایک حصہ موجود تھا۔ ادھر راجہ میسور وزیر کھانڈے راؤ اور
مرہٹہ سرداروں نے بنگلور کی طرف کوچ کیا۔ ان کا ارادہ تھا کہ یہاں اس کا محاصرہ کر کے ہم اس کو

گرفتار کرلیں گے۔ حیدر علی بھی تیار ہو چکا تھا۔ اس نے قلعہ سے نکل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ راجہ کی فوج سخت نقصان اٹھانے کے بعد منتشر ہوگئی اور جب اس شکستِ فاش کی خبر سرنگا پٹن پہنچی تو محل میں کہرام مچ گیا محلاتِ حیدری میں میدانِ جنگ کی جو تصویر مصنف محلات حیدری نے کھینچی ہے اس کا ایک حصہ مصنف سلطنت خداداد نے اپنی کتاب میں درج کیا ہے جو بجنسہٖ نقل کیا جاتا ہے :۔

دونوں مہابھارت دلیں جیسے ساون بھادوں کے گھنگھور بادل چاروں طرف سے اُٹھتے ہیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ پہلے تو دور سے گولیاں اور گولے اولے کی طرح دونوں طرف سے برسنے لگے۔ جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے نزدیک آئیں تب تو تیغ و تبر، خنجر، جمدھر، پستول، طمنچے، بھالے، برچھی بوچھاریں چلتی تھیں اور لہو کی پھوہاریں اُڑتی تھیں۔ ایک لمحہ میں خون کی ندیاں اور نالے بہنے لگے اور ہاتھی گھوڑے، اونٹ، گاؤ، بچھڑے کی مانند نظر آتے تھے۔ فیلوں کے سر حباب کی مانند تیرتے پھرتے تھے۔ آخر کار نواب رستم شوکت اسفندیار صولت نے راجہ میسور کے لشکر کو ہزیمت دی،

اس واقعے کی اطلاع جب نند راج کو ہوئی تو اس نے الیاجی سپہ سالار مرہٹہ فوج کو جو اس وقت سرنگا پٹن میں تھا ایک خط لکھا جس میں راجہ اور کھانڈے راؤ کی سازشوں کا پورا حال درج تھا جو ان دونوں نے نند راج کے ساتھ روا رکھی تھیں اس خط کو دیکھتے ہی الیاجی نے حیدر علی کو خط لکھا کہ اگر وہ اخراجاتِ جنگ ادا کرے تو مرہٹہ فوج واپس چلی جائے گی۔ حیدر علی نے روپیہ کے عوض بارہ محل کا علاقہ انھیں دے دیا اور مرہٹہ فوج واپس چلی گئی۔ اس اثنا میں حیدر علی کی وہ فوج بھی واپس آگئی تھی جو پانڈی چیری گئی ہوئی تھی۔ اس نے اس وقت یہی مناسب سمجھا کہ جس طرح ہو سکے سرنگا پٹن پر قبضہ کرلے چنانچہ اس نے نند راج سے مشورہ کرنے کے بعد سرنگا پٹن پر حملہ کر دیا اور اسے نہایت آسانی سے فتح کرلیا۔ دوسرے دن حیدر علی نے راجہ کی نذر کے لئے چند تحائف بھیجے اور باریابی کی اجازت چاہی۔ بعد اجازت چند منتخب سردار محل کے اندر گئے اور راجہ سے مطالبہ کیا گیا کہ انتظامِ ریاست حیدر علی کو تفویض کر دے۔

چنانچہ حیدر علی نے راجہ کے مصارف کا انتظام کر کے حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی اور اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ وہ آج سے حکمرانِ میسور ہے۔

حیدر علی نے ۱۷۶۳ء میں صوبہ سرا کے انتظام سے فارغ ہو کر بالاپور جنڈد اور نندی گڑھ کی طرف توجہ کی۔ یہاں کے راجہ سے ایک سخت مقابلہ ہوا اور آخر کار راجہ نے اپنے آپ کو حیدر علی کے سپرد کر دیا اور نندی پر بدرالزمان خان کو بطور قلعہ دار مقرر کر دیا گیا۔ بالاپور اور نندی گڑھ کی فتح سے فارغ ہو کر نواب حیدر علی سرا میں مقیم تھا کہ بدنور کا ایک جائز وارث آکر طالبِ داد ہوا اور اس نے نواب سے التجا کی کہ وہ غاصبوں سے اس کی سلطنت چھین کر جائز وارث کے سپرد کر دے۔ نواب نے اس کی درخواست کو قبول کر لیا اور بدنور فتح کر کے اس کے جائز وارث کے حوالے کر دیا۔ یہاں سے منگلور فتح کرنے کی غرض سے آگے بڑھا اور کچھ عرصے میں اس نے منگلور فتح کر لیا۔ وہاں سے واپس ہو رہا تھا کہ اس کے مارنے کے لئے بدنور میں ایک سازش کی گئی مگر نواب کو عین وقت پر اس کی اطلاع ہو گئی اور اس نے رانی اور اس برہمن کو جو اس سازش میں شریک تھے گرفتار کر کے قتل کرا دیا اور ملک پر نواب کا قبضہ ہو گیا۔ نواب حیدر علی کو یہاں اس قدر خزانہ ملا کہ جس کا اندازہ بارہ کروڑ روپیہ کیا جاتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر وہ راجہ علی امیر البحر کی درخواست پر ملیبار کی طرف روانہ ہوا۔ ملیبار ہندوستان کے جنوب مغربی ساحل پر ایک زرخیز خطہ تھا یہاں مسلمان عرب تاجر کثرت سے آباد تھے مگر وہ اپنے ہمسایوں کی روز روز کی لڑائی سے تنگ آ گئے تھے چنانچہ حیدر علی جب ایک جرار لشکر کے ساتھ ملیبار پہنچا ہے تو نائروں نے اس کے مقابلے کے لئے ایک فوج جمع کی۔ کنانور کے قریب ایک ندی کے کنارے جنگ ہوئی جس میں حیدر علی کو فتح حاصل ہوئی۔ یہاں سے حیدر علی کالی کٹ روانہ ہوا اور نہایت آسانی سے اس پر قبضہ کر لیا اور وہاں کے زامرن نے اپنے محل میں آگ لگا دی اور جل کر مر گیا۔ اس خبر کو سنتے ہی نائروں نے کالی کٹ پر حملہ کیا مگر یہاں بھی انھیں شکست ہوئی۔ اسی اثنا میں بارش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نواب حیدر نے یہ سوچا کہ اگر ملیبار میں مقیم رہیں گے تو فوج کو سخت نقصان پہنچے گا اس لئے وہ کوئمبٹور کی طرف روانہ ہو گیا۔ نائروں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پھر ایک لشکر جمع کر کے پونانی کے مقام پر حیدر علی کا مقابلہ کیا۔ یہاں مقابلہ سخت ہوا مگر

ایک شدید جنگ کے بعد نائروں کو فاش شکست نصیب ہوئی۔ اسی اثنا میں مرہٹوں نے بدنور پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب حیدر علی کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے ایک فوج اُدھر روانہ کی مگر اس فوج کے پہنچنے سے قبل ہی مرہٹے بارش کی کثرت کی وجہ سے واپس جا چکے تھے۔ جس وقت مرہٹوں نے بدنور پر حملہ کیا تھا تو نواب شاہ نور نے اُن کی مدد کی تھی۔ لہٰذا حیدر علی نے اُن کا صفایا کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ اُس نے شاہ نور پر حملہ کیا اور اس کی افغان فوجوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ وہاں کے نواب نے مجبور ہو کر صلح کی درخواست کی جسے نواب حیدر علی نے منظور کر لیا۔

مرہٹوں کا میسور پر حملہ

ہم پہلے اِس کا ذکر کر چکے ہیں کہ نواب حیدر علی نے الیاس جی کو بارہ محل کا علاقہ تفویض کر دیا تھا مگر جب الیاس جی بارہ محل پہنچا تو وہاں کے حیدری قلعہ داروں نے قلعہ جات حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اُس وقت تو الیاس جی واپس چلا آیا مگر جب مادھو راؤ پیشوا ہوا اور اُس نے حیدر علی کے روز افزوں اقتدار کا حال سُنا تو اُس نے بارہ محل لینے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ وہ ایک لاکھ سوار۔ ۶۰ ہزار پیادے پچاس ہزار تیر انداز اور ایک بڑا توپ خانہ لے کر روانہ ہوا۔ راستے میں اُس نے شاہ نور، چتلدرگ، سرا اور مدگیری کو نہایت آسانی سے فتح کر لیا۔ حیدر علی نے جب یہ خبر سُنی تو اُسے فکر ہوئی کہ کس طرح اس کا مقابلہ کیا جائے۔ اس نے سواروں کے ایک دستے کو حکم دیا کہ وہ صحرائے ماگڑی میں چھپ کر مرہٹی فوج پر شبخون مارا کریں۔ گری فتح کرنے کے بعد مادھو راؤ قلعہ ماگڑی کی طرف بڑھا یہاں کے حاکم سردار خاں نے نہایت شجاعت کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا۔ مگر آخر کار اُس کے تمام سپاہی لڑتے لڑتے مر گئے۔ اور وہ خود زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اِس عرصے میں حیدری فوج نے جو جنگل میں چھپی ہوئی تھی کئی مرتبہ شبخون مارا مگر اس سے کیا ہو سکتا تھا۔ آخر کار اس کا ماگڑی پر قبضہ ہو گیا۔ یہاں سے بالاپور، کراپہ، کولار، گرم کنڈہ پر قبضہ کرتا ہوا مادھو سرنگاپٹم کی طرف بڑھا اس نے اپنا صدر مقام چنتامنی کو مقرر کر کے ایک بھاری توپ خانہ اور پچاس ہزار فوج سرنگاپٹم کی طرف

روانہ کی۔ اِدھر حیدر علی پریشان تھا۔ ایسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطنت حیدری کوئی دم کی مہمان ہے۔ مگر اس نے اپنی خداداد دلیری سے کام لے کر ماگڑی کے جنگل میں اس فوج کا انتظار کیا جس وقت نصف شب گذری تو اس نے اس فوج پر شبخون مارا اور یہ حملہ کچھ اس غضب کا تھا کہ قریب قریب کُل مرہٹے کٹ گئے اور جو بچے بھاگ نکلے۔ دوسری طرف مرہٹی فوج کا ایک چھوٹا دستہ بارامحل پر چڑھ رہا تھا۔ اس پر بھی حیدری فوج نے شبخون مارکر اُس کو واپسی پر مجبور کر دیا۔ مادھوراؤ کو جب اِن دونوں شکستوں کی خبر پہنچی تو وہ حیران تھا کہ کیا کرے۔ ایک جانب اس کی غیرت قبول نہیں کرتی تھی کہ شکست کھا کر واپس جائے، دوسری طرف فوج کی کمی آگے بڑھنے سے مانع تھی۔ اس موقع سے حیدر علی نے فائدہ اٹھا کر سات لاکھ روپیہ مادھوراؤ کے پاس بھیجے اور پچاس لاکھ دینے کا وعدہ کیا۔ مادھوراؤ نے اسے ایک خداداد فتح خیال کرتے ہوئے پونا کی طرف کوچ کر دیا۔

(باقی آئندہ)

انوکھا ظلم

(یہ زمانۂ حال کے مشہور ترکی انشا پرداز عمر سیف الدین کا افسانہ ہے جس کا ترجمہ انگریزی میں خالدہ خانم صاحبہ کی ایک عزیزہ بلقیس خانم صاحبہ نے کیا ہے۔ ہم ان دونوں خواتین کے شکر گذار ہیں کہ ان کی عنایت سے یہ رسالۂ جامعہ کو اشاعت کے لئے حاصل ہوا)

نہیں معلوم کیوں شاید یہ سبب ہو کہ میرے باپ دادا پرانے زمانے میں جاگیر دار تھے، جب کبھی میں بلغاریہ میں گھومتا ہوں تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے آباؤ اجداد کے کھیتوں میں گشت لگا رہا ہوں۔ سبز نرسل سے ڈھکی ہوئی چھوٹی نہریں، بے شمار گلاب کے تختے کھیتوں کے گرد کانٹے دار جھاڑیاں، اداس مکان اور ان کی کشادہ برساتیاں، بدوضع گرجا گھر جو بالکل جَو کے کھلیان معلوم ہوتے ہیں، خوگیر کسے ہوئے کرایے کے ٹٹو، غور و فکر میں ڈوبے ہوئے خچر، موٹی سفید بطخیں، غرضکہ ہر چیز حتیٰ کہ میلے کیچڑ میں سنے ہوئے سور۔ سب سے میں خوب مانوس معلوم ہوتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں ہمیشہ سے ان موٹی ٹانگوں والی عورتوں سے واقف ہوں جو ندیوں میں کپڑے دھوتی رہتی ہیں، ان بد مزاج لڑکیوں کو جانتا ہوں جو ہر وقت اپنے گھروں کے سامنے موزے بنتی رہتی ہیں اور ان دیہاتیوں سے بھی خوب شناسائی رکھتا ہوں جو غروب آفتاب کے وقت جب میدان کی جھاڑیوں کا رنگ گہرا سبز ہو جاتا ہے دفعتہً نمودار ہو کر مجھے سلام کرتے ہیں۔

بلغاریہ میں لیجنا وہ مقام ہے جسے میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ گذشتہ سال میں وہاں کے چشموں میں غسل کرنے کے لئے گیا ہوا تھا اور میرا دوست کوستانوف میرے ہمراہ تھا شام کے وقت ہم دونوں شہر سے باہر نکل کر ادھر ادھر چہل قدمی کیا کرتے تھے اور ان بادلوں کو دیکھتے تھے جو کوہ "کورانوا" پر روشن نظر آیا کرتے تھے اور رات کو ہم ڈینی کو کی سرائے میں شراب

پی کر اور تاش کھیل کر گزارتے تھے۔ اس پرانی سرائے کے زیریں حصے میں ایک قدیم طرز کا بڑا کمرہ تھا ہر اتوار کو مشہور شرابی جو سات سات بوتلیں ایک وقت میں چڑھا جاتے تھے اس کمرے میں جمع ہو جاتے تھے اور اپنے حقوں اور ناچ کی آواز سے تمام رات ہم کو سونے نہ دیتے تھے۔ ایک روز اتوار کی شام کو رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے کوستانوف سے کہا۔

" آج رات کو یہ لوگ ہمیں سونے نہ دیں گے۔ پھر ہم کہیں اور ہی کیوں نہ چلیں "

"کہیں اور کہاں ؟"

" مثلاً ڈاکسٹر کے ہاں۔ وہ کئی دن سے ہمیں دعوت دے رہے ہیں۔"

" کسی اور رات کو وہاں چلیں گے "

لیکن آج رات کو کیوں نہ چلو ؟"

اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا " آج رات کو میں تمہارا تعارف ایک پرانے سیاست داں سے کراؤں گا جو ترکی زبان خوب اچھی بول سکتے ہیں اور جنھوں نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں استنبول میں تعلیم پائی ہے "

" وہ کہاں ہیں ؟"

" وہ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ وہ بھی فصل کے لئے آئے ہیں۔ لیکن جس قسم کے وہ آدمی ہیں اس کا تمھیں پتہ چل جائے گا۔ بالکل "بائی گوتیو" ہیں (ناول نویس کانسٹنٹین الیکو کا مشہور ہیرو)

شام کے کھانے کے بعد کوستانوف نے سرائے والے سے دوات قلم منگوایا۔ ایک پرچہ لکھا اور اُسے یہ کہہ کر دیا کہ اسے گوسپوڈن کیپازنی کے پاس لے جاؤ۔

پھر وہ مجھ سے اس شخص کی زندگی کے حالات بیان کرتا رہا۔ ابتدا میں کیپازنی ایک انقلابی تھا بلغاریہ کی آزادی کے بعد وہ وزارت داخلہ میں ایک عہدہ دار کی حیثیت سے مامور ہو گیا۔ پھر نائب وزیر ہوا اور اخیر میں چند مہینوں کے لئے وزیر عدالت ہو گیا۔ اس کی استمبلاف سے بڑی گہری دوستی تھی۔

اس نے کہا "یہ عجیب حضرت ہیں۔ خیر تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ وہ کسی اور کو بات کرنے تھوڑا ہی دیتا ہے۔ تمام وقت خود ہی بولتا رہتا ہے۔ یورپ کے جتنے سیاست داں ہیں سب کو ذلیل سمجھتا ہے۔ بسمارک کا دماغ اس کے نزدیک مغز سے بالکل خالی تھا اور اس بات کی تو وہ قسم کھاتا ہے کہ روس میں ایک بھی معقول آدمی نہیں ہے"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سرائے والا آگیا اور کہنے لگا

"گاسپوڈن آپ کو اور آپ کے دوست کو اپنے کمرے پر بلاتے ہیں۔ انھیں گٹھیا کی شکایت ہے اور خود نیچے اتر کر نہیں آسکتے"

"ان کے کمرے کا کیا نمبر ہے؟"

"ایک"

"کیا وہ اکیلے ہی ہیں"

"جی ہاں"

کوستانوف جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ کر مجھے ایک پتلے زینے سے کھینچتا ہوا اوپر لے گیا کہ

"چلو ایک پرانے زمانے کے آدمی کو بھی دیکھ لو۔"

سرائے کے کمروں میں نمبر ایک کا کمرہ شاید سب کمروں میں بہترین تھا۔ یہ کمرہ سڑک کے رخ تھا اور اس کے دروازے کے دو پہلو تھے۔ کوستانوف نے دروازے پر اس طرح دستک دی جیسے فوجی مارچ میں ٹکی تک، ٹکی تک تک، تک تک، ٹکی تک، ٹکی تک تک، کی آواز پیدا ہوتی ہے۔

پھر اس نے دھکا دے کر کواڑ کھولا۔ یہ کمرہ حقیقتاً دوسرے کمروں کے مقابلے میں بہت زیادہ آراستہ تھا۔ کھڑکیوں پر سبز پردے اور شیڈز لگے ہوئے تھے۔ دیواروں پر بادشاہ فرڈیننڈ اور بادشاہ بورس کی روغنی تصویریں ٹنگی ہوئی تھیں۔ آیوڈین کی تیز بو ہماری ناک میں گھسی۔

گرمی کے باوجود کھڑکیاں بند تھیں۔ گاسپوڈن ایک کونے میں صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کی ٹانگیں ایک سُرخ کمبل سے ڈھکی ہوئی اور اُس کے سامنے بچھی ہوئی ایک آرام کُرسی پر رکھی ہوئی تھیں اُس کے بال اور داڑھی سپید تھی اور اُس کا چہرہ سُرخ تھا۔ جب ہم داخل ہوئے تو وہ ہنسا اور چلاکر کہنے لگا۔

"تم ہو کوسٹشانوف۔ تمہارا یہاں کیا کام ہے۔ کسانوں کو دھوکا دینے آئے ہو۔"

"نہیں۔ میں غسل کرنے کے لئے آیا ہوں۔"

"یہ فریب دوسروں کو دینا۔ اگر میں برسراقتدار ہوتا تو میں تمھیں اور تم جیسوں کو سانس تک نہ لینے دیتا۔ جنیسر بیٹھو......"

ہم نے ایک ایک کُرسی لے لی اور اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ پھر کوسٹشانوف سے مخاطب ہو کر اُس نے کہا :-

"کیا خبریں ہیں۔ کہو ؟"

"خبر کیا ہے کچھ بھی نہیں گاسپوڈن !"

"خبر کیسے نہیں۔ تم جیسے نو آموز کسی بات کو کچھ اہمیت ہی نہیں دیتے۔ کیوں ٹھیک ہے نا ؟"

پھر اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اُس کی نیلی آنکھیں بھورے شعلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"آپ کون ہیں ؟ کیا یہ بھی تمھارے شاگرد ہیں ؟"

"نہیں گوسپاڈن یہ بلغاری نہیں ہیں۔"

"پھر یہ کون ہیں"

"ترک"

"ترک ؟"

"ہاں"

میرے سر پر کلپاک تھی۔ اس سے اس نے سمجھا کہ کوشتانوف مذاق کر رہا ہے اور ہنسنے لگا۔ لیکن پھر بھی اُسے کچھ تامل ہوا اور جب کوشتانوف نے اُسے یقین دلایا تو اس نے مان لیا میں بھی اس عرصے میں مُسکرا رہا تھا۔

"یہ یہاں کیا کر رہے ہیں" اس نے پوچھا

"یہ غسل کے لئے آئے ہیں اور میرے دوست ہیں۔"

"کیا آپ بھی سوشلسٹ ہیں" یہ کہہ کر اس نے مجھے گھورنا شروع کیا۔

"میں نے کہا نہیں" اور کوشتانوف نے بھی میری تائید کی۔

"یہ قوم پرست ہیں گوسپاڈن" کوشتانوف نے کہا

"مجھے زیادہ بے وقوف نہ بناؤ۔ ایک ترک نہ سوشلسٹ ہو سکتا ہے نہ قوم پرست۔"

اب وہ برابر ہنس رہا تھا۔ انسان بھی عجیب ہوتا ہے۔ اگر کسی ترک نے یہ بات کہی ہوتی تو مجھے اس کی شاید پروا نہ ہوتی۔ لیکن جب ایک بلغاری نے یہ بات کہی تو مجھے بُری معلوم ہوئی اور اس وجہ سے اور بھی کہ اس میں استہزا کی جھلک تھی۔ میرا چہرہ یقیناً بہت زیادہ سرخ ہو گیا ہوگا۔

"کیوں نہیں ہو سکتے" میں نے کہا "میری طرف دیکھئے میں قوم پرست ہوں۔"

"کیا تم ترک نہیں ہو؟"

"ہاں میں ترک ہوں"

"تو پھر عزیز من تم کچھ بھی نہیں ہو سکتے"

"کیوں نہیں ہو سکتا"

"کیونکہ عزیز من تم ترک ہو۔"

"یہ کیسی عجیب بات ہے"

اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ کوشتانوف نے یہ دیکھ کر کہ مجھے بُرا معلوم ہوا ہے بات کو ٹالنا چاہا۔

"لیکن گاسپوڈن نوجوان ترکوں کے متعلق تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔"

مگر بڈھا سیاست داں سر ہلاتا رہا اور اس بات کو اصرار کے ساتھ کہتا رہا۔

" بڈھے ہوں یا جوان ترک ترک ہیں۔ میں انھیں خوب جانتا ہوں۔ روئے زمین پر کوئی شخص ترکوں کو مجھ سے بہتر نہیں سمجھ سکتا۔"

کوستانوف نے کئی مرتبہ احتجاج کرنا چاہا بعض وقت معقولیت کے ساتھ اور بعض وقت ایسے الفاظ میں جن سے کوئی مفہوم پیدا نہ ہوتا تھا۔ اخیر میں کیپازلیف نے کہا

" ترکوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ خیال ہے نہ نصب العین۔ اُن کے پاس صرف ایک چیز ہے"

ہم دونوں نے پوچھا

" وہ کیا ہے ؟ "

" مذہبی دیوانگی "

" ...."

ہاں مذہبی دیوانگی۔ بلغاریہ میں مَیں نے اُن کی مذہبی دیوانگی سے بہت فائدہ اٹھایا۔ اگر میں آج برسرِ اقتدار ہوتا تو آج بھی فائدہ اُٹھا سکتا تھا۔ استامبلوف کو اس بات کا یقین تھا کہ میں ایک غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کا شخص ہوں۔ جب ہماری ریاست کی نئی نئی تنظیم ہو رہی تھی اگر میں نہ ہوتا تو بلغاریہ کی یہ حالت نہ ہوتی جو آج ہے۔ ترک اس قدر زیادہ تھے .... ہماری تعداد سوبرانیا میں یقیناً نصفا نصف ہوتی اور ایک دن جماعتِ عاملہ میں آدھی تعداد ترکوں کی ہوتی۔ لیکن میں نے..... لیکن میں نے ...."

اس نے اپنی ٹانگوں کو سمیٹا اور اپنے سینے کو اپنے بال دار ہاتھوں سے ٹھوک کر اور کوستانوف کی طرف اشارہ کر کے کہا

" یہ جاہل ہماری قدر نہیں کرتے۔ لیکن تاریخ سے حقیقت کا اظہار ہو گا۔"

مجھے یہ معلوم کرنے کی جستجو تھی کہ اس نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ اس لئے میں نے پوچھا۔

"جناب گوسپاڈن صاحب کیا آپ ہمیں یہ نہ بتلائیے گا کہ آپ نے ترکوں کی مذہبی دیوانگی سے کس طرح فائدہ اٹھایا"

"کیوں نہیں بڑی خوشی سے"

"شکریہ" میں نے کہا۔ کوشتانوف کو بھی اشتیاق تھا۔

"بڈھے آدمی نے کمبل کے نیچے ایک پاؤں پر دوسرا پاؤں رکھا۔ منہ بنایا۔ جیب سے ایک سگریٹ کیس نکالا۔ ایک ایک موٹا سگریٹ ہم دونوں کو دیا، اور ایک خود سلگایا۔ قصہ بیان کرتے وقت وہ سر، بازو اور اپنے تمام جسم کو ہلاتا رہا اور تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھٹنوں پر ہاتھ مارتا تھا۔

"بچپنے میں میری اور استمبلوف کی دوستی تھی۔ استنبول میں ہم دونوں ساتھ ہی مدرسے میں داخل ہوئے تھے۔ جب بلغاریہ کو آزادی ملی تو ہم نے کانگریس کو اور تمام کمیٹیوں کو جمع کیا۔ اس وقت بلغاریہ محض برائے نام ایک ریاست تھی۔ کیونکہ آدھی سے زیادہ آبادی ترک تھی اور یہ ایک بڑا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ بے وقوف آدمی قتل عام کی تجویزوں کو سوچتے تھے اور ان پر گفتگو کر رہے تھے۔ ایک دن استمبولاف نے مجھ سے پوچھا

"ترکوں کے ساتھ ہمیں کیا کرنا چاہئے"

"میں نے کہا" یہ تو بہت سہل ہے۔ ہم انھیں ترکی واپس بھیج دیں گے"

"کس طرح؟" استمبولاف نے کہا "کیا یہ لوگ اپنا گھر بار اور مکان اپنی خوشی سے آپ ہی چھوڑ دیں گے"

میں نے جواب دیا "ہاں ضرور" لیکن اُسے یقین نہیں آیا۔ اُس کا بھی یہی خیال تھا کہ قتل عام ہونا چاہئے۔ دراصل قتل عام کی جن لوگوں کے لئے ضرورت تھی وہ یونانی تھے کیونکہ بلغاریہ سے انھیں نکالنے کی کوئی صورت ہی نہیں تھی۔ چنانچہ اخیر میں یہی کرنا پڑا۔ لیکن ترکوں کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ اُن کا سب سے زیادہ مقدس جذبہ اُن کی مذہبی دیوانگی ہے۔ میری پرورش انھیں کے درمیان ہوئی تھی

میرے پڑوسی سب ترک تھے۔ انھیں کسی سے نفرت نہ تھی۔ وہ کسی کو نقصان نہ پہنچاتے تھے حتیٰ کہ روسیوں کو بھی نہیں جو اُن کے دشمن تھے۔ اُن کی تمام زندگی' مذہبی دیوانگی کے سیاہ پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔ مثلاً انھیں سوروں سے نفرت تھی۔ سور آپ جانتے ہیں بے ضرر جانور ہے۔ لیکن ترک اس کے جانی دشمن تھے۔ جب کبھی انھیں سور نظر آجاتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتے اور اس سے ایسے بھاگتے گویا کہ شیطان سے بھاگ رہے ہیں۔ جب حکومت اس وقت کے حاکموں کا یعنی ہمارا تقرر کر رہی تھی تو میں نے استمبولاف سے کہا

"میں ایسے حصّے میں جاؤں گا جہاں بلغاری بالکل ہی نہیں ہیں اور چند دنوں میں میں سب ترکوں کو بلغاریہ سے باہر نکال دوں گا۔"

"لیکن یورپ والوں کا بھی تو خیال کرو۔" اس نے کہا اور سر ہلایا۔ اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں ترکوں کا قتل عام کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اُسے یقین دلایا کہ "کسی کی نکسیر بھی تو نہ پھوٹے گی۔"

"تو پھر تم کیا کرو گے۔"

"میں ایک انوکھا ظلم کروں گا۔"

"کس طرح"

میں نے اُسے نہیں بتلایا۔ میرا ڈیلی ارمن میں تقرر ہو گیا جہاں اگر دوا کے لئے بھی ضرورت ہوتی تو ایک بھی بلغاری دستیاب نہ ہو سکتا۔ میں نے مقدونیہ کے ایک امان دیئے ہوئے خاندان کو شہر میں بسایا۔ میں نے سرکاری بجٹ میں سے خفیہ خدمت کی مد میں اسے چار لیرا کی رقم دی اور اُن سے پانچ سور خریدوا دیئے۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہہ دیا کہ ان جانوروں کو سڑکوں' باغوں اور کھیتوں میں غذا کی تلاش میں آزاد گھومنے دیں۔

سور تمام شہر میں پھیل گئے۔ اُس وقت ترکوں کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ اُن کے بڑے بزرگ میرے پاس آئے اور مجھ سے احتجاج کیا۔

"بلغاریوں کے سور آزادی سے سڑکوں پر گھوم رہے ہیں۔ وہ پانی کے حوضوں کو خراب کر رہے ہیں اور کھیتوں کو سونگھتے پھرتے ہیں، ہم سے یہ برداشت نہیں ہو سکتا۔"

میں نے آزادی پر ایک لمبی چوڑی تقریر کی اور میں نے کہا کہ جیسے بکریوں، گایوں، بیلوں اور مرغیوں کو آزاد رہنے کا حق حاصل ہے ویسے ہی سوروں کو بھی ہے اور میں نے اس سوال پر معاملے کو ختم کر دیا کہ

"کیا ہمیں تمھاری بھیڑوں پر کوئی اعتراض ہے؟"

وہ اِس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ لیکن اس کے بعد سے انھوں نے اُن حوضوں سے پانی لینا بند کر دیا جہاں سور پانی پیتے تھے۔ وہ چراگاہوں میں لنگوٹ باندھ کر پہلے کی طرح نہ ننگے ہو سکتے تھے نہ کُشتی لڑ سکتے تھے کیونکہ وہاں بھی سور گھومتے پھرتے تھے۔ چھ سات مہینوں میں سوروں کا قلیل التعداد گلہ بڑھا اور ہر جگہ پھیل گیا۔ جب ترکوں کو یہ معلوم ہوا کہ اُن سے نجات کی کوئی صورت نہیں ہے تو ایک ایک کر کے ہجرت کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جو بہت امیر تھے انھوں نے بھی اپنے گھر کا سامان باندھنا شروع کیا اور اپنی جائداد اور زمین کو کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کر ڈالا۔ میں حکومت کے لئے تمام زمین خرید رہا تھا۔ وہ لوگ جو گئے تھے اور جا کر استنبول میں بس گئے تھے وہ واپس آئے اور اپنے عزیز و اقربا کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ کسان بھی ہجرت کرنے لگے اور میں مقدونیہ کے بلغاریوں کو امداد دے کر بُلا رہا تھا اور ویران شہروں کو اُن سے بسا رہا تھا۔

مختصر یہ کہ دو سال کے اختتام پر تمام شہر میں ایک ترک بھی باقی نہیں رہا۔ ہاں تمام ترکوں نے اپنے صدیوں کے گھر بار کو اِس طرح خیرباد کہا گویا آگ اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔ حکومت نے میرا طریقہ اُن تمام شہروں میں جاری کیا جہاں بلغاری آبادی نہ تھی۔ یعنی بلغاریہ والوں کا ایک خاندان اور سوروں کا ایک گلہ۔ سال کے اندر اندر اس سے ترکوں کی آبادی اپنی اصل تعداد کے مقابلے میں نصف ہو جاتی تھی۔ میری حکمتِ عملی سے اسمبولاف بہت خوش ہوا اور جب کبھی میری اُس سے ملاقات ہوتی وہ کہا کرتا کہ تم غیر معمولی ذکاوت اور ذہانت کے آدمی ہو۔ تم بسمارک سے بھی بڑھ کر ہو۔

استمبولات مجھ سے بیج بیچ بغلگیر ہوتا تھا اور میرا منہ چومتا تھا۔ ہاں لسمارک السلاس لورین کے مسئلے کا ایسا تیر بہدف علاج نہ سوچ سکا۔ زبان کی تعلیم کو روکنا مدرسوں کو بند کرنا ظالمانہ طریقے ہیں میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ کیا کرنا چاہیے تھا۔ لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ کوئی ایسی بات کی جا سکتی تھی جس سے فرانسیسیوں کو غصہ آتا اور ان کی مذہبی دیوانگی برانگیختہ کی جا سکتی۔ اگر لسمارک نے اس چیز کو ڈھونڈھ لیا ہوتا تو سال کے اندر اندر اس نے ان صوبوں کو جرمن بنا دیا ہوتا۔

دس سال ہوئے میں سینٹ پیٹرس برگ گیا تھا۔ میں نے سازانوف سے گفتگو کی تھیں معلوم ہے کہ اس بے وقوف کو لوگ یورپ میں سیاست داں کہتے ہیں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم استنبول پر قبضہ کرنا چاہتے ہو۔ کیوں۔ اس نے بلا کسی تامل کے جواب دیا

"ہاں"

"یہ کام بہت آسان ہے۔"

"کس طرح" سازانوف نے پوچھا

"دنیاوی جنگوں کی ضرورت نہیں ہے۔ جیسا تمھارا خیال ہے۔ ایک بہت ہی سہل طریقہ ہے"

اس نے دوبارہ پوچھا "کس طرح"

"تم ترکوں کو استنبول چھوڑنے پر مجبور کر سکتے ہو اور ان کی جگہ روسی بسا سکتے ہو۔ پچیس سال میں ایک بھی ترک باقی نہ رہے گا اور استنبول روسی شہر ہو جائے گا۔"

"اس نے تیسری دفعہ پوچھا" لیکن یہ کس طرح ممکن ہے۔"

"بہت سہل ہے" میں نے کہا۔ اور پھر میں نے اسے بتلایا کہ ترکوں میں کوئی سیاسی خیال نہیں ہے۔ انھیں وطن اور ملک سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ وہ مذہبی دیوانگی کے ماتحت تمام چیزوں کو سوچتے ہیں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ اگر ترکوں کے محلہ میں ایک روسی یا بلغاری خاندان کو سوروں کے گلے کے ساتھ بسا دیا جائے گا تو ترک آوارہ گرد چڑیوں کی طرح گھبر کر اڑ جائیں گے۔ گدھے کو میری بات کا یقین نہ آیا۔ بے شک وہ گدھا تھا۔ کیونکہ وہ ان لوگوں کی

ذہنیت سے واقف نہ تھا جن کے دارالسلطنت پر وہ قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرے طریقے پر ہنسا اور اُس نے خیال کیا میں مذاق کر رہا ہوں لیکن جب اُسے بعد کو معلوم ہوا کہ میں سنجیدگی کے ساتھ اِس بات پر اعتقاد رکھتا ہوں تو اُس نے ہمارے ایلچی سے کہا

" کوسپوڈن کیا ذلیل بھی کیسا عجیب آدمی ہے۔ پہلی ہی ملاقات میں مجھے بنانے لگا۔"

" ہاں یہ شخص ضرور گدھا تھا۔ یورپ میں خصوصاً روس میں ایک متنفس بھی ایسا نہیں ہے جو سیاست سے صحیح طور پر واقفیت رکھتا ہو۔ ہاں سب کے سب گدھے ہیں۔"

عمر رسیدہ سیاست داں ایک کے بعد دوسرا سگریٹ جلاتا رہا اور ہم سے بھی یہی کراتا رہا۔ وہ اپنی پرانی کامیابیوں کی داستان کو ختم نہ کر سکا۔ نصف شب گذر چکی تھی۔ میرے لئے یہی بہت تھا اور کشتانوف یہ محسوس کر رہا تھا۔ اِس لئے اُس نے رخصت چاہی اور ہم نے کمرے کو جو سگریٹ کے دھوئیں سے لبریز تھا خیرباد کہا۔ باہر آکر اُس نے مجھ سے کہا

" جو کچھ یہ کہتا ہے اس میں سے ہر بات کا تمھیں یقین نہ کرنا چاہئے۔"

" کیوں کیا وہ جھوٹ بول رہا تھا "

" نہیں "

" تو پھر "

" یہ مبالغے سے کام لیتا ہے۔ اس میں سے پانچ فیصدی نکال دو اور باقی پر یقین کر لو۔"

میں اپنے کمرے میں گیا کپڑے اُتارے اور بستر پر لیٹ گیا لیکن نیند غائب تھی۔ مجھے بخار تھا لیکن میرا بدن گرم نہ تھا۔ میرے تمام جسم پر سرد پسینے کی تہ جمی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ بڑے کمرے میں گانے اور ناچنے کا شور بلند ہوگیا۔ مرغوں نے اذانیں دیں۔ دن نکلنے لگا۔ میں نے اپنی آنکھیں مضبوطی سے بند کر لیں۔ منہ بستر میں دے لیا اور اونگھنے کی کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اپنے بہادر آبا و اجداد کو، اپنے جاں باز بھائیوں کو، اپنے پاک باطن اور سادہ لوح ہم قوموں کو گندے سوروں کے گلوں کے

آگے آگے پاگلوں کے ایک مجمع کی طرح بھاگتا ہوا دیکھ رہی ہوں۔ اُن کے عمامے ہوا میں اُچھل رہے ہیں۔ اُن کے گھوڑے اور گاڑیاں دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اُن کی توپیں اور بندوقیں، اُن کی بیویاں اور بچے ایک ایک کر کے راستے میں گرتے جا رہے ہیں۔

ہاں اُس رات مجھے بالکل نیند نہیں آئی ؂

تنقید و تبصرہ

اُمہات الامہ | مصنفہ شمس العلما۔ مولانا حافظ نذیر احمد مرحوم قیمت فی نسخہ ۶/ ملنے کا پتہ ساقی بک ڈپو دہلی
یہ وہ ہنگامہ خیز کتاب ہے جس کے شائع ہونے پر دہلی کے بعض مولویوں نے شورش برپا کرکے دور دور تک پھیلایا اور اس کے مصنف پر کفر و الحاد کے فتوے لگائے چنانچہ اُن کی زندگی ہی میں جب دہلی میں ندوۃ العلما کا اجلاس ہوا تو مولوی صاحبان نے جمع ہوکر اس کتاب کی تمام جلدوں کو جو ایک صاحب کے پاس امانتاً رکھوا دی گئی تھیں لیکر ڈھیر لگایا اور اس پر مٹی کا تیل ڈالکر آگ سے جلا دیا۔ اتفاق سے اس کا ایک نسخہ بچا ہوا رہ گیا تھا جسے امسال دوبارہ مسٹر شاہد احمد نے جو مصنف کے پوتے ہیں شائع کیا ہے اس میں جو باتیں علما کے نزدیک قابل اعتراض ہیں ان کو ایک مولوی صاحب نے جن کا نام عبدالغنی تھا کشف الغمہ کے نام سے شائع کیا تھا اس کا جواب علامہ احمد حسن محدث دہلوی صاحب احسن التفاسیر نے لکھا تھا یہ دونوں رسالے بھی اس کتاب کے ساتھ شامل کر دئے گئے ہیں تاکہ لوگ ان وجوہات کو دیکھیں جن کی بنیاد پر کتاب نذر آتش کی گئی تھی۔

یہ کتاب پادری احمد شاہ شائق کی کتاب امہات المومنین کے جواب میں لکھی گئی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خانگی زندگی پر اعتراضات کئے گئے تھے مولانا نذیر احمد نے ان تمام اعتراضات کے نہایت مستند اور دنداں شکن جوابات دئے ہیں میں نے ساری کتاب غور سے پڑھی میرا خیال یہ ہے کہ جس غرض و غایت کیلئے یہ لکھی گئی ہے نہایت مشرح اور مکمل ہے۔ بیشک بعض امور میں علمی حیثیت سے اختلاف کی گنجائش ہے لیکن ان اختلافات سے مصنف کا دین و ایمان قطعاً زیر بحث نہیں لایا جاسکتا۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے۔ رسولؐ پاک کی مدافعت میں لکھا ہے خلوص نیت سے لکھا ہے۔ علم اور ایمان کی روشنی میں لکھا ہے کہیں ان کی عقیدت سے فتور کا شائبہ نہیں ملتا۔ بیشک چند الفاظ زبان قلم سے ناولانہ رنگ کے نکل گئے ہیں جن سے ان کی طبیعت مالوف تھی مگر ان کی بنا پر یہ کتاب سوختنی نہیں

ن اگرچہ ہماری خواہش یہ ضرور ہوتی ہے کہ کاش ان الفاظ سے بھی جو عوام میں ہیجان پیدا کر سکتے ہیں یہ پاک ہوتی۔

جن حضرات نے اس کو جلایا یا جلوایا میرا خیال یہ ہے کہ معاصرانہ عداوت یا کچھ اور جذبات اس کے محرک رہے ہوں گے ورنہ اس کتاب سے تو قطعاً مصنف کا کفر والحاد ثابت نہیں کیا جا سکتا زیادہ سے زیادہ بعض الفاظ سے سوء ادب کا الزام لگایا جا سکتا ہے وہ بھی بزعم خود کیونکہ مصنف کا رتبہ ادب اردو میں نہایت بلند مسلم ہو چکا ہے وہ اگر ان الفاظ یا فقرات کو ادب کے خلاف سمجھتے تو میرا یقین ہے کہ ہرگز نہ استعمال کرتے

<u>محمدیہ پاکٹ بک</u> | مؤلفہ منشی محمد عبداللہ صاحب معمار امرتسری تقطیع خورد لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ ضخامت ۷۳۶ صفحے۔ مجلد قیمت فی مجلد ؎ ملنے کا پتہ شعبۂ تالیف و طبع انجمن اہلحدیث براندرتھ روڈ لاہور۔

یہ کتاب مرزائیت کی تردید میں نہایت جامع اور مبسوط لکھی گئی ہے جس میں اس کے تمام اصولی اور فروعی امور زیر بحث لائے گئے ہیں انداز بیان اس قدر معقول اور مدلل ہے کہ سوائے تسلیم کے کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا مرزائیوں نے احمدیہ پاکٹ بک شائع کر کے مرزا صاحب کی چند پیشین گوئیوں کا وقوع ثابت کیا تھا لیکن چند پیشین گوئیوں کے صحیح ہو جانے سے کوئی شخص نبی نہیں ثابت ہو سکتا تاوقتیکہ یہ نہ دکھایا جائے کہ اس کی کوئی پیشین گوئی غلط نہیں نکلی اس کتاب میں مؤلف نے مرزا صاحب کی اکثر پیشینگوئیوں کو جو بڑے ادعا کے ساتھ کی گئی تھیں جھوٹا ثابت کر دیا ہے اور ان کے عدم وقوع کو خود مرزا اور مرزائیوں کی تحریروں سے دکھلا دیا ہے۔ ہندوستان کے اس مدعی نبوت کی پیشینگوئیوں کی حقیقت اگر کوئی دیکھنا چاہے تو اس کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیئے واقعی اس کا مؤلف فاضل مرزائیت ہے اگر کوئی یونیورسٹی اس لٹریچر کی مہارت پر ڈگری دیتی تو منشی عبداللہ کو اس کتاب پر ضرور پی ایچ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔

<u>مزدوری کہانیاں</u> | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب۔ قیمت ۶؍ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب میرٹھی۔ مکتبہ شرفیہ۔ دہلی

قاضی صاحب نے اس کتاب میں ہندوستان کے راجاؤں، بادشاہوں اور نوابوں کے ایسے واقعات اور قصص فراہم کئے ہیں جن سے ہندوستانی قوموں میں باہم اتحاد بڑھے، مخالفوں نے ہندوستان کی تاریخ کو جو یہاں کی اقوام میں باہمی منافرت پیدا کرنے کا ذریعہ بنا رکھا ہے اس قسم کی کتابوں سے اُن کے زہر کا ازالہ ہو سکتا ہے قاضی صاحب کی یہ کوشش ہر بہی خواہ ہند کی نگاہ میں نہایت مفید ہے۔

سودیشی اردو | مصنفہ قاضی عبدالصمد صاحب فی نسخہ ۱۲ ملنے کا پتہ مولوی محمد ادریس صاحب مالک مکتبہ شریفیہ دہلی

اس رسالہ میں قاضی صاحب نے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں اور باتیں خالص اردو میں لکھی ہیں اس میں عربی و فارسی کے الفاظ نہیں آئے ہیں عبارت رواں اور صاف ہے جو لوگ خالص اردو کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے یہ ایک عمدہ تحفہ ہے۔

روزنامچہ یا مجنوں کی ڈائری | از جناب قاضی عبدالغفار صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت وطباعت اچھی، یہ کتاب "لیلیٰ کے خطوط" کے ساتھ ۲؎ میں ملتی ہے ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

دارالادب پنجاب نے ایک خاص نوع کا ادب لطیف پیش کرنا شروع کیا ہے جس میں اخلاقی، مذہبی رسمی اور روایتی قیود سے بے نیاز ہو کر کتاب کے موضوع کا انتخاب کیا جاتا ہے اور دوران تصنیف میں خیال آفرینی پر کسی قسم کی حد بندی یا رکاوٹ عاید کرنا آزادی تحریر کے منافی سمجھا جاتا ہے اس نوع کا ادب عموماً سماج کے اس دور میں پیدا ہوتا اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جب امرا اور تعلیم یافتہ جماعت میں تشکیک کا غلبہ ہوتا ہے اور ان کے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی تمام پرانی قدریں اپنا اثر زائل کر دیتی ہیں اور نئی قدریں ذوق و نشاط عمل پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہیں مذہب، اخلاق، قانون معاشرت، رسم و رواج، سیاسی تحریکیں سب لغو و مہمل نظر آنے لگتی ہیں حتیٰ کہ خود زندگی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا، شراب ہوس پرستی اور موسیقی وجہ تخلیق کائنات اور مدار زندگی بنجاتے ہیں خیال کی پختگی اور گہرائی کے اعتبار سے یہ دور چاہے کتنا ہی بے مغز کیوں

نہ ہو لیکن اس کے بعض ادبی شاہکاروں کی لطافت اور دلچسپی خراج تحسین وصول کیے بغیر نہیں رہتی۔
زیر تنقید کتاب اسی قسم کی تصنیف ہے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے یہ چاہے جس قدر بھی قابل اعتراض ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ ادبی حیثیت سے یہ اسی قدر کامیاب ہے

"شرح حال" کے عنوان سے کتاب کی ابتدا میں قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک طویل مقالہ بزرگانہ کے انداز میں سپرد قلم فرمایا ہے جس میں انھوں نے اپنی تصنیف کی "معنوی کیفیات" کو بے نقاب کرنے کی کوشش فرمائی ہے اور ان لوگوں کی تعریف کو جو اپنی توجہ اس تصنیف کی محض ادبی خوبیوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں "تحسین ناشناس" سے تعبیر کیا ہے لیکن ان کی اس پیش بندی کے باوجود ہم اُن کی کتاب کو اس سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

"مجنوں کی ڈائری" سے اگر "شرح حال" کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہمارا خیال ہے اس سے کسی قسم کی اصلاحی یا تعلیمی خدمت نہیں ہوتی بلکہ اس سے غیر پختہ ذہنوں میں جہاں ابھی تک خدا کا ڈر، شریعت کا احترام اور سماج کے قانون کی عزت باقی ہے ایک طرح کی غیر ذمہ دارانہ آزادی، نراجی انتشار اور مایوس کن کیفیت بے عملی اور بے راہروی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ قاضی صاحب کو اُس چیز کا مطالبہ نہ کرنا چاہیے جس کے وہ مستحق نہیں ہیں ادبی حیثیت سے ہمیں اعتراف ہے ان کا کارنامہ بڑی حد تک کامیاب ہے لیکن اس دور ابتلا اور آزمائش میں جب کہ ہر نوجوان کے سامنے ایک واضح اور متعین معیار اور مقصد ہونا چاہیے ان کی کتاب کی تخریبی مساعی کسی نہج سے لائق ستائش نہیں ہو سکتیں ان کے وسیع تجربہ اور بالغ نظری سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ نوجوانوں کے مسائل کو زیادہ پیچیدہ بنانے کی بجائے اُن کی زندگی کے خطرناک راستہ کو سہل اور ہموار کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

"شرح کلام" کے اختتام پر قاضی صاحب نے امید دلائی ہے کہ "داستان ابھی باقی ہے جو اس سلسلہ کی آئندہ اقساط میں پیش کی جائے گی" ہماری تمنا ہے کہ آئندہ جو "داستان" پیش کی جائے وہ ایسی ہو کہ اُس سے زندگی کا ایک صحیح اور تندرست فلسفہ پیدا ہو سکے تاکہ موجودہ دور شک و الحاد اور بے عملی کا خاتمہ ہو اگر قاضی صاحب اس خدمت کے کرنے میں کامیاب ہوئے تو ان کی تحریر کے ادبی نقوش کی تعریف

کے ساتھ ساتھ ان کی تصنیف کی "معنوی اہمیت" کی بھی ہر طرف سے خاطر خواہ داد ملے گی آخر میں ہم قاضی صاحب موصوف سے درخواست کریں گے کہ وہ نوجوانوں کی اُن ذہنی کیفیات کا جن کا تعلق محض شہوانی جذبات سے نہیں ہے ذرا زیادہ گہرا مطالعہ کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں اور اُن "غریب نوجوانوں کو جنھیں کالجوں میں پیا گھولا اور چھانا جاتا ہے" اپنی دل سوزی ہمدردی اور تعمیری مساعی کا زیادہ مستحق سمجھیں اور ان پر سستی قسم کی پھبتیاں چست کرنے سے جہاں تک ہو سکے اجتناب فرمائیں کیونکہ ان "آبگینوں" کو ٹھیس لگانا سماج کے لیے سخت مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

<u>لیلیٰ کے خطوط</u> | از قاضی عبدالغفار صاحب۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۲ صفحات کتابت و طباعت اچھی "مجنوں کی ڈائری" کے ساتھ ہے، ۸ر میں مل سکتی ہے ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب بارود خانہ اسٹریٹ لاہور

یہ کتاب ایک ذہین تعلیمیافتہ اور شاید فطرتاً نیک بازاری عورت کے فرضی خطوط ہیں جن کے وسیلے سے اس کے فلسفۂ زندگی اور نفسیاتی کیفیات کے تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے موضوع کتاب یعنی ابتدا میں جوانی کی لغزش، تربیت کرنے والوں کی عدم توجہی اور بعد میں معاشی ضرورت سے مجبور ہو کر طبعی تنفر اور بیزاری کے باوجود پیشہ کو جاری رکھنا، اور مناسب موقع ملنے پر اس سے کنارہ کش ہو جانا ہر چند پامال ہو چکا ہے لیکن جس جدت خیال اور ندرت بیان کے ساتھ قاضی عبدالغفار صاحب نے کتاب میں اپنی انفرادیت کو چمکانے کی کامیاب کوشش کی ہے وہ یقیناً مستحق ستائش ہے ادب لطیف کے اس دلکش خزانے میں چند جواہر پارے تو واقعی بہت بیش قیمت ہیں مثلاً ایک خط کی ابتدا ایک ایسے بلیغ استعارے سے ہوتی ہے کہ کل کتاب کا ماحصل چند مختصر الفاظ میں محدود ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتی ہے:-

"قدرت کے دو بچوں نے کہا آؤ ایک کشتی بنائیں انھوں نے ایک چھوٹی سی کشتی بنائی محبت سے اس کے تختے جوڑے اس کو اپنے ایک باغ کے خوبصورت تالاب میں ڈال دیا جہاں موسم بہار کی معطر ہوائیں اس ننھے سفینے کو پانی کی ہلکی لہروں پر جھولا جھلایا کرتی تھیں وہ کشتی کاغذ کی نہ تھی، نہ لکڑی کی تھی نہ لوہے کی، لیکن کاغذ سے بھی زیادہ نازک تھی مگر اس کے بنانے والے نہ جانتے تھے کہ ایسی کشتیاں

کس قدر نازک ہوتی ہیں شاید انھوں نے یہ سمجھا کہ ایک چھوٹے سے باغ کے چھوٹے سے تالاب کے بے موج اور بے طوفان پانی کے لیے کشتی کو مضبوط بنانے کی ضرورت نہیں وہ بھول گئے کہ تالاب کی کشتی کو بھی کسی دن طوفان خیز سمندروں اور تیز دریاؤں میں جانا پڑتا ہے۔ تالاب بھی دریا اور سمندر بن سکتا ہے۔ وہ خطرات کو بھول گئے۔ مگر بھول جانے سے خطرات کم نہیں ہو سکتے یہ خدا کا نہ بدلنے والا قانون ہے۔"

برسات آئی۔ ایسی برسات آئی کہ چاروں طرف سے نالے چشمے اور دریا اُمنڈ آئے پھولوں کی کیاریوں کو پانی کی چادر نے ڈھانک لیا ...... جب تک اس ننھے سفینہ میں دم تھا اور دم ہی کتنا تھا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن کوئی سہارا نہ تھا کشتی والے بےخبر تھے انھوں نے کس محنت سے سفینہ بنایا تھا اور کس بے پروائی سے اس کو بھول گئے تالاب کے پانی اور برسات کی ہواؤں نے یوں گویا کہ دونوں کی سازش تھی ایک دو دن اس شکستہ لنگر کشتی کو ادھر ادھر گھسیٹا اور پھر آخری جھٹکا دیکر چھوڑ دیا۔ ایک طرف کیچڑ میں جہاں مینڈکیں بول رہی ہیں اور جھینگر شور مچا رہے ہیں، درختوں کے گرے ہوئے پتے سڑ رہے ہیں چند گلے ہوئے تختوں کا انبار پڑا ہوا ہے کچھ کیچڑ میں کچھ کیچڑ کے باہر......

"کوئی ان بے خبر کشتی والوں کو بلائے اگر چاہیں تو ان تختوں میں اب بھی اتنی سکت باقی ہے پھر اپنی کشتی بنالیں وہ ایسی مضبوط تو نہ ہوگی جیسی پہلے تھی مگر کسی چھوٹے سے باغیچہ کی نہر میں اب بھی پڑی رہ سکتی ہے کہیں کوئی ملاح ہے جو اس ٹوٹی ہوئی کشتی کے تختوں کو جوڑ دے جو اس کشتی کے لیے ایک بادبان اور لنگر کہیں سے لادے؟

"میرے مہربان! یہ پہلی جو بیان کی گئی آپ بیتی ہے......"

اسی قسم کے اور بہت سے لطیف ادبی شہ پارے ہیں۔ کتاب مستحق مطالعہ ہے اور بازاری عورت کے شرمناک عہد زندگی کے اختتام اور نئے عہد پاکبازی کے آغاز پر ختم ہوتی ہے آخری خط میں وہ لکھتی ہے "چند روز اس نئی دنیا میں مجھے دم لینے دو جس کے دروازے میرے لیے کھلتے جاتے ہیں۔ اس ویرانے کو آباد ہونے دو مجرموں سے میرے انتقام کا وقت وہ آئے گا جب میں بیوی اور ماں بنکر بغاوت کا علم بلند کروں گی۔ ابھی تو میں ایک بازاری عورت ہوں، ذلیل حقیر گردن زدنی!"

دلچسپ افسانے | ازجناب کوثر چاندپوری تقطیع چھوٹی ضخامت چارسو صفحات کتابت و طباعت روشن کاغذ متوسط قیمت ۲ ملنے کا پتہ شمیم اختر بیگم۔ بیگم گنج بھوپال یا مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

یہ جناب کوثر چاندپوری کے پچیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں ان میں سے بیشتر سماج کی اصلاح کے مقصد سے لکھے گئے ہیں اور اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہیں کچھ حسن و عشق کے افسانے بھی ہیں جن میں رومان پیدا کرنے کی کوشش کیگئی ہے جناب مصنف کی طبیعت مبالغہ کی جانب بھی مائل معلوم ہوتی ہے "انتقام قدرت" میں سورج سنگھ کا کیرکٹر مبالغہ آمیز ہے سورج سنگھ کو اس کے مظالم کی سزا قدرت کی طرف سے یہ ملی ہے کہ اس کا گھر سیلاب میں بہ گیا اور وہ خود بیوی بچوں سمیت سیلاب کی نذر ہو گیا مگر یہ صورت تو کم و بیش گاؤں کے دوسرے رہنے والوں کے ساتھ بھی پیش آئی انھیں کس جرم میں یہ سزا ملی۔ کتاب کے شروع میں جناب مصنف اور جناب قاضی امیرالدین صاحب نائب دیوان ریاست دتیا کی تصویریں بھی ہیں۔

رموز کلام غالب | مرتبہ محمد اسحاق صاحب، حجم ۸۲ صفحات تقطیع چھوٹی۔ کتابت و طباعت متوسط کاغذ معمولی قیمت ۸ ملنے کا پتہ منیجر صاحب رسالہ ماہ تمام نمبر ۸۲ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

جناب اسحاق صاحب امرتسری، غالب کے سات اشعار مختلف عنوانات: مایوسی، قسمت، طاعت، آئینہ، شراب، دین و دنیا۔ انسان کی دنیا کے تحت میں تقسیم کرکے اُن کی تشریح کی ہے

ہوش کے ناخن | از جناب میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان تقطیع چھوٹی حجم ۹۴ صفحات کتابت و طباعت متوسط کاغذ اچھا قیمت دس آنے ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔ یہ ایک انگریزی ڈرامے کا ترجمہ ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ انسان طمع زر میں کیسا سخت دل اور خود غرض ہو جاتا ہے اور اپنا مطلب نکالنے کے لیے کیسی کیسی عیاریوں سے کام لیتا ہے اور اگر کوئی ان خرابیوں کی اصلاح کرنا بھی چاہے تو ماحول اور سوسائٹی اسے بالکل بے بس اور مجبور کر دیتی ہے۔ ترجمہ بہت صاف اور شگفتہ ہے اور قابل مترجمین نے اسے بڑی خوبی سے اپنایا ہے۔

زبان حیدرآباد کی مقامی ہو جس سے ڈراما کا لطف اہل حیدرآباد کے لیے اور بڑھ گیا ہوگا۔ حیدرآباد میں دوبارہ کامیابی کے ساتھ اسٹیج بھی ہو چکا ہو۔

چالیس حدیثیں | مرتبہ خواجہ عبدالحی صاحب فاروقی استاد تفسیر جامعہ ضخامت ۴۴ صفحے تقطیع چھوٹی کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ۲ ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جناب خواجہ صاحب نے اس کتاب میں بچوں کے لیے مختلف عنوانات مثلاً جسم اور کپڑوں کی صفائی، وقت کی پابندی، استقلال، باپ رشتہ دار وغیرہ عنوانات کے ماتحت قرآن کی آیات اور احادیث جمع کردی ہیں ساتھ ہی نہایت آسان زبان اور موثر انداز میں ان کی تشریح بھی کی ہو یہ کتاب بچوں اور بوڑھوں سب کے لیے مفید ہو۔

بچوں کے اسمٰعیل | از جناب سعید انصاری صاحب بی۔ اے (جامعہ) ضخامت ۰۸ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ عمدہ قیمت ۸ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ قرول باغ دہلی

جناب سعید انصاری صاحب نے اس چھوٹی سی کتاب میں ہندوستان کے مشہور شاعر اسمٰعیل میرٹھی کی اُن نظموں کا انتخاب شائع کیا ہو جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی ہیں اور ان کی ریڈروں میں چھپ چکی ہیں مولانا اسمٰعیل میرٹھی کو بچوں کی نظمیں لکھنے میں جو کامیابی ہوئی ہو وہ اب تک بہت کم شاعروں کو نصیب ہوئی۔ سعید صاحب نے یہ بہت اچھا کام کیا ہو کہ ان نظموں کو ایک جگہ جمع کردیا ہو انھوں نے اس امر کا التزام کیا ہو کہ سہل اور آسان نظمیں پہلے آئیں اور بعد میں مشکل ہوتی جائیں آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ہو۔

شذرات

خدا کا شکر ہو کہ جامعہ کا وفد جو شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی سرکردگی میں صوبہ متحدہ کے مغربی اضلاع کا دورہ کر رہا ہو اب تک ہر طرح کامیاب رہا ہو۔ مظفر نگر، سہارن پور، بجنور کا کام ختم ہو چکا ہو اور ان تینوں ضلعوں کے باہمت لوگوں نے جس گرمجوشی، خلوص اور فیاضی سے ہمارے وفد کی امداد کی ہو اس سے ایک طرف تو یہ اندازہ ہوتا ہو کہ ان مالی مشکلات کے زمانے میں مسلمانوں کا ہاتھ تنگ ہو، مگر دل تنگ نہیں ہو اور دوسری طرف یہ کہ جامعہ ملیہ نے ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگوں کو اپنی تعلیمی تحریک کی طرف متوجہ کر لیا ہو اور اب انشاء اللہ اس کی راہ میں وہ دشواریاں جو اب تک تھیں باقی نہیں رہیں گی آئندہ ہفتے میں وفد بریلی، شاہجہاں پور، بدایوں وغیرہ جائے گا۔ ہمیں یقین ہو کہ روہیلکھنڈ کے حامیانِ تعلیم اور محبانِ ملت اپنے قومی ادارے کی مدد میں قسمت میرٹھ کے باشندوں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ تخمینہ یہ ہو کہ مظفر نگر، سہارن پور، بجنور کے چندے کی مجموعی رقم اُس نصاب سے ڈیوڑھی ہو جو ان اضلاع کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ دیکھنا ہو کہ اور اضلاع صرف اس تناسب کو قائم رکھتے ہیں یا آگے بڑھ جاتے ہیں۔

تجویز ہو کہ آئندہ سال سے جامعہ میں ابتدائی مدارس کے معلموں کی ٹریننگ کا انتظام کیا جائے بعض اسلامی انجمنوں نے جو ابتدائی مدرسوں کو چلاتی ہیں اور دو ایک میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہو کہ جامعہ اپنے یہاں معلموں کی تعلیم کا مدرسہ کھولے، خود جامعہ کے ابتدائی مدرسہ سے ہر سال مدرس ٹریننگ کے لیے باہر بھیجے جاتے ہیں اور اُن کی تعلیم کا خرچ جامعہ کو برداشت کرنا پڑتا ہو اگر وہ اپنے یہاں ٹریننگ کا معقول انتظام کرے تو اس کے مدرسوں اور دوسرے اسلامی مدرسوں کو بڑی سہولت ہو جائے گی اسی خیال سے فی الحال ایک سال کیلئے ٹریننگ کا شعبہ امتحاناً قائم کیا جا رہا ہو اور اس میں بہت تھوڑے سے طلبا داخل کئے جائیں گے، داخلہ کی مفصل شرائط بہت جلد شائع کر دی جائیں گی۔ غالباً اسلامیات، اردو، انگریزی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ کم سے کم

ثانوی دوم (مڈل) تک جانے کی قید ہوگی ممکن ہو داخلہ کا کوئی امتحان بھی رکھا جائے طلبا کو اصول تعلیم نفسیات اطفال، طریق درس، نظم مدرسہ، حفظان صحت وغیرہ کے علاوہ ان مضامین کی مزید تعلیم بھی دیجائے گی جو انھیں ابتدائی مدرسوں میں پڑھانے ہوں گے۔

کالج کے نصاب تعلیم پر بھی دوبارہ غور کیا جا رہا ہے، خیال ہے کہ ثانوی چہارم کے بعد کالج کی چار سال کی تعلیم کا ایک ہی نصاب بنایا جائے اور ایک ہی سند (بی۔اے) رکھی جائے ہر سال کے ختم پر امتحان ہوا کرے صرف اس لیے کہ سال بھر کی تعلیم کا نتیجہ معلوم ہو سکے، نصاب میں اختیاری مضامین نہ رکھے جائیں بلکہ ہر طالب علم کے لیے ایک ہی نصاب ہو، جو انگریزی اردو کے علاوہ اسلامیات اور اجتماعیات پر حاوی ہو، اور جس کے ختم کرنے کے بعد طلبہ صحافت، معلمی اور دوسری معاشرتی، قومی خدمات انجام دے سکیں۔

بی اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ہر طالب علم سے یہ توقع کیجائے گی کہ ان میں سے کسی کام کی عملی تربیت بھی حاصل کرے اور جب تک جامعہ میں اس کا انتظام نہیں ہے اُس وقت تک کسی دوسرے ادارے میں جا کر اس کی تکمیل کرے۔

امیرِ جامعہ ڈاکٹر انصاری صاحب مدظلہٗ کے برادر بزرگ نواب ضیا نواز جنگ بہادر نے یکایک بنگلور میں انتقال فرمایا اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہم جامعہ ملیہ کے طلبا اور اساتذہ اور رسالہ جامعہ کے قارئین کرام کیطرف سے ڈاکٹر صاحب قبلہ اور مرحوم کے کل عزیزوں سے اس صدمۂ جانکاہ میں قلبی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں، مرحوم اعلیٰ درجہ کے منتظم اور مدبر، اعلیحضرت خسرو دکن کے معتمد خاص، نہایت دیندار خوش خلق اور مہمان نواز بزرگ تھے، جامعہ ملیہ سے دلی ہمدردی رکھتے تھے اور اس کی مدد میں ہر طرح کی سعی فرماتے تھے۔

خداوند تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے (آمین)

مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم

کی

شرافت سے ناجائز فائدہ

حکیم صاحب مرحوم نہیں چاہتے تھے کہ دوا فروشی سے اپنی جیب پُر کریں۔ اُن کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ طب یونانی غیر ذمہ دار ہاتھوں سے تباہ ہو۔ اِسی احساس سے متاثر ہو کر ۱۹۱۰ء میں ہندوستانی دواخانہ جاری کیا اور اس کا کل منافع آیورویدک اینڈ یونانی طبی کالج کے لئے وقف کیا۔ اُن کے انتقال کے بعد بعض پست خیال لوگ ایسے اشتہارات دے رہے ہیں جن سے گمان ہوتا ہے کہ ان دواخانوں سے حکیم صاحب کو کوئی نسبت تھی۔ ہم صاف بتا دینا چاہتے ہیں کہ بڑا دواخانہ، ہمدرد دواخانہ، ہندوستانی ہمدرد دواخانہ، دفتر حکیم اجمل خاں مرحوم، کارخانہ دواخانہ حکیم اجمل خاں فریدآباد، گڑگانوہ وغیرہ دواخانوں کا ہندوستانی دواخانہ یا اُس کے سرپرستوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہندوستانی دواخانے کی کوئی برانچ دہلی یا دہلی کے باہر نہیں۔

سَو روپیہ انعام

اُس شخص کو دیا جائے گا جو ایسے شخص یا اشخاص کو گرفتار کرائے جو دوا فروشی حکیم اجمل خاں مرحوم کے نام سے کر رہا ہو!!

ہندوستانی دواخانہ کی چند مخصوص دوائیں

مصفی	شربت صدر	اکسیر نسواں	روغن موم
خون کی خرابی سے پیدا ہونے والے ہر مرض کی تیر بہدف دوا ہے۔ کھجلی۔ داد۔ پھوڑے پھنسی حتیٰ کہ جذام اور آتشک تک اس کے استعمال سے اچھے ہو جاتے ہیں۔ **ترکیب استعمال** - ایک ایک خوراک صبح - دوپہر - شام تھوڑے پانی میں ملا کر پئیں۔ **قیمت** فی شیشی ۲۴ خوراک ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ۸)	حلق اور سینے کے امراض کی مکمل دوا ہے۔ نزلہ۔ زکام۔ ذات الریہ نمونیہ۔ کھانسی۔ نفث الدم اور سل ودق جیسی خطرناک بیماریاں اس کے استعمال سے دور ہو جاتی ہیں۔ ہزاروں مریض اس کے استعمال سے اچھے ہو چکے ہیں۔ **ترکیب استعمال** ایک ایک خوراک شربت صبح۔ شام دس دس تولہ گائے کے دودھ اور عرق گاؤزباں میں ملا کر پئیں۔ قیمت فی شیشی ۸ خوراک ۱۲/	اکسیر نسواں۔ سیلان الرحم (لیکوریا) کی بے نظیر دوا ہے۔ علاوہ ازیں ضعف رحم، ورم رحم، حیض کی تمام خرابیاں مثلاً حیض کے درد سے آنے اور تکلیف سے آنے وغیرہ کے لئے نہایت مفید اور کامیاب ثابت ہو چکی ہے۔ **ترکیب استعمال** تین تین ماشہ دوا صبح شام پاؤ سیر دودھ میں ملا کر پئیں۔ قیمت فی شیشی دس تولہ ایک روپیہ	ہر قسم کے دردوں خصوصاً گٹھیا۔ درد کمر، عرق النسا وغیرہ کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ چوٹ کے پرانے درد کو بھی دور کرتا ہے۔ **ترکیب استعمال** - درد کی جگہ نیم گرم مالش کر کے اوپر سے روئی باندھ دیں۔ **قیمت** ۸ تولہ کی شیشی دو روپے (عہ)

ہندوستانی دواخانہ دہلی - پوسٹ بکس نمبر (۲۲)

رجسٹرڈ نمبر

جامعہ

اردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی
کا
ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین۔ ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

قیمت سالانہ صہ ر   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

قائم مقام ایڈیٹر: محمد عاقل ایم۔ اے

جلد ۲۴	مئی ۱۹۳۵ء	نمبر ۵

فہرست مضامین

محمد مجیب بی اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

پستالوزی

"کوئی قوم اُس وقت تک صحیح معنوں میں طاقتور نہیں ہوسکتی جب تک کہ اُس میں ایک پستالوزی نہ پیدا ہوچکا ہو"۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو میرے محترم اُستاد پروفیسر اشپرانگر نے جو موجودہ جرمنی کے سب سے بڑے ماہر فلسفۂ تعلیم ہیں ایک مرتبہ مجھ سے دورانِ ملاقات میں فرمائے پستالوزی کی عظمت اعتقاداً اسی دن سے میرے دل میں جم گئی اور مجھے اُس کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے اور اُس کی تصانیف کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوگیا۔ جرمنی کے چار برس کے دوران قیام میں میں برابر پستالوزی کے خیالات اور اس کے ہمہ گیر اثرات کا مطالعہ کرتا رہا۔ بالآخر مجھے یقین ہوگیا کہ موجودہ یورپ اور خصوصاً جرمنی کے احیاء اور ترقی میں ہنوز پستالوزی کا محبت بھرا دل و دماغ کام کر رہا ہے۔

بدقسمت ہندوستان اس وقت تک پستالوزی کی ایسی ایک ہستی سے محروم ہے جو یہاں کے کروڑ مفلس اور درماندہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے خود کو وقف کردیتا اور اپنے ایثار و قربانی سے قوم کی توجہ کو ابتدائی تعلیم کی طرف منعطف کردیتا۔ جب تک کہ قومی زندگی کے بنیادی سرچشمے سیراب نہ ہوں گے، جب تک کہ ہماری حیاتِ ملی کی جڑیں مضبوط نہ ہوں گی، جب تک کہ ہندوستان کے بیشمار ننھے ننھے نونہال جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی یافتہ نہ ہوں گے، ہمارا قصرِ قومیت ہمیشہ کمزور اور متزلزل رہے گا۔ اسی احساس نے مجھے مجبور کیا کہ پستالوزی کے خیالات اور اس کے حالاتِ زندگی اہلِ ہند کے سامنے پیش کیے جائیں۔

پستالوزی جس ماحول میں تقریباً آج سے سو برس قبل یورپ میں پیدا ہوا وہ ہندوستان کے موجودہ ماحول سے بہت کچھ مشابہ ہے۔ یورپ میں اٹھارھویں صدی کا آخر اور انیسویں صدی کا اوّل ایک پرآشوب زمانہ تھا۔ گذشتہ اٹھارہویں صدی کا تصورِ زندگی منہدم ہو رہا تھا اور اس کی جگہ نئے نئے خیالات لے رہے تھے۔ انقلابی خیالات کا ہر جگہ دور دورہ تھا اور اس طرح جدید تمدن کی تہ میں

بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ مغربی اقوام اپنی جہالت کے باعث اس تمدن کے بوجھل بار مستقل طور پر اٹھانے کے ناقابل تھیں پستالوزی ان میں اس تمدن کے متحمل ہونے کی اہلیت پیدا کرنا چاہتا تھا چنانچہ اسی وجہ سے تمدنی اور تعلیمی مسائل اس کے یہاں بالکل مخلوط ہیں۔ شروع میں اسے تمدنی مسائل سے زیادہ شغف رہا لیکن اسے بعد میں واضح ہو گیا کہ تمدنی اصلاح ناممکن ہے جب تک کہ انسانی سیرت میں بنیادی تبدیلی نہ کی جائے! اور یہ صرف تعلیم ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔

یہی مسائل آج اہل ہند کے سامنے بھی پیش ہیں! اور اسی باعث پستالوزی کے خیالات کے مطالعہ سے ہم بہت کچھ مستفیض ہو سکتے ہیں لیکن ہمیں اس کے خیالات اور نہ اس کے طریقہ تعلیم کی اندھی تقلید کرنے کی ضرورت نہیں پستالوزی کی شخصیت اور اس کے خیالات ایک مخصوص مغربی تمدن اور ایک مخصوص ماحول اور ضرورت کی پیداوار ہیں اس نے اپنے وقتی مسائل پر غور و فکر کر کے اپنی قوم کے درد کے لیے ایک درمان پیش کیا۔ ہمیں بھی اپنے تمدنی مسائل پر غور و فکر کرنے کے بعد ایک راہ عمل تجویز کرنی چاہیئے لیکن جس طرح ایک مسافر کے لیے اپنے پیشرو کے آثار سفر باعث امداد ہوتے ہیں اسی طرح تمدنی اور تعلیمی مسائل کی تحقیق و جستجو میں پستالوزی ہمارے لیے شمع ہدایت کا کام دے سکتا ہے۔ وہ واقعتاً پہلا عظیم الشان شخص ہے جس نے اپنی توجہ ابتدائی تعلیم کی طرف مبذول کی اور چھوٹے بچوں کی تعلیمی مشکلات کا احساس کر کے ان دقتوں کو رفع کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی تعلیم کے لیے گذشتہ صدی میں جس قدر بھی کوششیں کی گئیں اس میں پستالوزی کا ہمہ گیر اثر ہر جگہ کام کرتا رہا۔ اس وقت بھی دنیا میں ابتدائی تعلیم کی کوئی ایسی تحریک موجود نہیں ہے جس پر بالواسطہ یا بلاواسطہ پستالوزی کا اثر مرتب نہ ہوا ہو۔

اس مضمون میں ہم پستالوزی کے حالات زندگی سے تفصیلی بحث نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس کی سیرت اس کے اندرونی جذبات خیالات اور ذہنی تصورات کو روشنی میں لانا چاہتے ہیں پستالوزی کے خارجی حالات بیان کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ انسان ان اندرونی عوامل کو سمجھ لے جو پستالوزی کی خارجی زندگی کا باعث ہوئے ہیں جو پستالوزی کے جذبات کو نہیں سمجھ سکتا وہ اس کے

حالاتِ زندگی سے نہیں واقف ہو سکتا۔

پستالوزی کی زندگی کو صحیح طور پر سمجھنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ وہ اضداد سے معمور تھا۔ ظاہری طور پر اس کی زندگی غیر مرتب دکھائی دیتی ہے مگر داخلی طور پر ارتقا کی کڑیاں مسلسل ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے پستالوزی کو ایک ناکامیاب انسان کہا جاسکتا ہے مگر اسی ناکامیابی میں اس نے وہ صداقتیں حاصل کیں جس نے اس کے نفس کو تسکین اور روح کو تسلی بخشی۔ غریب بچوں کی محبت پستالوزی کو تمام عمر رہی۔ نیوہوف میں اس نے اولاً غریب بچوں کی تعلیم اور اصلاح کی کوشش شروع کی اور بالآخر اس کی آخری عمر میں اس کی ان کوششوں کا وہیں اختتام بھی ہوا۔

پستالوزی ایک جذباتی انسان تھا۔ لوگ بسا اوقات اس کی طبیعت کے الجھاؤ سے بہت پریشان ہوتے تھے مگر اس کے ساتھی جان گئے تھے کہ وہ ایک جذباتی انسان ہے اس لیے وہ اس کے غصہ کا زیادہ احساس نہ کرتے تھے اس کے غصہ اور محبت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ تصنیف وہ صرف تصنیف کی خاطر کبھی نہیں کیا کرتا تھا بلکہ اسی وقت لکھنے بیٹھتا جب اسے احساس ہوتا کہ اسے دنیا کو کچھ پیغام دینا ہے۔ بہ حیثیت مصنف کے جب اس کی شہرت ہر جگہ پھیل گئی تو وہ اس وقت اپنے دل میں کڑھا کرتا تھا کہ وہ کوئی عملی کام نہیں انجام دے رہا ہے۔ وہ عملی لحاظ سے زیادہ کامیاب انسان ثابت نہیں ہوا لیکن عمل کیلئے وہ ہمیشہ بہت مضطرب رہا کرتا تھا۔ وہ اصل زندگی اور نیکی کو عمل ہی میں مضمر سمجھتا تھا۔

وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا اور اسے اس پر فخر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ زیادہ کتابی علم نہ ہونے کے باعث وہ زندگی سے بلاواسطہ تعلق پیدا کرسکا اور تجربہ سے اس نے وہ سب کچھ حاصل کرلیا جو اس کے معاصرین نے ذہنی کاوش اور فلسفہ کے ذریعہ حاصل کیا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ پستالوزی جاہل تھا بلکہ وہ اپنے زمانہ کی تمام تمدنی اور تعلیمی تحریکات سے واقف تھا۔ اس کا وطن زیورچ اس زمانہ میں علمی اور ادبی مرکز تھا جہاں بڑے بڑے آئمۂ فن موجود تھے۔ پھر دوسرے ممالک کے حالات اور خیالات اخبارات کے ذریعہ معلوم کیا کرتا تھا۔ کم تعلیم یافتہ ہونے کے باعث وہ اپنی تصانیف میں آخر تک بھی فلسفیانہ نظم نہ پیدا کرسکا۔ وہ اپنی تحاریر اپنے رفیق کار نیڈرر کے حوالہ کردیا کرتا تھا تاکہ وہ ان کو اس زمانہ کی تمدنی روشنی میں دوبارہ مرتب کرلے۔

"پستالوزی کی تحریر آرائش و تصنع سے پاک ہے۔ وہ بااوقات ایک ہی بات کو متعدد بار دہراتا ہے اُس کی طرز تحریر اس کی شخصیت کی صحیح ترجمان ہے۔ اُس میں جوش و جذبہ کا اکثر اظہار رہتا ہے۔ اُس کی تحریر میں منطقی استدلال کے بجائے گہرائی پائی جاتی ہے اور انسان بغیر غور و فکر کے اس کو نہیں سمجھ سکتا۔ اُس کی تحریر میں پیغمبرانہ انداز ہے انسانوں کی محبت کا اظہار ہوتا ہے جو پستالوزی کے بشرہ سے بھی عیاں ہوتی رہتی تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ایسے جذباتی انسان کے متعلق لوگ بہت ہی مختلف فیہ رائے قائم کرتے ہیں بعض لوگ اسے درشت اور تند مزاج سمجھتے تھے لیکن بعضوں کی نظر میں وہ محض بیوقوف تھا۔ سب سے زیادہ اُس کو صحیح ہینگ نے سمجھا ہے جس کا بیان ہے کہ "پستالوزی اپنی روحانی بصارت کے باعث لکھتا، بولتا اور عمل کرتا ہے اسی باعث اُس میں آزادی اور قوت پائی جاتی ہے۔ میں اس اظہار سے شرمندہ نہیں ہوں چاہے مجھ پر ہزاروں کیوں نہ ہنسیں کہ پستالوزی حقیقی معنوں میں ایک پیغمبر تھا"

آج کل پستالوزی کی عظمت اور تقدس پر سب متفق ہوگئے ہیں مگر اسوقت تک اس کی زندگی پر ایک مدرس کی حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے حالانکہ وہ اس سے کہیں زیادہ بلند اور جامع انسان تھا۔ درس و تدریس اس کی ہمہ گیر زندگی کا صرف ایک شعبہ تھا۔ ہم کو اس کی زندگی کے صرف ایک شعبہ کے مطالعہ پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے ورنہ ہم اس کی زندگی کے اندرونی عوامل سے چشم پوشی کریں گے اور اُس سے کماحقہ، واقف نہیں ہوسکیں گے پستالوزی کی زندگی بہت زیادہ گہری ہے اس کی زندگی کے مختلف عملی کام اس کے اندرونی جذبات اور ارادوں کے نامکمل مظہر ہیں۔ جان ہائینرش پستالوزی ۱۷۴۶ء میں بارہ جنوری بمقام زیورچ (سوئستان) میں پیدا ہوا۔ یہ ایک نہایت حسین شہر ہے جس کے اطراف و اکناف فطرت کی دلفریبیوں سے مالا مال ہیں۔ کوہ الپس کی سر بفلک، صاف و شفاف چوٹیاں انسان کو بلندیٔ تخیل اور نیکی کی طرف مائل کرتی ہیں اور وہ مادی کثافتوں سے آزاد ہو کر فضائے روحانی میں پرواز کرنے لگتا ہے۔

پھر زیورچ علمی اور ذہنی زندگی کا اکثر مرکز رہا۔ سونگلی ایسا پرجوش مذہبی مصلح یہاں پیدا ہوا پستالوزی کا بچپن اسی ماحول میں گذرا اس کے باپ کا انتقال بچپن میں ہوگیا تھا۔ اس کی ماں نے اس کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا برتاؤ کیا۔ نرمی کا یہ عنصر جو بچپن ہی سے پستالوزی کی زندگی میں داخل ہوگیا

تھا آخر عمر تک اس میں یہ قرار رہا۔

پستالوزی نے اولاً دینیات کی تعلیم حاصل کی مگر بعد میں اسے قانون کا شوق پیدا ہوا اور اس نے دینیات ترک کردی۔ قانون کے ذریعہ وہ چاہتا تھا کہ آئندہ وہ اپنے ملک کی سیاسی جد و جہد میں حصہ لے لیکن اس عرصہ میں اس کی ملاقات ایز آلین سے ہو گئی جس سے اسے عشق ہو گیا اور بالآخر پستالوزی نے اس سے شادی کرلی۔ ایز آلین "محب وطن جماعت" کی رکن تھی جس کا رہبر بوڈمیر نامی ایک شخص تھا یہ انقلاب فرانس کا زمانہ تھا۔ اور زیورچ کے نوجوانوں نے یہ جماعت انھیں خیالات کے زیر اثر اپنے ملک کو آزاد کرنے کے لیے قائم کی تھی اس میں لائبنز اور ولف، شافٹسبری، اور ملٹن لاک اور ہیوم، والٹیر اور روسو کے چرچے رہا کرتے تھے۔ یہ یونانی علوم و فنون کے شیدا تھے اور اپنے ملک کو کلیسا کے تسلط سے آزاد کرانا چاہتے تھے، روسو کی روح خاص طور پر ان میں بہت زیادہ کام کر رہی تھی یہ لوگ فرانس کے خراب اخلاق پر بہت زیادہ تنقید کیا کرتے تھے، تمدن اُن کے نقطۂ نظر سے جماعت میں خرابی پیدا کرتا ہے اس لئے بالآخر یہ تمدن ہی کے مخالف ہو گئے، پستالوزی کے خیالات کی بنیا دیں انھیں صحبتوں میں پڑیں یہ وہ اپنے اس دور پر بعد میں نکتہ چینی بھی کرتا ہے مگر خود کو وہ اس نوجوانی کے اثرات سے کبھی بھی آزاد نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ پستالوزی پر اس کے عہد شباب میں عیسائیت کے مذہبی قائدین، لوتھر، سونگلی اور کیلون کے بہت زیادہ اثرات مرتب ہوئے وہ ان لوگوں کی عظمت سے اس قدر مرعوب تھا کہ تمام عمر اظہار رائے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔ پستالوزی سوئستان کے قدیم اخلاق کا زبردست معترف تھا اور اسی اخلاق کو وہ تمدن جدید کی تباہ کاریوں سے بچانا چاہتا تھا۔ پستالوزی کے خیالات کا ایک خاکہ اس عہد میں ضرور مرتب ہوا مگر اس پر بعد میں جو عمارت تعمیر ہوئی وہ محب وطن جماعت کے خیالات سے بالکل مختلف تھی "انسانیت" "فطرت" وغیرہ کے تصورات "محب وطن جماعت" کے لیے بہ حیثیت نصب العین کے کام دیا کرتے تھے۔ پستالوزی نے ان اصطلاحات کو قبول تو کرلیا مگر ان میں محبت کا عنصر شامل کردیا جو اس کی مذہبی طبیعت کا لازمی نتیجہ تھا۔

پستالوزی نے اپنے ایک دوست کی وصیت کی بنا پر عملی سیاست سے ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی

اختیار کرلی اور ایک پیشہ اختیار کیا جس میں اسے زیادہ دلی سکون اور اطمینان میسر ہو سکتا تھا۔ اسی باعث اس نے قانون کی تعلیم بھی ترک کردی۔ آنّا الین سے شادی کے بعد ۱۷۶۹ء میں اس نے نیو ہوف میں کاشتکاری شروع کی ۱۷۷۴ء میں وہاں اس نے ایک یتیم خانے کی بنیاد ڈالی پستالوزی میں انتظامی قابلیت نہ تھی جس کے باعث نہ تو وہ کاشت کرسکا اور نہ یتیم خانہ چلا سکا۔ آنّا الین کو پہلے اپنے خاوند پر بہت بڑا اعتقاد تھا۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے دنیا میں بھیجا گیا ہے مگر اس ناکامیابی سے وہ ہراساں ہو گئی اور پستالوزی سے اُسے زیادہ توقع نہ رہی پستالوزی کا ایک زمانہ بے حد پریشان حالی مفلسی اور بیکاری پر گذرا۔ دنیا اسے ایک ناکامیاب انسان سمجھتی تھی اور وہ خود اپنی حالت سے پریشان تھا لیکن ظاہری ناکامیابیاں باطنی سربلندیوں کے لیے محرک ثابت ہوئیں اس نے بالآخر ۱۷۸۰ء میں اپنی پہلی کتاب جب کہ وہ چونتیس برس کا تھا لکھی، اس نے اس کتاب کو ایک شاعرانہ نام "ایک خلوت گزیں کے لمحات شام" سے موسوم کیا اس کے ایک برس بعد اس نے اپنا مشہور تعلیمی افسانہ "لین ہارڈ و گرٹروڈ" لکھا جس سے وہ بہ حیثیت مصنف تمام سوئٹزرلینڈ میں مشہور ہو گیا ۱۷۹۷ء میں اس نے اپنی شکل اور جامع ترین فلسفیانہ کتاب "نسل انسانی کے ارتقا میں فطرت کے راہ عمل پر میری تحقیقات" لکھی اسی سال اس نے طریقۂ تعلیم کی پہلی کتاب "اشکال ابجد کی تعلیم" لکھی ۱۷۹۹ء میں اس نے سوئٹزرلینڈ کی جنگ جمہوریت میں شرکت کی اس جنگ میں سیکڑوں بچے یتیم ہو گئے تھے۔ پستالوزی نے چار سو بچوں کے لیے ایک یتیم خانہ کی بنیاد ڈال دی۔ یہ یتیم خانہ اسٹانز میں قائم ہوا تھا۔

اس زمانہ سے پستالوزی کی زندگی کا ایک بالکل نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اب تک وہ ایک قومی مصلح تھا اور بہ حیثیت مصنف کے فلسفۂ تمدن کے مسائل پر روشنی ڈالا کرتا تھا لیکن اب اس نے درس و تدریس بہ حیثیت پیشہ کے اختیار کر لیا کیونکہ اس کے نزدیک قوم کو درست کرنے کی اب صرف یہی ایک واحد صورت باقی رہ گئی تھی پہلے وہ تمدنی زندگی میں باقاعدہ حصہ لیتا تھا اور ایک ہفتہ وار اخبار کے ذریعہ لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرتا تھا مگر اب اس نے خود کو تعلیمی تجربات اور بچوں کی تربیت کیلئے وقف کر دیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میرا اول پیشہ درس و تدریس ہے گو کہ آخر عمر تک بھی اس کو ایک کامیاب

مدرسہ قائم کرنے میں کامیابی نہ ہوئی اور اسی وجہ سے اس کو اپنی تمام جائداد سے ہاتھ دھونا پڑا اور ہر قسم کی ذہنی و مالی پریشانیاں برداشت کرنا پڑیں۔ اس نے اپنے تعلیمی تجربات برگ ڈورف اور شلوس کے مقامات پر بھی کیے جس کے نتائج اس نے اپنی کتاب "طریقۂ تعلیم" میں ۱۸۰۰ء میں شائع کیے۔ ان اصولوں کو اس نے تفصیلی طور پر اپنی کتاب "گرٹروڈ اپنے بچوں کو کس طرح تعلیم دیتی ہے" میں شائع کیا۔ اس کے بعد وہ کچھ دنوں میونخ (جرمنی) اور افرٹن میں بھی اپنے تعلیمی تجربات کرتا رہا جس کے باعث وہ بہت ہی مشہور ہوگیا۔ اسٹانز میں اس کے مدرسہ میں تمام یورپ کے طلبا، تعلیم کے لیے آتے تھے، زار روس اور اس کی ملکہ نے پستالوزی سے آکر خود ملاقات کی، اس کے مدرسہ کا معائنہ کیا اور روس میں اس کے طریقۂ تعلیم مروج کرنے کے لیے اس کو روس چلنے کی دعوت دی جس کے لیے پستالوزی راضی بھی ہوگیا تھا مگر بعد میں بعض ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے نہ جاسکا۔

بڑے بڑے اہل علم اور فلسفیوں نے پستالوزی کے خیالات اور اس کے طریقۂ تعلیم کی تائید کی جرمنی کا مشہور فلسفی فشٹے خود پستالوزی سے ملنے کیلئے زیورچ آیا اور بعد میں جرمنی قوم کو اپنے مشہور خطبات میں پستالوزی کے طریقۂ تعلیم کی طرف توجہ دلائی۔ اس نے جرمن قوم کو ہدایت کی کہ وہ جمہور کی صحیح ترین تعلیم صرف پستالوزی کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر دے سکتے ہیں جرمن حکومت نے متعدد طلبا پستالوزی کے مدرسہ میں روانہ کئے تاکہ وہ وہاں جاکر پستالوزی کے تعلیمی اصول سیکھیں یہیں کے فارغ التحصیل طلبا، نے جرمنی کے ابتدائی نظام تعلیم کی تربیت کی، انگلستان، فرانس، روس، اٹلی وغیرہ کے طلبا، نے بھی پستالوزی سے فیض حاصل کیا غرضکہ پستالوزی کی زندگی میں تمام مغربی اقوام میں اس کی تعلیم کا چرچا ہوگیا اور پستالوزی کے خلوص، عظمت اور محبت کا ہر شخص مدح خواں ہوگیا۔ لیکن اسی شہرت کے زمانہ میں پستالوزی کے ساتھیوں میں باہم کشیدگی پیدا ہوگئی۔ یہ دلوں کی رنجش تھی مگر جھگڑا بہ ظاہر مدرسہ کی مالیات پر ہوا۔ بڈھا پستالوزی اس کا کچھ علاج نہ کرسکا۔ اور بالآخر مدرسہ بند ہوگیا۔ اسی مایوسی کے زمانہ میں اس نے اپنی آخری کتاب "ہنس کا وداعی نغمہ" لکھی جس میں اس نے اپنی زندگی کے تمام واقعات اور اصول دہرائے۔ نصف صدی کی جدوجہد کے بعد اکیاسی برس کی عمر میں پستالوزی نے اس دنیا سے اسی جگہ سفر آخرت کیا جہاں اس نے اپنی

عملی زندگی کا آغاز کیا۔ نیوہوف میں زائرین کو پتا لوزی کی قبر پر اس وقت بھی مندرجہ ذیل کتبہ دکھائی دیتا ہے:

> جان ہنرش پتالوزی زیورچ میں بارہ جنوری ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوا، برگ میں ستارہ ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا۔ اس نے نیوہوف میں غریبوں کو نجات دلائی۔
>
> اس نے "لین ہارڈ اور گرٹروڈ" میں قوم کو نصیحت کی اس نے اسٹانز میں باپ کی طرح یتیموں کی پرورش کی، اس نے برگ، ڈورف، اور میونچ میں قومی مدرسہ کی بنیاد ڈالی اس نے افرٹن میں انسانیت کی تعلیم دی۔
>
> وہ ایک انسان، ایک عیسائی اور ایک شہری تھا۔ اس کا سب کچھ دوسروں کے لیے تھا خود کے لیے کچھ نہ تھا۔ خدا اس پر رحمت کرے۔

پتالوزی کی خارجی زندگی کے واقعات کے بعد ہم اب اس کی داخلی زندگی پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ محبت پتالوزی کی فطرت کا جز تھی اگر کوئی اس کی محبت میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا تو وہ حد درجہ غمگین ہوتا تھا۔ سوئٹزرلینڈ کے دلفریب مناظر روسو کی طرح اس کے لیے اس قدر باعث کشش نہ تھے جس قدر انسانوں کی محبت، بلا تمیز و تفریق کے انسانی محبت اس کو بے چین رکھتی تھی، پتالوزی کی محبت سقراط و افلاطون کی محبت نہ تھی وہ جذباتی محبت سے شروع ہو کر بالآخر ایک روحانی رنگ اختیار کرلیتی۔ اس کی محبت عیسائی محبت تھی جس کو ہم مادرانہ محبت سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں یعنی وہ محبت جو بغیر کسی غرض سے ہو اور خود کو دوسروں کے لیے فنا کردے، لوگ کہتے ہیں کہ پتالوزی میں نسوانیت تھی لیکن درحقیقت وہ نسوانیت نہ تھی بلکہ مادرانہ محبت تھی جو پتالوزی کی محبت کا جزو تھی پتالوزی غریب بچوں سے اس لیے محبت نہ کرتا تھا کہ وہ اُن کی ضروریات کو پورا کرے بلکہ وہ اُن سے صرف اس لیے محبت کرتا تھا کہ وہ انسانیت کے سب سے زیادہ معصوم نمائندے ہیں پتالوزی کو تمام نسل انسانی سے محبت تھی۔ لیکن تمام نسل انسانی سے بہ یک وقت محبت نہیں کی جاسکتی اس لیے اس کا اظہار افراد ہی سے ہوتا ہے لیکن تمام نسل انسانی سے محبت کرنے والوں کے لیے افراد مقصود بالذات نہیں ہوتے

بلکہ نسل انسانی سے محبت کرنے کا صرف ذریعہ ہوتے ہیں اس محبت میں مذہبی جذبات کام کرتے ہیں نسل انسانی کی محبت گویا خدا کی محبت ہوتی ہے۔

ماں کی محبت کو پیستالوزی خدائی محبت کا اس دنیا میں ایک نمونہ سمجھتا تھا اس لیے وہ محبت مادرانہ کا بہت معترف تھا اور اسی کے ذریعہ بچوں کی تعلیم و تربیت کروانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی تمام تعلیمی تصانیف ماں کی رہنمائی کے لیے کی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ آئندہ نسلوں کی صحیح تعلیم و تربیت ہو سکے پیستالوزی محبت کے جذبات سے اس قدر مملو تھا کہ وہ اکثر لوگوں سے بغلگیر ہو جایا کرتا تھا اور ان کے بوسہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب نارروکس اس کے مدرسہ کے معائنہ کے لیے آیا اور اس کے کام سے خوش ہوا تو پیستالوزی فرط محبت سے اس سے بغلگیر ہو گیا۔ وہ اپنے مدرسہ میں بچوں اور استادوں کو تعلیم دیا کرتا تھا اور اس کی محبت کا یہ عالم تھا کہ سب اہل مدرسہ اسے باپ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

جذباتی ہونا علیحدہ بات ہے اور ان جذبات کو عملی جامہ پہنانا علیحدہ بات ہے پیستالوزی صرف خیالات کی دنیا میں نہیں رہنا چاہتا تھا بلکہ وہ اس دنیا میں کچھ عملی کام بھی کرنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے زندگی کے مسائل سے واقفیت پیدا کی، حساب و کتاب سیکھا شروع ہی سے ایک پیشہ اختیار کر لیا تاکہ اس ذریعہ سے کوئی مفید کام انجام دے سکے، نیوہوف میں اس نے کاشت شروع کی اور وہ اپنے اس کام سے بہت خوش تھا لیکن اس کام میں اس کو کامیابی نہ ہوئی وہ معمولی معمولی جزئیات پر جو کسی کام کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں نگاہ نہ رکھ سکتا تھا جس کے باعث اسے اکثر ناکامیابی کا منہ دیکھنا پڑتا تھا۔ درحقیقت وہ اس دنیا کا انسان نہ تھا۔ بلکہ اس کی نظر ہمیشہ ایک اعلیٰ دنیا کی بلندیوں پر رہا کرتی تھی جس کے باعث وہ اس دنیا کو حقیر سمجھ کر اس سے بے پرواہ ہو جایا کرتا تھا۔

پیستالوزی نے کاشت کو چھوڑ کر بعد میں مدرسی کا پیشہ کیوں اختیار کیا یہ ایک بہت اہم سوال ہے حقیقت یہ ہے کہ تمدن سے مایوسی کے باعث اس نے اس دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنی چاہی لیکن فطرتاً وہ تنہائی پسند نہ تھا اس کی عملی طبیعت اپنے لیے کوئی جولانگاہ ڈھونڈتی تھی بالآخر اس نے

یہ طے کرلیا کہ وہ صرف درس و تدریس کے ذریعہ ہی آئندہ نسلوں کو بہتر بنا سکتا ہے یہ اقدام اس کے خیالات میں ایک زبردست انقلاب کا نتیجہ تھا۔

نیو ہوف میں ناکامیابی کے باعث پستالوزی پر بہت طعن و تشنیع کیے گئے چونکہ وہ دوسروں کے خیالات سے بہت زیادہ متاثر ہوتا تھا اس لیے اس پر اس کا تمام عمر اثر رہا ان لوگوں کی تنقید کو ہمیشہ نیک نیتی پر محمول کرتا رہا اس لیے ان کا خوف بھی اس کے دل میں بہت تھا۔ وہ بہت زیادہ حساس تھا اسی باعث اپنے اخلاقی فرائض کا اس کو بہت زیادہ احساس تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عظیم الشان کام صرف قربانی ہی کے ذریعہ پایہ تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں اس لیے وہ ہر وقت اس قربانی کے لیے آمادہ رہتا تھا۔

پستالوزی کے مذہبی حس کا اُن خطوط سے پتہ چلتا ہے جو اسنے اپنی منگیتر ازالین کو لکھے جو بعد میں اس کی بیوی ہوگئی تھی۔ وہ ایک جذباتی عورت تھی اس لیے اکثر ان دونوں میں بھی کشیدگی ہو جایا کرتی تھی پستالوزی کے جب لڑکا تولد ہوا تو وہ خود کو اس کا اہل نہ سمجھتا تھا ایک تو اس کے پاس مستقل ذریعہ آمدنی نہ تھا دوم وہ ذہنی اعتبار سے خود کو اتنا ترقی یافتہ نہ سمجھتا تھا کہ ایک بچہ کی تربیت کرسکے خود کو اس قدر کم مایہ سمجھنا اس کے گہرے مذہبی احساس کا نتیجہ تھا۔

پستالوزی عیسائیت کے منشار کے مطابق انسانوں میں وہ قوت پیدا کرنا چاہتا تھا کہ بالآخر رُوح کو جسم پر غلبہ ہو جائے لیکن وہ خود کو بھی اس معاملہ میں کمزور خیال کرتا تھا اس لیے غمگین ہوا کرتا تھا اپنی کمزوریوں کا احساس، ناکامی اور کامیابی پر خدا سے التجا و دعا وغیرہ پستالوزی کی مذہبی ذہنیت پر دلالت کرتے ہیں لوتھر کی طرح پستالوزی میں بھی خدا پر بہت زیادہ اعتماد پایا جاتا ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ " مجھ سے زیادہ کسی کو اس کا گہرا احساس نہیں ہو سکتا کہ میرا کام خود میرا کام نہیں ہے" اس نے ایک مرتبہ اپنے ایک دوست اسٹیپر کو لکھا کہ " طریقہ تعلیم کو ایجاد کرنا میرا کام نہیں ہے بلکہ خدا کا کام ہے میرا کام صرف اس قدر تھا کہ میں محبت سے اس چیز کی تلاش کروں جس سے میں لاعلم تھا اور ایمان بالغیب کی بنا پر اس چیز کی اُمید رکھوں جس کو میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پستالوزی کو اپنے گناہوں کا بہت زیادہ احساس تھا۔ وہ خود کو بہت ہی کمزور خیال کرتا تھا اور ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا کہ وہ جو کچھ بھی

کام انجام دیتا ہے وہ صرف فضل ایزدی کے طفیل سے ہے وہ انجیل کے بہت سے اقتباسات اپنی زندگی پر منطبق کیا کرتا تھا

پستالوزی اپنے ساتھیوں نیڈرر، فیلنبرگ، اشمڈ وغیرہ کو اپنے سے زیادہ قابل خیال کرتا تھا اور وہ ان سے بہت ہی عزت سے پیش آیا کرتا تھا اس میں اس کی زندگی کا جذباتی عنصر کام کیا کرتا تھا۔ پستالوزی کی جذباتی فطرت سے یہ بات واضح کی جاسکتی ہے کہ وہ کیوں بسا اوقات غصہ ہوا کرتا تھا اُس پر بعض اوقات جنون اور مدہوشی کی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ کبھی وہ بھاگتا اور کبھی دوڑتا اور وہ زور سے میز پر ہاتھ پٹکا کرتا تھا۔ یہ باتیں کچھ عارضی بیماری کی علامتیں نہ تھیں بلکہ اس کی یہ کیفیت عمر بھر باقی رہی اسی بنا پر بعض اوقات یہ مشہور ہو جایا کرتا تھا کہ پستالوزی پاگل ہوگیا ہے۔ بعض اوقات پستالوزی کی آنکھوں کی ایک عجیب کیفیت ہو جایا کرتی تھی بعض وقت وہ بالکل خاموش ہو جاتا کسی کی طرف ٹکٹکی باندھ کر گھورنے لگتا پھر دفعتہً جوش میں ابل پڑتا بعض اوقات وہ بہت خوش ہوتا اور بعض وقت بہت ناراض وہ بہت نرم مزاج تھا اور سخت مزاج بھی یہ اس کی طبیعت کے تضاد کے باعث نہ تھا بلکہ اس کی محبت کے جذبات کی شدت کے باعث وہ لوگوں سے بہت محبت کرتا تھا مگر اس کو اس کا برابر جواب نہیں ملا کرتا تھا یا وہ پامال کیجاتی تھی۔

پستالوزی میں اس کی تاب نہ تھی کہ وہ یہ طرز عمل برداشت کرے اسی باعث اس کے جذبات بھڑک اٹھتے تھے۔ پستالوزی کا دل چونکہ محبت سے معمور تھا اس کا جواب کماحقہٗ اس دنیا میں نہیں ملتا تھا اور اس لیے وہ خود کو تنہا محسوس کرتا تھا۔ اس تنہائی کا احساس اس کی پہلی تصنیف "لمحات شام" میں بھی شدت سے پایا جاتا ہے بچوں سے اسے بہت زیادہ محبت تھی اور ان کی ایک معصومانہ نظر اس کو تمام مصائب برداشت کرنے کے لیے آمادہ کر دیتی تھی وہ کئی مرتبہ اساتذہ کی مجلس سے جوش وغصہ میں اٹھ کر چلا گیا اور زور سے اپنے پیچھے دروازہ بند کر لیا مگر راستہ میں جب کوئی بچہ اسے دکھائی دیا تو وہ اس سے اس قدر خوش ہوا کہ پھر دوبارہ جلسہ میں واپس آگیا اور اساتذہ سے معافی مانگی۔

وہ اکثر خوب ہنسا بھی کرتا تھا اور مذاق بھی کیا کرتا تھا اور اس طرح اپنے غم و تفکر کو بھول جایا کرتا تھا اپنی آخری تصنیف میں اس نے لکھا ہے کہ وہ اس قدر عمر کو کبھی بھی نہ پہنچتا اگر اس میں ہنسنے بولنے کا یہ مادہ موجود نہ ہوتا۔ روس کے بادشاہ اسکندر نے جب پستالوزی سے ملاقات کی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اس کا ارادہ روس بھی جانے کا تھا تاکہ وہاں کسانوں کے بچوں کو تعلیم دے سکے اس سلسلہ میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ پستالوزی جمہوریت پسند تھا یا شہنشاہیت پسند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ پستالوزی کسی خاص طرز حکومت کا قائل نہ تھا بلکہ ہر اس حکومت کا طرفدار تھا۔ جو عوام کے مفاد کو پیش نظر رکھے وہ اس زمانہ کے سوئٹسان کی عمرانیت سے عاجز آگیا تھا اور ایک اچھے بادشاہ کو ضرور اس طرز حکومت سے بہتر سمجھتا تھا۔

پستالوزی کو اپنے مشن کی کامیابی پر یقین کلی تھا' اسٹیپر وزیر کو اس نے لکھا کہ "طریقہ تعلیم برابر پھیل رہا ہے جس طرح کہ مجھے شروع ہی سے امید تھی۔ جلد یا بہ دیر وہ دنیا میں ضرور پھیل کر رہیگا" پستالوزی اپنی زندگی کے مقاصد کو بعض اوقات خواب میں متشکل دیکھا کرتا تھا۔ اپنے چوہتر برس کی سالگرہ کی تقریب کے موقعہ پر ۱۲ر جنوری ۱۸۱۸ء میں اس نے بیان کیا کہ " میں ایک رات کو بہت دیر تک کام کرتا رہا۔ اُس وقت مجھے ایک نوجوان دکھائی دیا میں اب تک اس کو دیکھ رہا ہوں اس نے مجھے ہمت دلائی وہ مجھے بہت پسند آیا میں نے اس کو محبت سے جواب دیا اس نے کہا کہ تم کو یاد ہے کہ سات برس پہلے جب میں ایک بچہ تھا تمہارے پاس آیا تھا اور تم نے مجھے لینے سے انکار کر دیا تھا میں وہی بچہ ہوں اور اب جوان ہو گیا ہوں' اس جوان نے مجھ سے کہا کہ تو جو کچھ بھی بچوں کے لیے کر سکتا ہے کر۔ اس کے الفاظ مجھے ایسے دکھائی دیتے ہیں جس طرح انجیل میں کسی پیغمبر کے احکامات۔

ریمزا اور پستالوزی کا پرائیویٹ سکریٹری تھا اس کا قول ہے کہ پستالوزی کا املا لکھنا بہت دشوار ہے۔ وہ بسا اوقات صرف آدھے جملے کہکر خاموش ہو جایا کرتا ہے پستالوزی ایک خط میں تحریر کرتا ہے کہ " ہر لفظ جو میں تحریر کرتا ہوں یا بولتا ہوں میرے دل کو پاش پاش کر دیتا ہے اور میں اس سے اس قدر متاثر ہوتا ہوں کہ خود کو ان اثرات سے آزاد نہیں کر سکتا " پستالوزی کی شخصیت کی طرح

اس کی طرزِ تحریر بھی مکمل نہیں ہے گو کہ اس کے خیالات میں تسلسل ضرور موجود ہے اس کی تحریر میں نقشِ اول ضرور بہتر ہوتا تھا لیکن وہ اس سے کبھی مطمئن نہ ہوتا اور اس کی بہت اصلاح کیا کرتا تھا وہ عموماً چھوٹے چھوٹے جملوں میں اظہارِ خیال کرتا ہے جو اس کی وجدانی طبیعت کے لیے بہترین طرزِ ادا ہے۔

پستالوزی کے دوستوں کا ذکر کرنا بھی اس وقت بے محل نہ ہوگا۔ اشمتھ میں تنظیم کی قابلیت بہت زیادہ تھی اور اسے پیسہ سے بھی بہت محبت تھی۔ انتظامی قابلیت کے باعث پستالوزی اس کا بہت مداح تھا۔ نیڈرر نے فلسفہ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور وہ شیلنگ کے فلسفہ وحدت کو پستالوزی کے خیالات میں شامل کر دیا تھا پستالوزی پہلے اس سے بہت خوش تھا مگر بعد میں دونوں میں رنجش ہو گئی اور دونوں کو پتہ چلا کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں نیڈرر کی طبیعت فشتے کے قریب تر تھی وہ تخیلات کی دنیا میں پرواز کرنا چاہتا تھا اس کی نظر موجودہ دنیا پر نہیں بلکہ نصب العین پر رہا کرتی تھی وہ پڑھانا نہیں چاہتا تھا بلکہ فلسفیانہ مباحث کرنا چاہتا تھا۔ نیڈرر اور پستالوزی میں بالآخر اختلاف ہوا اور وہ الفرڈن کے مدرسہ سے علیحدہ ہو گیا۔

پستالوزی کی محبت کی پیاس آخری عمر میں بھی بالآخر نہ بجھ سکی اس کی اکیاسی برس کی سالگرہ پر اس کے چند دوستوں کے سوا اور کوئی موجود تھا اپنی زندگی کی صبح میں وہ جو تنہائی محسوس کرتا تھا وہی تنہائی زندگی کی شام میں بھی اس کے ہمرکاب تھی کلیسا سے اُسے بہت اختلاف رہا۔ ظاہراً لوگ اسے صحیح عیسائی بھی نہ مانتے تھے مگر مذہب دراصل اس کی فطرت کا جزوِ اعظم تھا ایمان اور محبت کی قوتوں نے اسے آخر تک سہارا دیا۔ پستالوزی اپنے آخری ایام میں اپنے مقاصد کی کامیابی پر خوش تھا وہ اپنی جدجہد سے مطمئن تھا اور اس کے چہرے پر امید اور تسکین کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

ہندی زبان و ادب پہ اجمالی تبصرہ

ہندی کی اہمیت (سیاسی اور قومی) اور اس کا اردو سے تعلق

ہندی ادب وشاعری کی خدمت گذاری کو میں اردو ادب وشاعری کی بھی خدمت گذاری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ خیال اب عام ہوتا جاتا ہے کہ اردو اور ہندی ایک زبان ہیں، ایک جان ہے دوسرا قالب ایک روح ہے دوسرا جسم، ایک پھول ہے دوسرا خوشبو، ایک بغیر دوسرے کے ناقص اور کمزور ہے۔ بغیر اتحاد کے دونوں بے بس و مجبور ہیں۔

اگر ہم واقعی ہندی اردو کو ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے ہیں، اگر ہم حقیقتاً قومی یکجہتی کے ساتھ ساتھ لسانی یکجہتی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اگر ہم قومیت کے لئے ایک زبان کے وجود کو ضروری بلکہ لازمی سمجھتے ہیں تو اس کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ جسقدر جلد ہوسکے ہندی، اردو، اور ہندی اردو میں جو مغائرت پیدا ہوگئی ہے اسے دور کریں، ان دونوں میں جو نفاق پیدا ہوا ہے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور پھوٹ کے بجائے اتحاد اور فرقہ پروری کے بجائے یکجہتی قائم کریں۔ اگر ہمنے نادانی یا سہل انگاری سے کام لیا یا تنگ نظری کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دی تو وہ دن یقیناً آئے گا کہ نہ ہندی کو قومی زبان بننے کا شرف حاصل ہوگا اور نہ اردو کو یہ عزت حاصل ہوگی بلکہ بدیسیوں کی غاصب زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہ صرف سرکاری زبان بنجائے گی بلکہ پیشہ وری کاروباری اور تمدنی بھی ابھی سے اس کا قبضہ شہروں پر ہو چلا ہے اور اس کا رعب ہمارے دلوں پر چھا گیا ہے اگر ہم نے غفلت برتی اور چندے توقف کیا تو اس کا سکہ دیہات پر بھی جم جائے گا اور اس کا وقار ہمارے دلوں میں بھی پیدا ہو جائے گا پھر ہاتھ پیر مارنے سے بھی کچھ نہ ہوسکے گا اور ہم اپنی غفلت کی وجہ سے اپنے ساتھ اپنی مادری زبان کو بھی لے ڈوبیں گے۔ نہ ہندی رہے گی نہ اردو بلکہ اس کی جانشین ممتاز اور مختار انگریزی ہی

علم الصحت کا یہ مسلمہ نظریہ کہ "تشخیص مرض فی نفسہٖ بیکار ہے تاوقتیکہ علاج مرض بھی نہ تجویز کیا جائے" خوش قسمتی سے تشخیص مرض کے ساتھ ساتھ مختلف لوگوں کو علاج مرض کا بھی احساس ہوا اور مزید خوش قسمتی یہ کہ تمام ہندوستانی محققین نے فرداً فرداً جو تشخیص کی اور جو علاج تجویز کیا وہ ایک دوسرے

سے مطابقت کرتا ہے اور سب کی یہی متفقہ رائے ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان بننے کا فخر نہ تو سنسکرتی یا پراکرتی ہندی کو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ معرب و مفرس اردو کو بلکہ ہندی اردو کو۔ اور اردو ہندی میں دائمی ملاپ قائم کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہندی داں اردو، اور اردو داں ہندی سیکھیں، ہندی کے ساتھ ساتھ اردو اور اردو کے ساتھ ساتھ ہندی پڑھائی جائے اور مدارس میں طلبا کے لیے اردو اور ہندی لازمی زبانیں قرار دی جائیں اگر ہم قومی فلاح و بہبود اور مستقبل کی سہولت کے لیے صرف اسی قدر کریں کہ ہندی اور اردو کو مدارس میں یکساں رتبہ دیں تو بہت جلد ہندی دانوں اور اردو دانوں کی علمی زبان مشترک ہو جائے گی۔ عوام کا خیال غیر ضروری ہے کیونکہ عوام کی زبان اب بھی یکساں ہے عام بول چال کی حد تک اب بھی ہندی اور اردو میں کوئی فرق نہیں کیونکہ عام بول چال میں جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں وہ ہندی اور اردو دونوں میں استعمال ہوتے ہیں فرق علمی زبانوں میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس فرق کو مدارس کے ذریعہ دور کیا جا سکتا ہے

اردو اور ہندی کے اتفاق کے لیے ایک دو کی نہیں دس پچاس کی نہیں بلکہ تقریباً ہر صاحب فہم کی آواز بلند ہو رہی ہے ملک کے گوشہ گوشہ سے صدا آ رہی ہے کہ آئندہ کی ترقی چاہتے ہو تو قومی زبان کی بنیاد قائم کرو کیونکہ قومیت کی محکم لسانی بنیاد ہی پر قائم کی جا سکتی ہے کوئی کہتا ہے کہ۔

"بحالت موجودہ یہی ضروری ہے کہ ناگری رسم الخط استعمال کرنے والے اردو خط سے واقفیت حاصل کریں اور اردو داں ناگری سیکھیں اس کے بغیر باہمی اتحاد و ارتباط ترقی نہیں کر سکے گا اور بیگانگی کی خلیج طوفانی رفتار کے ساتھ بڑھتی جائے گی" [1]

کہیں سے صدا بلند ہوتی ہے:۔

"وحدت قومی کے لیے وحدت لسان بہ نسبت وحدت مذہب کے زیادہ لازمی ہے اور جب تک ہندوستان میں زبانوں کی کشمکش اور رقابت جاری ہے اس وقت تک قوم پروری کی تمام کوششیں

---

[1] ڈاکٹر سید محی الدین قادری پروفیسر کلیہ جامعہ عثمانیہ (عبارت ماخوذ از رسالہ "مجلہ مکتبہ" اکتوبر ۱۹۳۱ء جلد ۸ شمارہ ۹ صفحہ ۹)

بیکار ہیں" لہ

کسی کا یہ خیال ہو کہ :۔

"ہر ہندو کو اردو سیکھنی چاہیئے اور ہر مسلمان کو ہندی مرا تو راسخ عقیدہ ہو کہ بغیر اردو جانے کوئی شخص بھی ہندی کا اچھا انشا پرداز نہیں ہو سکتا" لہ

کہیں سے یہ صدا آرہی ہو :۔

"ہر ہندو کا فرض ہو کہ اردو سیکھے اور ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہو کہ وہ ہندی کی استعداد بڑھائے میں تو یہ بھی کہوں گا کہ صرف ہندی و اردو ہی پر اکتفا نہ کرنا چاہیئے بلکہ سنسکرت اور فارسی کی طرف بھی ہمیں توجہ کرنی چاہیئے" لہ

یہ ہیں مختلف آوازیں جو ملک کے مختلف حصوں سے ملند ہو رہی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان آوازوں کی گونج سے درد مند دل اور فرض شناس اشخاص متاثر ہو رہے ہیں اور اگرچہ ابھی ہر سمت میں ان اصولوں پر عمل کم ہو رہا ہو مگر یہ احساس پیدا ہو چلا ہو کہ ہندی کی بہبودی اردو کی ترقی میں مضمر ہو اور اردو کا مستقبل ہندی کے پرچار میں پوشیدہ ہو۔

اس قدر توضیح اور مختلف شواہد اور آرا کے پیش کرنے کے بعد آپ کو یقین ہو گیا ہو گا کہ اردو کی خدمت ہندی کی خدمت اور ہندی کی خدمت اردو کی سیوا ہو۔

ہندی بھاشا کی علمی و ادبی اہمیت | سیاسی اور قومی اغراض سے قطع نظر ہندی کی اہمیت و ضرورت کا ہمیں اسی وقت بخوبی احساس ہو سکتا ہو جب کہ ہم اس کے ادبی محاسن اور علمی فوائد پر غور کریں یہاں میں علم بدیع کی مختلف اصولی تقسیموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کسی قوم پرست ہندو نے نہیں بلکہ علامہ شبلی نعمانی

لہ ایک مسلم اخبار کے مدیر

لہ رام نریش ترپاٹھی "کویتا کومودی" حصہ اول مطبوعہ ہندی مندر پریاگ ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۵

لہ دکشنا بھارت ہندی پرچار سبھا کے سالانہ جلسہ ۱۹۳۲ء کے صدر ریوی داس گاندھی۔

جیسے عالم و ماہر زبان داں نے لکھا ہو کہ:۔

"عربی اور فارسی میں اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہیں ہو اور اس لحاظ سے ہندی کو فارسی اور عربی پر ترجیح ہو۔"[1]

بھاشا میں علم بدیع کی کیسی عالمانہ تقسیم ہوگی کہ اسے شبلی نعمانی سے یہ حسن طرح تحسین و تعریف ملا۔ عرب جنکی شاعری کے متعلق حالی نے مسدس میں ان خیالات کو نظم کیا ہو کہ وہ دنیا میں اس فن کے بانی تھے "آفاق میں کوئی ان کا ثانی نہ تھا اور ایک زمانہ نے ان کی فصاحت مانی تھی" اگر علم بدیع میں ایسی عالمانہ تقسیم پیش نہ کر سکے جو ہندی کے برابر ہو تو پھر کسی اور زبان سے کیا توقع کیجا سکتی ہو۔

ہندی سیکھنے کا ایک اور فائدہ ہو وہ یہ کہ اس کے علمی و ادبی خزائن سے ہم مستفید ہو سکتے ہیں اور از سر نو ہندی ادب سے ربط و تعلق پیدا کر کے اردو نظم اور نثر کو مالا مال کر سکتے ہیں اس میں کوئی ذلت ہو نہ خجالت، اس میں نہ کوئی شرم کی بات ہو نہ جھینپنے کی تمام ترقی یافتہ ممالک کا یہ دستور ہو اور آغاز علمیت سے دنیا کا یہی طریق رہا ہو کہ ایک سے دوسرا استفید ہوتا رہے جس طرح فارسی زبان سیکھ کر گوئٹے نے "مغربی مشرقی دیوان"[2] مرتب کیا اور جس طرح السنہ مغربیہ کے کلام سے فائدہ اٹھا کر اور مغربی شعرا اور فلسفیوں کے خیالات سے متمتع ہو کر سر محمد اقبال نے مشرقی مغربی دیوان مشہور بنام "پیام مشرق۔ در جواب شاعر المانوی گوئٹے" مرتب کیا اسی طرح اردو شعرا ہندی سے مستفیض ہو کر اردو شاعری میں نئی جان ڈال سکتے ہیں اردو کے محققین ہندی کے علمی کتابوں اور ہندی کے علما اردو کی علمی کتابوں سے فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

---

[1] عبارت ماخوذ از "مقالات شبلی" جلد دوم مرتبہ دار المصنفین اعظم گڈھ ۱۹۳۱ء صفحہ ۴۹

[2] "WESTOSTLICHER DIVAN" یہ دیوان جرمن زبان میں ہو اور چھوٹی چھوٹی نظموں کا دلفریب مجموعہ ہو اگرچہ ان نظموں کے خیالات و تخیلات کا ماخذ فارسی نظمیں اور تشریں ہیں مگر جرمن زبان میں ان کی یک اور بہترین مکمل صورت نظر آتی ہو شیشہ ادبی نقطۂ نظر سے بھی جرمنی نظموں کا یہ مجموعہ جسے گوئٹے کے شہ پاروں میں شمار کیا جاتا ہو قدر کی نظر سے دیکھا جاتا ہو اور اس مجموعہ کو جرمانی شاعر کے غیر فانی شہ پاروں میں شامل کیا جاتا ہو۔

غیر زبان اور غیر ملک کے شعرا کے خیالات سے جب ہم اردو شاعری کو مالا مال کرتے ہیں[1] تو اس میں کیا شرم کی بات ہے کہ ہم اپنے ہی دیس کی زبانوں سے خصوصاً اپنی ہمشیر زبان ہندی سے خیالات اخذ کریں اس کی تشبیہیں استعمال کریں اور اردو میں ہندی روح پھونک دیں۔ اس قسم کی تقلید میں کوئی شرم کی بات نہیں خصوصاً جب کہ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ ہمارے بزرگوں کا یہی طریق تھا۔

چنانچہ علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

ہندی شاعری کے مضامین عربی زبان میں بعینہٖ نقل ہوئے یعنی علمائے ادب نے سنسکرت اور بھاشا کی نظموں کا بعینہٖ عربی میں ترجمہ کیا اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ہمارے انشا پردازوں نے

---

[1] اس کی بہترین مثال یقیناً علامہ نواب حیدر یار جنگ بہادر (علی حیدر صاحب طباطبائی) کی مشہور نظم "گور غریباں" ہے جو GREYS ELGGY کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کیا ہے حقیقت میں طبع زاد نظم معلوم ہوتی ہے جس کمال سے نواب صاحب موصوف نے گریز الجی کے خیالات کو اپنا لیا ہے اور جس خوبی سے مغربی روح کو ہندی قالب میں منتقل کیا ہے وہ اردو نظم کی بہترین خدمتگذاری ہے اس مشہور نظم کے علاوہ بھی اردو میں کئی ایک نظمیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئی ہیں بطور مثال خلیفہ ڈاکٹر عبدالحکیم استاذ جامعہ عثمانیہ کے اس معروف ترجمہ کا حوالہ دینا کافی ہوگا جو آپ نے LONGFELLOW کی نظم THE PSALM OF LIFE کا "ترانہ حیات" کے نام سے کیا ہے اسی سلسلہ میں ایک کڑی لسان العصر اکبر الہ آبادی کا مقبول ترجمہ ہے جو انھوں نے (SOUTH کے WATERS OF LODORE) کا "روانی آب" کے عنوان سے کیا ہے یہ اور اسی قسم کے عمدہ عمدہ منظوم ترجمے مولوی الیاس برنی صاحب کے "منتخبات اردو" کی اردو جلدوں میں (جو معارف ملت 'جذبات فطرت اور مناظر قدرت' کے نام سے شائع ہوئی ہیں ملتے ہیں) انگریزی کی چیدہ چیدہ مشہور و مقبول نظموں اور ان کے منظوم ترجموں کا ایک دلآویز مجموعہ شیخ غلام محی الدین صاحب ایم اے نے تالیف کیا ہے اور "دو آتشہ" کے نام سے چھپوایا ہے (مطبوعہ لاہور پرنٹنگ پریس لاہور ۲۲ء) اس مجموعہ میں کل ۴۲ انگریزی نظموں کا ترجمہ ہے بعض انگریزی نظموں کے دو دو ترجمے مختلف شعرا نے کئے ہیں اور یہ مختلف ترجمے بھی اصل انگریزی نظموں کے ساتھ چھاپے گئے ہیں افسوس ہے کہ اکبر الہ آبادی کی ترجمہ نظم "روانی آب" قطع و برید کے بعد چھاپی گئی ہے۔ نہ جانے اس میں کیا مصلحت تھی اکبر الہ آبادی کی نظم تمام و کمال الیاس برنی صاحب کی مؤلفہ منتخبات نظم اردو میں یا اکبر کے دیوان میں ملتی ہے۔

سنسکرت اور برج بھاشا کے علم ادب کے نکتے نکتے کو سمجھا اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن اس کے فیض سے وہی محروم رہ گیا جو سب سے زیادہ حقدار تھا یہ ظاہر ہے کہ اردو بھاشا سے نکلی اور اسی کے دامن میں پلی لیکن بھاشا سے جو سرمایہ اس کو ملا صرف الفاظ تھے مضامین و خیالات سے اس کا دامن خالی رہا۔ بخلاف اس کے عربی زبان جس کو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا وہ سنسکرت اور ہندی دونوں سے مستفید ہوئی۔"[1]

علامہ شبلی کے ان سطروں کو لکھے ہوئے چوتھائی صدی گذر چکی ہے اور تاسف سے کہنا پڑتا ہے کہ بھاشا کے انمول مضامین اور لاجواب خیالات سے اردو کا خزانہ اب تک خالی ہے یہ موجودہ اور آئندہ کی نسلوں کا فریضہ ہے کہ گذشتہ نسلوں کے ناتمام کار کو پایۂ تکمیل پر پہنچائیں۔ اردو کے سرمایۂ ادب میں اضافہ کریں تاکہ اردو ہندی مل کر قومی زبان کا وقار حاصل کر سکیں یا کم از کم مختلف النوع مضامین اور خیالات سے مالا مال ہونے کی بدولت اردو کی ساکھ اور زیادہ بڑھ جائے۔ اردو داں افراد قوم کو خواب غفلت سے چونکانے کیلئے بزرگانہ اور ناصحانہ انداز میں وحید الدین سلیم مرحوم نے لکھا ہے کہ

"اگر آپ جرمن، فرانسیسی یا انگریزی زبان کی لغات کھول کر دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے تمام دنیا کی زبانوں اور ادبیات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کوئی مذہب، کوئی زبان کوئی ملک اور کوئی قوم ایسی نہیں ملے گی جس کے عقائد، رسوم، اوہام، تاریخ اور ادب کے متعلق ضروری الفاظ ان ترقی یافتہ زبانوں میں موجود نہ ہوں گویا انھوں نے اپنی زبانوں کے ادب کو ایک عالمگیر ادب بنا دیا ہے کیا ہمارے لئے یہ بات شرم کی نہیں ہے کہ ہم نے اپنی زبان کو اب تک ہندوستانی زبان کہلانے کا مستحق بھی ثابت نہیں کیا؟ اگر ہم فراخ دل ہوتے، اگر ہم میں تعصب کی جھلک نہ ہوتی، اگر ہم اپنی زبان کے ساتھ اپنے وطن کی عزت بھی کرنا چاہتے تو پھر ہمارا فرض تھا کہ جتنی قومیں ہندوستان میں آج ہیں ان کے عقاید و اوہام، ان کے رسم و رواج اور ان کی تاریخ و ادب کے تمام ضروری الفاظ اپنی زبان میں داخل کر لیتے اور اس کا دائرہ اس قدر وسیع کرتے کہ ہندوستان کی کوئی موجودہ زبان اس کا مقابلہ نہ کر سکتی اگر عام بول چال میں

---

[1] الندوہ، فروری ۱۹۱۱ء عبارت ماخوذ از مقالات شبلی جلد دوم ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء صفحہ ۱۰۰

تغیر و تبدل کرنے کا اختیار ہم نہیں رکھتے تو یہ بات تو ہماری قدرت میں ہے کہ ہم اپنے ادبیات کا دائرہ وسیع کر دیں اور اس کو ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ باشندوں کے لیے قابل مطالعہ اور لائق انس بنا دیں، اردو زبان کے بنانے میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے ادب میں صرف اسلامی ادبیات کے آثار موجود ہیں، ہندو قوم کے ادبیات کا کوئی نشان نہ ہماری نثر میں ہے نہ نظم میں"[۱]

ایک اور مضمون میں حکیم صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"اردو زبان کی اس محرومی کے اسباب کچھ ہی ہوں مگر بلاشبہ یہ محرومی بدقسمتی کی علامت ہے اس سے ہماری زبان کے ادب کو جو نقصان پہنچا ہے وہ کچھ کم نہیں ہے۔ ہم اس ملک میں رہتے ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ ہمارا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صدیاں گذر گئی ہیں کہ ایک ہی آب و ہوا میں ہم دونوں کی پرورش ہوئی ہے اور ایک ہی زمین پر ہمارے مُردے گاڑے یا جلائے جاتے ہیں اس ملک کا گوشہ گوشہ ہم دونوں قوموں کے تمدن کی علامتوں سے بھرپور ہے تاہم ایک دوسرے سے ہم بےخبر ہیں ایک دوسرے کے خیالات سے بےپرواہ ہیں ایک دوسرے کے جذبات سے نابلد ہیں۔ نہیں جانتے کہ ہماری ہمسایہ قوموں نے علم و فن کے میدانوں میں کیا جولانیاں دکھائی ہیں ہم کو اس بات کا مطلق علم نہیں ہے کہ ان قوموں کے ادب میں کیا خوبیاں ہیں اور شاعری اور انشا پردازی میں انھوں نے کس حد تک ترقی کی ہے اگر آج ہماری زبان میں ہندوؤں کے ادب کا عکس بھی نظر آتا تو پھر ممکن نہ تھا کہ آج کل کے دردناک ہنگامے برپا ہوتے مشترک زبان اور مشترک ادب ہی ایک ایسی چیز ہے جو اتحاد کا سب سے بڑا راز ہے۔ کاش ہمارے شعرا اور انشا پرداز اس غلطی کو محسوس کریں اور اس کی تلافی پر کمر باندھیں اور فیاضی اور رواداری کے ساتھ ایک مشترک ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں"[۲]

عہد جدید میں اگرچہ ہندی شاعری کی وہ عظمت اور شان نہیں ہے[۳] جو کسی زمانے میں تھی مگر آج بھی

---

[۱] "تکمیلات" رسالہ اردو اورنگ آباد دکن جلد ۲ نمبرہ ۵ بابتہ جنوری ۱۹۲۲ء صفحہ ۱۰۷، ۱۰۸

[۲] تلسی داس کی شاعری، رسالہ اردو جلد ۵ حصہ ۱۹ بابتہ جولائی ۱۹۲۵ء صفحہ ۳۷۸-۳۷۹

[۳] سری ورندارن داس بی اے ایل ایل بی۔ भारती۔ ناصری کے دکھنو کا خطبہ بابتہ دسمبر ۱۹۳۳ء

ہندی میں ایک سے ایک بہتر شاعر اور ادیب پائے جاتے ہیں لہ

हिंदी की उत्पत्ति और उसका विकास — کے عنوان سے لکھتے ہیں
औरंगज़ेब के राज्य से मुग़ल शासन का अंत — اورنگ زیب کی حکومت کے
समझा जाता है! मुग़ल शासन के अंत के साथ — بعد عہد مغلیہ کا اختتام سمجھا
हिंदी की उन्नति में भी बाधा पड़ गई। इसी कारण — جاتا ہے عہد مغلیہ کے
अठारहवीं शताब्दी के अंतिम काल में हिंदी के — اختتام کے ساتھ ساتھ
साहित्यकारों में किसी महत्वपूर्ण नक्षत्र का — ہندی کی ترقی میں بھی
उदय नहीं हुआ॥ — دشواریاں پیدا ہو گئیں اسی لیے ۱۸ صدی کے بعد سے ہندی فلک ادب پر کوئی منور ستارہ طلوع نہ ہوا۔ (دیکھئے ادھری بابتہ دسمبر ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۹۵)

"There is no Hindi poet of any power in modern India. Sufficient however, are the vast treasures of the immediate past." — پران سنگھ کے اس قول میں صداقت ضرور ہے: "جدید ہندی میں کوئی زبردست ہندی شاعر موجود نہیں مگر ماضی قریبہ کے وسیع ادبی خزانے کافی ہیں"

ماخوذ از Puran Singh مصنف The Spirit of Oriental Poetry مطبوعہ Kegan Paul بمقام لندن ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۸۸

لہ سیرلوت جنس دھرو دیا لنکار کی ایک تصنیف پر تنقید کرتے ہوئے ادبیات کے مستند نقاد اور اردو کے مسلم محقق مولوی عبدالحق صاحب نے (جنکی بے لوث تنقیدیں اور ذمہ دارانہ تحریریں ملک کے طول و عرض میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں) لکھا ہے کہ "اہل ذوق کا یہ اعتراض ہے کہ نئی ہندی نظم میں وہ گھلاوٹ اور ملاحت نہیں جو پرانی ہندی میں تھی وہ کہتے ہیں کہ نئی ہندی بھاشا نظم میں بھدی اور بوجھل معلوم ہوتی ہے اور اس میں وہ لطافت اور حسن نہیں جو پرانی ہندی کے اشعار میں تھا یہ اعتراض کسی قدر معقول معلوم ہوتا ہے لیکن جب

ہندی میں سینکڑوں علوم وفنون کی بیسیوں کتابیں موجود ہیں اور آئے دن چھپتی رہتی ہیں۔ اور علوم و فنون کا تو مجھے علم نہیں مگر علوم عمرانی بالخصوص معاشیات، سیاسیات اور تاریخ کا ہندی میں اچھا خاصہ ذخیرہ ہے علم تمدن کے متعلق بھی بعض اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں ہندی میں ادب علوم عمرانی کے متعلق آئندہ ایک مضمون کی صورت میں تفصیلی تبصرہ پیش کیا جائے گا۔ اس موقع پر یہ کہنا کافی ہے کہ ہندی میں نئی طرز کی علمی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں جن سے اردو داں بہت مستفید ہو سکتے ہیں اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تب بھی ہندی کی اہمیت کم از کم ادبی و علمی نقطہ نظر سے اس قدر ہے کہ صرف ہندی کے ممتاز شعراء کے کلام سے محظوظ ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی خاطر ہندی کا سیکھنا ضروری ہے۔ ہندی ادب و شاعری کے کسی دلدادہ نے کہا ہے کہ "ہندی میں بیسیوں اچھے اچھے شاعر نہ بھی ہوتے اگر کبیر اور رائے داس، گرو نانک اور سور داس، ملک محمد جائسی، اور دادو دیال، عبدالرحیم اور بہاری لال، میرا بائی اور سہجو بائی، ہوشن اور درند نہ بھی ہوتے پھر بھی تنہا تلسی داس ہندی شاعری کی عظمت کو منوانے کے لیے کافی تھے اور ان کے کلام میں سے بھی صرف رامائن ہی باقی رہتی اور باقی تمام تصانیف نیست و نابود ہو گئی ہوتیں تب بھی ہندی شاعری دنیا کی بہترین شاعری میں شمار کیے جانے کی مستحق ہوتی" ڈاکٹر اعظم صاحب کریوی نے صحیح لکھا ہے کہ "تلسی داس جی نے اپنے کلام سے ہندی ادب کی دنیا میں انمول ہیرو کے ڈھیر لگا دئے۔ رامائن میں قدرتی مناظر، حسن و عشق، معرفت و تصوف، اور ناصحانہ انداز کی ایسی دلکش تصویریں موجود ہیں جو اہل نظر کے لیے جنت نگاہ ہیں اس کی مقبولیت کا ثبوت اس سے بڑھ کر نہیں دیا جا سکتا کہ بہت سے لوگ صرف رامائن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہندی سیکھتے ہیں" [1]

جب ایک ہی کتاب کی یہ عظمت و اہمیت ہو تو آپ خیال کر سکتے ہیں کہ تمام شعراء کی جملہ تصنیفات متحدہ طور پر کس قدر اہم ہوں گی۔؟

بنسی دھر صاحب کی نظمیں پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ اب بھی ہندی میں ایسے لکھنے والے ہیں جن کے کلام میں سادگی کے ساتھ لطف اور خیالات کی بلندی بھی پائی جاتی ہے" رسالہ اردو جلد ۹ حصہ ۲۹ جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۳۶-۱۳۷

[1] "ہندی شاعری" ناشر ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد ۱۹۳۱ء صفحہ ۲۱، ۲۲۔

ہندی شاعری کی خصوصیات | ہندی کی پیاری پیاری عشقیہ نظمیں، دلگداز، محبت آمیز اور جذبات انگیز شاعری کا بہترین نمونہ ہیں اسی طرح ہندی شاعری نفسیاتی مشاہدات اخلاقی نکات، اور فلسفیانہ مضامین کا بہترین مجموعہ ہے اور دنیا کی ہر مہذب زبان کے اعلیٰ ترین ذخیرۂ ادبِ شاعری کے ہم پلہ ہے اعلیٰ درجے کے ہندی شعراء بڑے قادر الکلام اساتذہ تھے جن کی عمدہ عمدہ نظموں میں بندش کی صفائی، برجستگی، سلاست و روانی پائی جاتی ہے الفاظ میں نشست کی خوبی اور ترکیب کی دلآویزی ان کی نمایاں خصوصیات ہیں

اس امر کو بھی واضح کرنا ضروری ہے کہ بعض ہندی بھاشا کی نظمیں دوہے، سورٹھے، کبت، بھجن اور چوپایاں اردو داں حضرات کو ابتداً ذرا غیر فصیح معلوم ہوتی ہیں اس کی وجہ صرف یہی ہے اور ہو سکتی ہے کہ ہمارے کان ان الفاظ سے غیر مانوس ہیں، ہندی ادب کا مطالعہ کرتے رہنے سے یہ بات بالکل جاتی رہتی ہے اور وہی دوہے جو ابتداءً غیر فصیح معلوم ہوتے ہیں بتدریج کانوں کو بھی اچھے معلوم ہونے لگتے ہیں اور جیسے جیسے انسان ہندی پر عبور حاصل کرتا جاتا ہے ان دوہوں وغیرہ کی فصاحت بھی واضح ہوتی جاتی ہے۔ یوں بھی ہندی شاعری میں اس قدر موسیقی اور ترنم ہے کہ وہ ہندی کے مبتدیوں کو بھی مرغوب ہوتی ہے اور اردو داں حضرات کے دل پر اثر پیدا کرتی ہے۔

ہندی شاعری میں ہمہ قسم کی نظمیں ملتی ہیں جن کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت دلگداز پراثر اور درد انگیز ہوتی ہیں۔ عمدہ عمدہ تشبیہات اور لاجواب تمثیلات ان کی ایک مزید خصوصیت ہے فلسفیانہ اخلاقی، نفسیاتی دوہے اور نظمیں بھی ادبی نقطۂ نظر سے بالعموم اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں عشقیہ نظموں اور عاشقانہ دوہوں کا کیا کہنا اول تو موضوع ہی عالمگیر تاثیر کی صلاحیت رکھتا ہے پھر ہندی شعراء کی سحر بیانی ان میں اس قدر مقناطیسیت پیدا کرتی ہے کہ دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا اردو کے مشہور انشاپرداز مہاشے سدرشن کا کتنا ایک حد تک صحیح ہے کہ "ہندی شاعری میں جو لطافت، جو رنگینی، جو سوز و گداز، جو دل کو گرما دینے والی تاثیر اور جو تخیل ہے اس کا مقابلہ دنیا کی دیگر زبانیں کم کرسکتی ہیں ہندی شاعری کی دنیا وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر آپ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جہاں آپ بیخود ہو جاتے ہیں اور جہاں آپ کی روح رقص کرنے لگتی ہے۔"[1]

قوس قزح میں جو مختلف رنگوں کی آمیزش ہوتی ہے وہ ہندی کے پاکیزہ دوہوں اور نظموں پر موجود ہے گھنے جنگلوں میں جس طرح آفتاب کی شعائیں پتیوں میں سے چھن چھن کر زمین تک پہنچتی ہیں اسی طرح ہندی شاعر کا تخیل پُر درد اور پُر اثر الفاظ کے توسط سے دل تک پہنچتا ہے جس طرح بھولے کے وقت ننھی ننھی بوندیں سہادنی معلوم ہوتی ہیں اسی طرح ہندی نظم میں روزمرہ کے معمولی معمولی چٹکلے اور باتیں لطف پیدا کر دیتی ہیں۔

ہندی بھاشا اور مسلمان

مسلمانان ہند بالعموم اور مسلمانان دکن بالخصوص اس سخت غلطی اور غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی زبان ہے اردو زبان و ادب کی ہندوانی خدمت گذاری اور ہندوؤں کی اردو نوازی اور اردو کی سرپرستی کے متعلق کچھ کہنے کا یہ موقع نہیں [1] ۔ مگر ہندی کے متعلق اور خصوصاً ہندی شاعری کے متعلق تو میں یہ ضرور کہوں گا کہ ہندی شاعری کو جو آج یہ مرتبہ حاصل ہے اس میں بڑا دخل مسلمانوں کا ہے راجہ ٹوڈرمل سے سیکر ورند تک جتنے بڑے بڑے ہندی شعرا گذرے ہیں ان میں سے تقریباً سب کی اعانت مسلمان بادشاہوں، مسلمان شاہزادوں اور مسلمان امیروں نے کی نہ صرف ادب پروری علم دوستی، ہندی نوازی اور لسانی سرپرستی سے مسلمانوں نے ہندی کو ہندی بنایا بلکہ مسلمان شعرا نے اور مسلمان ادیبوں نے ہندی کی ایسی مایہ ناز خدمت کی اور خود ہندی پر

(فٹ نوٹ صفحہ ۳۱۱) ماخوذ از "ہندی شاعری" نوشتہ سدرشن رسالہ "چندن" لاہور بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء

[1] اس موضوع پر خواجہ عشرت صاحب لکھنوی نے ایک کتاب "ہند و شعرا" کے نام سے تالیف کی ہے مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ ۱۹۳۱ء تعداد صفحات ۱۵۹ اس کتاب کے دیباچہ میں خواجہ صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ :- "ہندی زبان جس قدر زیادہ ترقی کرے گی اردو کو فائدہ پہنچائے گی اردو کی وہی اچھی زبان ہے جس میں ہندی کے الفاظ زیادہ شامل ہوں اور فارسی کے الفاظ بضرورت لیے گئے ہوں"۔

ایسی عمدہ عمدہ نظمیں لکھیں اور ایسی بیش بہا تصانیف اپنی یادگار چھوڑیں کہ اُن کے بار احسان سے ہندی ادب و شاعری کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی، پنڈت رام نرائن ترپاٹھی نے اس امر کا اعتراف کیا ہو کہ مسلمانوں میں ایسے ایسے ہندی شعراء ہوئے ہیں جن کے ایک ایک دوہے پر کتنے ہی ہندو شعرا کا کلام نچھاور کر دیا جا سکتا ہو[1] یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہندی کے بہترین شاعر (تلسی داس) ہندو تھے لیکن یہ کہنا یقیناً مبالغہ ہو کہ ہندی میں سوائے تلسی داس جی کے کوئی اور شاعر نہ ہوتا تب بھی ہندی کا وہی مرتبہ ہوتا جو آج اسے حاصل ہو۔ یہ تو صرف تعریف کرنے کا ایک طریقہ ہو ورنہ کوئی ہندی شاعری کا قدردان ایسا نہیں جو یہ خیال کرتا ہو کہ امیر خسرو، کبیر صاحب، ملک محمد جائسی، عبدالرحیم خانخاناں، رسکھان، مبارک، احمد، میرن، آسی وغیرہ کا وجود یا عدم وجود ہندی شاعری کے لیے یکساں ہو۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کی شاعری نے ہندی کو مالا مال کیا۔ ان کے اور ہندی کے دوسرے شعراء مثلاً رلیے داس، سورداس، میرا بائی، سہجو بائی، دادو، کیشوداس، بہاری لال، بھوشن، ورند وغیرہ کے بغیر ہندی شاعری مثل اس ویرانے کے ہوتی جس میں صرف ایک ہی خوشبودار پھول کا درخت ہو، مگر خوش قسمتی سے ہندی شاعری رنگ برنگ کے خوشبودار پھولوں کا ایسا چمن ہو جس کی سیر سے دل و دماغ معطر ہوتا ہو، قلب کو سکون اور روح کو مسرت ہوتی ہو۔

یہ چمن آج سرسبز و شاداب نہ ہوتا اور نہ اس میں رنگ برنگ کے خوشنما اور خوشبودار پھول ہوتے اگر اس پر مسلمانوں کی توجہ نہ ہوتی۔ خود اچھی نظمیں لکھنے کے علاوہ مسلمانوں نے ہر طرح ہندی ادب و شاعری کی قدردانی کی۔ ہندی شعراء کو درباری شاعر ہونے کا اعزاز بخشا ان کے کلام سے محظوظ ہو کر روپیہ پیسہ تو کیا اشرفیاں بلکہ خزانے لٹا دئے، ایک ایک دوہے کے معاوضہ میں بیش بہا قیمتی جواہر نچھاور کر دئے جاگیریں دیں، خطابات عطا کئے، اور ہندی قدردانی کا اعلیٰ ترین ثبوت یہ دیا کہ ہندی کو عام و مقبول بنانے کے لیے خود ہندی سیکھی، اپنی اولاد کو اور اولاد کی اولاد کو ہندی سکھائی اکبر سے لیکر آخری

---

[1] कविता कौमुदी کوتا کومدی جلد اول، مطبوعہ ہندی مندر الٰہ آباد ۱۹۲۶ء صفحہ ۱۸

شاہان مغلیہ تک سب کو ہندی آتی تھی اور ہندی کی جیسی قدر خاندان مغلیہ میں خصوصاً اکبر، دارا شکوہ اور شہزادہ عظیم الشان نے کی وہ اپنی نظیر آپ ہے۔

جو حال شہنشاہوں اور بادشاہوں کا تھا وہی ان کے درباریوں کا، ممتاز شعراء کی قدر و ہمت افزائی کے لیے اُن کا دل بیتاب اور خزانہ کھلا رہتا تھا اور اگر کوئی مستحق یا قابل قدر شاعر آنکلتا تو ڈھیروں دولت سمیٹ لیجاتا۔ اگر کوئی سنیاسی اور تارک الدنیا ہونے کی وجہ سے دولت دنیوی سے مستفید نہ ہونا چاہتا تو محض اس کی سفارش پہ دوسروں کو مال و دولت سے سرفراز کیا جاتا چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے (مگر افسوس کہ آج مسلمانوں میں اس قسم کی باتیں جاننے اور یاد رکھنے والے بہت کم ہیں) کہ ایک مرتبہ ایک ضرورت مند برہمن جو اپنی بیٹی کی شادی کے لیے کچھ رقم چاہتا تھا تلسی داس جی کے پاس آیا۔ ان کے پاس کیا دھرا تھا انھوں نے دوہے کا صرف یہ پہلا مصرعہ اس برہمن کو لکھ کر دیا اور عبدالرحیم خانخاناں کے پاس بھجوایا۔

सुरतिय नरतिय नागतिय यह चाहत सब कोय ।

سُرتیا نرتیا ناگ تیا یہ چاہت سب کوے۔ (ہر مرد عورت چاہتا ہے چاہے وہ اچھی ہو، معمولی ہو یا بری ہو) مطلب یہ ہے کہ اس برہمن کی لڑکی سے شادی کرنے کا خواہشمند بھی آن پہنچا ہے اور اسے اپنی بیٹی کی شادی میں جہیز دینے کیلئے پیسہ چاہیئے۔ عبدالرحیم خانخاناں نے اس برہمن کو بہت دولت دی اور اس دوہے پر یہ مصرعہ لگا کر دوہے کی تکمیل کی۔

गोद लिये हुलसी फिरै तुलसी सो सुत होय ।

گود لے۔ہلسی پھرے تلسی سا ست ہوے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ہر مرد عورت چاہتا ہے تو ہر ہلسی (خوشی سے بھری ہوئی عورت یہاں یعنی حاملہ) یہ چاہتی ہے کہ اسے تلسی داس جیسا (فرشتہ خصال، شریف الطبع، ذہین) بیٹا ملے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ تلسی داس جی کی ماتا کا نام ہلسی تھا۔

دربار اکبری کے قادر الکلام شاعر گنگ نے ایک مرتبہ خانخاناں کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا۔ کہتے ہیں کہ اس قصیدے کو سن کر خانخاناں اس قدر خوش ہوئے کہ ۳۶ لاکھ کی ایک ہنڈی اٹھا کر گنگ کو

دے دی۔

یہ تو خیر اس وقت کی فیاضی ہے جب کہ عبدالرحیم خانخاناں صاحب جائداد اور صاحب اقتدار تھا کروڑوں کا مالک اور حکومت مغلیہ کا صوبہ دار تھا۔ اس وقت کی حالت سنئے جب کہ جہانگیری عتاب کی وجہ سے رحیم پر طرح طرح کی مصیبتیں پڑی تھیں وہ خود پیسہ پیسہ کو محتاج تھا۔ اس حالت میں بھی غرضمند اس سے کچھ نہ کچھ طلب کرنے کیلئے آن پہنچتے تھے ایک سائل نے تو انھیں اتنا تنگ کیا کہ انھوں نے مجبور ہو کر اس سائل کو ریوان کے راجہ کے پاس بھجوایا مگر راجہ نے یہ خیال کرکے کہ خود رحیم کو پیسے کی ضرورت ہو اور انھوں نے اسی بہانے سے منگایا ہو ایک لاکھ روپیہ رحیم کے پاس بھجوایا۔ مگر رحیم نے پوری کی پوری رقم اس سائل کے حوالے کردی۔ اس مادیت اور خود غرضی کے زمانہ میں یہ اعلیٰ طبیعتیں رکھنے والے تو درکنار ایسے عالی طبع لوگوں کے کردار و سیرت کو سمجھنے والے ہی کم ملیں گے۔ شبلی نعمانی نے صحیح لکھا ہے کہ "حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ عالمگیر کو نہایت متعصب کہا جاتا ہے اور عام خیال یہ ہے کہ وہ ہندوؤں کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا لیکن مسلمانوں نے بھاشا پر جس قدر اس کے زمانے میں توجہ کی پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ بھاشا کی زبان دانی اور شاعری کا ذوق اس زمانہ میں اس قدر عام ہوا کہ بڑے بڑے علماء اور حضرات صوفیہ اس میں کمال پیدا کرتے تھے۔ یہ ذوق اس قدر ترقی کر گیا کہ محمد شاہ کے زمانے میں علمائے اسلام نے اس کے حکم سے شرح چغمنی اور ہیئت کی کتابوں کا ترجمہ بھاشا میں کیا۔ شرح چغمنی اس درجہ کی مشکل کتاب ہے کہ اردو میں اسکا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا اس سے قیاس کرنا چاہیئے کہ جو علماء بھاشا زبان میں اس کا ترجمہ کرسکے اُن کی بھاشا دانی کا کیا رتبہ ہوگا"[۱] اور ایک جگہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے کہ:۔

"تصنیفات کے ساتھ مسلمانوں کی توجہ کی یہ نوبت پہنچی کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابوں کو زبانی یاد کرتے تھے"[۲]

---

[۱] دیکھئے مقالات شبلی جلد دوم مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء صفحہ ۸۵، ۸۶، ۸۷۔

[۲] دیکھئے مقالات شبلی جلد دوم مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۳۱ء صفحہ ۸۵۔ ۸۶، ۸۷۔

ایک تو وہ زمانہ تھا کہ مسلمان ہندی کی بڑی بڑی نظموں کو حفظ کرتے تھے اور آج وہ دن ہے کہ حفظ کرنا تو درکنار ان نظموں کو پڑھنے والے اور سمجھنے والے ہی گنتی کے چند لوگ رہ گئے ہیں اور جیسے کہ قرائن سے پتہ چلتا ہے شاید ہی کوئی مسلمان ایسا ہو جس نے اپنے ہم مذہب ملک محمد جائسی کی مشہور و معروف نظم "پدماوت" تمام و کمال پڑھی ہو ہماری تغافل کا یہ حال ہے اور ہندوؤں کے نزدیک اس نظم کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ "پدماوت" کا ترجمہ سنسکرت میں بھی ہوا ہے۔[1]

مسلمان بادشاہ اور امرا تو ہندی کی برابر سرپرستی کرتے رہے مسلمان شعرا ہندی میں بہترین سے بہترین نظمیں کہتے رہے اور ہندی ادب و شاعری کو مالا مال کرتے رہے مگر آجکل کے مسلمان یہی کہتے ہیں کہ "ہندی ہندوؤں کی زبان ہے" اس سے بڑھ کر کفران نعمت اس سے بڑھکر نادانی اور اس سے بڑھ کر غفلت کیا ہو سکتی ہے؟ اس سے اپنے باپ بزرگوں کے خدمات کو یکسر فراموش کیا جا سکتا ہے کہ ہمیں جو چیز ورثے میں ملے اس پر ہمارا بھی حق ہے اس حق سے ہم خود اپنی نادانی و ناسمجھی سے خود کو اور آئندہ نسلوں کو محروم کریں! جو زبان ہمیں ورثہ میں ملی ہے اگر وہ بیکار ہوتی تو کوئی رنج کی بات نہ تھی اگر اس پر ہمارا کوئی حق نہ ہوتا تو کوئی افسوس کی بات نہ تھی مگر ملال تو یہی ہے کہ وہ دنیا کی بہترین زبانوں میں سے ہے اس پر ہمارا حق ہے وہ ہماری زبان ہے اور اگر ہم غفلت سے چونک گئے اور ان انمول موتیوں کو کنکر کی طرح ٹھکرایا تو ہمیشہ ہماری زبان رہیگی۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم ہندی اور اردو کا یکساں خیال رکھیں اور دونوں کو اپنانے کا مصمم ارادہ کریں اگر کثیر تعداد میں ہندی دانوں نے اردو اور اردو دانوں نے ہندی سیکھنا شروع کیا تو وہ دن یقیناً بہت جلد آئے گا کہ ہندی اور اردو گھل مل کر ایک زبان ہو جائے گی۔

جینیوں اور سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ از سر نو لسانی یکجہتی قائم کریں اور ہندی اردو کا جھگڑا مٹا کر اسے ایک زبان سمجھیں اپنی زبان سمجھیں اپنے بزرگوں کی زبان سمجھیں آئندہ آنیوالی نسلوں کی زبان سمجھیں اور اسطرح باہمی کوششوں سے ہندی اردو کو ہندوستان کی تجارتی، کاروباری، سماجی، علمی اور قومی زبان بنائیں۔

ہندی کے ادب و شاعری پر اس تبصرے کے بعد ہم ہندی شاعری کے چند ممتاز اخلاقی فلسفیانہ اور عشقیہ ابیات معہ مختصر تشریح و توضیح کے ناظرین کی دلچسپی کیلئے پیش کریں گے۔ (باقی)

---

[1] حوالہ ENCYCLOPEDIA BRITANNICA گیارھویں ایڈیشن سنہ ۱۹۱۱ء جلد ۱۳ صفحہ ۲۸۵

اعلانِ اشتراکی[1]

انسانی معاشرت کی جس قدر تاریخ موجود ہے وہ اول سے آخر تک مختلف طبقوں کی باہمی کشمکش پر مشتمل ہے۔ آزاد شہریوں کا طبقہ اور غلاموں کا طبقہ، امیروں کا طبقہ اور غریبوں کا طبقہ، زمینداروں کا طبقہ اور پرجا کا طبقہ، تجارتی پنچایتوں میں پنچوں کا طبقہ اور مزدوروں کا طبقہ، مختصر یہ کہ ظالم اور مظلوم مستقل طور پر ایک دوسرے کے مدِمقابل نظر آتے ہیں اور کبھی پوشیدہ طور پر اور کبھی علی الاعلان ایک دائمی سلسلۂ جنگ کو جاری رکھتے ہیں ایک ایسی جنگ جس کا انجام یا تو جماعت میں انقلاب اور تعمیرِ نو کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے یا محارب طبقوں کی مشترکہ تباہی کی شکل میں۔ تاریخ کے ابتدائی ادوار میں ہمیں تقریباً ہر جگہ جماعت کی ایک ایسی پیچیدہ تنظیم نظر آتی ہے جس میں طبقات مراتب اور مناصب کی تفریق پائی جاتی ہے اگر روما ئے قدیم میں ہمیں شریفوں، نائٹوں، غریبوں اور غلاموں کی تفریق نظر آتی ہے تو عہدِ وسطیٰ میں جاگیرداروں، باجگزاروں، پنچوں اور مزدوروں، اشراف اور عوام کے طبقے نظر آتے ہیں پھر ان میں سے ہر ایک طبقے کے اندر بہت سے چھوٹے چھوٹے طبقے بھی ہوتے ہیں۔

جدید سرمایہ دارانہ معاشرت میں بھی جو جاگیرداری نظام کی تباہی کے بعد پیدا ہوئی طبقوں کے اس باہمی عناد کا خاتمہ نہیں ہوا بلکہ پرانے طبقوں کی جگہ نئے طبقے پیدا ہوگئے اور پرانی کشمکش نے نئی شکلیں اختیار کرلیں۔

مگر ہمارے عہد یعنی سرمایہ داری کے عہد کی ایک امتیازی خصوصیت ہے وہ یہ کہ اس نے طبقوں کے اختلافات میں جس قدر الجھاؤ تھے اُن کو سلجھا دیا۔ انسانی جماعت اب دو بڑے مخالف گروہوں میں تقسیم ہوتی جارہی ہے اور یہ دو بڑے طبقے (یعنی بورژوا یا سرمایہ داروں کا طبقہ اور پرولتاریہ یعنی مزدوروں کا طبقہ) اب براہِ راست

---

[1] یعنی سرمایہ داروں اور مزدوروں کی باہمی رقابت کے متعلق کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کا وہ معرکۃ الآرا بیان جو پہلی مرتبہ ۱۸۴۸ء میں شائع کیا گیا تھا اس اعلان کا صرف حصہ اول جس کا عنوان سرمایہ دار اور مزدور ہے یہاں درج کیا جاتا ہے حصہ دوم جس کا عنوان مزدور اور اشتراکیت ہے حذف کر دیا گیا ہے۔

ایک دوسرے کے حریف بنتے جا رہے ہیں۔

عہد وسطیٰ کے عوام سے ابتدائی شہروں کے تاجر پیدا ہوئے ان شہری تاجروں سے سرمایہ داروں کے ابتدائی عناصر کی تعمیر ہوئی۔ امریکہ کے دریافت کر لینے اور راس اُمید سے گذر جانے کے بعد اس ترقی پذیر سرمایہ دار جماعت کے لیے نئے راستہ کھل گئے مشرقی ہندوستان اور چین کی منڈیوں تک رسائی آسان ہو گئی امریکہ کی نو آبادیاں بسیں ان نو آبادیوں سے تجارت شروع ہوئی ذرائع مبادلہ اور اشیاء کی رسد میں عام طور پر ترقی ہوئی، تجارت، جہاز رانی اور صنعت کو وہ فروغ حاصل ہوا جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ ہوا تھا ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوال پذیر جاگیرداری نظام کے انقلابی عناصر نہایت تیزی سے ترقی کرنے لگے۔

نئی منڈیوں کی روز افزوں طلب کے لئے جاگیرداری تنظیم صنعت جس میں صنعتی پیداوار کا اجارہ ایک محدود تجارتی پنچایت کو حاصل ہوتا تھا اب ناکافی ہو گئی اس لیے اس کی جگہ صنعتی نظام نے لے لی متوسط طبقے کی آجر جماعت نے سرپنچوں کو برطرف کر دیا۔ مختلف پنچایتوں کی اجتماعی تقسیم عمل غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ ہر ایک کارخانہ میں تقسیم عمل کا سلسلہ جاری ہوا۔

اسی دوران میں منڈیوں کی وسعت اور طلب بڑھتی رہی محض دستی صنعت اب وقت کی ضرورت کو پورا نہ کر سکتی تھی اس لیے بھاپ اور مشین سے صنعتوں کی پیداوار میں انقلاب کیا گیا دستی صنعت کی جگہ جدید صنعت کا دیو نمودار ہوا متوسط طبقہ کے صنعتی تاجر کی جگہ اب لکھ پتی تاجر یعنی موجودہ سرمایہ دار پیدا ہوا جو صنعتی مزدوروں کی ایک بڑی فوج کی سپہ سالاری کرنے لگا۔

امریکہ کے انکشاف سے جو راستہ ہموار ہوا تھا جدید صنعت نے اس کے ذریعہ سے عالمگیر منڈی قائم کی اس عالمگیر منڈی کے پیدا ہو جانے سے تجارت، جہاز رانی اور بری وسائل آمد و رفت کو بڑا فروغ حاصل ہوا پھر اس فروغ سے صنعت و حرفت میں مزید توسیع ہوئی اور جس تناسب سے صنعت، تجارت، جہاز رانی اور ریلوں کی توسیع ہوتی رہی اسی تناسب سے سرمایہ دار طبقہ کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا رہا اور وہ ان تمام دوسرے طبقوں پر جو عہد وسطیٰ میں پائے جاتے تھے حاوی ہو گیا۔

مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جدید سرمایہ دار نتیجہ ہے ایک طویل سلسلہ ارتقا کا اور اس

ارتقار کے محرک وہ انقلابات ہیں جن کی وجہ سے دولت کی پیدائش اور مبادلہ کے طریقوں میں برابر تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ سرمایہ دار طبقے نے ترقی کی طرف جو قدم بھی اٹھایا اُس کی وجہ سے اس کے طبقے کو ساتھ ہی ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوتا رہا ابتدا میں وہ جاگیرداروں کے ماتحت ایک مظلوم طبقے کی حیثیت سے زندگی گذارتا تھا پھر عہدِ وسطیٰ کے شہروں میں کہیں تو اس نے آزاد شہری جمہوریتیں قائم کیں (مثلاً اٹلی اور جرمنی میں)، اور کہیں ملوکیت کے ماتحت دارالعوام کے حقوق حاصل کئے (جیسے فرانس میں)، پھر اس نے ایک خود مختار اور مسلّم انجمن کی حیثیت حاصل کرلی پھر صنعتی عہد میں اس نے کبھی مطلق العنان بادشاہوں اور کبھی نیم جاگیرداروں کا ساتھ دے کر شرفا کے زور کو گھٹایا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عظیم ملوکیتوں کا اگر اس عہد میں کوئی پشت پناہ تھا تو یہی طبقہ پھر اس نے جدید صنعت کے قیام کے زمانے سے نمائندہ طرز کی ریاستوں میں ایسا مکمل سیاسی اقتدار حاصل کرنا شروع کر دیا جس میں کوئی دوسرا طبقہ اس کا شریک نہ رہ سکا جدید ریاستوں کی جماعت عاملہ کی حیثیت اب بالکل ایسی ہوگئی گویا سرمایہ داروں نے اپنے مشترکہ کاروبار چلانے کے لیے ایک انتظامیہ کمیٹی بنالی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو سرمایہ دار طبقے نے سخت انقلاب انگیز کام کیے ہیں۔

سرمایہ داروں نے جہاں کہیں اقتدار حاصل کیا انھوں نے زمینداروں کی مراعات، مربیانہ ہمدردی مہربانی اور مروت کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے نہایت بے دردی سے جاگیرداری نظام کے اُن مختلف رشتوں کو توڑ ڈالا جن کے سہارے سے اس وقت کے تمام آدمی "خدا کے بنائے ہوئے سرداروں" کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ رکھا کرتے تھے اور اُن کی جگہ پر کوئی دوسرا نیا رشتہ سوائے اس غیر ہمدردانہ تعلق کے جو کھلی خود غرضی اور "نقد ادائیگی" سے قائم ہوتا ہے پیدا نہیں کیا۔ مذہبی عقیدت کی رفعتیں، مردانہ شجاعت کی فیاضیاں، شاعرانہ جذبات پرستیاں، سب منفعت ذاتی کے حساب کتاب میں ڈوب کے فنا ہوگئیں قدر ذاتی کا معیار قیمت مبادلہ کو قرار دیا گیا بے شمار، باوثوق، دستوری مراعات کی جگہ اب ایک واحد مبہم اور مشتبہ آزادی یعنی معاملے اور تجارت کی آزادی نے لے لی۔ مختصر یہ کہ اس ناجائز فائدہ کی جگہ جو مذہبی اور سیاسی دھوکوں کی آڑ لے کر حاصل کیا جاتا تھا اب ڈھٹائی بے غیرتی اور ظلم کیساتھ

کھلم کھلا فائدہ اٹھایا جانے لگا۔

سرمایہ دار جماعت نے ان تمام پیشوں کی عزت خاک میں ملا دی جن کی عظمت اور شوکت کا رعب ابھی تک لوگوں کے دلوں پر طاری تھا۔ اس نے حکیموں، ڈاکٹروں، وکیلوں، مولویوں، پنڈتوں شاعروں، عالموں، سائنس دانوں، سب کو اپنا تنخواہ دار ملازم بنا کر ذلیل اور رسوا کر دیا۔

سرمایہ داروں نے خاندانی زندگی کے چہرے سے شفقت اور الفت کے نقابوں کو نوچ کر اتار پھینکا خاندانی رشتہ کو محض زرطلبی کا رشتہ بنا دیا۔

سرمایہ دار جماعت ہی نے اس بات کو بھی ظاہر کیا کہ عہد وسطیٰ میں قوت اور زندگی کا جو ظالمانہ مظاہرہ ہوا تھا اور جس کی رجعت پسند طبقے خوب تعریفیں کرتے ہیں اس کا موزوں اور مناسب انجام یہی ہو سکتا تھا کہ ہر طرف سخت ترین کاہل انگاری اور جمود کا دور دورہ ہو جائے پھر اسی طبقے نے دکھا دیا کہ انسان کی کوششیں کیا کچھ کر سکتی ہیں اس نے مصر کے اہرام، رومیوں کی نہروں، گاتھوں کے گرجاؤں سے بڑھ کر کارہائے نمایاں انجام دئے اس نے ایسی ایسی مہمیں سر کیں جن کے سامنے تمام قوموں اور صلیبی جنگوں کی ہجرتیں بالکل حقیر نظر آتی ہیں۔

سرمایہ دار جماعت اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک آلات پیدائش دولت میں انقلاب کا سلسلہ جاری نہ رہے پھر ان انقلابات کے نتیجے کے طور پر پیدائش دولت کی وجہ سے جو تعلقات پیدا ہوتے ہیں اُن میں بلکہ کل معاشرتی تعلقات میں بھی انقلابات کا پیدا ہونا ناگزیر ہو جاتا ہے اس کے برعکس تمام قدیم صنعتی طبقے پیدائش دولت کے پرانے طریقوں کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنا اپنی بقا کے لیے پہلی لازمی شرط خیال کرتے ہیں۔ طریقہ ہائے پیدائش دولت میں مستقل انقلابات، تمام معاشرتی حالات میں مسلسل انتشار دائمی شبہ اور ہیجان یہ چیزیں ہیں جو سرمایہ داری کے عہد کو دوسرے زمانوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ تمام مقررہ اور محکم رشتے اور ان کے ساتھ تمام قدیم اور مقدس تعصبات اور تخیلات سیلاب میں بہ جاتے ہیں تمام نئے تعمیر شدہ رشتے اور نصب العین محکم ہونے سے پہلے متروک ہو جاتے ہیں۔ جو چیزیں ٹھوس ہیں وہ پگھل کر ہوا میں مل جاتی ہیں، جو مقدس ہیں وہ ناپاک ہو جاتی ہیں اور آدمی آخرکار مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی زندگی کے

حقیقی ماحول اور بنی نوع سے اپنے صحیح تعلقات کے تعلق عقل و شعور سے کام لے۔

سرمایہ دار اپنی پیداوار کیلئے اضافہ پذیر منڈی کی تلاش میں تمام کرۂ زمین کی سطح پر سرگرداں رہتا ہے اس کی خاطر اسے ہر مقام پر مکان بنانے پڑتے ہیں بستیاں بسانی پڑتی ہیں اور تعلقات قائم رکھنا ہوتے ہیں۔

سرمایہ دار نے دنیا کی منڈیوں سے فائدہ اٹھا کر پیدائش اور صرف دولت کو ہر ملک میں ایک عالمگیر شکل دے دی ہے رجعت پسندوں کو یہ بات ناگوار ہے مگر صنعت کے پاؤں تلے سے قومی زمین جس پر وہ ابھی تک قائم تھی نکل چکی ہے تمام قدیم قومی صنعتیں برباد ہو گئی ہیں یا برباد ہوتی جا رہی ہیں ان کی جگہ نئی صنعتیں لے رہی ہیں جن کا مہذب ملکوں میں اختیار کرنا ذاتی بقا کیلئے بالکل لابدی ہو گیا ہے۔ یہ صنعتیں وہ نہیں ہیں جو صرف ملکی اشیاء خام کو مصنوعہ شکل دیا کرتی تھیں بلکہ یہ دور دراز خطوں سے اپنی مصنوعات کے لیے اشیاء خام فراہم کرتی ہیں یہ صرف ملکی منڈی کے لیے نہیں بلکہ تمام کرۂ زمین کے لیے مال تیار کرتی ہیں پرانی احتیاجات کی جگہ جو ملکی مصنوعات سے پوری ہو جاتی تھیں اب نئی احتیاجات پیدا ہو رہی ہیں جن کو رفع کرنے کے لیے بعید ممالک اور مختلف آب و ہواؤں کی پیداوار ضروری ہو جاتی ہے قدیم مقامی اور قومی عزلت گزینی اور مستغنی بالذات نظام معیشت کی جگہ اب ہر طرف آمد و رفت شروع کی جاتی ہے اور تمام اقوام کے درمیان عالمگیر وابستگی پیدا ہو جاتی ہے مادی دولت آفرینی میں یہ بات جس طرح نمایاں ہوتی ہے اسی طرح ذہنی میں بھی ہوتی ہے منفرد اقوام کی ذہنی تخلیق سب کی مشترک ملکیت بن جاتی ہے۔ قومی یکجہتی اور تنگ خیالی روز بروز ناممکن ہوتی جاتی ہے اور لاتعداد قومی اور مقامی ادبوں سے ایک عالمگیر ادب پیدا ہو جاتا ہے۔

سرمایہ دار طبقہ تمام اقوام کو جس میں سخت ترین وحشی اقوام بھی شامل ہیں آلات دولت آفرینی کے تیز رفتار ارتقا اور وسائل آمد و رفت کی کثیر سہولتوں کے ذریعہ سے تہذیب کے حلقہ میں شامل کرتا ہے سستی قیمتوں کے توپ خانہ سے جس کے سامنے وحشیوں کی انتہائی ضد اور نفرت کو بھی مجبوراً ہار ماننا پڑتی ہے چینی دیواروں کو منہدم کرتا ہے پس ماندہ اقوام کو سرمایہ دارانہ نظام اختیار کرنے کیلئے تباہی اور قلت کے خوفناک مناظر سامنے رکھ کر مجبور کرتا ہے اپنے ملک میں "تہذیب" رائج کرنے یعنی سرمایہ دارانہ نظام اختیار کرنے کے لیے وہ بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ مختصر یہ کہ سرمایہ دار اپنی جیسی دنیا ہر جگہ بناتا جاتا ہے۔

سرمایہ دار طبقے نے دیہات کو شہروں کا غلام بنا دیا ہے اس نے بڑے بڑے شہر پیدا کئے ہیں دیہاتی آبادی کے بالمقابل شہری آبادیوں میں بہت زیادہ اضافے کئے ہیں اور اس طرح پر آبادی کے ایک بڑے حصہ کو دیہاتی زندگی کے گنوارپن سے نجات دلائی ہے جس طرح اس نے دیہات کو شہروں کا پابند کر دیا ہے اسی طرح اس نے وحشی اور نیم وحشی ممالک کو سرمایہ داروں کے ممالک کا، مشرق کو مغرب کا پابند کر دیا ہے۔

سرمایہ دار منتشر آبادی، منتشر وسائل دولت آفرینی اور منتشر ملکیت کو ختم کرتا جا رہا ہے آبادیاں مجتمع ہو رہی ہیں، وسائل دولت کا انتظام مرکز کی طرف کھنچ رہا ہے اور ملکیت کے حقوق صرف چند افراد کے لیے محدود ہوتے جا رہے ہیں اس کے لازمی نتیجے کے طور پر سیاسی اقتدار میں بھی مرکزیت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے خود مختار اور نسبتاً آزاد صوبے جن کے مفاد، قوانین، حکومتیں اور نظام محاصل مختلف تھے ایک قوم کے ماتحت جمع کر دیئے گئے اور ایک واحد حکومت، واحد نظام قانون، واحد قومی طبقہ وار مفاد، واحد سرحد اور واحد محصول چنگی پیدا ہو گیا۔

سرمایہ دار طبقے نے ایک صدی سے کم اپنی مدت اقتدار میں ایسے وزنی اور زبردست وسائل دولت آفرینی کی تخلیق کی جس تمام گذشتہ نسلیں مل کر بھی پیدا کرنے سے قاصر ہیں قدرتی قوتوں کو انسان کا مطیع بنانا، مشینوں کو ایجاد کرنا صنعت و زراعت میں علم الکیمیا سے استفادہ، دخانی جہاز رانی، ریلیں، بجلی کے تار، بڑے بڑے براعظموں کا کاشت کے لیے صاف کرنا، دریاؤں سے نہریں نکالنا، ویران زمینوں پر بات کی بات میں کثیر آبادیوں کو بسا دینا کیا اس سے پہلے کسی صد سالہ دور کو اس کا وہم و گمان بھی تھا کہ مزدوروں کی اجتماعی کوششوں سے ایسی دولت آفریں قوتیں بیدار ہو سکیں گی۔

الغرض اس تمام بحث سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جاگیرداری معاشرت ہی میں ان وسائل دولت آفرینی اور مبادلہ کی ابتدا ہوئی جن کی بنیاد پر سرمایہ داروں کا طبقہ عالم وجود میں آیا ان وسائل دولت آفرینی اور مبادلہ کے زمانہ ارتقا میں ایک منزل ایسی آئی جب وہ حالات جن کے تحت جاگیردارانہ معاشرت میں مبادلہ اور دولت آفرینی کے کاروبار کو جاری رکھا جاتا تھا اور زراعت و

صنعت کو جاگیردارانہ تنظیم دی جاتی تھی یا بالفاظ مختصر ملکیت کے تمام جاگیردارانہ رشتوں اور تعلقوں کو قائم رکھا جاتا تھا۔ ترقی پذیر دولت آفریں قوتوں کے مقابلہ میں غیر موزوں اور بے محل نظر آنے لگے انھوں نے قید و بند کی صورت اختیار کرلی اُن کا توڑنا ضروری ہوگیا لہٰذا وہ توڑ ڈالے گئے۔

ان کی جگہ آزاد مقابلہ نے لی جس کے حسب حال معاشرتی اور سیاسی نظام بھی ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوا اور سرمایہ دار جماعت کو ہر جگہ معاشی اور سیاسی اقتدار حاصل ہوگیا۔

اسی قسم کی ایک تحریک ہماری نگاہوں کے سامنے بھی جاری ہے موجودہ سرمایہ دارانہ معاشرت اپنے مخصوص تعلقات دولت آفرینی، مبادلہ اور ملکیت کے ساتھ ایک ایسی معاشرت کا منظر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس میں پیدائش دولت اور مبادلہ کے وسیلوں نے ایک مہیب پیکر اختیار کرلیا ہے اور اُس کی مثال اس جادوگر کی سی ہے جو ان سفلی قوتوں کو قبضہ میں رکھنے سے قاصر ہوگیا ہے جنھیں خود اُس نے اپنے جادو کے زور سے جگایا تھا پچھلے چالیس پچاس سالوں سے تو صنعت و تجارت کی تاریخ درحقیقت اس بغاوت کی تاریخ ہوگئی ہے جو جدید دولت آفریں قوتیں، جدید لوازم پیدائش دولت یعنی ملکیت کے ان رشتوں اور تعلقات کے خلاف کررہی ہیں جن کی بنیاد پر سرمایہ دار طبقہ اور اُس کا اقتدار قائم ہے۔ اس بیان کی تائید میں اُن تجارتی بحرانوں کا ذکر کافی ہوگا جو مقررہ میعادوں کے بعد بار بار اور ہر مرتبہ زیادہ خطرناک شکل میں رونما ہوکر تمام سرمایہ دارانہ معاشرت کے وجود کو دور ابتلا و آزمائش میں مبتلا کردیتے ہیں ان بحرانوں میں نہ صرف موجودہ پیداوار کا ایک معتدبہ بلکہ پچھلے زمانہ کی پیدا کی ہوئی دولت آفریں قوتوں کا بھی ایک قابل لحاظ حصہ میعادی طور پر ضائع ہوتا رہتا ہے۔ ان بحرانوں میں ایک ایسی وبا پھیل جاتی ہے جسے تمام پچھلے زمانوں میں حماقت سے تعبیر کیا جاتا یعنی زائد از ضرورت دولت کی وبا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں عارضی طور پر عہد وحشت کا دور دورہ ہوگیا ہے۔ ایسا نظر آتا ہے گویا کسی قحط سالی یا عالمگیر تباہ کن جنگ کی وجہ سے ہر قسم کے وسائل معاش کی رسد مسدود ہوگئی ہے۔ سوسائٹی کے قبضے میں جو دولت آفریں قوتیں ہوتی ہیں وہ سرمایہ دارانہ ملکیت کے داعیات کو پورا نہیں کرتیں اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے گویا حالات کی اُن زنجیروں کے مقابلہ میں جن سے وہ بندھی

ئی ہیں وہ اب اس قدر زیادہ طاقتور ہو گئی ہیں کہ اُن کا پابند رہنا نہایت دشوار ہو گیا ہو اور جوں ہی وہ اپنی زنجیروں کے توڑنے میں کامیاب ہوں گی تمام سرمایہ دارانہ معاشرت میں بدنظمی پیدا ہو جائیگی اور سرمایہ دارانہ ملکیت خطرے میں پڑ جائے گی سرمایہ دارانہ معاشرت کے حدود اس قدر تنگ ہیں کہ وہ اس دولت کو بھی اپنے اندر جذب نہیں کر سکتے جسے وہ خود پیدا کرتے ہیں سوال یہ ہو کہ سرمایہ دار طبقہ ان بحرانوں سے نجات کس طرح حاصل کرتا ہو؟ ایک طریقہ تو یہ ہو کہ دولت آفریں قوتوں کو برباد کیا جاتا ہو اور دوسرا یہ کہ یا تو نئی منڈیاں فتح کیجاتی ہیں یا پرانی منڈیوں سے زیادہ مکمل طریقہ پر فائدہ حاصل کیا جاتا ہو اس کے معنی دوسرے الفاظ میں گویا یہ ہوئے کہ اس طرح زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ مہلک بحرانوں کے لیے راستہ ہموار کیا جاتا ہو اور ان وسائل کو جن سے بحرانوں کا تدارک ہو سکتا ہو کم کیا جاتا ہو۔

جن ہتھیاروں سے سرمایہ دار طبقہ نے جاگیرداری نظام کو برباد کیا تھا اب وہ ہی ہتھیار اس کے خلاف بھی استعمال کئے جا رہے ہیں۔

پھر لطف یہ ہو کہ سرمایہ دار طبقہ ان ہتھیاروں کو ہی صرف اپنے ہاتھ سے نہیں بنا رہا ہو جن سے اُس کی موت واقع ہو گی بلکہ وہ اُن آدمیوں کو بھی پیدا کر رہا ہو جو ان ہتھیاروں کو استعمال کریں گے یعنی جدید مزدوروں کے طبقے یا پرولتاریہ کو جس تناسب سے سرمایہ دار طبقہ یعنی سرمایہ ترقی کرتا ہو اُسی تناسب سے پرولتاریہ بھی ترقی کرتا ہو یعنی ایسے جدید مزدوروں کا طبقہ جو اجرت پر کام ملنے کی صورت میں ہی زندہ رہ سکتا ہو اور کام اسے تبھی ملتا ہو جب اس کی محنت سے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہو یہ مزدور جو اپنے آپ کو ہر مرتبہ تھوڑا تھوڑا فروخت کرنے کیلئے مجبور ہیں آدمی نہیں رہتے بلکہ تمام دوسری اشیاء کی مانند خود بھی ایک شے بنجاتے ہیں اور اس لیے مقابلے کے تمام حوادث اور منڈی کے اتار چڑھاؤ کے نتائج جھیلنے کے لیے مجبور ہوتے ہیں۔

مشین کے ہمہ گیر استعمال اور تقسیم عمل سے مزدوروں کا طبقہ اپنی تمام انفرادی خصوصیات اور اپنے کام کی تمام لذت و دلکشی کو زائل کر دیتا ہو وہ مشین کا ایک پرزہ بنجاتا ہو۔ کام کرنے کیلئے جن اہلیتوں کی اب اسے ضرورت ہوتی ہو وہ بہت سادہ، بہت یکساں اور نہایت آسانی سے حاصل کی

جا سکتی ہیں۔ مزدور کو کام کے لیے تیار کرنے کی لاگت گھٹتے گھٹتے وسائل تھا اور وسائل از دیا دنسل تک محدود ہو جاتی ہے جس تناسب سے کام کی ناگواری میں کمی ہوتی ہے اسی تناسب سے اُجرت گھٹتی رہتی ہے پھر معاملہ یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ جس تناسب سے مشین کے استعمال اور تقسیم عمل میں اضافہ ہوتا ہے اسی تناسب سے کام کا بار بھی بڑھتا جاتا ہے کبھی تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ کام کے اوقات طویل کر دئے جاتے ہیں کبھی یہ کہ مقررہ وقت میں کام کی مقدار بڑھا دی جاتی ہے یا مشین کی رفتار تیز کر دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

جدید صنعت نے پدرانہ شفقت سے کام لینے والے آجروں کے چھوٹے کارخانوں کی ہیئت بدلکر صنعتی سرمایہ دار کی بڑی فیکٹریاں بنا دیں مزدوروں کے کثیر انبوہوں کو جو فیکٹریوں میں جمع رہتے ہیں فوجیوں کی طرح منظم کیا اس صنعتی فوج کے سپاہی حوالداروں اور دوسرے بالا دست حاکموں کے درجہ بدرجہ ماتحت رہ کر اپنا کام انجام دیتے ہیں یہ لوگ صرف سرمایہ دار طبقہ اور سرمایہ دار ریاست کے ہی غلام نہیں ہوتے بلکہ روز بروز، ساعت بہ ساعت مشین کے، مستری کے اور سرمایہ دار آجر کے غلام بنتے جاتے ہیں سرمایہ دار کی مطلق العنانی نفع طلبی کو جس قدر زیادہ واضح طور پر اپنا مدعا اور مقصد قرار دے رہی ہے اسی قدر زیادہ اُس میں خفیف الحرکتی، نفرت انگیزی اور تلخی و ناگواری زیادہ نمایاں ہو رہی ہے۔

دستی محنت میں جسقدر کم مہارت، مشقت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے یعنی جس قدر زیادہ جدید صنعت میں ترقی ہوتی ہے اسی قدر زیادہ مردوں کی محنت کی جگہ عورتوں کی محنت سے کام لیا جاتا ہے مزدوروں کی جماعت میں عمر اور جنس کے فرق کی اہمیت مٹ جاتی ہے سب آلات محنت بنجاتے ہیں اور جنس و عمر کی مناسبت سے کم و بیش سستے یا مہنگے ثابت ہوتے ہیں مزدور سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش سے جب کبھی آجر اس حد تک اجتناب کرتے ہیں کہ مزدور کو نقد اُجرت ملنا شروع ہو جاتی ہے اسی وقت سرمایہ دار طبقے کے دوسرے گروہ یعنی زمیندار، دکاندار، مہاجن وغیرہ اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

متوسط طبقے کے نچلے دار لوگ یعنی چھوٹے تاجر، دکاندار، ایسے لوگ جو پہلے کبھی تاجر تھے مگر اب بیکار چھوڑ بیٹھے دستی صناع اور خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیندار یہ سب کے سب رفتہ رفتہ مزدوروں کے طبقے میں شامل ہوتے جاتے ہیں کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن کا زوال پذیر سرمایہ اس پیمانہ پر کام کرنیکے

لیے جس پر جدید صنعت چلائی جاتی ہے کافی نہیں ہوتا اور بڑے سرمایہ داروں کے مقابلہ کی تاب نہیں لاسکتا اور کچھ اس لیے کہ اُن کی مخصوص مہارت پیدائش دولت کے نئے طریقوں کی وجہ سے بیکار ہوجاتی ہے اس طرح پر مزدور پیشہ طبقے میں ہر طبقے کے لوگ شامل ہوتے رہتے ہیں۔

مزدور پیشہ طبقہ ارتقاء کے مختلف مدارج سے گذرتا ہے اُس کے پیدا ہوتے ہی سرمایہ دار طبقہ سے آویزش کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ابتدا میں مزدور انفرادی طور پر جھگڑا کرتے ہیں پھر ایک فیکٹری کے تمام مزدور اس جھگڑے میں شریک ہونے لگتے ہیں پھر ایک مقام کی ایک قسم کی تجارت کے تمام مزدور اُس سرمایہ دار کے خلاف انفرادی طور پر کھڑے ہوجاتے ہیں جو اُن سے براہ راست ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے وہ اپنے حملوں کا محاذ سرمایہ دارانہ طرز دولت آفرینی کو نہیں بلکہ آلات دولت آفرینی کو قرار دیتے ہیں وہ باہر کے منگائے ہوئے اُس مال کو برباد کرڈالتے ہیں جو ان کی محنت سے تیار کئے ہوئے مال کا مقابلہ کرتا ہے وہ مشین کو توڑ کر اُس کے پرزے پرزے کرڈالتے ہیں وہ فیکٹریوں کو جلا ڈالتے ہیں مزدوروں کو جو حقوق مراعات عہد وسطیٰ میں حاصل تھے انھیں وہ زبردستی تسلیم کرالیتے ہیں

اس منزل میں مزدوروں کا طبقہ ایک ایسے انمل بے جوڑ گروہ پر مشتمل ہوتا ہے جو تمام ملک میں پھیلا ہوتا ہے اور جس میں باہمی مقابلہ کی وجہ سے اختلافات پائے جاتے ہیں اگر اس زمانے میں وہ کہیں ٹھوس منظم بنتے بھی ہیں تو یہ اپنی ذاتی کوشش سے نہیں بلکہ سرمایہ دار طبقہ کے اتحاد کی وجہ سے کیونکہ یہ طبقہ اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے تمام مزدور پیشہ طبقہ کو متحرک ہونے پر مجبور کرتا ہے اور تھوڑے عرصہ کے لیے اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوجاتا ہے اس لیے اس منزل میں مزدور پیشہ فرقہ اپنے دشمنوں سے نہیں بلکہ اپنے دشمنوں کے دشمنوں سے یعنی مطلق العنان ملوکیت کے حاشیہ نشینوں، زمینداروں، غیر صنعتی سرمایہ داروں اور چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں سے جنگ کرتا ہے مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ تاریخ کی تمام کارفرمائیوں کا مرکز ابھی تک سرمایہ دار ہی رہے ہیں جو فتح بھی حاصل ہوئی ہے وہ سرمایہ دار طبقہ کے لئے ہی مفید ثابت ہوئی ہے۔ لیکن صنعت کے ارتقا کے ساتھ ساتھ مزدور پیشہ طبقہ کی صرف تعداد ہی میں اضافہ نہیں ہوتا بلکہ یہ بڑے بڑے مرکزوں

میں مجتمع ہو جاتا ہے اس کی طاقت بڑھ جاتی ہے اور اسے اپنی طاقت کا زیادہ احساس ہونے لگتا ہے مزدور پیشہ طبقے کے مختلف مفاد اور ان کی زندگی کے مختلف حالات میں یکسانیت اور مساوات اُسی نسبت سے بڑھتی رہتی ہے جس نسبت سے مشین محنت کی تفریقوں کو مٹاتی جاتی ہے اور تقریباً ہر جگہ اُجرتوں کو ایک ہی قسم کی پست سطح پر لے آتی ہے سرمایہ دار طبقے کا اضافہ پذیر باہمی مقابلہ اور اس مقابلہ کی وجہ سے پیدا ہونے والے تجارتی بحران مزدوروں کی اجرتوں کو اور بھی زیادہ تغیر پذیر بنا دیتے ہیں مشین کی اصلاح و ترمیم کا دائمی سلسلہ جو روز افزوں طریقہ پر مائل بہ ترقی رہتا ہے اُن کی روزی کو دن بدن زیادہ مشتبہ کر دیتا ہے مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان جو انفرادی تصادم ہوتے ہیں وہ روز بروز طبقوں کے تصادم کی شکل اختیار کرنے لگتے ہیں اس کے بعد مزدور سرمایہ داروں کی مخالفت میں متحد ہونا یعنی مزدور پارٹی بنانا شروع کرتے ہیں وہ اپنے کلب اس لیے بناتے ہیں تاکہ مزدوری کو بلند سطح پر قائم رکھ سکیں وہ مستقل انجمنیں بناتے ہیں تاکہ پہلے ہی سے وقت بے وقت کی بغاوت کیلئے تیار رہیں کہیں کہیں اس قسم کی کشمکش سے فسادات بھی رونما ہو جاتے ہیں

کبھی کبھی مزدوروں کو کامیابی بھی ہوتی ہے لیکن محض وقتی طور پر اُن کی جنگوں کا اصل ثمر فوری نتیجہ کی شکل میں نہیں بلکہ مزدوروں کے وسعت پذیر اتحاد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے پھر اس اتحاد کو ترقی یافتہ ذرائع آمد و رفت اور خبر رسانی سے جنھیں جدید صنعت نے پیدا کیا ہے امداد ملتی ہے اور اسی کی بنا پر مختلف مقامات کے مزدور ایک دوسرے سے تقرب حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسا تقرب جس کی بیشمار ایک ہی قسم کے مقامی تنازعات کو طبقوں کے درمیان ایک قومی تنازعہ بنانے کیلئے بڑی ضرورت ہے لیکن ہر طبقہ دار تنازعہ ایک قومی تنازعہ ہوا کرتا ہے عہد وسطیٰ کے شہریوں کو اپنی خراب خستہ سڑکوں کی بنا پر جس اتحاد کو حاصل کرنے کے لیے صدیاں لگتیں اسے جدید مزدور پیشہ طبقہ، ریلوں کی برکت سے چند سالوں میں حاصل کر سکتا ہے۔

مزدوروں کے باہمی مقابلے کی وجہ سے اُن کی تنظیم اور سیاسی جماعت بندی کو برابر نقصان پہنچتا رہتا ہے لیکن ہر شکست کے بعد یہ پھر از سر نو زیادہ مضبوط، زیادہ استوار اور زیادہ طاقتور بنتے رہتے ہیں

سرمایہ داروں کی باہمی ناچاقی سے فائدہ اٹھاکر مزدوروں کے حقوق قانوناً تسلیم کرائے جاتے ہیں چنانچہ انگلستان میں دس گھنٹہ کی محنت کا قانون اسی طرح بنایا گیا تھا۔

پرانی معاشرت کے طبقوں کے درمیان جو تصادم ہوتے ہیں وہ بھی مختلف طریقوں سے مزدوروں کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں سرمایہ دار کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی جنگ جاری رکھنا پڑتی ہے ابتدا میں وہ امرا کے طبقہ سے جنگ کرتا ہے بعد میں خود سرمایہ داروں کے اس حصہ سے جس کے مفاد، صنعت کی ترقی میں مزاحم ہونے لگتے ہیں اور دوسرے ملکوں کے سرمایہ داروں سے تو ہر وقت جنگ جاری رکھنا پڑتی ہے۔ ان تمام جنگوں میں وہ مجبور ہوتا ہے کہ مزدوروں سے اپیل کرے اُن کی امداد طلب کرے اور انھیں بھی سیاسی میدان میں کھینچ لائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ خود سرمایہ دار ہی مزدوروں کو سیاسی اور عام تعلیم کے عناصر سے روشناس کرتا ہے بالفاظ دیگر گویا وہ مزدوروں کو ان ہتھیاروں سے مسلح کرتا ہے جن سے بعد میں وہ سرمایہ داروں سے لڑ سکیں۔

علاوہ ازیں جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں، صنعت کی ترقی سے حکمراں طبقوں کے گروہ کے گروہ مزدوروں کے طبقے میں شامل ہونے کیلئے مجبور ہو جاتے ہیں یا کم از کم اپنے مخصوص حالات زندگی میں اس قسم کا خطرہ محسوس کرنے لگتے ہیں یہ لوگ بھی مزدوروں کے طبقے کی تعلیم اور روشن خیالی کا موجب ہوتے ہیں۔

پھر اُن زمانوں میں جب فرقہ وارانہ جنگ فیصلہ کن ساعت کے قریب پہنچنے لگتی ہے، حکمراں طبقے کی آہستہ آہستہ تباہی بلکہ کل پرانی معاشرت کی ہمہ گیر فنا پذیری، ایسی تند و تیز اور نمایاں شکل اختیار کرلیتی ہے کہ حکمراں طبقے کا ایک قلیل التعداد حصہ مستقبل کی قیادت کو اس نئی راہ سے حاصل کرنے کیلئے اپنے طبقے سے تعلق منقطع کرلیتا ہے اور انقلابی جماعت میں شامل ہوجاتا ہے اس سے پیشتر کے زمانے میں جس طرح امرا کے طبقے کا ایک حصہ سرمایہ داروں کی جماعت میں شامل ہوگیا تھا اسی طرح اس زمانے میں سرمایہ داروں کا ایک حصہ مخصوصاً وہ خیال پرست حصہ جو اپنے آپ کو اس قدر بلند کرلیتا ہے کہ تاریخی تحریکوں کے مجموعی مطالعہ سے جو نظریے پیدا ہوتے ہیں انھیں سمجھ سکے، مزدوروں سے ملجاتا ہے۔

اُن تمام طبقوں میں جو آج سرمایہ دار طبقے کے مدمقابل نظر آتے ہیں صرف مزدوروں ہی کے طبقے کو

انقلابی طبقہ کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے طبقے جدید صنعت کے مقابلہ میں مائل بہ زوال ہو جاتے ہیں اور آخر میں فنا ہو جاتے ہیں لیکن مزدوروں کا طبقہ جدید صنعت کی مخصوص اور لازمی پیداوار ہے۔

ادنیٰ متوسط طبقہ چھوٹے آجر، دکاندار، کاریگر، خود کاشت کرنے والے چھوٹے زمیندار سب متوسط طبقے کے اجزا کی حیثیت سے اپنے وجود کو فنا سے بچانے کیلئے سرمایہ دار طبقے سے جنگ کرتے ہیں اس لیے یہ طبقے انقلابی نہیں بلکہ قدامت پسند ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ رجعت پسند ہوتے ہیں کیونکہ یہ تاریخ کے پہیہ کو الٹا چکر دینا چاہتے ہیں اگر اتفاق سے یہ کبھی انقلابی بنتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انھیں خیال ہو جاتا ہے کہ اب وہ مزدوروں کے طبقے میں شامل ہونے والے ہیں یوں گویا وہ اپنے موجودہ مفاد کی تو نہیں مگر مستقبل کے مفاد کی محافظت کرتے ہیں، وہ اپنے طبقے کے مفاد کی حفاظت اس لیے ترک کرتے ہیں تاکہ وہ مزدوروں کے طبقے کے مفاد کی جس میں وہ خود شامل ہونے والے ہیں حفاظت کر سکیں۔

قدیم معاشرت کا ادنیٰ ترین بیکار گروہ جسے بدمعاش یا خطرناک طبقہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کہیں کہیں ممکن ہے مزدور پیشہ طبقہ کی انقلابی تحریک کی رو میں بہ کر اُن کا شریک ہو جائے۔ لیکن عموماً اُس کے حالات زندگی مجبور کرتے ہیں کہ وہ رجعت پسند سازشوں کا آلۂ کار بن جائے۔

مزدوروں کا فرقہ جن حالات میں زندگی گذارتا ہے ان میں قدیم معاشرت کے حالات زندگی ختم ہو چکے ہوتے ہیں مزدور کے پاس کوئی جائداد نہیں ہوتی بیوی اور بچوں سے اُس کے جو تعلقات ہوتے ہیں اُن میں اور سرمایہ داروں کے خانگی تعلقات میں کوئی قدر مشترک نہیں ہوتی۔ جدید صنعتی محنت اور سرمایہ کی جدید غلامی نے جو انگلستان میں بھی ویسی ہی ہے جیسی فرانس میں، امریکہ میں بھی ویسی ہے جیسی جرمنی میں، اُس کو قومی سیرت کے ہر ایک نام و نشان سے معرا کر دیا ہے اس کے نزدیک قانون اخلاق، مذہب، سرمایہ دار طبقے کے ایسے تعصبات ہیں جن کی آڑ لیکر وہ اپنے مفاد کی حفاظت کرتا رہتا ہے گذشتہ زمانوں میں جتنے طبقوں نے بھی اقتدار حاصل کیا انھوں نے ہیئت اجتماعی کو بصورت مجموعی اپنی شرائط تصرف اور حصول قبضہ کا پابند بنا کر کوشش کی کہ اپنے حاصل کردہ مرتبہ اور منصب کی حفاظت کریں مزدوروں کا طبقہ بھی ہیئت اجتماعی کی دولت آفریں قوتوں کا اُس وقت تک مالک نہیں

بن سکتا جب تک وہ حصول قبضہ کے اپنے قدیم طریقوں کو اور اس کے ذریعہ سے تصرف کے اور تمام دوسرے طریقوں کو متروک قرار نہ دے مزدوروں کے پاس اپنی کوئی چیز ہمیہ اور حفاظت کیلئے نہیں ہے اس لیے ان کا مذہبی فریضہ یہ ہے کہ انفرادی ملکیت کے تمام گذشتہ بیموں اور تحفظات کو فنا کرڈالیں۔

تاریخ کی گذشتہ تمام تحریکیں یا تو اقلیتوں کی تحریکیں تھیں یا اقلیتوں کے مفاد کیلئے تھیں مزدور طبقے کی تحریک کثیر التعداد اکثریت کی باشعور اور خود مختار تحریک ہے ہماری موجودہ ہیئت اجتماعی کا سب سے ادنٰی پرت اس وقت تک نہ تو حرکت کرسکتا ہے نہ اُبھر سکتا ہے جب تک اور پرت جو اس کے اوپر جمے ہوئے ہیں کھود کر نہ پھینک دئے جائیں۔

حقیقت میں تو نہیں مگر ظاہری طور پر مزدوروں کے طبقہ کی سرمایہ دار طبقے سے جنگ ابتدا میں قومی شکل ہی میں ظاہر ہوتی ہے ایسا ہونا ٹھیک بھی ہے کیونکہ ہر ملک کے مزدور طبقہ کو سب سے پہلے اپنے ہی ملک کے سرمایہ دار طبقہ سے نبٹنا چاہیئے مزدوروں کے طبقہ کی عام ارتقائی شکلیں بیان کرتے وقت ہم نے موجودہ ہیئت اجتماعی میں جو در پردہ خانگی جنگ جاری ہے اس کا اس مقام تک پتہ چلایا تھا جب یہ جنگ ایک اعلانیہ شکل اختیار کرلیتی ہے اور جب سرمایہ دار طبقے کی تشدد آمیز شکست سے مزدور پیشہ فرقے کے اقتدار کی بنیاد پڑتی ہے

ابھی تک ہر قسم کی ہیئت اجتماعی کی بنا جیسا ہم اوپر بیان کرچکے ہیں ظالم اور مظلوم کی باہمی مخاصمت پر رکھی گئی ہے لیکن ایک طبقے پر ظلم جاری رکھنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ بالکل مٹنے نہ دیا جائے بلکہ اس کی حالت اس حد تک سنبھلی رہے کہ کم از کم وہ اپنی غلامانہ زندگی پر قائم رہ سکے۔ کمینوں کے عہد میں، ایک کمین کو موقع تھا کہ وہ شہری پنچایت کی رکنیت حاصل کرسکے اسی طرح جاگیردارانہ مطلق العنانی کے زمانہ میں چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار، بڑے سرمایہ دار بن سکتے تھے لیکن جدید مزدوروں کی صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کا رتبہ بلند نہیں ہوتا بلکہ اس کی بجائے اپنے طبقے کے حالات زندگی کے مقابلہ میں وہ پست اور پست تر معیار اختیار کرنے کیلئے مجبور ہوتا جاتا ہے وہ مفلس اور قلاش ہوجاتا ہے آبادی اور دولت سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ افلاس ترقی کرتا ہے اور اس سے یہ حقیقت ہر شخص پر عیاں ہوجاتی ہے کہ سرمایہ دار ہیئت اجتماعی میں حکمراں طبقہ بننے اور اپنی شرائط زندگی تسلیم کرانے کیلئے ناموزوں ہے حکمرانی

کیلیے ناموزوں اس لیے ہو کہ یہ اپنے غلام کیلئے غلامی کی حالت کو بھی متحکم نہیں کرسکتا اسے اس حالت تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتا جس میں مزدور کا پیٹ کاٹنے کی بجائے سرمایہ دار کو خود مزدور کے لیے غذا فراہم کرنیکی ضرورت پیش آتی ہو اس قسم کے سرمایہ دار طبقہ کے ماتحت ہیئت اجتماعی زندگی نہیں گذار سکتی بالفاظ دیگر اُس کا وجود نظام معاشرت میں لغو اور مہمل نظر آنے لگتا ہو۔

سرمایہ دار طبقے کے وجود اور اس کے غلبہ کے لیے لازمی شرط سرمایہ کی تعمیر اور ترقی ہو اور سرمایہ کی تخلیق کا انحصار اجرت پر کام کرنے والے مزدور پر ہو۔ اجرت پر کام کرنے والا مزدور، مزدوروں کے باہمی مقابلے سے پیدا ہوتا ہو صنعت کی ترقی جس کے ارتقا کا سرمایہ دار غیر اختیاری طور پر باعث ہوتا ہو۔ مزدوروں کی عزلت گزینی کو جو مقابلے کا نتیجہ ہوتی ہو ختم کر دیتی ہو اور غیر اختیاری طور پر مزدوروں کو انجمن سازی کے لیے مجبور کرتی ہو اس طرح جدید صنعت کا ارتقا سرمایہ داروں کے پاؤں تلے کی اس بنیاد کو کھود ڈالتا ہو جس پر کھڑے ہو کر وہ دولت پیدا کرتے اور اس پر قبضہ حاصل کرتے ہیں سرمایہ دار اپنی قبر کھودنے والوں کو خود ہی پیدا کرتے ہیں لہذا سرمایہ دار طبقہ کی تباہی اور مزدوروں کے طبقہ کی فتح لازمی اور ناگزیر ہو۔

دعوتِ عمل

جھجکتے کیوں ہو؟ مرد ہو پوری داڑھی والے۔
خدا نے تمھیں ارادے کی قوت دی ہے اور ہمت بھی۔
اگر تم اس سے کام لینا چاہو۔ ارادہ کی کوئی قوت آج تک ایسی نہیں ہوئی جس نے
اپنی تکمیل کے لیے راہ یا ذریعہ نہ ڈھونڈھ نکالا ہو۔
نہ کبھی قسمت نے اس شخص کے ساتھ بے وفائی کی جس نے جرأت سے کام لیا۔
کیا اس درد انگیز ظلم کی موجودگی میں ۔
وقت کی اس اعلیٰ ترین فرصت میں
ہم کھڑے لرزتے، دیکھتے رہیں گے جب کہ ہماری صرف ایک دلیرانہ ضرب سے لاکھوں
کی وہ تمام کراہنے والی آبادی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد کیجا سکتی ہے؟
پھر..... وہ ضرب بھی ایسی انصاف پر مبنی اس قدر نیکی سے معمور
اس قدر نوعِ انساں کی مسرت کے عین مطابق ہے۔
کہ تمام فرشتے ہمارے اس کارنامے پر مرحبا اور آفریں کے نعرے بلند کریں گے

ترجمہ　　　　ای۔ آر۔ ٹیلر

آہ میرے بچوں کی قسمت

میں اپنی عمر کی اٹھارویں منزل میں تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ میرے اوپر ناگہانی مصائب کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ سارے گھر کا بار اپنے کمزور اور نوعمر کندھوں پر اٹھانا پڑا۔ معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم ختم ہوگئی، کھیل کے دن رخصت ہو گئے، بچپن اور بچپن کی بے فکریاں، جوانی اور جوانی کی آزادیاں ہمیشہ کے لئے خواب وخیال ہو کر رہ گئیں۔

یہ میری زندگی کا ایک عہد آفریں واقعہ تھا۔ اس کے بعد کے زمانے کو میں انقلابی زمانہ کہہ سکتا ہوں۔ اس دور انقلاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ پانچ ننھے ننھے بچے میری سرپرستی میں آگئے تھے۔ یہ میرے چھوٹے بھائی بہن تھے۔ ان کی پرورش، تربیت اور تعلیم کا بار میرے اوپر تھا۔ میں اس بار کو، اس ذمہ داری کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ میری زندگی کا کوئی لمحہ ان کے خیال اور ان کی یاد سے خالی نہ تھا۔ میری تمام مصروفیتیں، تمام جدوجہد انھیں کی خاطر تھی۔ ان کی فلاح وبہبود کو، ان کی سرسبزی کو میں نے اپنا مقصد حیات بنا لیا تھا، اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے لیا تھا، میں زندہ بھی انھیں کے لئے تھا اور مرنا بھی چاہتا تھا تو انھیں کے لئے۔

میرے بعض کرمفرما مجھے اس معاملہ میں بہت بدقسمت [illegible]
ہمدردی کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے پرخلوص لہجے اور محبت آمیز [illegible]
میں کبھی کبھی اس طرح سوچنے پر مجبور [illegible]
اور پھر اس بار کا احساس مجھے دیکر مجھ پر [illegible]

ردیا ہے۔ کاش مجھ پر ان بچوں کی سرپرستی کا بار نہ ہوتا۔ میں ان ذمہ داریوں سے جو مجھے گھیرے ہوئے ہیں۔ اور ان خانگی افکار سے جو میرے دل و دماغ پر قبضہ کئے ہوئے ہیں، آزاد ہوتا۔ میں یہ محسوس کرتا کہ میں ہوا کا ایک جھونکا ہوں، ہلکا پھلکا، بے وزن، اور بے فکر، جہاں چاہتا جاتا، اور جو جی میں آتا کرتا۔ دنیا کے جھمیلوں اور بندھنوں سے آزاد ہوتا اور اپنی دولت اور جوانی کی مدد سے ایک ایسی جنت ارضی تعمیر کرتا جو عرش بریں کے جلووں سے معمور ہوتی۔ جہاں رنگینیوں اور رعنائیوں کے سوا کسی اور چیز کا گزر نہ ہوتا۔ مگر افسوس کہ قدرت نے مجھے اتنی مہلت نہ دی۔ اس نے میرے شباب اور شباب کی تمام آرزوں پر کشمکش، افکار، اور ذمہ داریوں کا ایک کچل ڈالنے والا وزن رکھدیا۔ یہاں تک کہ اب میں اپنے اندر جوانی کی کوئی اُمنگ، شباب کا کوئی ولولہ نہیں پاتا۔ میری تمام مصروفیتوں میں، تمام مشاغل حیات میں بڑھاپے کی متانت پائی جاتی ہے۔ میں جوان ہوتے ہوئے بھی جوان نہیں ہوں۔ وقت سے پہلے بوڑھا ہوں۔ آہ جب میں سچ مچ بوڑھا ہوجاؤنگا۔ اور اپنی گذری ہوئی زندگی پر ایک نظر ڈالوں گا تو میری سرد سرد آہیں اس بات کا اعلان کریں گی کہ اس بدقسمت انسان کو قدرت نے شباب سے محروم رکھا۔ بچپن کے بعد جوان ہونے کی بجائے یہ بوڑھا ہوگیا۔"

لیکن ان تمام مایوسانہ خیالات کے بعد جب مجھے ان بچوں کا خیال آتا جو میری سرپرستی اور سایہ عاطفت میں پل رہے تھے، تو میرا حُزن و ملال اس طرح دور ہوجاتا جس طرح برسات کی رات کا ہولناک اندھیرا بجلی کے چمک اٹھنے پر غائب ہوجاتا ہے دماغ گویا سورج کی کرنوں سے منور ہوجاتا۔ دل سچی مسرت سے لبریز ہوجاتا۔ اور سینے میں حیات افروز جذبات کے چشمے پھوٹ پڑتے۔ پھر میں ان بچوں کے مستقبل پر غور کرتا اور تصور کی آنکھوں سے دیکھتا کہ وہ پڑھ کر جوان ہوگئے ہیں، علم کے زیور سے

آراستہ ہیں، تہذیب و اخلاق کی دولت سے مالا مال ہیں، قوم و ملک کے مفید اور قابل قدر افراد ہیں، اس وقت میری خوشی کی انتہا نہ رہتی اور میں اپنی جنت میں پہونچ جاتا اور حسرت و ملال کی وہ دنیا جو کچھ دیر پہلے میری جان کے لئے عذاب ہوتی تھی، دل و دماغ سے محو ہو جاتی۔

اس طرح میں نے تقریباً پندرہ برس اپنی بہن بھائیوں کی تربیت میں گذارے۔ میں نے اپنی دولت اور محبت بے دریغ ان پر صرف کی اس طویل مدت کے دوران میں میری کوئی چیز میری نہ تھی۔ میرا دل، میرا دماغ، میرے بازوؤں کی قوت، میرے دلوں کا پسینہ، میری راتوں کا سوچ بچار، میری ہر چیز ان کے لئے وقف تھی۔ اور میرا خیال ہے کہ میری محنتیں رائگاں نہ گئیں۔ مجھے اپنی قربانیوں کا جو صلہ ملنا چاہئے تھا وہ ملا۔ یعنی ان سب بچوں نے میری شفقت اور محبت کے سہارے اپنی یتیمی کا زمانہ یتیمی کا احساس کئے بغیر گذار دیا۔ وہ سب پروان چڑھے۔ بڑے ہوئے، جوان ہوئے، بہترین تربیت پائی، اچھی سے اچھی تعلیم حاصل کی، لڑکے فارغ التحصیل ہو کر صاحب روزگار ہوئے اور زندگی کے وسیع میدان میں اپنی لیاقتوں کے اعتبار سے بہت اچھے مقامات پر فائز ہوئے۔ لڑکیاں بہترین نسوانی محاسن سے آراستہ ہو کر مناسب اور ذی وقار گھرانوں میں بیاہی گئیں اور اپنے اپنے گھر کو سدھاریں۔

میری زندگی کا ایک اہم مقصد پورا ہو گیا۔ میں اس منزل پر پہنچ گیا جو پندرہ برس تک میرا مطمح نظر بنی رہی تھی۔ مجھے اس خواب کی تعبیر مل گئی جو پندرہ برس پہلے میری آنکھوں نے دیکھا تھا۔ مجھے اس شاندار کامیابی پر خوشی ہوئی بے اندازہ خوشی ہوئی۔ لیکن آہ کامیابی اور فتحمندی کا سیلاب اپنے جلو میں تباہیوں اور بربادیوں کو بھی لئے ہوئے تھا۔ خوشی کے پھولوں کے ساتھ غمگینی کے کانٹے بھی تھے۔ مسرت کی سرور انگیز شراب میں رنج و ملال کے تلخ قطرے بھی شامل تھے۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب

رہے ہے۔ لیکن مجھے اس کامیابی پر مبارکباد دینے والا کون تھا؟ میرے غیر آباد گھر کی ویرانی میرے خالی مکان کا ہیبت ناک سناٹا، اجڑے ہوئے بام ودر، سنجیدہ ستون خاموش دالان، وسیع اور اداس صحن۔ گھر میرے لئے جہنم ہوگیا۔ میں اپنے وقت کا زیادہ حصہ گھر سے باہر گزارنے لگا۔ لیکن باہر بھی جی نہ لگتا۔ دوستوں کی صحبت میں تھوڑی دیر دل بہلتا۔ مگر مستقل سکون حاصل نہوتا۔ کاروباری مصروفیتوں سے وحشت ہوتی، مطالعے سے دل اٹھتا، طبیعت کبھی نہایت بے قرار ہوکر غیر معمولی طغیانیاں پیدا کرلیتی اور کبھی بالکل سرد ہوکر یخ بستہ ہوجاتی۔ توازن نہ رہا، اطمینان نہ رہا، راحت نہ رہی، کچھ نہ رہا۔ زندگی بے مزہ ہوگئی +

بات یہ تھی کہ محبت میری سرشت میں داخل ہوگئی تھی۔ میری فطرت کا لازمی عنصر بنگئی تھی۔ جس طرح ایک شرابی شراب پئے بغیر نہیں رہ سکتا، ایک شاعر شعر کہنے سے باز نہیں آسکتا۔ اور ایک رہزن چوری کرنے اور انسانوں کے خون سے اپنی تلوار کو رنگنے پر مجبور ہے، اسی طرح میں بھی محبت کئے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ مجبور تھا کہ اپنے دلی جذبات کو کسی کے ساتھ وابستہ رکھوں۔ یہ میری زندگی کا سہارا تھا، میرے جینے کا بہانہ تھا۔ اس کے بغیر میرے دن رات بے لطف تھے، بے کیف تھے +

قلب ودماغ کی یہ کیفیت بڑھتی گئی، بڑھتی گئی تاآنکہ نسیمہ سے میری ملاقات ہوئی وہ خوبرو ہونے کے ساتھ ساتھ پاکیزہ خو بھی تھی۔ اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مجھے اس کے ساتھ شدید محبت ہوگئی۔ میرا دل محبت کی پیاس سے بیتاب تھا۔ تڑپ رہا تھا اور اس روح فرسا تشنگی کو بجھانے کے لئے ایک حسین و نوجوان عورت کی محبت کا چشمہ کوثر و تسنیم کا حکم رکھتا تھا۔ بہت جلد ہم دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے میرے تنفس میں جان پڑگئی، میری محبتیں پھر شادکام نظر آنے لگیں۔ اور میری امنگوں اور آرزوؤں کا سبزہ زار پھر لہلہانے لگا +

شادی کے بعد کا زمانہ پاکیزہ ترین مسرت کا زمانہ تھا۔ شاید جنت تھوڑے دنوں کے لئے زمین پر اتر آئی تھی۔ اور میرے گھر میں مقیم ہوگئی تھی۔ یا آسمان کے معصوم فرشتوں نے اپنی ابدی زندگی کے چند لمحے مجھے مستعار دیدیئے تھے۔ میں ایک نوشگفتہ پھول کی طرح شاداب تھا اور چاندنی کی طرح مسرور و مطمئن۔ میری آواز میں نغمہ تھا۔ میری آنکھوں میں ہنسی تھی۔ میں گویا زندگی کی اس منزل سے گذر رہا تھا، جہاں بچپن ختم ہوتا ہے اور جوانی شروع ہوتی ہے۔

لیکن یہ عہد مسرت زیادہ طویل نہونے پایا تھا کہ مجھے پھر ایک شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ ہماری شادی کے بعد وقت گزرتا گیا، گزرتا گیا، یہاں تک کہ تین سال ختم ہوگئے۔ لیکن ہماری گودیں خالی تھیں۔ ہم ایک بچے کے لئے، چاند کی طرح روشن اور پھول کی طرح مسرور بچے کے لئے ترستے رہے اور پھر مجھے یقین دلایا گیا کہ میری بیوی میں ماں بننے کی صلاحیت مفقود ہے۔ اس اطلاع سے تسنیمہ کو جو رنج پہونچا وہ ناقابل بیان ہے لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ میری پھر وہی حالت ہوگئی جو شادی سے پہلے تھی۔ وہی زندگی سے بیزاری، کاروباری مشاغل سے نفرت، دوستوں کی صحبت سے گریز، گھر سے وحشت، اپنے آپ سے وحشت، ہر چیز سے وحشت۔ مکان پر رہتا تو درودیوار کاٹ کھانے کو دوڑتے، باہر جاتا تو اس انسانوں سے بھری دنیا میں کوئی ہمدرد اور دمساز نظر نہ آتا۔ جو لمحے بیوی کی معیت میں گزرتے وہ مایوس نگاہوں اور سرد آہوں سے لبریز ہوتے۔

اس زمانے میں میری سب سے بڑی ضرورت ایک حسین و گل اندام بچہ تھا۔ میں اپنی تمام آرزوئیں اور امنگیں اپنے محبت سرشت قلب کے سارے جذبات ایک ننھے سے ہنس مکھ بچے کے ساتھ وابستہ کر دینا چاہتا تھا۔ اگر میں کہیں کسی خوب صورت اور تندرست و توانا بچے کو کھیلتے ہوئے دیکھتا تو میرے بازوؤں میں ایک عجیب قسم کی بے چینی محسوس ہوتی۔ دل

بے اختیار یہ چاہتا کہ دوڑ کر اس بچے کو اٹھالوں، کلیجے سے لگا کر خوب بھینچوں اور پیار کروں اور پھر کبھی اپنی آغوش سے جدا نہ کروں۔ اکثر مایوسی کے عالم میں یہ خواہش دل میں پیدا ہوتی کہ کاش وہ چھوٹے بھائی بہن جنکو پال پوس کریں نے بڑا کیا ہے۔ پھر کسی طرح بچے بنجائیں، اور میں پھر ان کو گود میں اٹھائے پھروں۔ پھر ان کی پرورش کروں، پھر ان پر اپنی محبتیں نثار کروں۔ میری اس حالت نے یہاں تک طول کھینچا کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اگر میرے بازو ایک بچے سے خالی رہیں گے تو میرا جسم خاکی بھی جان سے خالی ہو جائے گا۔

لیکن زندہ تو بہر حال رہنا ہی تھا۔ پھر بچہ کہاں سے آتا۔ اس کی بھی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ میرا چھوٹا بھائی عقیل ان پانچ بچوں میں سب سے بڑا تھا جو باپ کے مرنے پر میری سرپرستی میں آئے تھے۔ وہ بہت جلد لکھ پڑھ کر اپنے قدموں پر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کی شادی میری شادی سے تین سال پہلے ہوگئی تھی گویا اسوقت اس کے بیاہ کو چھ برس ہو چکے تھے اور اب وہ تین ننھے ننھے بچوں کا باپ تھا۔ بیوی کے مشورے سے یہ طے پایا کہ ہم اس کے سب سے چھوٹے بچے جمیل کو لے لیں اور اسے اپنے آغوش کی زینت اور اپنے دلوں کی ٹھنڈک بنائیں۔ عقیل اسپر راضی ہوگیا، لیکن اسکی بیوی یعنی میری بھاوج نے یہ شرط لگائی کہ میں اپنی جائداد جمیل کے نام منتقل کردوں۔ میرے نزدیک ان حالات میں جائداد کی کیا قیمت ہوسکتی تھی۔ میں نے بغیر کسی پس و پیش کے تقریباً اپنی ساری جائداد جمیل کے نام لکھدی۔ میں جمیل کو اپنے گھر لے آیا۔ نسیمہ نے اس کی پرورش بالکل اس طرح شروع کی گویا وہ اس کا اپنا بچہ ہے۔ وہ ہمارے گھر کی رونق بنکر آیا۔ اس کے دم سے ہماری اجڑی ہوئی گودیاں آباد ہوئیں۔ ہمارے سینے مسرت کی روشنی سے پرنور ہوئے +

جمیل ہماری محبت کی گرم آغوش میں پلتا رہا۔ اس نے گود سے اتر کر چلنا سیکھا پھر وہ اس لائق ہوا کہ ہر وقت ابا ابا کہکر مجھ سے باتیں کیا کرے اور ایک وہ دن آیا جب اس نے ایک شفیق استاد کی نگرانی میں اپنی تعلیم کی ابتدا کی۔ اب وہ چھ سات سال کا ہوگیا

تھا۔ اس نے میرے گھر میں ہوش سنبھالا تھا۔ وہ مجھے اپنا باپ تصور کرتا تھا اور مجھے بھی یہ بات شاذ و نادر ہی یاد آتی تھی کہ وہ حقیقت میں میرا بیٹا نہیں بھتیجا ہے ۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ اسکو قدرت کی ستم ظریفی کہوں یا نوازش بے جا، کہ اولاد کی طرف سے ان تمام مایوسیوں کے بعد ایک روز میری بیوی نے مجھے یہ خبر سنائی کہ وہ ایک بچے کی ماں ہونیوالی ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ یہ بات معلوم کرکے مجھ پر کون سی کیفیت طاری ہوئی۔ خوشی و مسرت کی یا رنج و ملال کی، حیرت و استعجاب کی یا غم و غصہ کی، شاید وہ ان سب کا مجموعہ تھی۔ ہاں اتنا خوب یاد ہے کہ جس دن میری لڑکی سلیمہ پیدا ہوئی اُسدن میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھکر گھنٹوں ہنستا تھا اور خوشی کے مارے میرے حواس درست نہ تھے ۔

سلیمہ ابھی زیادہ بڑی نہوئی تھی کہ میری بھاوج یعنی جمیل کی ماں نے ہم کو، مجھے اور میری بیوی کو الزام دینا شروع کیا کہ اب ہم جمیل کی طرف سے بے پرواہ ہوگئے ہیں ہماری محبت تمام و کمال سلیمہ کیطرف وقف ہوکر رہ گئی ہے اور اب ہمارا گھر جمیل کے رہنے کے لیے مناسب مقام نہیں ہے۔ میں اپنے خالق کو گواہ بناکر کہتا ہوں کہ یہ ایک بہتان تھا۔ ایک ناپاک تہمت تھی۔ ہمارا گناہ صرف اس قدر تھا کہ ہم نے سلیمہ کو بالکل جائز طور پر اس محبت و شفقت میں برابر کا شریک بنایا تھا جس کا تنہا مالک اب تک جمیل رہا تھا۔ میں نے ابتدا میں اپنی شریر بھاوج کی باتوں پر دھیان نہ دیا۔ لیکن جب اسکا شوہر یعنی عقیل بھی اُس کا ہمنوا ہوگیا تو معاملے نے نازک صورت اختیار کرلی۔ (آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ روپیہ ان نادانوں کی نیتوں کو خراب کر دیگا) انھوں نے چاہا کہ جمیل کو واپس لے لیں۔ میں نے انکار کر دیا لیکن جب ان کا تقاضہ شدید ہوا اور بدمزگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا تو میں مجبور ہوگیا میں نے اپنی تقدیر کے آگے سر تسلیم خم کرکے یہ صدمہ بھی برداشت کرنا گوارا کیا اور ایک دن اپنے کلیجے پر پتھر رکھکر جمیل کو اوس کے

والدین کے حوالے کر دیا +

سلیمہ کے بعد خدا نے مجھے دو لڑکے اور عطا کئے۔ اب میں اپنے تین بچوں کی پرورش میں اپنی زندگی کے دن گذار رہا ہوں۔ میں نے دوسرے بچوں پر اپنی دولت اور اپنی محبت صرف کی تھی! دولت تو اب رہی نہیں۔ صرف ایک محبت ہے۔ اور وہ محبت بھی بہت کمزور ہو چکی ہے۔ اس کی قوت دوسروں پر صرف ہو چکی ہے اور اس کا رس چوسا جا چکا ہے۔ لیکن میرے پاس اپنے بچوں کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں آہ، میرے بچوں کی قسمت!!

آسمانی لوریاں

روز روشن جا چکا، ہیں شام کی تیاریاں
اڑ رہی ہیں آسماں پر زعفرانی ساریاں

شام رخصت ہو رہی ہے رات کا منہ چوم کر
ہو رہی ہیں چرخ پر تاروں میں کچھ سرگوشیاں

جلوے ہیں بیتاب پردوں سے نکلنے کے لئے
بن سنور کر آ رہی ہیں آسماں کی رانیاں

نوعروس شب نے پہنا ہے لباس فاخرہ
آسمانی پیرہن میں کہکشانی دھاریاں

کارچوبی شامیانے میں رچی بزم نشاط
ساز نے انگڑائی لی، بجنے لگی ہیں تالیاں

لاجوردی فرش پر ہے مشتری زہرہ کا رقص
نیل تن کرشن کے پہلو میں مچلتی گوپیاں

دست و پا کی نرم خوش آہنگ ہلکی جنبشیں
یا فضا میں ناچتی ہیں گنگناتی بجلیاں

سرمدی نغمات سے ساری فضا معمور ہے
نطق رب ذوالمنن ہیں رات کی خاموشیاں

نیند سی آنکھوں میں آتی ہے جھکا جاتا ہے سر
سن رہا تھا دیر سے میں آسمانی لوریاں

غزل

تجھے کس سے اے دل وفا کی پڑی ہے
انھیں چاہ کے نام سے دشمنی ہے

بھلی دلکشی ہے بھلی دلبری ہے
تمھیں میرے دل کی لگی دل لگی ہے

زباں سے ادا کیا ہو توصیف اُن کی،
جنھیں بات اچھی بھی میری بری ہے

ہوئے دوست تھے جس کی الفت میں دشمن
وہ دشمن سو اب مائل دوستی ہے

حقیقت کو پہونچا ہو زاہد، تو سمجھے،
بتوں میں خدائی کسے دیکھتی ہے

جلاتی ہے دل اور بھی سرد مہری
پھر اس سے تمھاری جفا ہی بھلی ہے

کچھ اے چارہ گر ہم کو دیکر سُلا دے
یہ حکمی علاجِ غمِ زندگی ہے

محبت میں آنکھوں پہ پردے پڑے ہیں
برائی بھلائی کسے سوجھتی ہے

مرا حلق تر آبِ خنجر سے کیجیے،
بجھانی اگر موت کی تشنگی ہے

کچھ ایسی کٹی رات بیمارِ غم کی
کہ غیروں میں گھر گھر سحر سے خوشی ہے

کہاں تیرے اشعار میں اشک جدت
نئی بوتلوں میں پرانی بھری ہے؛

حیدر علی

انگریزوں سے پہلی جنگ

۱۷۶۷ء سے تا ۱۷۶۹ء

تاریخ کی کتابوں میں یہ جنگ میسور کی پہلی جنگ کے نام سے موسوم ہے۔ حیدری فتوحات اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھکر میسور کے آس پاس کی تمام ریاستیں رشک کرتی تھیں، انگریزوں کو خوف تھا کہ کہیں یہ بڑھتی ہوئی طاقت اُن کو ہندوستان سے باہر نہ کر دے۔ نظام علی خاں کو الگ اس کا ابھرنا شاق گذر رہا تھا۔ چنانچہ میسور سے مادھوراؤ کے واپس جانے کے بعد ان طاقتوں نے یہ سمجھ لیا کہ حیدر علی کی طاقت بالکل شکستہ ہوگئی ہے۔ اور اس کو ختم کر دینے کا یہ موقع اچھا ہے۔ نظام علی خاں نے انگریزوں سے اتحاد کر لیا اور ان کے ساتھ ایک مرہٹی سردار بھی دس ہزار سپاہیوں کیساتھ مل گیا اور یہ متحدہ فوجیں علاقہ میسور کی طرف بڑھیں، بعض متعصب انگریز مورخین کا خیال ہے کہ جنگ کی ابتدا حیدر علی نے کی ورنہ انگریزوں اور نظام الملک کی کبھی یہ خواہش نہ تھی کہ میسور پر چڑھائی کیجائے۔ یہ متحدہ فوجیں صرف مدافعت کر رہی تھیں۔ لیکن ان متعصب مورخین کی بدقسمتی کو کیا کیجئے کہ قدرت نے خود انھیں کی جماعت میں چند ایسے نفوس پیدا کر دیئے جنکی تحریریں ان غلط دعووں کی تردید کے لئے کافی ہیں۔

مورخ ڈیلافوس اپنی تاریخ ہند صفحہ ۱۷۶ پر لکھتا ہے:-

"فتوحات حیدری سے خوف زدہ ہو کر نظام الملک اور مرہٹوں نے انگریزوں سے اتحاد کیا اور کرنل اسمتھ کے ماتحت یہ متحدہ فوجیں بغیر کسی وجہ کے میسور پر بڑھیں"۔

دوسرا انگریز مورخ ٹامپسن اپنی تاریخ ہند صفحہ ۲۶۸ پر لکھتا ہے

"نظام الملک کو ہمیشہ حیدر علی پر رشک رہا اسکو حیدر علی سے اسدرجہ نفرت تھی کہ وہ اس کو غاصب سلطنت سمجھتا رہا لہذا انگریزوں مرہٹوں اور نظام الملک نے متحد ہو کر حیدر پر چڑھائی کی۔"

ان بیانات کے علاوہ یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ حیدر علی جسے ابھی مرہٹوں سے کافی نقصان ہوا تھا، جس کی قوت منتشر ہو رہی تھی، کیسے یہ جرات کر سکتا تھا کہ وہ انگریزوں اور اس کے حلیفوں کے ساتھ جنگ کرے۔ اگر اس میں اتنی طاقت ہوتی تو کیا ہمارا یہ بہادر سپہ سالار تحفہ تحائف دیکر مرہٹوں سے صلح کرتا اس لئے انگریز مورخین کا یہ خیال کہ ابتدا حیدر علی نے کی تعصب اور ناواقفیت پر مبنی ہے۔

بہرحال یہ متحدہ فوجیں علاقہ بالاگھاٹ پر بڑھیں، حیدر علی نے بھی اپنی فوجیں مدافعت کی غرض سے بڑھائیں، اور اس غرض سے کہ متحدہ فوجوں کو رسد نہ ملے ملک کو لوٹ کر فوجوں پر شبخون مارنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے اسوقت یہ چال چلی کہ حیدر علی کی توجہ ہٹانے کے لئے علاقہ بمبئی سے ایک فوج ساحل منگلور پر اتار دی تاکہ وہ بڑھ کر بدنور پر قبضہ کرے۔ نواب کو اسکی خبر ہو گئی، اس نے ٹیپو سلطان کو اس طرف روانہ کر دیا اور بعد میں محمد علی کمیدان کو مشرقی محاذ سپرد کر کے خود بھی مغربی محاذ کیطرف بڑھا اور وہاں باپ بیٹے نے ملکر انگریزی فوج کو نہایت سراسیمگی کی حالت میں اپنا تمام سامان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مشرقی محاذ سے ٹیپو سلطان اور حیدر علی کے چلے جانے کے سبب سے اتحادیوں کی فوجوں کو پیشقدمی کا کافی موقع مل گیا تھا اور انھوں نے وانمباڑی، ترپاتور کولار اور ہوسکوٹہ وغیرہ فتح کر لیا تھا۔ اسی اثنا میں حیدر علی مغربی محاذ کو فتح کر کے مشرقی محاذ پر آ گیا۔ یہاں ٹیپو سلطان، حیدر علی، محمد علی کمیدان نے مختلف سمتوں سے انگریزی فوج پر شبخون مارنا شروع کر دیا۔ اور باہر سے رسد کا آنا مشکل کر دیا۔ جو رسد آتی تھی یہ لوگ رستہ ہی میں لوٹ لیتے تھے۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ تمام فوج منتشر ہو گئی اور نظام الملک

نے صلح کی درخواست کی۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان ایک صلح نامہ مرتب ہوگیا۔
اس صلحنامہ کے بعد ہی حیدر علی نے گورنر مدراس کو ایک خط لکھا جس میں محمد علی کی دغابازی کا حال درج تھا۔ مگر بجائے اس کے کہ گورنر اس سے نصیحت حاصل کرتا اس نے کرنل ووڈ کے ماتحت بنگلور پر قبضہ کرنے کے لئے ایک فوج روانہ کردی۔ حیدر علی نے سب سے پہلے محمد علی کا خاتمہ کر دینا مناسب سمجھا۔ چنانچہ فوراً ہی اس نے اپنی فوجوں کو پائیں گھاٹ پر بڑھنے کا حکم دیدیا۔ حیدری افواج نے تھوڑے ہی عرصہ میں پائیں گھاٹ کو لوٹ کر ویران کر دیا۔ اور آس پاس کے تمام علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف ٹیپو سلطان کی فوجیں نواح مدراس میں لوٹ مار کرتی ہوئی قلعہ سینٹ جارج پر پہونچ گئیں۔ اب انگریزوں کی آنکھیں کھلیں، مگر انھوں نے دھوکے سے ٹیپو کو واپس کر دیا۔ اسوقت کرنل ووڈ (wood) بنگلور فتح کرنے کے ارادہ سے چل چکا تھا، حیدر علی نے اسکو راستہ ہی میں روک لیا اور حیدری افواج نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مگر عین وقت پر میجر فٹز جیرلڈ (Fitz gerald) نے پیچھے سے آکر کرنل ووڈ کی فوج کو تمام دکمال برباد ہونے سے بچالیا۔ اب حیدر علی کو معلوم ہوا کہ یہ سوداگر آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں، اور یہ رفتہ رفتہ ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ خود نواب حیدر علی ایک جرار فوج لیکر روانہ ہوا۔ راستے میں اسے کہیں کہیں مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن نہایت آسانی سے سب کو شکست دیتا ہوا اور شہروں کو تاخت وتاراج کرتا ہوا مدراس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس فوج کشی سے مدراس کا گورنر بہت پریشان ہوا۔ اس نے صلح کی درخواست کی، حیدر علی نے صلح پر رضامندی ظاہر کی مگر محمد علی کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنے سے انکار کر دیا، اسپر صلح ملتوی ہوگئی۔ اور حیدر علی نے سفیر کو یہ کہکر رخصت کر دیا کہ میں مدراس خود آرہا ہوں۔ سفیر کو روانہ کرنے کے بعد اس نے اپنی بے باک جرات وہمت سے جس کے لئے وہ ممتاز تھا۔ وہ تدابیر اختیار کیں کہ مدراس گورنمنٹ پر لرزہ طاری ہوگیا

وہ خود چھ ہزار چیدہ سوار لیکر روانہ ہوا۔ اور ۳½ دن میں ۱۳۰ میل کا دھاوا کرکے کوہ سینٹ ٹامس پر جا پہونچا۔ جو مدراس سے پانچ میل پر واقع ہے۔ انگریزوں نے فوراً سراطاعت خم کر دیا۔ حیدر علی نے صلح کے لئے بہت سی اہم شرائط پیش کیں جو فوراً منظور کر لی گئیں اور ۲۹ مارچ ۱۷۶۶ء کو اس صلحنامہ پر دستخط ہو گئے۔ اور اس کی یادگار میں قلعہ سینٹ جارج مدراس کے دروازے پر حیدر علی کے حکم سے ایک کتبہ لگایا گیا جس کے متعلق سر الفرڈ لائل لکھتا ہے:۔

"حیدر علی نے اپنی فتح کی یادگار مدراس میں اس طرح چھوڑی کہ اس کے حکم سے انگریزوں نے ایک تصویر قلعہ سینٹ جارج کے دروازے پر کندہ کرائی جس میں بتلایا گیا کہ گورنر مدراس اور ممبران کونسل حیدر علی کے آگے اپنے زانوؤں پر بیٹھے ہیں اور حیدر علی ایک ممبر کی ناک پکڑ کر کھینچ رہا ہے جس میں سے اشرفیاں گر رہی ہیں۔ کرنل اسمتھ ایک طرف صلحنامہ ہاتھ میں لئے اپنی تلوار توڑ کر رکھ رہا ہے۔"

اس موقع پر حیدر علی نے جس رواداری کا ثبوت دیا دنیا کی تاریخ بمشکل اسکی نظیر پیش کر سکے گی۔ اور حیدر علی کی یہ رواداری اس قابل ہے کہ اس پر مسلمان جس قدر ناز کریں بجا ہے۔ اس نے دنیا کے آگے بہادری کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اس وقت انگریزوں کا وجود و عدم اس کے چشم و ابرو کی ایک ادنیٰ جنبش پر منحصر تھا۔ وہ اگر چاہتا تو اپنے شکست خوردہ حریفوں کے وجود کو صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیتا اور جنوبی ہند ہمیشہ کے لئے اندرونی کشمکش سے نجات پا جاتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور باوجود فاتح ہونے کے اس نے اپنے حریفوں کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کی ایک شریف بہادر سے امید کی جا سکتی تھی۔ وہ ان کے تمام مقبوضات کو واپس کر دیتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے دوستی کا حلف لیکر بغیر کسی معاوضہ کے یوں ہی پلٹ جاتا ہے۔ لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان

اس صلحنامہ پر جتنا ماتم کرے بجا ہے کہ باوجود اس جنگی فراست اور دانائی کے ہمارے اس نامور ہیرو نے ایک ایسی خاموش غلطی کی جس کے باعث آج ہندوستان غلام ہے، لیکن اگر اس وقت کے حالات پر ایک غائر نظر ڈالی جائے اور جن حالات میں حیدر علی نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی ہے ان کا مطالعہ کیا جائے تو اس غلطی کو قابل معافی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ اسوقت حیدر علی چاروں طرف سے دشمنوں کے نرغے میں تھا، مرہٹوں کو یہ فکر دامنگیر تھی کہ ایک اسلامی طاقت کا آغاز ان کے سدراہ ہے، نظام الملک کو حسد تھا کہ حیدر علی کا وجود اس کے لئے پیغام مرگ ہے اس لئے حیدر علی کو ایک حلیف کی ضرورت تھی۔ جو اڑے وقت پر کام آئے اور اس نے اس صلح نامہ کے ذریعے ایک حلیف پیدا کر لیا۔ گو اس نئے حلیف سے وہ کبھی فائدہ نہ اٹھا سکا اور ہمیشہ اپنی عادت کے موافق اس قوم نے اپنے محسن اور مربی کے ساتھ دغا کی بلکہ اس کو سرے سے مٹا دینے ہی کی فکر میں لگے رہے۔

نواب حیدر علی کے فتوحات اور صلحنامہ مدراس کی خبر جب پونا پہونچی تو مادھوراؤ تقریباً ۲ لاکھ سپاہیوں کے ساتھ میسور پر حملہ آور ہوا۔ نواب حیدر علی نے اسوقت بموجب عہدنامہ مدراس انگریزوں سے مدد طلب کی مگر انہوں نے مدد دینے سے انکار کر دیا کیونکہ انگریزوں کو یقین تھا کہ اسوقت حیدر علی کی خیر نہیں۔ آخر کار حیدر علی بھی اپنی فوج لے کر مقابلہ کے لئے آگے بڑھا۔ ایک سخت جنگ کے بعد اسکو شکست ہوئی اور حیدری فوج قریب قریب کل کٹ گئی۔ اور جو باقی تھی وہ بھاگ نکلی۔ حیدر علی حیران اور پریشان تھا کہ ہیبت جنگ ایک تازہ دم لشکر لیکر آ گیا۔ لیکن حیدر علی نے پیچھے ہٹنا ہی مناسب سمجھا اور وہ بنگلور چلا گیا۔ وہاں سے اس نے صلح کی کوشش کی۔ مگر مادھوراؤ نے ایک کروڑ روپیہ طلب کیا دراس کے ساتھ اور کچھ ایسی ہی سخت شرطیں لگائیں کہ حیدر علی کو سوائے جنگ کے اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ مرہٹی فوجیں برابر سرنگا پٹم کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھیں اور انھوں نے تقریباً تمام شمالی اور شرقی اضلاع فتح کر لئے تھے۔ یہاں تک کہ منگلور سے ۳۰ میل کے

فاصلہ پر چگل کے مقام پر آپہونچے۔ یہاں مادھوسخت بیمار ہوگیا اور پونا واپس چلا گیا اور اپنی فوج کو ترمک راؤ کے سپرد کر گیا۔ اس نے آس پاس کے راجاؤں کو بھی بلا لیا اس طرح مرہٹی فوج کا یہ طوفان بڑھتا ہوا سرنگاپٹم کے قریب پہونچ گیا۔ اسوقت اپنی خداداد جرات سے کام لیکر حیدر علی نے مقابلہ کیا۔ مگر مٹھی بھر فوج ٹڈی دل لشکر کا کہاں مقابلہ کر سکتی تھی، آخر کار حیدر علی کو سخت شکست ہوئی، اور اس کے بہت سے وفادار افسر مارے گئے جب حیدر علی نے دیکھا کہ قسمت پلٹ چکی ہے، فوج منتشر ہو چکی ہے اور سرداران فوج میں سے کسی کا پتہ نہیں ہے تو وہ تن تنہا سرنگاپٹم روانہ ہو گیا۔ سرنگاپٹم پہونچکر حیدر علی نے اپنے آنے کی کسی کو خبر نہیں کی اور پوشیدہ طور سے ایک لشکر جمع کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں اس نے ۴۰ ہزار سپاہی اپنے گرد جمع کر لیئے اور پھر کھلے میدان میں ترمک راؤ سے مقابلہ کی ٹھانی۔ حیدر علی، محمد علی کمیدان اور ٹیپو سلطان نے مختلف سمتوں سے حملہ کرکے مرہٹی فوجوں کو میدان سے بھگا دیا۔ اور اب ترمک راؤ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ پھر سرنگاپٹم پر بڑھے۔ اس لیئے اب اس نے بائیں گھاٹ کا رخ کیا اور اس کے اطراف وجوانب میں لوٹ مار شروع کر دی۔ محمد علی کمیدان اور ٹیپو برابر ان کے تعاقب میں لگے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ایک خونریز جنگ کے بعد مرہٹوں کو پسپا کر دیا۔ مرہٹوں نے پونا سے امداد طلب کی، مگر وہاں مادھو راؤ کے مرجانے کی وجہ سے خود اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے مدد نہ آسکی اور ترمک راؤ کے دل کی حسرت دل ہی میں رہی۔ اور پونا واپس چلا گیا۔

حیدر علی کی مرہٹوں سے یہ جنگ بہت خطرناک تھی اور کسی کو یہ امید نہ تھی کہ مرہٹے حیدر علی سے شکست کھا جائیں گے، مرہٹوں کے پاس کئی لاکھ سپاہی تھے، اور حیدر علی کے پاس چالیس پچاس ہزار۔ مگر قدرت نے حیدر علی کو دو ایسے سپہ سالار مہیا کر دیئے جن کی بہادری اور حکمت عملی نے مرہٹوں کے ٹڈی دل فوج کا خاتمہ کر دیا۔

مختلف موقعوں پر محمد علی کیمدان نے وہ بہادری دکھائی کہ مرہٹہ جیسے بہادر سپاہیوں کے دانت کھٹے کر دیئے وہ جانتا تھا کہ اگر اس وقت اس کی طرف سے سستی کی گئی تو حیدر علی کی سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائیگا۔ چنانچہ کسی موقع پر اس نے اپنی جان کی پرواہ نہ کی اور مرہٹوں کو شکست دے کر اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ایک وفادار سپہ سالار اپنے آقا کے لئے کیا کچھ کر سکتا ہے، کاش ٹیپو سلطان کو بھی ایسے چند وفادار سپہ سالار مل جاتے۔ تو آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔

مرہٹوں کے پونا واپس چلے جانے کے بعد جب حیدر علی نے دیکھا کہ سلطنت کا خزانہ خالی ہو چکا ہے تو اسے نئے فتوحات کی سوجھی۔ نیز بعض راجاؤں نے جو پہلے حیدر علی کے مطیع و فرمانبردار تھے، دوران جنگ میں مرہٹوں کی بہت مدد کی تھی۔ اس لئے حیدر علی ان کو کافی سزا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے تھوڑے ہی دنوں میں کورگ (۱۷۷۳ء) ملیبار (۱۷۷۳ء) بلاری (۱۷۷۵ء) گٹی (۱۷۷۶ء) تمام علاقے قبضے میں کر لئے۔

جس وقت حیدر علی ان علاقوں کو تاخت و تاراج کر رہا تھا پونہ میں واقعات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اور نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ رگھوبا پونا چھوڑ کر حیدر علی کے پاس آیا اور طالب امداد ہوا اور اس کے عوض میں وہ تمام علاقے جو دریائے کرشنا سے جنوب کی طرف مرہٹوں کے قبضے میں تھے، حیدر علی کو دیدیئے اسی اثناء میں رگھوبا کی فوج میں پھوٹ پڑ گئی۔ جس کی وجہ سے رگھوبا کی اسکیم پایۂ تکمیل تک نہ پہونچنے پائی اور وہ گجرات چلا گیا۔ چونکہ رگھوبا کی کارروائیوں میں انگریزوں کا ہاتھ کام کر رہا تھا اس لئے دوسری طرف نانا فرنویس انگریزوں کو ملک سے نکالنے کی فکر میں تھا۔ اس نے اس سلسلہ میں حیدر علی سے بھی مدد کی درخواست کی مگر حیدر علی نے اسکا کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ اس کی اطلاع انگریزوں کو کر دی۔

بعض ہندو مورخین حیدر علی کے اس طرز عمل سے ناخوش ہیں اور اس پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ اس نے نانا فڑنویس کا یہ راز انگریزوں پر ظاہر کر کے اپنے مدبر اور محب الوطنی کا کچھ اچھا نمونہ نہیں پیش کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی معترضین کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ سنہ ۱۷۶۱ء سے سنہ ۱۷۷۱ء تک مرہٹوں نے چار دفعہ میسور پر حملہ کیا اور ہر بار ان کی یہی خواہش رہی کہ حیدر علی کو کسی طرح صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر دیا جائے، اور اگر ان موقعوں پر محمد علی اور ٹیپو جیسے وفادار سپہ سالار حیدر علی کو نہ ملتے تو ان کے مٹ جانے میں کوئی کسر بھی باقی نہ تھی۔ نیز مختلف موقعوں پر حیدر علی نے مرہٹوں سے صلح کی درخواست کی مگر ہمیشہ ان مغرور مرہٹوں نے اس کی درخواست کو ٹھکرا دیا۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے حیدر علی نے اگر اس راز کو جوش انتقام سے انگریزوں پر ظاہر کر دیا تو اس پر کوئی الزام نہیں آتا۔ اس کے علاوہ اس وقت تک حیدر علی اپنے ان مکار حریفوں کو اپنا حلیف سمجھتا تھا۔ اور گو انگریزوں نے مختلف موقعوں پر اس کے ساتھ دغا کی۔ پھر بھی وہ اپنی طرف سے کوئی زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان حالات میں حیدر علی نے جو کچھ کیا وہ اقتضائے وقت اور مجبوری کی وجہ سے تھا۔

حیدر علی سے انگریزوں کی دوسری جنگ

صلح نامہ مدراس کے بعد جب مرہٹوں نے میسور پر کئی حملے کئے اور حیدر علی کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا ہوا۔ تو اس نے بموجب عہدنامہ مدراس انگریزوں سے مدد طلب کی۔ مگر انگریزوں نے جس ایمانداری سے اس عہد کو نبھایا۔ اسے خود انگریزی مورخین کی زبانی سنیئے۔ انگریزی مورخ ڈی لافوس اپنی تاریخ ہند میں صفحہ ۱۸۰ پر لکھتا ہے:-

"جب آزمائش کا وقت آیا تو انگریزوں نے اپنا عہد پورا نہیں کیا۔"

دوسرا انگریز مورخ سنکلیر لکھتا ہے :-

"جب حیدر علی کو ضرورت تھی تو عہد نامے کے بموجب انگریزوں کو مدد دینی چاہئے تھی۔ مگر انہوں نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا"

ایک اور انگریز مورخ لکھتا ہے ۔

"انگریزوں نے جب عہد نامہ پر دستخط کئے تو ان کا یہ ارادہ ہی نہیں تھا کہ اس پر عمل درآمد بھی کریں اور اس پر لطف یہ ہوا کہ انہوں نے نواب والاجاہ محمد علی کا علاقہ کرور بھی حیدر علی کو دیدیا تاکہ ہمیشہ ان دونوں میں چلتی رہے"

کپتان ایل جے۔ ٹراٹر سلسلہ رولرس آف انڈیا کے صفحہ ۱۰۷ پر اس عہد نامہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

"عہد نامہ کچھ ایسے الفاظ میں مرتب تھا کہ جس کے مختلف معنے ہو سکتے ہیں اور اس سے انگریزوں نے فائدہ اٹھا کر حیدر علی کو جس وقت مدد کی ضرورت تھی کمک نہیں دی اور اس طرح ایک عمدہ دوست کو دشمن بنا لیا"

(سلطنت خداداد)

غرض ہر انگریز مورخ اس کا معترف ہے کہ ہمیشہ نقص عہد ہماری جانب سے ہوا۔ اور ہم نے اپنے اس غلط طرز عمل سے ایک شریف اور بہادر حلیف کو کھو دیا۔ میسور کا سابق چیف کمشنر مسٹر ٹبورنگ اپنی کتاب حیدر علی اینڈ ٹیپو سلطان میں اس کی صراحت کرتا ہے کہ خود حیدر علی نے اپنی طرف سے ہمیشہ عہد نامہ مدراس کی پابندی کی' مرہٹوں نے کرناٹک کے علاقوں پر حملہ کرنے میں حیدر علی سے مدد مانگی تو اس نے صاف انکار کر دیا وہ اسوقت چاہتا تو انگریزوں سے انکی بدعہدی کا بدلہ لے لیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور مرہٹوں کے ارادوں کی انگریزوں کو اپنا حلیف سمجھکر اطلاع دیدی۔ مزید براں وہ انگریزوں کی جانب سے ایسے منافی عہد یا سرد مہری کا سلوک دیکھکر بھی ان سے

بگاڑنی نہیں چاہتا تھا۔ کہ اتنے میں انہوں نے ماہی کی بندرگاہ پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا یہ بندرگاہ ملیبار میں واقع تھی اور تمام ملیبار حیدر علی کی زیر حکومت تھا جس وقت انگریزی فوج نے ماہی پر چڑھائی کی اور باوجود حیدر علی کی مخالفت کے اس کے ملک سے گذری تو اسپر فرانسیسیوں نے جو اس وقت ماہی میں تھے، حیدر علی سے مدد طلب کی، اور چونکہ فرانسیسی حیدر علی کے ملک میں تھے اس لئے ان کی امداد کرنا حیدر علی کا فرض تھا

سر الفرڈ لائل اپنی تاریخ میں لکھتا ہے۔

فرانسیسیوں کی حمایت کے علاوہ حیدر علی کی دوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستان کی کمزوری کی وجہ دراصل ہندوستان کی بحری طاقت کا فقدان ہے اور بحری طاقت ہی کی وجہ سے یورپین اقوام ہندوستان پر تسلط جما رہی ہیں۔ اس خیال سے حیدر علی نے بھی بحری طاقت کا انتظام شروع کر دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ ماہی بندرگاہ حیدر علی کے لئے یورپ سے رسل و رسائل قائم رکھنے اور انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں سے سامان جنگ حاصل کرنے کے لئے ایک عمدہ بندرگاہ تھی۔ حیدر علی کو پہلے ہی سے انگریزوں سے بدظنی تھی اور جب کہ انگریزوں نے ماہی پر قبضہ کر لیا تو اس نے پوری قوت کے ساتھ انگریزوں پر حملہ کر دیا۔

(سلطنت خداداد ص۱۲۳)

مورخ ٹامپسن اس جنگ کے وجوہات میں لکھتا ہے۔

انگریزوں نے عہدنامہ مدراس کو ردی کا کاغذ سمجھ کر پھینک دیا اور جب حیدر علی کو امداد کی ضرورت تھی تو انھوں نے مدد دینے سے صاف انکار کر دیا۔ نواب محمد علی کے تمام ملک پر یہ قبضہ کر چکے تھے، جو حیدر علی کے لئے تشویش کا باعث ہوگیا۔ دوسری طرف انگریزوں نے گنٹور پر قبضہ کر لیا جس کے باعث نظام الملک بھی ان سے بگڑ بیٹھا، اور انگریزی فوج نے حیدر علی کے علاقے سے بغیر اس کی اجازت کے گذر کر ادھونی میں

بڑھنا چاہا۔ ایک طرف تو مرہٹے انگریزوں سے لڑ رہے تھے اور دوسری طرف نظام الملک آمادۂ جنگ تھا۔ ان مواقع سے حیدر علی نے فائدہ اٹھانا چاہا مگر انگریزوں نے گنٹور کا علاقہ نظام الملک کو واپس دیکر اس کو اپنی طرف ملا لیا۔ لیکن جنگ کی ابتدا اس طور پر ہوئی کہ یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ جانے سے ہندوستان میں انگریز نے تمام فرانسیسی علاقوں پر قبضہ کرکے ماہی پر بڑھے جو حیدر علی کے علاقہ ملیبار میں فرانسیسیوں کا ایک بندرگاہ تھا، حیدر علی کو فرانسیسیوں کی حمایت اور دوستی کا حق ادا کرنا لازمی تھا۔

یہی مورخ آگے چلکر لکھتا ہے۔

نواب حیدر علی سے اگر انگریز اپنا وعدہ ایفا کرتے تو وہ ان کا بہترین دوست ثابت ہوتا۔ کیونکہ اسکو انگریزوں پر کامل اعتماد تھا۔

انگریزوں کو جسوقت نانافرنویس نظام الملک اور حیدر علی کے نامہ و پیام کی خبر ہوئی تو انہوں نے بھی اپنے دو سفیر حیدر علی کے پاس بھیجے۔ مگر اس نے اسوقت ان سے دوستی کا عہد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے فوراً ماہی پر قبضہ کر لیا۔ حیدر علی بھی اپنی پوری قوت کے ساتھ کرناٹک کی طرف بڑھا۔ حیدر علی کا یہ حملہ اسقدر مہیب اور زبردست تھا کہ کرناٹک نے اس سے پہلے اس قدر فوجوں کی کثرت اور خونریزی نہیں دیکھی تھی۔ حیدری فوج نے راستہ میں معمولی لڑائیوں کے بعد ارنی، ترو تور کلوہ۔ کاویری پٹن۔ محمود بندر اور گنجی کوٹہ پر قبضہ کر لیا۔ اور خود نواب حیدر علی نے ارکاٹ کا محاصرہ کیا۔ انگریزوں نے ارکاٹ بچانے کے لئے مدراس سے جنرل سر ہیکٹر منرو اور علاقہ نظام سے کرنل بیلی کو بھیجا۔ جب حیدر علی کو اس کی خبر ملی تو وہ مقابلہ کے لئے مقام کنجی پر آ گیا۔ یہاں سے اس نے اپنے بیٹے کو پولی پور کی طرف روانہ کر دیا تاکہ وہ دونوں فوجوں کو ملنے نہ دے۔ جسوقت کرنل بیلی پولی پور پہنچا تو ٹیپو نے اس پر حملہ کر دیا دوسری طرف سے حیدر علی خود بھی آ گیا۔ دونوں نے تمام انگریزی فوج کو کاٹ کر

رکھدیا اور کرنل بیلی باقیماندہ فوج کے ساتھ اسیر ہوگیا۔ سر الفرڈ لائل اس جنگ کے متعلق لکھتا ہے:۔

ہندوستان میں اس سے بڑھ کر مصیبت انگریزوں پر اور کوئی نہیں آئی جس میں دو ہزار انگریزی سپاہ اسیر ہوگئی۔

انگریز مورخین کے بیان کے مطابق اس جنگ میں ساڑھے چار ہزار فرنگی سپاہی مقتول ہوئے۔ اور کرنل فلچر بھی اسی جنگ میں مارا گیا۔ جسوقت اس شکست کی خبر سر ہکٹر منرو کو ملی۔ تو یہ اپنی بڑی بڑی توپوں کو ندی میں پھینک کر مدراس بھاگ گیا۔ یہاں سے حیدر علی دیلور فتح کرتا ہوا ارکاٹ پہونچا۔ اور سخت جنگ کے بعد اس کا ارکاٹ پر قبضہ ہوگیا۔ یہاں اس نے ان تمام لوگوں سے جو دشمنوں سے میل جول رکھتے تھے نہایت سختی کے ساتھ انتقام لیا۔ اور اس جرم میں کئی ایک مواضعات تباہ کردیئے گئے۔ اس کے جذبہ انتقام کا پتہ اس تقریر سے چلتا ہے کہ جو اس نے ارکاٹ میں ایک دربار منعقد کرکے کی تھی۔ اسنے کہا:۔

والاجاہ محمد علی کی وطن دشمنی اور اس کی متواتر غداری سے اسقدر تنگ آگیا ہوں کہ اس دفعہ میں ساکنان کرناٹک کے حق میں غضب الٰہی کا آلہ بن کر آیا ہوں۔

مگر جب حیدر علی کا کامل طور پر قبضہ ہوگیا تو اس نے وہاں کی رعایا کے ساتھ جو سلوک کیا اسے مسٹر ڈبلیو ٹارنس ممبر پارلیمنٹ کی زبانی سنئے۔

ایک مہیب و خونریز حملہ کے بعد ارکاٹ پر ۳ / نومبر کو حیدر علی کا قبضہ ہوگیا۔ قبضہ کے بعد رعایا کے ساتھ نہایت انسانیت کا سلوک کیا گیا۔ لوٹ اور قتل و غارت قطعی طور پر روک دیئے گئے ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ امن و آسائش کے ساتھ اپنا کاروبار جاری رکھے۔ بلکہ ان ملازموں کو جو والاجاہ محمد علی کے تھے، ان کے سابقہ عہدوں پر بحال رکھا گیا۔ جو انگریزی قیدی حیدر علی کے قبضے میں آئے انھیں حیدر علی کی جانب سے روپیہ

دیا گیا کہ اپنی ضروریات مہیا کریں۔

ابھی حیدرعلی یہیں مقیم تھا کہ مدراس سے انگریزوں کا ایک وفد صلح کی درخواست لیکر آیا مگر حیدرعلی نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ

"مجھے گمان تھا کہ انگریزی قوم میں سچائی اور وفاداری ہے۔ مگر آزمائش سے اب مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ان صفات سے معرا ہے۔"

(سلطنت خداداد)

ارکاٹ کے جشن شاہانہ سے فارغ ہوکر حیدرعلی نے اپنی فوج کے ایک کثیر حصہ کو مختلف مقامات کی طرف روانہ کر دیا۔ جس نے سوائے چند ساحلی مقامات کے تمام کرناٹک پر قبضہ کر لیا۔ اور حیدرعلی خود بھی کچھ فوج لیکر ۱۰ اگست کو نواح مدراس میں پہونچ گیا۔ انگریز خوفزدہ ہوکر قلعہ اور جہازوں میں پناہ گزیں ہوگئے۔ وارن ہیسٹنگز کو جب یہ خبر ملی کہ تقریباً پورا مدراس کا علاقہ حیدرعلی کے قبضہ میں چلا گیا ہے تو اس نے جنرل سرائرکوٹ کو براہ دریا مدراس بھیجا، یہاں پہونچکر اس نے ایک فوج جمع کی اور کوہ مور سے ہوتا ہوا انڈی واش پہونچا، جہاں حیدری فوج نے کپتان فلنٹ کو محصور کر رکھا تھا۔ حیدری فوج انگریزوں کی اس نئی فوج کو دیکھکر محمود بندر چلی گئی اور یہاں انگریزوں اور حیدری افواج میں ایک خونریز جنگ ہوئی اور اس موقع پر انگریزی جہازوں نے اس شدت سے گولہ باری کی کہ حیدری فوج پیچھے کو ہٹ گئی۔ اور محمود بندر پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انگریزی جہازوں نے بھی جنگ میں حصہ لیا۔ اور چونکہ حیدری فوج اس کا جواب نہیں دے سکتی تھی، اس لئے ان کا بہت سخت نقصان ہوا اور بہت سے جانباز سپاہی مارے گئے۔ اگر حیدرعلی کے پاس بھی جنگی جہاز ہوتے یا انگریز جنگی جہازوں کو استعمال نہ کرنے پاتے تو حیدرعلی کی فتح یقینی تھی۔

انگریز اس معمولی سی فتح پر بہت مسرور تھے۔ مگر انھیں اس قدر جرأت نہیں تھی کہ

ملک کے اندر بڑھیں، کیونکہ وہاں تک جنگی جہازوں کا پہونچنا ناممکن تھا۔ اسی اثنار میں کرنل گال اور اسٹورٹ کے ماتحت بنگال سے پانچ ہزار سپاہی مع سامان حرب کے آپہونچے۔ اسوقت کرنل کوٹ اس نئی فوج کو لیکر ملک کے اندر داخل ہوا اور اس نے پولی لور میں قیام کیا حیدر علی بھی اپنی فوج لیکر آگیا اور کارزار گرم ہوگیا۔ انگریزی فوج کو شکست فاش نصیب ہوئی اور وہاں سے انہوں نے شولنگر اور آرنی کی طرف رخ کیا۔ نہایت آسانی سے ان دونوں مقامات کو فتح کرلیا۔ حیدر علی کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی وہاں پہونچا۔ مگر اس کے آنے سے قبل ہی کرنل کوٹ مدراس چلا گیا تھا۔ جہاں اس کا انتقال ہوگیا اور جنرل اسٹوٹ سپہ سالار بنادیا گیا۔

اس عرصہ میں مدراس گورنمنٹ میں رد و بدل ہوا اور انگلستان سے نیا گورنر لارڈ میکارنٹی مدراس کا گورنر مقرر ہوکر آیا۔ اس نے فوراً ہی اپنی فوج کو ناگ پٹم پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اور ایک زبردست فوج نے ناگ پٹم فتح کرکے تلچری پر چڑھائی کی۔ جہاں ٹیپو سلطان نے کاویری ندی کے قریب ان کو شکست دی اور انگریزی فوج قریب قریب کل کٹ گئی اور باقی رہی سہی اسیر ہوگئی۔ اسی اثنار میں فرانسیسی گورنمنٹ نے حیدر علی کی امداد کے لئے ایک جنگی جہازوں کا بیڑا امیرالبحر سفرن کے ماتحت بھیجدیا فرانس کے جنگی جہازات کے آجانے کیوجہ سے حیدر علی کی ہمت بڑھ گئی۔ کیونکہ انگریزوں نے اپنی جنگی جہازوں کی مدد سے اب تک بعض ساحلی مقامات پر قبضہ کر رکھا تھا۔ کڈلور میں حیدری فوجوں اور انگریزوں میں سخت جنگ ہوئی جس میں حیدر علی کو فتح نصیب ہوئی اس لئے کہ حیدری افواج خشکی کی طرف سے حملہ کر رہی تھیں اور فرانسیسی جہاز پر سے گولے برسا رہے تھے۔ یہاں سے حیدر علی ارنی گیا اسے فتح کرکے وہ ارکاٹ آگیا۔ یہاں اُس کے مرض نے زور پکڑا اور اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد یہ نامور ہیرو اس دنیا کو چل بسا۔ اسوقت ٹیپو سلطان یہاں موجود نہ تھا۔ اس لئے تاجدار میسور کی وفات کی خبر

۷ر دسمبر ۱۷۸۲ء ملکی اور جنگی مصلحتوں کی وجہ سے فوج سے اسوقت تک مخفی رکھی گئی جب تک ٹیپو سلطان ملیبار سے واپس نہ آگیا۔ اس کے آنے پر لاش سرنگا پٹم لائی گئی۔ جہاں لال باغ میں دفن کر دیگئی اور اسپر ٹیپو سلطان نے ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کیا۔

نواب حیدر علی جس زبردست شخصیت کا مالک تھا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ پونا میں مرہٹے نانا فرنویس کے ماتحت انگریزوں سے جنگ کر رہے تھے اور باوجود فاتح ہونے کے جسوقت نواب حیدر علی کی وفات کی خبر پہونچی تو انہوں نے صلحنامہ سالبی پر جسے وہ ٹھکرا چکے تھے، دستخط کر دیئے۔ حیدر علی کی وفات اور نانا فرنویس کی اس عجلت پسندی نے انگریزوں کے اکھڑے ہوئے قدم کو ہندوستان میں جما دیا۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے:-

"حیدر علی کی وفات انگریزوں کی خوش قسمتی کا باب تھی۔ اسکی وفات سے نہ صرف میسوریوں کو بلکہ مرہٹوں کو ناقابل تلافی نقصان پہونچا۔ نانا فرنویس کو حیدر علی کی فتوحات سے امید ہو چلی تھی کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہونیوالے ہیں مگر اسکی وفات نے نانا فرنویس کو مایوس اور مجبور کر دیا کہ انگریزوں کے شرائط صلح پر دستخط کرے اور ایک انگریزی مورخ لکھتا ہے۔

تقدیر ہندوستان کے خلاف ہو چکی تھی اس لئے حیدر علی کی غیر متوقع وفات نے انگریزوں کے قدم ہندوستان میں جما دیئے۔

اس موقع پر اگر نانا فرنویس انگریزوں سے جنگ جاری رکھتا تو اسکی فتح یقینی تھی کیونکہ ہندوستان میں اسوقت انگریزوں کی حالت بہت خطرناک تھی انکی تمام قوت منتشر تھی، بنگال پر ناگپور کا راجہ حملہ کرنیوالا تھا۔ اور وسطی ہند میں وہ خود ایک کامیاب جنگ میں مصروف تھا۔ جنوب میں انگریزی فوجیں جہازوں کی پناہ لئے ہوئے ساحل مدراس پر مقیم تھیں اور معلوم یہ ہو رہا تھا کہ انگریز کوئی دم کے مہمان ہیں مگر تاجدار میسور کی وفات سے نانا فرنویس اسقدر متاثر ہوا کہ اس نے فوراً انگریزوں کے سامنے سر اطاعت خم کر دیا۔ اور ان کے قیام و ثبات کی ایک صورت پیدا ہو گئی

کیا حیدر علی غاصب تھا؟ حیدر علی پر انگریزی مورخین کا اعتراض ہے کہ وہ غاصب تھا

ہے نے راجہ کی ملازمت میں رہ کر اسی کے تاج و تخت پر ناجائز قبضہ کر لیا۔ لیکن ان کا یہ اعتراض سب پر مبنی ہے۔ یہ ہر شخص جانتا ہے کہ سلطنت میسور کی وسعت اور عظمت حیدر علی کی قوت بازو کی رہین منت ہے۔ اس نے تھوڑے ہی دنوں میں جنوبی ہند کی تمام ریاستوں کا خاتمہ کر دیا اور صرف ایک ریاست میسور جس کی راجدھانی سرنگاپٹم تھی باقی رکھی۔ حیدر علی کی پرورش اسی خاندان میں ہوئی تھی۔ اسی لئے نواب حیدر علی ہمیشہ اسکو اپنا مربی سمجھتا رہا۔ اس نے نازک موقعوں پر اپنے راجہ اور محسن وزیر نندراج کی مدد کی، اپنی بہادری اور استقلال سے ان کے دشمنوں کا صفایا کیا وہ حیدر علی ہی تھا جس نے بہادر مرہٹوں کو کبھی میسور میں حکومت کرنے کا موقع نہیں دیا۔ مگر اس عرق ریزی، جانفشانی اور وفاداری کے صلے میں راجہ میسور اپنے وفادار سپہ سالار کو قید یا قتل کرنیکا حکم دیتا ہے۔ ایسی صورت میں حیدر علی سا اولوالعزم سپاہی کب یہ گوارا کر سکتا تھا کہ اس کی قوت بازو سے حاصل کی ہوئی سلطنت اس قدر آسانی سے کے ساتھ دوسروں کے قبضے میں چلی جائے اس موقع پر اس نے وہی کیا جو ایک دانشمند انسان بار بار ٹھوکریں کھانے کے بعد کر سکتا ہے۔ اس واقعہ کو خاص انگریز مورخین کی زبانی سنئے:۔

تاریخ رولرس آف انڈیا میں جی، ڈی، سول لکھتا ہے۔

رانی اور کھانڈے راؤ نے مرہٹوں سے سازش کی اور حیدر علی اپنی جان بچا کر بنگلور بھاگ گیا اس کا فرار ہونا بھی نہایت حیرت انگیز اور تاریخی یادگار ہے کہ صرف بیس گھنٹوں کے اندر تن تنہا بنگلور پہونچتا ہے۔ حیدر علی کی فطری چالاکیوں نے بہت جلد فوجوں کو مجتمع کر لیا۔ اور ایک خونریز جنگ میں کھانڈے راؤ اس کے دشمن کو شکست ہوئی۔ حیدر علی کی فوجیں نہایت چالاکی کے ساتھ سرنگاپٹم پہونچ گئیں۔ جہاں حیدر علی نے محل پر قبضہ کر لیا۔ رانیوں کی سفارش پر اس نے وعدہ کیا کہ کھنڈے راؤ کو قتل تو نہیں کریگا بلکہ ایک طوطے کی طرح پالے گا۔ چنانچہ وہ اسکو اسکی موت تک ایک لوہے کے پنجرے میں بند رکھ کے دودھ اور چاول دیتا رہا۔

ایک دوسرا مورخ انگریز، بورنگ اپنی تاریخ حیدر علی میں اس طرح لکھتا ہے۔

دغاباز کھانڈے راؤ جو صرف حیدر علی کی عنایت سے وزیر بنا تھا حیدر علی کے مقابلہ پر

آمادہ ہو بیٹھا اس نے حیدر علی کو بہت تکلیف دی۔ لیکن حیدر علی نے اس پر فتح پائی۔ پھر حیدر علی نے اس سے دغابازی کا انتقام لینے کیلئے سرنگاپٹم پر لشکر کشی کی اور راجہ کے مصارف کا انتظام کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی رانیوں کے سفارش پر کھانڈے راؤ کی جان بخشی کر کے اسکو لوہے کے پنجرے میں رکھا گیا اور تمام عمر اسکو دودھ چاول کھلائے گئے۔ (سلطنت خداداد)

اگر تعصب کی پٹی آنکھوں سے اتار کر حیدر علی کے اس سلوک پر نظر ڈالی جائے جو اس نے سرنگاپٹم فتح کرنیکے بعد راجہ سے روا رکھا تو اس کا کیرکٹر نہایت ارفع و اعلیٰ نظر آئیگا اسوقت حیدر علی کیلئے یہ بالکل آسان تھا کہ اس ریاست کا نام و نشان مٹا دیتا اور اس راجہ کو جس نے اسکی گرفتاری کے لئے انعام مقرر کیا تھا صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور احسان کا بدلہ احسان ہی سے دیا۔ راجہ کے تمام اعزاز و مراتب اسی طرح قائم رکھے گئے جس طرح پہلے تھے، دسہرہ کے موقع پر راجہ کا جلوس اسی شان و شوکت سے نکلتا تھا جس طرح پہلے نکلا کرتا تھا۔ اس موقع پر جو دربار ہوتا تھا اس میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی طرف سے نذر گذاری جاتی تھی۔ مگر اس شریفانہ سلوک کے باوجود مورخین تعصب کا شکار ہو کر اسکو غاصب کہنے سے باز نہیں آتے ؛

گذشتہ زمانوں کو چھوڑ کر آپ صرف ہندوستان کے موجودہ حکمرانوں کو لیجئے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح یہ لوگ دوسروں کی حکومت غصب کر کے برسر اقتدار ہوئے ہیں کون نہیں جانتا کہ ان لوگوں نے نوابان ارکاٹ و اودھ، راجگان ناگپور و ستارہ سے کس قسم کا سلوک کیا ہے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بہت سے راجاؤں اور نوابوں کو صرف اس جرم پر پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا کہ انہوں نے اس دوران میں انگریزوں کو پناہ نہیں دی۔ شاہزادگان دہلی کو اس لئے قتل کرا دیا گیا کہ ان کی موجودگی میں ہندوستان پر حکومت نہیں کیجا سکتی۔ آخری تاجدار دہلی کو صرف اس جرم میں نظر بند کر دیا گیا کہ انہوں نے اس نازک موقع پر خاموشی کیوں اختیار کی۔ مگر اسکو کیا کیجئے کہ یہاں انگریز مورخین کی آنکھوں پر پٹی بندھ جاتی ہے، کانوں میں روئی ٹھونس لیجاتی ہے اور لبوں پر مہر خاموشی ثبت ہو جاتی ہے۔ اور اگر حیدر علی اپنی ریاست کو جسے اسنے اپنے خون سے سینچا تھا بچانے کے لئے راجہ سے

نت اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے تو غاصب ہو جاتا ہے!

اس کے علاوہ حیدر علی کو اس کا یقین تھا کہ راجہ میسور اپنی رانیوں اور وزراء کے ہاتھ میں ایک کٹھ پتلی ہے جو اسکو سکھلایا جاتا ہے وہی کرتا ہے۔ اس نے میسور کے وفادار وزیر اعظم تندراج کو اسی لئے جلاوطن کر دیا کہ اس کا وجود رانیوں کی مرضی کے خلاف تھا اور خود حیدر علی کے خلاف اس لئے ـــ سے سازش کی گئی کہ وہ رانیوں اور کھنڈے راؤ کے لئے سدراہ تھا اور صرف اتنے ہی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ میسور کے وفادار اور جاں نثار سپہ سالاروں کو ختم کر دینے کے لئے مرہٹوں سے خفیہ خط و کتابت ہونے لگی۔ اسوقت حیدر علی نے یہ محسوس کیا کہ اب اگر راجہ کے ہاتھوں سے زمام سلطنت نہ لی گئی تو اسی طرح ریاست کے تمام وفادار ملازمین چن چن کر قتل یا قید کرا دئے جائیں گے اور ریاست میسور پر مرہٹوں یا انگریزوں کا قبضہ ہو جائیگا اس لئے اس نے اپنے ہندو مسلمان سپہ سالاروں کے مشورہ سے فوراً نظام سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حیدر علی کو ان سازشوں کی جو اس کے خلاف کی گئیں قطعاً پروا نہ تھی۔ اسے فکر تھی تو اپنی ریاست کے تباہ و برباد ہو جانے کی اس لئے ایسے نازک وقت پر اس نے جو کچھ کیا وہ ایک بہادر اور وفادار سپہ سالار کی شایان شان ہے +

تحریکِ امن کا خاتمہ

اِس مسئلے کے متعلق کہ آیا تحریکِ امن ختم ہو گئی یا نہیں تین پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے۔ اوّلاً اِس تحریک کے خاتمے کی نفسِ حقیقت سے، دوسرے اِس خاتمے کے اسباب سے اور تیسرے اس کے نتائج سے۔

پہلے سوال کے متعلق اختلاف رائے کی گنجایش نہیں ہے۔ دُنیا کی معاشی کانفرنس اور تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کی ناکامیاں، جاپان کی طرف سے معاہدہ واشنگٹن سے انکار، اسلحہ اندوزی کی دوڑ میں قوموں کی ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششیں، حملے اور مدافعت کے لئے خفیہ اور علانیہ طور پر اتحاد۔ یہ تمام واقعات اس بات کی قطعی شہادت ہیں کہ دنیوی امن کی کوششیں اب ختم ہو گئی ہیں۔ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۱۴ء کی درمیانی مُدت میں یورپ جس طرح جنگ کے متعلق سوچتا اور گفت گو کرتا تھا بالکل وہی حالت اب دوبارہ پیدا ہو گئی ہے۔

رہا انجمنِ اقوام کا مسئلہ سو اس کی بے بسی اور بے چارگی روز بروز عیاں ہوتی جا رہی ہے جاپان، جرمنی، اور ہر وہ طاقتور قوم جو اپنے عزائم میں اُسے مزاحم پاتی ہے اُس کے اخلاقی دباؤ اور احتجاج کی ذرہ برابر پروا نہیں کرتی۔ ورسائی کا معاہدہ جس پر یورپ کے امن وامان کی بنیاد قائم کی گئی تھی اس کا خاتمہ جرمنی نے فوج میں جبریہ بھرتی کے اعلان سے کر دیا ہے۔ اٹلی ابے سینیا کو لڑنے کے لئے ہزاروں سپاہیوں کو مشرقی افریقہ میں روانہ کر چکا ہے۔ روس اور جاپان کی جنگی تیاریاں سب پر روشن ہیں۔ برطانوی بجٹ میں فوجی مصارف کے لئے پہلے سے زیادہ رقوم منظور کی گئی ہیں۔ فرانس اور امریکہ بھی اس خطرے سے غافل نہیں ہیں۔ اقوام عموماً ایک دوسرے کو مخالفانہ اور معاندانہ نگاہ سے دیکھ رہی ہیں۔

جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے انجمن اقوام کی اہمیت زائل ہو چکی ہے۔ اقتدار،

سیاسی اثر، اخلاقی دباؤ اس کے یہ سب حربے بےکار ہو گئے ہیں۔ معاشی جنگ، سیاسی فوضویت اور جنگجویانہ قوم پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو انجمن اقوام روکنے سے قاصر ہے۔ آج لوگوں کو اس بات میں تو اختلاف ہو سکتا ہے کہ جنگ فوراً شروع ہو جائے گی یا کچھ عرصے بعد شروع ہوگی۔ لیکن اِس بات پر سب متفق ہیں کہ چند سالوں سے دنیا کے واقعات کا رجحان ایک نئی جنگ کی طرف ہے اور نیز یہ کہ اس رجحان کا سب سے پہلا شکار خود انجمن اقوام بن چکی ہے۔ القصہ جو لوگ اُمید پرور ہیں اُن کا کہنا ہے کہ ابھی حالات اتنے نازک نہیں ہوئے کہ یورپ کے لئے نجات کے تمام دروازے بند ہو گئے ہوں اور جو لوگ مایوس ہو چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ مرض علاج کی حد سے گذر چکا ہے۔

اگر تحریکِ امن کا خاتمہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس کے اسباب کیا ہیں۔ دنیا کی سخت ترین ہلاکت بار جنگ کو ختم ہوئے ابھی سترہ سال بھی نہیں گذرے ہیں۔ یومِ صلح کی صبح کو تمام اقوام کی آبادی نے جذبات سے بھری ہوئی جو صدا بلند کی تھی کہ اب جنگ کسی قیمت پر بھی نہ کرینگے اسے اِس قدر جلد کیوں بھلایا جا رہا ہے۔

تمام دنیا کے مطالبۂ امن کو پورا کرنے کے لئے دنیا کے صُلح جو رہنماؤں نے انجمن اقوام کا میثاق کیلاگ پیکٹ اور اِس قسم کے دوسرے معاہدے تیار کئے تھے۔ لیکن ان پر پوری طرح عمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ دنیا ان سے منحرف ہوگئی۔ دنیا کی تاریخ کی کوئی ستم ظریفی اِس قدر نمایاں اور دردناک نہیں ہے جتنی یہ کہ عین اُس وقت جب کہ آبادی کا ایک حصہ بین الاقوامی تنظیم کو ابتدائی منزل سے گذار کر مستحکم بنیاد پر قائم کرنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ دوسرا حصہ ہمہ گیر قوم پرستی کے بھوت کے زیرِ اثر اُنھیں بنیادوں کو جن پر قصرِ امن کی تعمیر کی جا سکتی ہے اندر ہی اندر کھوکھلا کر چکا ہے۔

اِس کا کیا سبب ہے؟ کیا دنیا نے واقعی اُس جذبۂ امن و صلح کو جو جنگ کے اختتام کے وقت ان کی زندگی پر حاوی تھا دیدہ و دانستہ خیرباد کہہ دیا ہے۔ انتہا پسند قومیت کے تشدد آمیز اعلان مطالبات کے باوجود میرا یہ ایمان ہے کہ دنیا جنگ نہیں چاہتی بلکہ امن چاہتی ہے۔ وہ

ڈکٹیٹر بھی جو اپنے دل کی گہرائیوں میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے جنگ کو ناگزیر سمجھتے ہیں اُن لائحہ ہائے عمل کو پیش کرتے وقت جن کی تکمیل محض جنگ سے ہو سکتی ہے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اپنی طرف سے امن و صلح کے دعووں اور تمناؤں کا اچھی طرح اظہار کر دیں اور تیاری جنگ کی ابتدا کا الزام اپنے سر نہ رکھیں۔

اگر عوام ابھی تک امن و صلح چاہتے ہیں تو موجودہ صورتِ حال اور بھی زیادہ حیرت افزا ہے۔ کیونکہ ایک طرف امن و صلح کے قیام کے لئے انجمنِ اقوام کی شکل میں ایک بڑا منظم ادارہ موجود ہے۔ دوسری طرف عوام کے دل میں جنگ کی ہلاکت آفریں تباہ کاریوں سے بچنے کی تمنا پائی جاتی ہے۔ یعنی انجمن اور اُس کے چلانے والی قوت دونوں موجود ہیں مگر پھر بھی قوت کا اثر ظاہر نہیں ہوتا اور انجمن چلنا شروع نہیں کرتا۔

ایسا کیوں ہے؟ میری رائے میں اس کا سبب یہ ہے کہ تحریکِ امن کے حامیوں نے ابھی تک تمام ممالک کی اکثریت کے دل میں اِس بنیادی حقیقت کو جاگزیں نہیں کیا ہے کہ بین الاقوامی امن کی بھی ایک قیمت ہے۔ وہ بھی ایک ایثار کا مطالبہ کرتا ہے جس کے بغیر اُس کے منافع حاصل نہیں کئے جا سکتے۔ قومی پالیسیاں جب تک نہیں بدلی جائیں گی اور قومی حقوق کی جب تک قربانی نہ کی جائے گی اُس وقت تک عالمگیر امن کا دَور دَورہ قائم نہ ہو سکے گا۔ ابھی تک لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انجمنِ اقوام کے ذریعے سے اپنے مفاد کو ترقی دیں اور جنیوا کی طرف سے اُن کے خود غرضانہ مقاصد کو رد کئے کی اگر ذرا سی بھی کوشش کی جاتی ہے تو اُسے برداشت نہیں کر سکتے۔

چنانچہ امریکہ کی آبادی نے اپنے ایوانِ اعلیٰ کے اِس فیصلے کی کہ وہ انجمن اقوام کی رکنیت سے مستغنی ہوتی ہے اس لئے حمایت کی کہ وہ اپنے اقتدارِ اعلیٰ کے مقابلے میں انجمن کے بالا دست اقتدار کو گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ برطانیہ نے جنیوا کے میثاق کو اِس لئے مسترد کر دیا کہ اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی موجودگی میں اُسے کسی دن انجمن اقوام کی ماتحتی میں دنیا کے قیامِ امن کے لئے اپنی بحری اور مالی قوت کو نہ استعمال کرنا پڑے۔ فرانسیسیوں نے برابر اپنی حکومت کی اِن مسئلے میں

ں کہ انجمن اقوام کو فرانس کے تحفظ کی ضمانت اپنے ذمے لینا چاہیئے۔ جب تک جرمنوں کو امید رہی کہ وہ جنیوا میں رہ کر اپنے حدودِ ملک کو جنگ سے قبل کی وسعت دِلا سکیں گے اور اسلحہ اندوزی میں مساوات کے حق کو تسلیم کرا سکیں گے وہ اسٹرسیمن کی قیادت میں انجمن میں شریک رہے۔ لیکن جب انھیں مایوسی ہوئی تو ہٹلر کا ساتھ دے کر وہ انجمن سے علیحدہ ہو گئے۔ جب تک اُن کا وقار بڑھتا رہا جاپانی انجمنِ اقوام میں شریک رہے لیکن جب انجمن نے اُن کی منچوریا کی مہم کی مخالفت کی تو وہ اُس سے کنارہ کش ہو گئے۔

چھ سات سال ہوئے قوموں نے کیلاگ کے سمجھوتہ کی منظوری کے سلسلے میں اپنی حکومتوں کی تعریف میں قصیدہ خوانی کی لیکن جب ان کی حکومتوں نے مستثنیات کے انبار میں اس کو دفن کر دیا تب بھی اُن کی تعریف و توصیف اتنی ہی پُرزور رہی۔ اُنھوں نے یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ محض اس اعلان سے کہ جنگ کو قومی پالیسی سے خارج کیا جاتا ہے یہ میثاق کامیاب نہیں ہو جائے گا بلکہ اس کے لئے ضرورت ہے کہ اُن پالیسیوں کو ترک کیا جائے جن کی تکمیل بغیر جنگ کے ناممکن ہو ایسا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے برعکس انھوں نے خود انجمن اقوام کو ان پالیسیوں کی تکمیل کا آلہ کار بنانا شروع کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب جس چیز کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے وہ کیلاگ کا سمجھوتہ نہیں ہے بلکہ ایک نیا پیرس کا سمجھوتہ ہے جس کے ماتحت تمام اقوام اس بات کا عہد کریں کہ وہ آئندہ انجمنِ اقوام کو اپنی قومی اغراض کی ترقی کے لئے استعمال کرنے سے احتراز کریں گی۔

جنگِ عظیم کے اختتام پر تحریکِ امن کا آغاز دو ابتدائی مفروضات کے ساتھ کیا گیا تھا۔ پہلا مفروضہ یہ تھا کہ مُلکوں کی آبادیاں ہر جگہ امن کی خواہاں ہیں اور دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ حل طلب جو مسئلہ ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ اُن کی اس خواہش کو مؤثر بنانے کے لئے اجتماعی بین الاقوامی سعی کے امکانات پیدا کئے جائیں مگر موجودہ صورتِ حال بالکل خلافِ توقع ہے۔ اس وقت آبادیوں کے دِل میں صلح و امن کی تمنا بھی باقی ہے اور وہ ادارہ بھی موجود ہے جس سے یہ تمنا عملی کوشش کی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی جو حالت ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک یعنی اُس زمانے میں تھی جب

جنگِ عظیم کی طرف نہایت تیزی سے قدم بڑھایا جا رہا تھا وہی اِس وقت بھی پائی جا رہی ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے صورتِ حال زیادہ خراب ہے۔ کیونکہ پہلے اگر صرف سیاسی قوم پرستی تھی تو اب اس کے ساتھ معاشی قوم پرستی کا بھی اضافہ ہو گیا ہے۔

اعلانِ صلح کے سولہ سال بعد یہ دردناک حقیقت آج اپنی تمام عریاں وضاحتوں کے ساتھ ہر شخص پر عیاں ہے کہ یورپ میں اس وقت جدائی پسند اور اشتعال پذیر قومیت کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔ اٹلی۔ جرمنی۔ یوگو۔ سلافیہ، پولینڈ اس کی زد میں آ چکے ہیں۔ فرانس حالتِ انتظار میں پر تول رہا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ میں بھی انجمن اقوام کے طرفدار کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ایشیا میں جاپان ایک فوجی جماعت کے قبضے میں ہے جس کے مقاصد کا اندازہ منچوریا کے قضیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ تمام دنیا میں حکومتیں اسلحہ اندوزی کا لائحہ عمل اسی پیمانے پر اختیار کر رہی ہیں جیسا جنگِ عظیم سے پہلے کیا کرتی تھیں اور انھیں اِس کام میں عوام کی تائید حاصل ہے۔

پریسیڈنٹ ولسن کی علمی تحقیق یہ تھی کہ جنگِ عظیم کے ذمہ وار وہ حکمران اور رجعت پسند مدبّر تھے جنھیں عوام کا اعتماد و اعتبار حاصل نہ تھا۔ اس کا اعتقاد تھا کہ دنیا کے لوگ امن پسند مگر بے بس ہوتے ہیں۔ اور مسئلہ صرف اِس قدر ہے کہ اس امن کی خواہاں اکثریت کو اپنی مرضی اور منشا کے اظہار کا موقع دیا جائے لیکن جس کسی شخص نے بھی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کی ہے وہ واقف ہے کہ زمانہ بعد از جنگ میں مندوبین جب ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں جس سے اتفاقِ رائے ناممکن ہو جاتا ہے تو اس کا سبب ذاتی مخاصمت نہیں ہوتی بلکہ سیاسی خوف ہوتا ہے۔ یہ مندوبین جانتے ہیں کہ اگر انھوں نے قومی مفاد کی حمایت کی تو اپنے ملک میں اُن کی بے حد تعریف ہو گی لیکن اگر حصولِ امن کے لئے انھوں نے ایسی رعایتوں کو جو ضروری ہیں منظور کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی تو اُن کی سیاسی زندگی ختم ہو جائے گی۔

اِن مندوبین کو خوب معلوم ہے کہ وہی عوام جو جنیوا کے برآمدوں میں کثیر اژدہام کے ساتھ جمع ہو کر تخفیفِ اسلحہ کی درخواستوں پر دستخط کرتے ہیں، مجالسِ قوانین ساز کے اُن نمایندوں کو بھی منتخب

کرتے ہیں جو اسلحہ کے اضافہ کے قوانین منظور کرتے ہیں۔ اگر آپ کا قیام واشنگٹن میں ہوتا۔ تو آپ پر یہ حقیقت جس کا ہر سیاسی رہنما معترف ہے منکشف ہو جاتی کہ اس حالت میں جب کہ بہترین بین الاقوامی تجویز کے نام پر ایک رائے بھی نہیں مل سکتی بدترین قومی مقصد کے ساتھ انتخاب یقینی ہوتا ہے۔ بحری قوت کے اضافے کے لئے کانگریس کے دونوں ایوانوں میں ہمیشہ اکثریت حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایوانِ اعلیٰ کے وہ ارکان بھی جو نجی طور پر عالمگیر عدالت کے مؤید ہیں اس بات کی خواہش کرتے ہیں کہ انتخاب کے موجودہ سال گذر جانے تک اس کی تائید میں رائے شماری کو ملتوی رکھا جائے۔

جب سکریٹری اسٹیمسن نے بحری کانفرنس میں مجوزہ معاہدہ پنج دول کو بچانے کے لئے ایک مشاورتی معاہدے پر بحث شروع کی تو تمام واشنگٹن میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور مجبوراً اس تجویز کو ترک کرنا پڑا۔ اس کے مقابلے میں جب دو سال ہوئے پریسیڈنٹ روز ولٹ نے اقتصادی کانفرنس کو اس لئے روکا تاکہ اس کے اس پروگرام کی حفاظت ہو سکے جو حالتِ خوش حالی کو از سرِ نو قائم کرنے کے لئے اختیار کیا گیا تھا تو امریکہ کی تمام قوم نے اس کی بے انتہا تعریف کی۔ دنیوی امن کے لئے یہ دونوں ناکامیاں سخت مہلک ثابت ہوئیں۔ لیکن اس کے باوجود امریکہ کے عوام جنھوں نے دونوں صورتوں میں اپنی حکومت کے فیصلوں کو سراہا تھا دل میں مطمئن ہیں کہ دنیوی امن اور برّی و بحری تخفیف اسلحہ کے مقاصد کے ساتھ ان کی وفاداری بدستور قائم ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تحریک امن کے خاتمے کا اصلی سبب در اصل لوگوں کی یہ عجیب و غریب خواہش ہے کہ ایک طرف تو وہ امن و صلح چاہتے ہیں لیکن دوسری طرف ایسی پالیسیوں کا مطالبہ کرتے ہیں جن سے قیامِ امن ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ بات محتاجِ وضاحت نہیں کہ صلح کا مسئلہ محض قیامِ امن کے ادارے قائم کرنے سے حل نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جنھوں نے میری طرح ماضی میں تحریکِ امن کی مخالفت کی ہے اس کے مقاصد سے منحرف نہیں ہیں۔ انجمن کو اس کے معاہدے کو اور کیلاگ کے سمجھوتے کو بذاتِ خود معیوب نہیں سمجھتے۔ ہمارا اعتراض جو کچھ رہا ہے اور ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ محض ان اداروں یا ان معاہدوں کی موجودگی سے یہ باور کر لینا کہ لوگ اس بات پر اصرار کریں گے کہ ان سے

فائدہ اٹھایا جائے خطرناک خام خیالی ہے۔

اگر مسٹر ولسن کا خیال صحیح ہوتا تو اٹلی کے باشندوں کو چاہئے تھا کہ وہ مسولینی کو مجبور کرتے کہ وہ اپنے قوم پر نصب العین کو ترک کر کے جنیوا جائے اور روم میں رہ کر اٹلی کے نئے اتحاد کے حصول کی کوشش جاری نہ رکھے۔ جرمنی کے باشندوں کو چاہئے تھا کہ وہ ہٹلر کو مجبور کرتے کہ وہ آسٹریا کی آزادی کو دبانے کی بجائے اس کی حمایت کرے اور جاپانیوں کو چاہئے تھا کہ مانچوریا کے معاملے پر اپنی حکومت کو برطرف کر دیتے۔ لیکن اس قسم کی کوئی چیز واقع نہیں ہوئی اور اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ معاملات کو قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے پر مصر ہیں اور اس لئے وہ اپنے اُن حکمرانوں کی تعریف کرتے ہیں جو صرف اپنی قوم کی بھلائی چاہتے ہیں۔

گذشتہ چند سالوں کی مُدت میں ٹھیک اُس وقت جب تحریک امن کے رہنما جنیوا میں معاہدۂ امن اور کیلاگ کے سمجھوتے کے درمیانی خلا کو نوشتۂ صلح (پروٹوکال) کی تعمیر کے ذریعے پُر کرنے میں مصروف تھے اور جنگجویانہ اور مدافعانہ اسلحہ کی تعریفیں سوچ رہے تھے، مسولینی نے بڑھ کر روم پر قبضہ کر لیا۔ ہٹلر نے پوٹسڈم کے اتحادِ ثانی کا تماشا دکھلا دیا اور جاپان، دیوارِ اعظم کو توڑتا ہوا چین میں داخل ہو گیا۔ ان صاف اور واضح شہادتوں کے ہوتے ہوئے بھی کیا اب دنیا کا جو عالمگیر رجحان ہے اُس کے متعلق کسی شبہ کی گنجائش ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر جگہ قومیت کو بین الاقوامیت پر فتح حاصل ہو گئی ہے۔ کیونکہ قومیت نے اپنی توجہ ذرائع کی جگہ انسان پر اور معاہدوں کی جگہ آبادیوں پر مرکوز کر رکھی ہے۔

اب سوال جو باقی رہ گیا وہ یہ ہے کہ تحریکِ امن کے اِس خاتمے کے نتائج کیا ہوں گے یہ کہنا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انجمن اقوام اس دھچکے سے مر گئی ہے حماقت ہے۔ کیونکہ انجمن کو کیلاگ کے سمجھوتے کی طرح کبھی زندگی دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوئی۔ ان کی زندگی اور موت تو درحقیقت اُن آبادیوں کے ہاتھ میں تھی جو انھیں استعمال سے زندہ اور عدمِ استعمال سے مُردہ کر سکتی تھیں۔ اور ابھی تک یہ چیز اُنھیں کے قبضے میں ہے۔ اسی طرح یہ توقع کرنی بھی فضول ہے کہ انجمن اقوام میں محض اس کے بنیادی

معاہدے میں تبدیلی پیدا کر دینے سے زندگی پیدا ہو جائے گی۔

تحریکِ امن کے خاتمے کے بعض نتائج بالکل ظاہر ہیں۔ عوام کے دلوں میں ہر جگہ عالمگیر امن کے تخیل کی حیثیت محض ایک لغو اور بے کار خواب کی سی ہو گئی ہے اور عالمگیر اتحادِ عمل کو وہ ایک ڈھونگ سمجھنے لگے ہیں۔ وہی ہیگ کی طرح جینوا کی وقعت بھی اکثریت کے دماغوں میں فریبِ خیال سے زیادہ باقی نہیں رہی ہے۔ جب سے ہٹلر نے اقتدار حاصل کیا ہے اس وقت سے یورپ جان بوجھ کر مابعدِ جنگ کے دور سے قبل از جنگ دور کی طرف واپس جا رہا ہے۔ اب اس کے مدترین سخت جد و جہد کے ساتھ اتحاد و اشتراک کی روایتی تدابیر سے اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس جنگ کو جسے وہ ہمیشہ کے لئے ملتوی کرنے کی توقع نہیں کر سکتے جب تک ہو سکے ملتوی کرتے رہیں۔

لیکن مستقبل میں کیا ہوگا؟ آج تو اسلحہ اندوزی اور قوم پرستی کے نئے سیلاب میں ہمیں تحریکِ امن صاف طور پر ختم ہوتی نظر آ رہی ہے اور اس کا بنیادی سبب بھی ہم پر واضح ہے یعنی یہ کہ جنگ کے بعد کے فیصلہ کن سالوں میں تحریکِ امن عوام کی تائید حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ اس نے ہر جگہ لوگوں کے سامنے بین الاقوامیت کا نصب العین رکھا لیکن لوگوں نے ہر جگہ قومیت کو ترجیح دی۔

اگر تباہی لازمی نہیں ہے تو یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کو دوبارہ تنظیم دینے کی ضرورت ہے وہ انجمنِ اقوام نہیں بلکہ خود تحریکِ امن ہے۔ کیونکہ وہ لکھوکھا آدمی جو آج مسولینی کے ہمراہ مارچ کرتے ہیں یا ہٹلر زندہ باد کے نعرے لگاتے ہیں وہ انجمنِ اقوام کے معاہدے یا کیلاگ کے سمجھوتے کی ترمیم سے دوبارہ تحریکِ امن کے حامی نہیں بن سکتے۔

تمام تحریکِ امن کا انحصار اس ابتدائی مفروضے پر تھا کہ اسے دنیا کی رائے عامہ کی تائید حاصل ہے لیکن گذشتہ پانچ سالوں میں ہر نازک موقع پر اس بات کا مشاہدہ کیا گیا ہے کہ رائے عامہ ہمیشہ ڈکٹیٹروں کے ساتھ رہتی ہے اور اگر دنیوی رائے عامہ کا کہیں وجود ہے بھی تو اسے قومی سرحدوں کے حدود کے اندر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا موقع حاصل نہیں ہے۔ جنیوا میں تحریکِ امن نے ایک گرجا تو قائم کر دیا لیکن عبادت کرنے والوں کا بھی کہیں نام و نشان ہے؟

(ترجمہ)

تنقید و تبصرہ

کتب :-

انجام۔ نیم شب۔ انقلاب فرانس۔ سیپارہ اول ترجمہ عبداللہ یوسف علی صاحب حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی۔ عہد عثمانی میں اردو کی ترقی۔ عصر جدید۔ ایوان تصور۔ اردو میں ڈرامہ نگاری۔ مسلمانوں کا صنعت و حرفت تجارت۔ دستور عشاق۔ فردوس خیال۔ مسلمان بیبیاں۔ اتالیق الصبیان۔

انجام (ڈراما) | مصنفہ پروفیسر محمد مجیب صاحب تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۱۴ صفحات طباعت ٹائپ۔ قیمت ۲/ ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

یہ تمثیل تجزیہ سیرت کی ایک نہایت دلچسپ کوشش ہے۔ مصنف نے بہت بلند سطح سے عمر رسیدہ لوگوں کی مذہبی زندگی کا مطالعہ کیا ہے اُن کی روحانی الجھنوں اُن کے گناہ و ثواب سزا و جزا کے تخیلات کے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور جس فلسفہ کے ماتحت مولوی اور صوفی دانستہ یا نادانستہ طور پر اپنے معتقدین کی اصلاح نفس کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کو بھی خوب نمایاں کیا ہے۔ ہمارا خیال ہے۔ پروفیسر مجیب کی تمثیل اردو زبان میں اپنے رنگ کی پہلی تصنیف ہے اور دلچسپی سے مطالعہ کیے جانے کے لائق ہے۔

تمثیل کا قصہ یہ ہے کہ ایک جج صاحب جن کی زندگی شاید ظلم و رشوت ستانی میں گذری ہے اور جنہیں اپنی ملازمت کے آخری زمانہ میں سخت کام کرنا پڑا ہے۔ پنشن پا کر خانہ نشین ہو جاتے ہیں اور اس بیکاری کے زمانہ میں اپنی گذشتہ زندگی کی بے اعتدالیوں پر ایک تجربہ کار جج کی حیثیت سے غور و فکر کرتے ہیں۔ اعصاب کی قوت چونکہ زایل ہو چکی ہے، قوئے عام طور پر کمزور اور مضمحل ہو گئے ہیں۔ اور توجہ کو ایک طرف سے ہٹا کر دوسری طرف لگانے کا موقع نہیں ہے اسلئے

ان پر اپنے خطا کار ہونے کا وہم سوار ہوجاتا ہے اور گنہگاروں کے لئے جسقدر عذاب اور عقوبتیں ہیں اُن کا خوف ہمیشہ دل پر غالب رہنے لگتا ہے۔

اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے وہ ایک مولوی سے رجوع کرتے ہیں۔ جب اس سے تشفی نہیں ہوتی تو ایک صوفی کے پاس جاتے ہیں لیکن اطمینان قلب کے لئے جس جاہلانہ خوش عقیدگی کی ضرورت ہے وہ قانون دانی اور زمانہ شناسی کی وجہ سے ان میں موجود نہیں ہے۔ جلد ہی اپنے رہنماؤں کے حریصانہ مطالبات سے متنبہ ہو کر تنقیدی نگاہ سے۔ اُن کے اعمال و افعال کو دیکھنے لگتے ہیں۔ اور اس طرح ابتدا میں جو تھوڑی بہت تسکین ہوئی تھی وہ بھی زایل ہو جاتی ہے اور وہم و اختلاج کی بیماری میں ترقی ہونے لگتی ہے۔ مجبور ہو کر پھر دوبارہ اُن رہنماؤں کی طرف مایل ہوتے ہیں۔ لیکن جب اُن کا نزدیک سے مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں خود غرضی، ریا۔ مکر اور فریب کا مجسمہ پاتے ہیں۔ غرضکہ اس کشمکش میں ایک دن وہم کے ہاتھوں اپنا گلا خود گھونٹ کر مر جاتے ہیں۔

اس تمثیل میں مولوی، مجاور، صوفی، صوفیوں کے دلال، ملازم فقیر وغیرہ کے کردار خوب پیش کئے گئے ہیں۔ ضمنی طور پر جج صاحب کے بیوقوف لڑکے اور تعلیمیافتہ لامذہب اور بے روزگار بھانجے کا کردار بھی اچھا ہے۔ زبان بہت پاکیزہ اور شستہ انداز گفتگو بھی بڑا دلکش ہے۔

نیم شب (ڈراما) | مصنفہ پروفیسر اشتیاق حسین صاحب قریشی۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۸۸ صفحات کتابت و طباعت اچھی۔ سرورق سادہ نفاست ذوق کا حامل۔ ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

یہ پروفیسر اشتیاق حسین صاحب کی تعلیمی تمثیل ہے جو نہایت کامیاب ہے۔

تعلیمی تمثیل میں مصنف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک مسئلہ کو اس کی جملہ مفروضہ شرائط کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اور پھر اس کے حل کرنے کی کوشش کی جائے۔ زیر نظر تمثیل کے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ اشتمالیت (بالشوزم) کے جس خطرے سے اسوقت ہندوستان دوچار ہے

اس کا صحیح حل کیا ہو سکتا ہے۔ اس غرض کے لئے مصنف نے اپنی تمثیل کے لئے ۱۹۵۵ء یعنی اب سے نصف صدی آگے کا زمانہ مقرر کیا ہے اور اس کا محل وقوع صوبہ جات متحدہ کا ایک گاؤں قرار دیا ہے جو اپنی طرز معاشرت کے اعتبار سے ہندوستان کی موجودہ دیہی زندگی کی ایک بالکل صحیح تصویر ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ برسر اقتدار حکومت غیر ملکیوں کی نہیں بلکہ خود اپنی قومی حکومت ہے۔ اور اس کے ایک ملازم یعنی فرق امین میں، ہمدردی، وسعت نظر اور دیانت داری سے اپنے فرائض منصبی کو پورا کرنے کا جذبہ موجودہ عہد کے راشی فرق امینوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ورنہ جو نقشہ زندگی کا قریشی صاحب نے کھینچا ہے وہ حرف بہ حرف موجودہ زندگی پر بھی صادق آسکتا ہے۔

اس قسم کے ماحول میں زمیندار کے ایک لڑکے کے دل میں غالباً غیر ملکی پروپگنڈے کے زیر اثر انقلابی اور اشتمالی خیالات کی پرورش ہوتی ہے وہ جماعت کے اُن تمام بنیادی خیالات سے جنھیں مقدس سمجھا جاتا ہے یعنی مذہب، فرق مراتب، حقوق ملکیت، جذبۂ قومیت، خاندانی زندگی سب سے منحرف ہو جاتا ہے اور قول و فعل سے اپنے خیالات کو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی اثنا میں ایک غیر ملکی اشتمالی حکومت سے ملکی قومی حکومت کی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ یہ نوجوان اس جنگ کی بھی مخالفت کرتا ہے اور غداری کے جرم میں ماخوذ ہو جاتا ہے لیکن اشتمالی فوجوں کا لڑائی کے دوران میں اس گاؤں پر قبضہ ہو جاتا ہے اور زمیندار ساہو کار اور پروہت پکڑے جاتے ہیں۔ اُن پر مقدمہ چلایا جاتا ہے اور سزا دی جاتی ہے عورتوں کے ساتھ اشتراکی نظام اخلاق کے مطابق برتاؤ کیا جاتا ہے جس کی تاب نہ لاکر وہ خودکشی کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد تھوڑی مدت کے لئے قومی افواج کو ایک عارضی فتح حاصل ہوتی ہے لیکن پھر اشتمالی افواج حاوی ہو جاتی ہے۔ تمثیل کے آخری منظر میں قومی سرمایہ دارانہ نصب العین کو اپنے وفادار حامیوں کے ساتھ نزع کی آخری سانسیں لیتا ہوا دکھلایا گیا ہے۔

یہ تمثیل کا مختصر خاکہ ہے۔ پروفیسر قریشی صاحب نے جیسی کہ اُن سے توقع تھی۔ اس مشکل موضوع پر نہایت خوبی، صفائی، صحت اور غیر جانب داری سے بحث کی ہے اشتمالیت کی

موافقت اور مخالفت میں جو دلائل پیش کئے جاسکتے تھے انہیں بہت مکمل طریقہ پر پیش کیا ہے۔ پھر خوبی یہ ہے کہ ایسی سادہ اور عام زبان اور ایسے آسان خیالات کے ذریعہ سے جو ذرا بھی دماغ پر گراں نہیں گزرتے۔ جو لوگ ڈرامے میں ادبی لطافتوں کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں انہیں اس تمثیل سے یقیناً مایوسی ہوگی۔ پروفیسر قریشی ایک ادیب نہیں بلکہ ایک مفکر ہیں۔ ان کے ڈرامے میں شروع سے اخیر تک کہیں ادبی لطافت کی ذرا سی بھی جھلک نظر نہیں آتی۔ نہ کہیں ظرافت یا شوخی کی چاشنی ہے۔ سیدھی سیدھی باتیں ہیں۔ سادہ زبان ہے۔ لیکن جو تصویر کھینچی ہے وہ حقیقی اور واقعی ہے۔ اور جو تعلیمی مقصد پیش نظر تھا۔ یعنی یہ کہ زمینداروں، اور ساہوکاروں کو تباہی سے پہلے غور و فکر پر مائل کیا جائے اور انہیں آمادہ کیا جائے کہ صلح، رعایت اور رواداری سے معاشی نظام کی اصلاح کریں۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

انقلاب فرانس | مرتبہ مولوی عبدالقادر صاحب بی۔ اے (جامعہ) تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۱۷۰ صفحات کتابت اور چھپائی معمولی۔ ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

زیر نظر کتاب میں تاریخ فرانس کے اس حصہ کو موضوع بحث قرار دیا گیا ہے جو بہت زیادہ دلچسپ ہے اور جس کو تاریخ یورپ بلکہ دنیا کی تمام تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جیسا کہ مصنف نے اپنے دیباچہ میں خود لکھا ہے "اہل فرانس دنیا کی اُن محسن قوموں میں خاص امتیاز رکھتے ہیں جنہوں نے اصول جمہوریت کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ اس لئے اُن کا انقلاب دنیا میں ذہنی اور عملی اعتبار سے سب سے بڑھ کر جمہوریت کا محرک ہوا" فرانس کے انقلابی عہد پر یورپ کی زبانوں میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن اردو ادب میں جہانتک ہمیں معلوم ہے ابھی تک کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی گئی جسے قابل تعریف سمجھا جاسکے۔ زیر تنقید کتاب اپنی جگہ پر بڑی حد تک کامیاب ہے۔ اس موضوع کے جو خاص مباحث ہیں اُن پر مصنف نے اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔ طرز تحریر سادہ ہے جو کہیں کہیں لطیف اور دلکش ہوگیا ہے۔ اور کہیں

نامانوس سا بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کتاب میں عام طور پر سادگی اور صفائی کی طرف رجحان پایا جاتا ہے۔ بصورت مجموعی کتاب اچھی ہے۔

سیپارہ اول | ترجمہ بزبان انگریزی۔ از علامہ عبد اللہ یوسف علی صاحب تقطیع کلاں کاغذ نہایت اچھا، طباعت بہترین، لندن کی مطبوعات سے ملتی ہوئی ہدیہ ایک روپیہ ناشر شیخ محمد اشرف صاحب کاشمیری بازار لاہور۔

علامہ عبد اللہ یوسف علی کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ انگریزی زبان پر جو قدرت اور دستگاہ انہیں حاصل ہے وہ مسلم الثبوت ہے۔ انکی عربی علمیت بھی خاصی معلوم ہوتی ہے اسکے علاوہ جس قدر تراجم موجود ہیں اُن کا انہوں نے بامعانِ نظر مطالعہ کیا ہے اور مستند تفسیروں سے ضروری امداد حاصل کی ہے۔ اس لئے ان کا ترجمہ ہر حیثیت سے قابل تعریف ہے سرورق پر چند اہل الرائے حضرات کے تبصرے بھی درج ہیں۔ جن میں مولینا سید سلیمان ندوی صاحب کا تبصرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ مولینا موصوف تحریر فرماتے ہیں "مسلم علما نے باتفاق رائے اس ترجمہ کے حسن وفصاحت اور شوکت کا اعتراف کیا ہے"! ان کا یہ بیان اس بات کی ضمانت ہے کہ ترجمہ میں مذہبی نقطۂ نگاہ سے کوئی بات قابل اعتراض نہیں ہے۔

اس طرف سے مطمئن ہو کر جب اس ترجمہ کی دوسری خصوصیات پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس میں وہ خوبیاں دکھائی دیتی ہیں جو موجودہ انگریزی تراجم میں شاید اس قدر تکمیل کیساتھ کہیں نہیں پائی جاتیں اور جن کی وجہ سے یہ ترجمہ اپنی نوعیت کا ایک واحد ترجمہ بنگیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس ترجمہ کا منظوم مقدمہ اپنی ادبی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے علامہ موصوف کی وہ بیش بہا خدمت ہے جو انہیں تمام دوسرے ترجمہ کرنیوالوں کے مقابلہ میں ایک ممتاز اور مفتخر جگہ پر متمکن کرنے کے لئے کافی ہے۔ ہم نے اس مقدمہ کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا۔ اور آیات پاک کے اس منظوم خلاصہ کو بھی جو اصل ترجمہ کے درمیان ضروری مواقع پر بکھرا ہوا نظر آتا ہے۔

[illegible] دعوے ہے کہ کوئی مخلص مفکر ان کے مطالعہ کے بعد اسلامی تعلیمات کی عظمت سے انکار نہیں کرسکتا۔ تبلیغ اسلام کے لئے اس دور آزادی و تہذیب میں اگر کسی عملی کوشش کے کامیاب ہونیکا امکان ہے تو یقیناً وہ ایسی ہی ہوسکتی ہیں جیسی کہ علامہ موصوف نے اس مقدمہ میں فرمائی ہے۔ اہل مغرب اور مغرب زدہ اہل مشرق کے لئے اس مقدمہ اور درمیانی خلاصوں میں فلسفہ اسلام اور قرآنی تعلیمات اس سانچہ میں ڈھال کر پیش کی گئی ہیں جو ان کے مطالعہ تاریخ، فلسفہ اور اجتماعیات کے عین مطابق ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ترجمہ ان کی بصیرت میں اضافہ کرے گا اور انہیں بہتر انسان بننے میں مدد دیگا۔ علامہ موصوف ہر تیسرے مہینہ قرآن کے ایک ایک سیپارہ کا اسی طرح ترجمہ فرماکر شایع فرماتے رہیں گے۔

حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی | از جناب عبد القادر صاحب سروری ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۳۶ صفحے کتابت و طباعت اچھی کاغذ متوسط قیمت ایک روپیہ (عہ) ملنے کا پتہ سید عبد القادر تاجر کتب چار مینار حیدرآباد دکن۔

اس کتاب میں حیدرآباد کی ربع صدی کی تعلیمی ترقیوں کا حال مندرج ہے۔

شروع میں مرتب نے قدیم نظام تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ پھر حیدرآباد میں تعلیم کی ابتدا اور اس کی تدریجی ترقی کی تاریخ بیان کی ہے۔ ان عربی مدارس کا ذکر کیا ہے جو اسلامی اور پھر آصفجاہی عہد میں حکومت، امرا، یا علما نے قائم کئے۔ اس کے بعد ان کوششوں کا ذکر ہے جو تعلیم کو تمام اور منظم کرنے کے لئے حکومت کی جانب سے عمل میں آئیں۔ پھر تعلیم کی جدید تنظیم عام تعلیم کی ترقی اور انگریزی تعلیم کے نتائج سے بحث کی گئی ہے اور اضلاع میں انگریزی مدارس کے قیام کا ذکر ہے پھر بعض خاص اسباب سے تعلیمی ترقی میں رکاوٹ اور جمود پیدا ہو جانے کا ذکر ہے پھر اس جمود کو دوبارہ ہیجان اور مختلف تعلیمی و علمی اداروں کے قیام ان کی کوششوں اور کامیابیوں کی تفصیل ہے اس کے بعد جامعہ عثمانیہ کے قیام کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ اور

ان کوششوں کا ذکر ہے جو اس سلسلہ میں کی گئیں پھر مرتب نے بتایا ہے کہ اردو کا حیدرآباد سے کیا تعلق ہے اور ریاست کی دوسری زبانوں کے ساتھ حکومت کا کیا سلوک ہے۔ آخر میں انہوں نے جامعہ عثمانیہ کے بعد تعلیم میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اس کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں انہوں نے محکمہ تعلیمات کی مستعدی تحتانی تعلیم کی اصلاح اور مختلف مدرسوں اور انجمنوں کے قیام کا حال بیان کیا ہے کتاب اگرچہ مختصر ہے لیکن اس کے مطالعہ سے حیدرآباد کی عہد بعہد خصوصاً گذشتہ پچاس سال سے اسوقت تک کی تعلیمی ترقیوں کا خاکہ ذہن میں کھنچ جاتا ہے۔ مصنف نے مواد کی فراہمی میں محنت اور انتخاب ترتیب میں سلیقے سے کام لیا ہے۔

ح۔ ج

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی | از جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زور ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ۔ تقطیع متوسط ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ کاغذ اور کتابت وطباعت نفیس۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

حیدرآباد میں۔ اس بیس پچیس سال کے عرصہ میں جو اردو زبان کو غیر معمولی ترقی اور وسعت نصیب ہوئی بلاشبہ حیرت انگیز ہے اس کتاب میں اُن ہی ترقیوں کا اجمالی تذکرہ یا تاریخ ہے دیباچہ اور تمہید کے علاوہ کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اعلیٰ حضرت سلطان العلوم کی اردو نوازی، اردو شاعروں انشاپردازوں انجمنوں اور اداروں کی قدر دانی اور قدر افزائی کی تفصیل پھر جامعہ عثمانیہ کی تشکیل۔ اور دارالترجمہ والتالیف کے قیام کا ذکر ہے۔

دوسرے حصہ میں حیدرآباد میں انفرادی و اجتماعی کوششوں سے اردو زبان کی اصلاح و ترقی، بولنے والوں کی تعداد میں اضافے۔ حیدرآباد سے باہر دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو کی ہمہ گیری وسعت و استحکام کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد تین ضمیمے ہیں جن میں ان شاعروں اور انشاپردازوں کی فہرست ہے جن کا ذکر کتاب میں آیا ہے ان انجمنوں کی فہرست ہے جو پچیس سال سے اردو کی ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اور ان اخبارات ورسائل کے نام ہیں جو پچیس

سال کے عرصہ میں حیدرآباد سے شایع ہوتے ہیں۔ سب سے آخر میں انڈکس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب بہت مجمل ہے اور محض خاکے کی حیثیت رکھتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ جناب مصنف کے خیالات یا طرزِ تحقیق اور نتیجہ تحقیق سے لوگوں کو اختلاف ہو، خیالات کا اظہار انہوں نے سیاسی مصالح سے اثر پذیر ہو کر کیا ہو۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے مصنف کی محنت سزاوارِ تحسین کہ انہوں نے اس موضوع پر مجمل ہی سہی۔ لیکن مستند مواد فراہم کر دیا ہے، اور آئندہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لئے انہوں نے بہت اچھی راہ کھول دی ہے۔ یہ کتاب آئندہ چل کر ایک بہت اچھا ماخذ بھی ثابت ہوگی کتاب کی ترتیب و تبویب میں خاص سلیقہ اور جدید ذوق نمایاں ہے۔

ح-ح

عصر جدید | از جناب جانکی پرشاد۔ تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحات کتابت و طباعت اچھی کاغذ متوسط۔ قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

اس کتاب میں عہد عثمانی کی ترقیوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں نظم و نسق سلطنت، مجلس وضع قوانین تعلیمات جامعہ عثمانیہ، مالیاتی اصلاحات، محکمہ آثار قدیمہ صنعت و حرفت، آبپاشی تعمیرات، عدالت، سکہ، فوج اور بہت سی چیزوں کی ترقی کا اجمالی تذکرہ ہے یہ کتاب بھی محنت سے مرتب کی گئی ہے۔

ایوانِ تصور | مولفہ ظفر قریشی دہلوی۔ تقطیع چھوٹی قیمت کتاب پر درج نہیں۔ ملنے کا پتہ دارالادب پنجاب لاہور۔

"مسز سروجنی نیڈو" کے انگریزی کلام کا اردو ترجمہ ہے۔ کلام کو جذبات اور خیالات کے لحاظ سے چار مختلف عنوانات کے ماتحت تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر ایک عنوان ضمنی عنوانات پر مشتمل ہے۔ ترجمہ میں اگرچہ اس بات کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے کہ شاعرہ کے صحیح جذبات

اپنے اصلی رنگ میں لوگوں کے سامنے آجائیں۔ مگر پھر بھی بعض بعض جگہ الفاظ کے استعمال میں احتیاط نہیں برتی گئی مثلاً

" وہ پالکی میں اس طرح تیرتی ہوئی جاری ہے جیسے الفاظ فضائے تصور میں پیران ہوں"۔ اگر پیران ہوں کی جگہ" پیرتے ہوں" استعمال کیا جائے تو جملہ کی بلاغت بہت بڑھ جائے۔ اسیطرح اور الفاظ ہیں نرم پر طاؤس کیطرح، "محبت کا سنگھاسن" وغیرہ ان کی جگہ اگر" مور کے نرم پر کیطرح" "پریم کا سنگھاسن" استعمال کرتے تو جملوں میں بلاغت اور عبارت میں زور زیادہ پیدا ہو جاتا۔

ترجمہ اچھا ہے اور جس کلام کا یہ ترجمہ ہے اس کی خوبیاں، شاعرانہ نکات اور گہرائیوں کو سمجھنے کے لئے فاضل مترجم کا دیباچہ بہت مدد دیتا ہے۔ جس میں موصوف نے "مسز سروجنی نیڈو" کے کلام کی خصوصیت وغیرہ پر اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ ب۔ ا

اردو ڈرامانگاری | مصنفہ سید بادشاہ حسین۔ ملنے کا پتہ آرکیڈیا نیوز ایجنسی۔ اندرون لودلیشاہ قادر کوٹلہ حیدرآباد دکن۔ قیمت عہ

یہ کتاب اردو میں "تمثیل نگاری" کی کیفیت پر ایک مبسوط تبصرہ ہے۔ فاضل مصنف نے نہایت شرح وبسط کے ساتھ "تمثیل" کی مختلف اصناف پر روشنی ڈالی ہے۔ اور بتلایا ہے کہ کسطرح "تمثیل" عام لوگوں کے افکار وخیالات اور ایسے واقعات کی پابند ہوتی ہے جو عام طور سے روزمرہ کی زندگی میں رونما ہوتے رہتے ہیں۔ تمثیل نگار ایسے واقعات سے احتراز کرتا ہے جو ناممکن الوقوع ہوں، یا بہت کم ظہور پذیر ہوتے ہوں۔ بلکہ اس کی نظر میں ایسے واقعات ہوتے ہیں جو عام زندگی میں ہمیشہ رونما ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے رہیں گے مختصر یہ کہ تمثیل زیادہ تر "واقعیت" سے بحث کرتی ہے۔ "اداکاروں" کی حرکات وسکنات سے بھی اس کتاب میں مفصل بحث کی گئی ہے کہ انہیں اپنا "کردار" ادا کرتے وقت کن کن خاص باتوں کا لحاظ رکھنا چاہیئے! اس کے بعد اردو میں "تمثیل" کے وجود کی تاریخ اور دوسری قدیم تمثیلوں کے تراجم پر مبصرانہ انداز میں نظر

ڈالی گئی ہے اور پھر قدیم و جدید طرز کے تمثیل نگاروں کی کیفیت اور ان کی خصوصیات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ آخر میں "اردو تمثیل نگاری" کے مستقبل پر روشنی ڈالتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ موجودہ رجحان کی اگر یہی کیفیت رہی تو وہ دن کچھ دور نہیں جب ادبیات کی یہ بہترین صنف "تمثیل" اردو دنیائے ادب کا نہایت درخشاں تارہ نظر آئیگی۔

کتاب اپنے موضوع کی نسبت اور مواد کے اعتبار سے ایسی تنقیدی کتابوں کی تمہید کہی جاسکتی ہے۔ جنکی اردو ادب کو عرصہ سے ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ جو کتابیں شایع ہوں گی وہ اپنے مواد اور زبان وغیرہ کے لحاظ سے بہت بہتر ہونگی۔۔

ب۔ ا

مسلمانوں کی صنعت وحرفت، زراعت، تجارت | از مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب۔ ایم۔ اے پروفیسر تاریخ اسلامی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد۔ قیمت ۱۲؍

یہ کتاب "فون کرامر" کی جرمن کتاب موسومہ "خلفا کے زمانے کی مشرقی تہذیب کی تاریخ" کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ شروع میں فاضل مترجم مولوی محمد جمیل الرحمٰن صاحب ایم اے نے ایک دیباچہ لکھا ہے جسمیں آپ نے بتایا ہے کہ صنعت وحرفت کی ترقی کا مدار حوصلہ افزائی اور قدردانی پر موقوف ہے۔ اس ضمن میں آپ نے اس قول پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ "دنیا میں ہر چیز کے موجد مسلمان ہیں" آپ کا خیال ہے کہ یہ بیان خودنمائی کا مترادف ہے مسلمانوں نے یقیناً دنیا میں بہت ترقی کی مگر اُن کی ترقی کی بنیاد وہ اثاثہ تھا جو دوسری قومیں اپنے نااہل خلفا کے پاس چھوڑ گئیں تھیں مسلمانوں نے اس منتشر اثاثہ کو ایک جگہ جمع کیا۔ اس کی خامیاں دور کیں۔ اور کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کرکے دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ لوگ اصل اور نقل میں امتیاز نہ کرسکے۔ فاضل مترجم کے اس خیال کی تائید ہماری موجودہ زمانہ کی ترقی کی تاریخ بخوبی کرسکتی ہے آگے چلکر اس دیباچہ میں آپ نے مسلمانوں کے تنزل کے اسباب پر بھی نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔

دیباچہ کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب نفس مضمون اور مواد کے اعتبار سے بہت اچھی ہے مگر زبان کے لحاظ سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے اور غالباً اسکی وجہ ترجمہ ہے عموماً ترجموں میں زبان کی خامیاں رہ ہی جاتی ہیں کتاب مذکور جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے تمام و کمال مسلمانوں کی صنعت و حرفت اور زراعت و تجارت کے عروج و زوال کی مختصر تاریخ ہے، فاضل مصنف نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ شعبہائے مذکورہ میں مسلمانوں اور خصوصاً عربوں کی ترقی کی رفتار دکھائی ہے، اور بتایا ہے کہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہ تھا جہاں مسلمان تاجر نہ پہنچے ہوں۔ یورپ کی بیداری سے پیشتر عرب ہی وہ قوم تھی جو دنیا کی تجارت صنعت و حرفت وغیرہ پر حاوی تھی۔ فاضل مصنف نے اس ترقی کا باعث قرآن کریم کے قانون کو قرار دیا ہے کہ اس نے جہاں ایک طرف ممالک میں امن و امان قائم کیا وہاں اُن تمام قدیم محاصل اور چنگیوں کا بھی خاتمہ کر دیا جو ہمیشہ تجارت کی ترقی میں سنگ راہ بنے رہتے تھے لوگ بلا کسی قسم کا محصول ادا کئے اپنا مال جہاں چاہے لے جاتے تھے، اور منافع حاصل کرتے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ یہ کتاب جہاں ایک طرف اردو کی کم مائیگی کے الزام کو رفع کرنے میں مدد دیگی وہاں دوسری طرف مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی اور اگر اردو میں اس قسم کے تراجم شایع ہوتے رہے تو تھوڑے ہی عرصہ میں سرمایہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا۔ ہمیں امید ہے کہ فاضل مترجم "فون کرامر" کی کتاب کے دوسرے ابواب کا بھی ترجمہ فرماکر اردو زبان پر بہت بڑا احسان کریں گے،

ب۔ ل

دستور عشاق | مطبوعہ برلن۔ حجم تقریباً سوا چار سو صفحے قیمت للعہ ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ دہلی

یہ کتاب ایک فارسی مثنوی ہے جامی کے یوسف زلیخا کے وزن و بحر میں جسمیں شاہزادۂ حسن اور شاہزادۂ دل کا قصہ منظوم کیا گیا ہے، شاہرخ مرزا تیموری کے عہد میں محمد یحییٰ بن سیبک متوفی سنہ ۸۵۲ھ نے جو فتاحی نیشاپوری کے نام سے مشہور ہے، اس قصہ کو نظم کیا تھا سنہ ۱۹۲۶ء

طبع آفتاب برلن سے بتصحیح ر۔س گرین شیلڈ پہلی بار شایع کی گئی ہے۔اس عہد کے ریں اس مثنوی نے قبولیت حاصل کی تھی۔چنانچہ اس کے بعد ترکی زبان میں اس کا ترجمہ یا اور ہندوستان میں مرزا بیدل نے اسکی تقلید کی، یورپ میں بھی اس کے تین ترجمہ ہو چکے ہیں دو انگریزی زبان میں اور ایک جرمن میں۔ ا۔ج

فردوس خیال | از جناب محمود اسرائیلی ضخامت ۹۶ اصفحات، تقطیع جیبی، کتابت و طباعت بہت اچھی، کاغذ متوسط قیمت ۸؍

یہ جناب محمود اسرائیلی صاحب کی اخلاقی رباعیوں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے مختلف عنوانات کے ماتحت لکھی ہیں، محمود صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کلام میں پختگی ہے رباعیوں کا ایک خاص انداز ہے، نمونہ کے لئے دو رباعیاں یہاں نقل کیجاتی ہے،

جب لہر جوانی کی اُتر جائے گی ؎ تب ساحل مقصد پہ نظر جائے گی
وقت و موقع کی راہ تکتے تکتے ؎ محمود یہ زندگی گذر جائے گی

دنیا کی سیاست سے گذر کے دیکھو اس سطح سے کچھ اور اُبھر کے دیکھو
تقلید فرنگ سے نہ کچھ کام چلا قرآن کی پیروی بھی کر کے دیکھو

ح۔ح

مسلمان بیبیاں | از جناب اعجاز الحق صاحب قدوسی ضخامت ۸۰ صفحات، تقطیع چھوٹی کتابت و طباعت صاف کاغذ عمدہ قیمت ۸؍ ملنے کا پتہ جامعہ قرول باغ دہلی۔

اس کتاب میں جناب اعجاز الحق صاحب نے مسلمان بچیوں کے لئے صحابیات رضی اللہ عنہن کے سبق آموز حالات جمع کئے ہیں۔ انہوں نے توحید، عبادات اور اخلاق کے عنوان قایم کئے ہیں اور اُن کے ماتحت ازواج مطہرات اور دوسرے محترم صحابیات کے سبق آموز اور نصیحت آمیز قصے لکھے

ہیں، زبان بہت سادہ، آسان اور بچیوں کی سمجھ کے مطابق ہے، شروع میں جناب مولوی عنایت اللہ صاحب سابق ناظم دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب اور جناب تمکین کاظمی کی رائیں بھی ہیں۔

ح ح

آتالیق الصبیان | ڈاکٹر احمد شاہ صاحب۔ قیمت ۸؎۔ ملنے کا پتہ ڈاکٹر احمد شاہ۔ نور منزل ڈاکخانہ راجپور ضلع دہرہ دون۔

چھوٹے بچوں کے لئے مختصر نظموں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے نظمیں نہایت صاف اور سادہ زبان میں ہیں، اور تمام تر حیوانات، نباتات، مصنوعات اور دیگر روزمرہ کے استعمال کی چیزوں پر مشتمل ہیں۔

کتاب بچوں کے لئے اچھی ہے۔ خاص بات اس میں یہ ہے کہ بچہ کو نظمیں یاد کرتے کے سلسلہ میں بہت سی ایسی چیزوں کے نام خودبخود یاد ہو جاتے ہیں جو شاید کسی دوسری طرح یاد نہ ہو سکتے، اس کے علاوہ بچوں کی عام معلومات میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہو جاتا ہے،

ب۔ ق

رسائل :-

ہمایوں (روسی ادب نمبر) فاران۔ سالنامہ مساوات سالنامہ عربک کالج میگزین۔

شاہکار

شاہکار ماہوار | تقطیع بڑی ضخامت ۴۲ صفحے۔ قیمت سالانہ ؏ (رعایتی تین ماہ تک ۱۲؎) طلبا سے ۱۲؎۔ فی پرچہ ۳؎ مقام اشاعت بجنور۔

یہ رسالہ چار مہینے سے پابندی کے ساتھ بجنور سے شائع ہو رہا ہے زیر نظر رسالہ سلسلے کا چوتھا نمبر ہے۔ یہ کئی شعبوں میں منقسم ہے اور ہر ایک شعبے کا ایڈیٹر الگ ہے۔ محی الدین قائد صاحب بی اے شعبہ علم و ادب کے مدیر ہیں شبیر حسن صاحب بی اے مراد آبادی شعبہ تاریخ و تمدن کے، اور مولانا حامد الانصاری غازی صاحب

علمی حصے کے نگراں ہیں۔ شروع میں شذرات یا نقوش اولین کے بعد ایک عنوان عالم افروز ہے جو مستقل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ماتحت موجودہ صلح و جنگ کے مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے پھر سیارۂ افکار کے عنوان سے ملک کے موجودہ مسائل پر رائے زنی کی گئی ہے۔ اس کے بعد مضامین نظم و نثر کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مضمون نگاروں میں چند اچھے اچھے لکھنے والوں کے نام نظر آتے ہیں۔ اسی طرح شاعروں میں حضرت آزاد انصاری اور حضرت جگر مرادآبادی کی غزلیں اور نظمیں بھی رسالے کی زینت ہیں۔ مضامین کا معیار بھی اچھا خاصا بلند ہے۔ بحیثیت مجموعی رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اگر ایڈیٹر صاحبان اسی توجہ اور محنت سے اسے مرتب کرتے رہے۔ تو بہت ترقی کرے گا۔

ہمایوں روسی ادب نمبر | ایڈیٹر میاں بشیر احمد (آکسن) و حامد علی خاں بی۔ اے ضخامت ۱۰۰ صفحات اس نمبر کی قیمت ۱۲ سالانہ قیمت ۵ مقام اشاعت دفتر ہمایوں لارنس روڈ لاہور

رسالہ ہمایوں پنجاب کا ایک باوقار علمی ادبی رسالہ ہے اور خاموشی کے ساتھ علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہے اس لئے تیں (؟) سنجیدہ طبقے میں وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا انداز لاہور کے دوسرے پرچوں سے بالکل الگ تھا، اور وہ بڑے استقلال کے ساتھ اپنا انداز نبھا رہا تھا۔ لیکن شاید تجارتی مصالح نے اسے بھی اپنا رنگ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ اور اب وہ بھی سال میں کئی خاص نمبر نکالتا ہے۔ اس پرچہ میں روسی ادب افسانہ، شاعری اور روسی ادیبوں اور شاعروں کے متعلق مضامین فراہم کئے گئے ہیں، افسانوں اور نظموں کے ترجمہ بھی ہیں۔ اکثر مضامین بہت مختصر اور تشنہ ہیں اور ان کے مطالعہ سے کوئی روسی ادب کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل نہیں کر سکتا، اگر رسالے کے مرتب صاحبان اُن حضرات سے رجوع کرتے جو روسی ادب و زبان سے واقف ہیں تو وہ رسالہ کو زیادہ مفید بنا سکتے تھے، اس نمبر کے دو افسانوں کا اس سے پہلے بھی ترجمہ ہو چکا ہے "نسبت" شادی کے پیغام" کے نام سے جامعہ ۳۲ء کے پرچہ میں شائع ہو چکا ہے" بلی کے بچے" کا ترجمہ جلیل قدوائی صاحب نے کیا ہے اور ان کے افسانوں

مجموعے اصنام خیال میں موجود ہے۔ یہ دونوں ترجمے بھی بہت اچھے ہیں، غالباً مترجمین کو ان ترجموں کی اطلاع نہ ہوگی۔ ح۔ ح

فاران، ماہوار | ایڈیٹر مولانا سعید انصاری تقطیع ۲۰×۳۰ کتابت طباعت نفیس کاغذ متوسط قیمت سالانہ ۔ ششماہی ۔ فی پرچہ ۔ مقام اشاعت بجنور۔

یہ ایک نیم مذہبی رسالہ ہے جو ہندوستان کے مشہور اردو اخبار مدینہ کے دفتر سے نکلا ہے اس کے ایڈیٹر جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین ہیں جو اپنی علمی و تاریخی کتابوں کی بدولت کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں، انہوں نے رسالہ کو عام ناظرین کے لئے دلچسپ اور مفید بنانیکی پوری کوشش کی ہے، اور اسمیں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں، رسالہ میں پانچ چھ مضمون خود ان کے ہیں اور سوائے ایک مضمون "اسلامی نظام سلطنت" کے سب مفید اور کارآمد ہیں۔ "اسلامی نظام سلطنت" میں عربی الفاظ کی اسقدر کثرت ہے کہ صرف عربی جاننے والے ہی اُس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں ویسے بھی مولانا سے ہماری درخواست ہے کہ اس قسم کے مضامین میں عربی الفاظ کم سے کم استعمال فرمائیں اسلئے کہ یہ رسالہ عام اور متوسط طبقے کے لئے ہے جو غیر مانوس الفاظ کا بار خواہ وہ عربی ہوں یا سنسکرت برداشت نہیں کرسکتا۔ رسالہ کے دوسرے مضامین بھی فائدے سے خالی نہیں۔ حصہ نظم کا معیار بھی امید ہے کہ رفتہ رفتہ بلند تر ہوجائیگا۔

ح۔ ح

سالنامہ عربک کالج میگزین | مرتبہ جناب صادق الخیری دہلوی تقطیع ۲۰×۳۰ حجم ۹۲ صفحات خوبصورت ٹائپ کی طباعت اور کاغذ نہایت نفیس، سرورق دیدہ زیب،

یہ رسالہ عربک کالج دہلی کے طلبا کا آرگن ہے اور کئی سال سے نکل رہا ہے۔ اب ایک سال سے جناب صادق الخیری صاحب اسے بہت محنت اور سلیقے سے مرتب کرتے ہیں انہوں نے رسالہ کا معیار بلند تر کردیا ہے۔ زیر نظر نمبر میں طلبا کے مضامین کے علاوہ باہر کے مشہور لکھنے والوں کے

مضامین نظم و نثر بھی فراہم کئے ہیں۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ رسالہ خوبصورت ٹائپ میں چھپا ہے جس سے شان اور خوشنمائی میں اضافہ ہوگیا ہے۔ رسالہ کا انگریزی حصہ بھی خوب ہے۔

ح۔ ح

سالنامہ مساوات | مرتبہ محمد منیر الدین صاحب تقطیع ۳۰×۲۰/۸ ضخامت ۱۴۲ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط۔ سالنامہ کی قیمت ۱۰/ قیمت سالانہ ۲/ مقام اشاعت پھلواری شریف پٹنہ

مساوات قوم مومن و انصار کا ماہوار آرگن ہے اور اپنی قوم کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس نے ۱۹۴۲ء کا سالنامہ بہت اہتمام سے نکالا ہے، ہندوستان کے اچھے اچھے لکھنے والوں کے مضامین نظم و نثر فراہم کئے ہیں، رسالہ کی ترتیب و تزئین میں بھی خاص سلیقے سے کام لیا گیا ہے، رسالہ میں دس تصویریں بھی ہیں، ان میں سے اکثر مومن کانفرنس گیا کے مناظر ہیں اور اور چند مومن قوم کے معزز افراد کے فوٹو ہیں۔

ح۔ ح

اعلان اشاعت:۔

(۱) نغمہ کہسار بزم اردو شملہ منعقدہ ۲ ستمبر ۱۹۴۲ء کا مجموعہ کلام مرتبہ سید تنویر علی صاحب قیمت ۵/ ملنے کا پتہ رائل ایجوکیشنل بکڈپو جامع مسجد دہلی۔

(۲) ہمارے قومی اخلاق۔ تقریر میاں بشیر احمد صاحب بی۔ اے (آکن) جو جلسہ انجمن حمایت اسلام میں پڑھی گئی تھی، ملنے کا پتہ دفتر ہمایوں لاہور

(۳) بچوں کی رباعیاں بمصنفہ (محمود اسرائیلی) صاحب قیمت ۱/ ملنے کا پتہ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(۴) نجمہ (افسانہ) مصنفہ جناب حبیب اللہ صاحب (اڑلیسہ) قیمت ۱۲/، ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

(۵) الشمس، پٹنہ طلباء مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کا سہ ماہی رسالہ، چندہ سالانہ ۱۲/

(۶) پیام روزنامہ حیدرآباد دکن، ایڈیٹر جناب قاضی عبد الغفار صاحب قیمت سالانہ ۱۵/

شذرات

خدا کا شکر ہے جامعہ کے امتحان کا زمانہ ختم ہو رہا ہے۔ پندرہ سال کی پیہم کوششوں کے بعد اب اسے وہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے جب اپنی قوم کے ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے آدمی کا اعتماد اُسے حاصل ہے۔ جامعہ کے بانیوں کی یہ خواہش تھی کہ یہ قومی ادارہ جمہور کی مشترکہ مساعی سے چلے۔ اس کے سیاہ و سفید کا فیصلہ انھیں کے ہاتھ میں ہو۔ وہی اس کی قسمت کے مالک ہوں اور انھیں کی فلاح و بہبود اس کی مساعی کا مرکز ہو لیکن ہر ایسے ادارے کے لئے جو آزادرہ کر کام کرنا چاہتا ہے ضرورت ہے کہ قوم اس کی مالی سرپرستی کے لئے آمادہ ہو۔ ہماری قوم جس قدر فراخ حوصلہ اور فیاض ہے اُس کا سب کو اعتراف ہے لیکن بدقسمتی سے اس کی سیرت کی ان اعلیٰ صفات سے ایسے ناجائز طریقہ پر فائدہ اُٹھایا گیا کہ قوم کے دل میں عام طور پر ایک بدگمانی پیدا ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس قسم کے تمام کاموں میں لوگوں کی حسن نیت مشتبہ نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔

قوم کی اس مریضانہ ذہنیت سے جتنا نقصان جامعہ کے تعمیری اور اصلاحی مقاصد کو پہنچا شاید ہی کسی دوسرے ادارے کو پہنچا ہو۔ ہم فیصلہ کر چکے تھے کہ سرِ اطاعت اگر جھکائیں گے تو صرف ملت کے سامنے اور دستِ طلب پھیلائیں گے تو صرف قوم کے آگے۔ یہ ہماری زندگی کا بنیادی اصول تھا۔ اسے چھوڑنا ایسا ہی تھا گویا ہم نے اپنی زندگی کے مقصد کو ترک کر دیا۔ خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر خودکشی کر لی۔ ہمیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن ہم نے اُن کا مقابلہ کیا۔ ہم جانتے تھے کہ کھویا ہوا اعتماد دوبارہ آسانی سے نہیں ملتا۔ لیکن اگر ملک و ملت کی نجات کی کوئی صورت تھی تو وہ یہی کہ اس اعتماد کو دوبارہ حاصل کیا جائے اور پبلک تعلیم میں جمہور کے اقتدار کو اپنی حقیقی ملکیت اور ترکہ کا وارث بنایا جائے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ہماری خاموش اور صبر آزما کوششیں آخر کار بار آور ہوئیں۔

ہمارے دعوے کا ثبوت وہ ہمت افزا جواب ہیں جن سے قوم نے گذشتہ چند سالوں میں ہمیں سرفراز فرمایا کہ

ابتدا میں اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لئے جامعہ نے قوم سے اپیل کی۔ اس کی آواز پر ملک کے ہر گوشہ سے صدائے لبیک بلند ہوئی۔ خصوصاً دو سال سے جامعہ کے ماہانہ مصارف کا ایک معتدبہ حصہ حلقہ ہمدردانِ جامعہ کی مشترکہ امداد سے چل رہا ہے۔ پھر مکانوں کے کرایہ کے بھاری بوجھ سے بچنے اور اپنے رہنے کا ایک مستقل ٹھکانا بنانے کے لئے گذشتہ فروری میں جامعہ کی عمارتوں کے لئے قوم سے فراہمی چندہ کی درخواست کی گئی۔ اس کا جو جواب قوم نے دیا وہ بھی نہایت امید افزا ہے۔ حالات کی اس موافق روش سے امید ہوتی ہے کہ عنقریب جامعہ کی بے سروسامانی رفع ہو جائے گی اور زندگی کی ابتدائی احتیاجات کی طرف سے بے فکر ہو کر جامعہ کو بہت جلد اپنی تعمیری کوششوں کو پورے انہماک کے ساتھ شروع کرنے کا موقع ملے گا۔

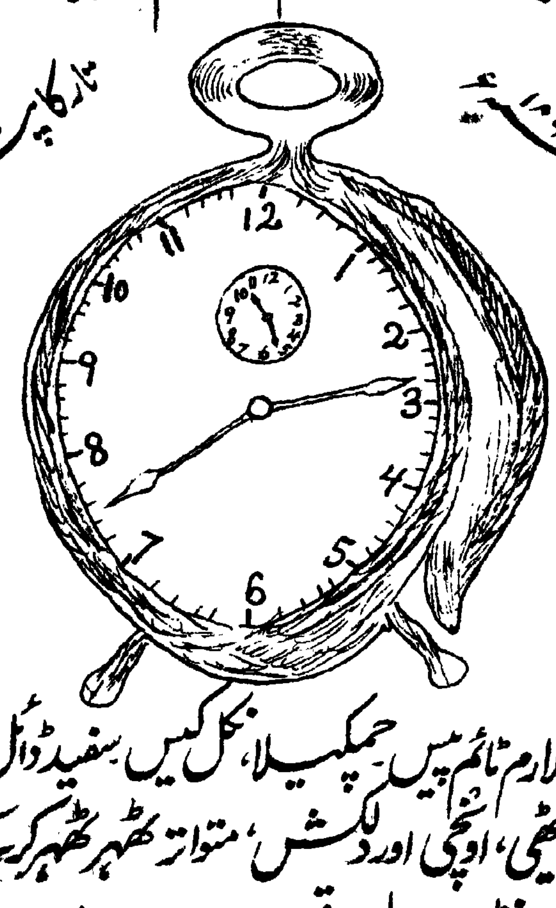
شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب اور ناظم حلقہ ہمدردانِ جامعہ مولوی شفیق الرحمٰن قدوائی، مظفرنگر، سہارنپور، بجنور اور مرادآباد کا دورہ ختم کرکے کچھ دنوں کے لئے دہلی واپس آگئے ہیں۔ ان مقامات پر توقع سے زیادہ کامیابی ہوئی۔ ساڑھے چار ہزار روپیہ نقد وصول ہو چکا ہے اور ڈیڑھ ہزار روپیہ کے یقینی وعدے ہیں جن کے جلد وصول ہونے کی پوری امید ہے۔ اس چندے میں بڑی رقوم یعنی سو سو روپیہ کی رقمیں بھی شامل ہیں۔ لیکن بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ اگر سو چندے ایسے ہیں جو پانچ روپیہ سے زیادہ کے ہیں تو دو سو ایسے ہیں جو صرف پانچ کے ہیں اور چار سو پانچ سے کم کے ہیں۔ ان چار اضلاع کے دورے میں تقریباً چھ سو آدمیوں سے جامعہ کے لئے امداد مانگی گئی اور ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جس نے جامعہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار نہ کیا ہو۔ قوم کا یہ اعتماد جامعہ کے کارکنوں کے لئے سب سے بڑا انعام ہے۔

جون کے پہلے ہفتہ میں شیخ الجامعہ صاحب دوبارہ دورے پر تشریف لے جائیں گے۔ اس مرتبہ بریلی، بدایوں، شاہجہانپور، پیلی بھیت کے اضلاع سے فراہمی چندہ کی درخواست کی جائیگی۔

جاگو" الارم ٹائم پیس

رجسٹر شدہ ۱۸۹۴ء

مارکہ پیٹنٹ ، نیوفرینڈ



یک روزہ الارم ٹائم پیس۔ چمکیلا نکل کیس سفید ڈائل، بڑھیا الارم جس کی آواز میٹھی، اونچی اور دلکش، متواتر ٹھہر ٹھہر کر بجنے والی گھنٹی ڈائل پہ سہ گارنٹی دو سال۔ قیمت صرف سات روپے للعہ

فہرست مفت طلب کیجیے!

نیوفرینڈ اینڈ کمپنی چاندنی چوک دہلی

رجسٹرڈ نمبر

جامعہ

اُردو اکادمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

کا

ماہوار رسالہ

زیر ادارت

ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

سالانہ صہ   مطبع جامعہ دہلی   فی پرچہ ۸ر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جامعہ

قائم مقام ایڈیٹر:- محمد عاقل ایم۔اے

نمبر ۶	جون ۱۹۳۵ء	جلد ۲۴

فہرست مضامین

محمد مجیب بی۔اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے جامعہ برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

جدید مغربی تمدن کی ماہیت

جدید مغربی تمدن کے جو سولھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے تین اہم ترین عناصر ہیں یعنی (۱) یونانیت (۲) رومیت اور (۳) عیسائیت ان تینوں اجزاء کے میل سے موجودہ مغربی تمدن وجود میں آیا ہے۔ ان اجزا کا میل عہد جدید کے مختلف ادوار، مختلف اقوام، اور مختلف اشخاص میں بہت ہی مختلف ہے۔ بعض اوقات عیسائیت کا غلبہ ہو جاتا ہے تو عہد جدید کی یہ تحریکات مذہبی شکل اختیار کر لیتی ہیں مثلاً لوتھر کی تحریک اصلاح۔ لیکن اس تحریک میں یونانیت اور رومیت کے اثرات بھی ضرور پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات یونانیت کا اثر زیادہ ہوتا ہے تو بعض تحریکات علمی اور جمالی شکل اختیار کرلیتی ہیں مثلاً یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک۔ بعض اوقات رومیت کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے تو بعض تحریکات سیاسی رنگ اختیار کرلیتی ہیں مثلاً میکاولی کے فلسفہ سیاست کے زیر اثر تحریکات۔ لیکن ہر تحریک میں چاہے اسکا مخصوص انداز کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ تینوں عناصر لازماً پائے جاتے ہیں۔ یہی کیفیت اشخاص کی بھی ہے جو خود ایک طرف ان تحریکات کا نتیجہ ہیں اور دوسری طرف خود ان تحریکات پر اپنی ذاتی شخصیت کا زبردست اثر ڈالتے ہیں۔

مختلف اقوام مغرب میں اُن اقوام کی مخصوص خصائص کے باعث انھیں تینوں عناصر نے مختلف اہمیت اختیار کرلی مثلاً فرانسیسی قوم پر ادبی اور جمالی رنگ زیادہ غالب ہونے کے باعث یونانیت کا اثر زیادہ ہوا۔ انگریزوں پر رومیت کا۔ جس کے باعث وہ قانون اور سلطنت کے قیام میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جرمنوں پر عیسائیت کا۔ جہاں سے کہ لوتھر کی عظیم الشان مذہبی تحریک اصلاح شروع ہوئی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان اقوام میں دوسرے عناصر موجود نہیں ہیں۔ دوسرے عناصر بھی ان میں موجود ہیں مگر ان کے قومی خصائص کے باعث ایک عنصر نے ان کی زندگی میں ضرور زیادہ اہمیت اختیار کرلی ہے۔

ایک یونانیت یونانیت سے ہمارا مفہوم اُن تحریکات سے ہے جو یونانی تمدن کے زیر اثر مغرب میں پیدا ہوئیں ۔ اہل یونان تمدن کے ہر شعبہ میں اہل مغرب کے امام ہیں ۔ سب سے پہلے وہاں حکومت معشیت، علوم و فنون کے مسائل پر نظر ڈالی گئی ۔ یونانی ایک نوجوان قوم ہونے کے باعث فطرت سے بلاواسطہ تعلق رکھتے تھے اور اسی باعث ان کے تمدن کے ہر شعبہ میں تر و تازگی اور زندگی پائی جاتی ہے ۔
یونانیوں کے تصور کائنات میں بہت زیادہ عقلی اور جمالی عناصر کا غلبہ ہے ۔ عام طور پر مذہباً وہ اصنام پرست تھے مگر اپنے بتوں میں بھی وہ عقل و دانش اور حسن و ہم آہنگی دیکھا کرتے تھے ۔ یونانیوں میں سلطنت کا تصور ایک جماعت کا ہم آہنگ نظام ہے ۔ اُنکا اخلاقی تصور ایک ہم آہنگ نفس ہے ۔ اسی تخیل کو یونان کے سب سے بڑے فلسفی افلاطون نے اپنی مشہور عالم کتاب " ریاست " میں پیش کیا ہے ۔
عقلی عنصر کے غلبہ کے باعث یونان میں مغربی فلسفہ کی ابتدا ہوئی ۔ اُس کی ابتدا طب سے ہوئی جو ایک تجربی علم ہے ۔ ارسطو نے بعد میں اپنے مشاہدات اور تجربات سے بہت سے نئے علوم ترتیب دئے جو سب کے سب عقل اور اس کی تحقیقات پر مبنی تھے ۔ ارسطو کے خدا کا تصور ایک عقلی تصور تھا جس نے نہ صرف یونان، ازمنہ متوسطہ کے کلیسا بلکہ علوم اسلامیہ میں بھی ایک غیر معمولی اہمیت اختیار کرلی ۔ زمانۂ جدید کو کلیسا سے آزادی حاصل کرنے کیلئے ارسطو کی طرح ذہنی غلامی کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا پڑا ۔ یونانیوں کے جمالی احساس کا اظہار خاص طور پر اُن کے ڈرامہ، نظم، عمارات اور بت تراشی میں ہوا ۔ اُنکی بت تراشی کا تناسب اور ہم آہنگی اس وقت تک مثال کا کام دیتی ہے اور ہنوز کوئی قوم اُس اعلیٰ معیار تک نہیں پہنچ سکی ہے ۔ غرضکہ یونانیوں کے تمام علوم و فنون میں عقلی اور جمالی احساس کا غلبہ ہے ۔ روحانیت کا پتہ نہیں ہے ۔ روح کے لئے اُن کے یہاں کوئی اصطلاح موجود نہیں ہے ۔ تراجم میں جن یونانی الفاظ کا ترجمہ روح کیا جاتا ہے اُس کا مفہوم یونانیوں کے پیش نظر کبھی بھی روح یعنی ایک غیر مادی چیز کا نہ تھا بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک لطیف مادہ کا خیال کرسکتے تھے حقیقتاً روح کا تصور ہی ایک بنیادی تصور ہے جو مغرب میں عیسائیت کی آمد سے داخل ہوا ۔

یونانی فلسفہ کی انتہا بالآخر نو فلاطونیت پر ہوئی ۔ یہ خالص یونانی فلسفہ نہ تھا ۔ جہاں اُس میں

افلاطون اور ارسطو کے اثرات تھے وہاں مشرق کے مذہبی اور صوفیانہ اثرات کا بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ یہاں عقل و وجدان، فلسفہ اور مذہب کا ایک ہم آہنگ امتزاج کیا گیا تھا۔ نوفلاطونیت کا فلسفہ نہایت جامع تھا جس میں اُس عہد کی تمام ذہنی تحریکات کے عناصر شامل تھے اور اُس پر خصوصاً صوفیانہ جمالی رنگ غالب تھا۔

یونان میں ان تحریکات کے علاوہ اور بھی تحریکات پیدا ہوئیں جن میں اخلاقی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا تھا مثلاً رواقیین اور لذتیین کی تحریکات۔ ان میں سے اول الذکر خودی کی نفی اور رہبانیت پر اور موخر الذکر لذت اور حصول عیش پر مبنی تھیں۔ ان کے بعد دیمقراطس کی مادی تعلیمات کا دور دورہ شروع ہوا جس نے کائنات کو ذرات اور اُن کے باہمی تعلقات کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کی۔

غرضیکہ اہل یونان نے وہ تمام بنیادی سوالات جو انسان، کائنات اور نفس انسان کے متعلق کر سکتا ہے دنیا کے سامنے پیش کر دیئے۔ یونانی علوم و فنون کے ہمہ گیر اثرات کا یہی باعث ہوا۔ مغربی کلیسا نے جب اپنے نظام کو فلسفیانہ بنیادوں پر قائم کرنا چاہا تو اُسے ارسطو کے فلسفہ کی طرف توجہ کرنا پڑی مسلم حکما نے بھی یونانی علوم و فنون سے کافی استفادہ کیا۔ عہد جدید میں جب مغربی اقوام میں نئی ذہنی زندگی پیدا ہوئی تو مثال کے لئے اُن کو یونانی علوم ہی کو لینا پڑا۔ چنانچہ مختلف اقوام کے خصائص اور مختلف ادوار کی ضروریات کے اعتبار سے یونان کے مختلف فلسفیوں اور ادیبوں نے اہمیت اختیار کر لی۔

۲- تحریک رومیت | دوسرا عنصر مغرب کے جدید تمدن میں رومیت کا ہے۔ رومیت سے ہمارا مفہوم روما کے تمدن کے زیر اثر تحریکات سے ہے۔ جس طرح اہل یونان اپنی علوم عقلی و جمالی کمالوں کے لئے ممتاز تھے اسی طرح اہل روما اپنے نظام سلطنت اور قانون کے لئے۔ اہل روم اور اہل یونان میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ اہل روم نے فطرت سے بلاواسطہ تعلق کے باعث تمدن حاصل نہیں کیا۔ وہ صرف ان کی قوم کی ذاتی جدوجہد اور کاوش ذہنی کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ انھوں نے اس کا اکتساب یونان سے کیا۔ جب تمدن کے تعیش نے اہل یونان کو جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے کمزور کر دیا تو اہل روم نے جو ایک تازہ دم اور مضبوط قوم تھی اُن پر قبضہ کر لیا۔ ابن خلدون کے نظریہ کی صداقت کے لئے کہ "ہر ترقی یافتہ

تمدن زوال پذیر ہوتا ہے اور قدیم متمدن قوم پر کوئی تازہ دم جاہل قوم آکر قبضہ کر لیتی ہے" یہ ایک واضح ترین دلیل ہے۔ اشپنگلر نے اپنی جدید تصنیف زوال مغرب میں "طاقت" کے اسی عنصر پر بھر زور دیا ہے۔ فلسفہ تاریخ کے اس اصول کے مطابق وحشی رومیوں نے متمدن یونانیوں پر قبضہ کر لیا۔ لیکن بہت جلد ہی فاتح مفتوح ہو گئے رومی یونانیوں کے سامنے درس تمدن کے لئے زانوئے ادب تہہ کر کے بیٹھ گئے۔ رومیوں نے فلسفہ اور علوم وفنون کا اکتساب یونان سے کیا لیکن چونکہ یہ انکی اصل فطرت کے مطابق نہ تھا اس لئے اس میں وہ کوئی خاص کمال پیدا نہ کر سکے۔ سسرو کے لئے بھی جو رومیوں کا سب سے بڑا فلسفی گذرا ہے علم فلسفہ بالذات کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اس کا اصل میدان سیاست وخطابت تھا۔ جب اسے مجبوراً جمہور کی مخالفت کے باعث سیاست سے کنارہ کشی کرنا پڑتی تو وہ اس وقت اپنے دل کو لذت علم سے تسلی دے لیا کرتا تھا۔

رومیوں کی اصل عظمت ان کے نظام سلطنت اور قانون میں ہے۔ وہ انتہائی نظم وترتیب جفاکشی اور داخلی امن کے باعث اس قابل ہو گئے کہ ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالدیں۔ رومی سلطنت کی کامیابی کی اصل وجہ وہ تربیت ہے جو اہل روما کو اوائل زندگی ہی میں اپنے خاندان میں مل جایا کرتی تھی۔ باپ گھر کا حاکم اعلیٰ ہوتا تھا جسے اپنے بچوں کو قتل کرنے کا بھی قانونی استحقاق حاصل تھا۔ خاندانی زندگی کی اس سختی اور اخلاق کی اس پختگی نے ان کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اس زمانہ کی متمدن دنیا پر حکمرانی کر سکیں۔ اہل روم اصول سلطنت اور قانون میں مغربی اقوام کے رہبر ہیں اور جہاں تک سلطنت وقانون کا تعلق ہے یورپ کا جدید ریاستی نظام روم کے قدیم نظام سلطنت وقانون پر مبنی ہے۔

۳۔ تحریک عیسائیت | تیسرا عنصر جس نے مغربی تمدن کی کایا ہی پلٹ دی عیسائیت ہے۔ یہ ایک مشرقی عنصر تھا جو مغربی زندگی میں جا کر شامل ہو گیا۔ یونانی اور رومی تمدن کی بنیاد دنیاوی زندگی اور اس کی ضروریات پر استوار تھی۔ ان کے دیوتا بھی دنیاوی صفات رکھتے تھے۔ آپس میں رشک، عداوت، پریم ومحبت، جنگ وجدال، ان کے روزمرہ کے کارنامے تھے۔ روح اور اس کے ساتھ آخرت کا ایک واضح تخیل ان کے یہاں مفقود تھا۔ عقل اور قوت کو ابتک مغربی تمدن میں ایک بنیادی حیثیت حاصل تھی۔

رومی سلطنت کا آخری دور جفا کاریوں اور خون آشامیوں کی ایک ہیبت ناک تصویر تھی۔ قوت کے بے پناہ جبر اور عقل کی موشگافیوں سے انسانیت عاجز آگئی تھی۔ وہ پریم و محبت کی متلاشی تھی۔ اپنے دل کی بے چینیوں کے لئے امن و سکون ڈھونڈھتی تھی۔ وقت کی ضرورت اور دنیا کی اس پیاس کو عیسائیت نے آکر پورا کیا اور بجھایا۔ عیسائیت نے قوت کی جگہ محبت کا نصب العین پیش کیا اور عقل کی بجائے ایمان کی تلقین کی اس دنیاوی سلطنت کی جگہ اُخروی بادشاہت کی طرف توجہ دلائی۔ انسان کی جگہ خدا کو مرکز میں لاکر کھڑا کردیا۔ عیسائیت نے چونکہ اس زمانہ کی انسانی ضرورتوں کو پورا کیا اس لئے وہ یورپ میں سرعت سے پھیلنا شروع ہوئی۔ یورپ میں مگر عیسائیت اُس طرح نہ داخل ہوئی جس طرح مسیح علیہ السلام نے اس کی تعلیم دی تھی۔ اس میں بہت سے خارجی عناصر آکر شامل ہوگئے مثلاً یونان کے چند قبائل کے باعث جنھوں نے سب سے پہلے عیسائیت قبول کی تھی اور جو سورج کی پرستش کیا کرتے تھے بہت سی باتیں عیسائیت میں ایسی داخل ہوگئیں جو اُن کے قدیم مذہبی عقائد سے وابستہ تھیں۔ تثلیث کا خیال انھیں اثرات کا نتیجہ ہے۔

شروع شروع میں صرف اخلاقی تعلیم جمہور کی ضروریات کے لئے کافی تھی لیکن جب قدرے اطمینان حاصل ہوا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ متمدن لوگوں نے بھی عیسائیت قبول کرلی تو مابعد الطبیعاتی مسائل کا پھر دور دورہ ہوا۔ کلیسا نے اپنے نظام کو مستقل کرنے کے لئے اُسے دو بنیادوں پر استوار کیا۔ ارسطو کا یونانی فلسفہ اور روم کا نظام شہنشاہیت۔ کلیسا چونکہ یونان اور روم کا تمدنی وارث تھا اس لئے یہ لازمی امر تھا کہ اُس کے تمدنی ورثہ پر یہ جدید عمارت کھڑی کی جائے۔ ارسطو کے تمام عقلی فلسفہ کو لے کر اُس نے اس پر ایک ذہنی عمارت تعمیر کی۔ کلیسا کا ظاہری نظام رومی شہنشاہیت کے طرز کا قائم کیا گیا۔ یہ دونوں کام سینٹ پال اور سینٹ آگسٹین نے انجام دیا جو زمانہ متوسط کے کلیسا کے بانی قرار دئے جاسکتے ہیں۔

باوجود ان تمام یونانی اور رومی اثرات کے عیسائیت کی دو باتیں ضرور قائم رہیں۔ ایک محبت کا تخیل اور دوم خدائی بادشاہت کا خیال۔ عیسائیت میں اخروی دنیا کی اہمیت کے باعث اس دنیا کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ گئی۔ فقر و فاقہ کشی، لذات سے محرومی، اور اس دنیا سے نفرت کلیسا کا جزو ہوگئی۔ آخرت کے

مسائل کے سامنے اس دنیا کے مسائل کی کوئی وقعت نہیں رہی۔ کلیسا کے آخری ایام میں مذہب بالآخر ایک فرسودہ چیز ہو کر رہ گئی جس کو انسانی مصائب اور ضروریات سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ کلیسا کے دور تسلط میں جو پندرھویں صدی عیسوی تک قائم رہا ارسطو کے فلسفہ کو اقتدار کلی حاصل رہا۔ لیکن پھر بھی بعض تحریکات خفیہ طور پر برابر مغربی زندگی میں جاری تھیں جو انفرادی زندگی کی حامل تھیں اور انسان کی بلاواسطہ حقیقت کی پیاس کو تسکین دیا کرتی تھیں۔ یہ تحریک تصوف تھی جو نوفلاطونیت کے جمالی وجدانی رنگ میں بعض جگہ خاموش اپنا کام کر رہی تھی۔

۴۔ عہد جدید: کلیسا کی ذہنی اور مذہبی غلامی سے بالآخر یورپ کی اقوام تنگ آگئیں اور وہاں نیا مذہبی احساس اور نئی ذہنی زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس نئی بیداری میں خارجی اور داخلی اثرات شامل ہیں۔ اپنے مذہبی جنون میں جب مغربی اقوام نے اسلامی اقوام سے جنگہائے صلیب میں مقابلہ کیا تو ان کو پہلی دفعہ یہ احساس پیدا ہوا کہ دنیا میں ایک قوم اور بھی موجود ہے جو اُن سے زیادہ متمدن اور با اخلاق ہے۔ اہل یورپ مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ لے کر ارض مقدس گئے تھے لیکن جب وہ وہاں سے لوٹے تو ظاہراً نہیں تو باطناً ضرور مسلمانوں کے وسیع اخلاق اور سادہ اور پاک مذہب کے قائل ہو گئے۔ مسلمانوں سے اس تصادم نے یورپ میں ایک نئی مذہبی اصلاح کی روح پھونک دی اور لوتھر کے متعلق اب قطعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن مجید اور اس کی تعلیمات سے واقف تھا۔ مرکزی یورپ اور صقلیہ میں مسلمان ایک عرصہ تک حاکم رہے۔ ہسپانیہ کے روشن خیال خلفاء کے تحت میں علوم و فنون نے بہت ترقی کی۔ فطرت کا آزاد مطالعہ قرآنی تعلیمات کا لازمی نتیجہ تھا جس میں متعدد بار فطرت اور نفس انسانی کے مطالعہ کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی باعث عرب خاص طور پر علوم طبعیہ، ریاضی اور طب کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اُس میں مہارت پیدا کی۔ عہد متوسط میں یونانی فلسفہ خصوصاً ارسطو کے فلسفہ کو زندہ رکھنے والے مسلمان ہی تھے۔ ارسطو کے فلسفہ کو مسلمان بہت غلط سمجھے تاہم عربوں ہی کی بدولت یہ عہد متوسطہ میں تباہی سے بچ گیا۔ ہسپانیہ اور صقلیہ کے اسلامی جامعات کے فارغ التحصیل طلبا نے یورپ کی ذہنی زندگی میں ایک ارتعاش پیدا کر دیا سینکڑوں برس تک ابن سینا اور ابن رشد کی تصانیف مغربی جامعات کے لئے باعث ناز رہیں۔ مغرب نے شروع

میں تو اپنے علم کی پیاس کو عربی، یہودی علوم وفنون اور یونانی علوم کے تراجم سے جو عربی زبان سے کئے گئے تھے بجھانا چاہا۔ لیکن بعد میں اُس نے اپنے تمدن کے اصل سرچشمے یعنی یونان کی طرف توجہ کی اور یہیں سے عہد جدید میں یونانیت کی وہ عظیم الشان تحریک پیدا ہوئی جس کی طرف ہم شروع ہی میں اشارہ کر چکے ہیں۔ پھر جدید سائنٹفک تحریکات، نئی دنیا کے انکشاف وغیرہ نے اہل مغرب کو عقل کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔

لیکن یورپ کی نئی زندگی صرف خارجی اثرات ہی کا نتیجہ نہ تھی۔ وہ صرف اہل عرب اور یونان کی نقالی نہ تھی، وہ صرف فطرت اور اُس کے قوانین کی اثر پذیری نہ تھی بلکہ مغربی اقوام اب پختہ تر اور جوان ہو گئی تھی۔ اپنے عہد طفولیت میں انھوں نے کلیسا کی سرپرستی کو تسلیم کر لیا۔ جو کچھ کلیسا نے اُن کو ذہنی اور مذہبی تعلیم دی قبول کیا۔ مغربی اقوام کی مثال بعینہٖ اُس بچے کی سی تھی جو اپنی تمام ضروریات کے لئے اپنے والدین پر بھروسہ کیا کرتا ہے۔ نہ وہ خود بلا واسطہ اشیاء کا علم حاصل کرسکتا ہے اور نہ اپنے افعال کے لئے آزادانہ کوئی راہ نکال سکتا ہے لیکن اپنے عہد شباب میں مغربی اقوام کلیسا کی یہ سرپرستی تسلیم نہیں کرسکتی تھیں بلکہ حقیقت سے بلاواسطہ تعلق پیدا کرنا چاہتی تھیں۔ علمی دنیا میں خود تحقیقات وجستجو کرنا چاہتی تھیں۔ سیاسی معاملات میں آزادانہ قومیت کی بنیادوں پر ریاستیں قائم کرنا چاہتی تھیں۔ غرض مغرب کی اس بیداری نے تین واضح شکلیں اختیار کرلیں جو باہم ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اوّل مذہبی۔ دوم علمی۔ سوئم سیاسی۔ مذہبی تحریکات نے اصل عیسائیت کو، علمی تحریکات نے یونان کو اور سیاسی تحریکات نے رومؔ کو پیش نظر رکھا۔ محبت، عقل اور قوت یورپ کی نئی اقوام کے لئے بہ حیثیت نصب العین کے پیش کئے جانے لگے۔

(ہمارا مقصد ان تینوں تحریکات پر تاریخی نظر ڈالنا نہیں ہے اور نہ انھیں تفصیل سے بیان کرنا ہے بلکہ مختصراً یہ بتا دینا ہے کہ یہ متضاد تحریکات نہ تھیں بلکہ ایک ہی کیفیت نفسی کا نتیجہ تھیں۔

۱۔ تحریک قوت | میکاولی انسانی زندگی میں قوت کا حامل تھا۔ وہ جدید مغربی سیاسی تحریکات کا رہبر اوّل ہے۔ میکاولی اٹلی میں پیدا ہوا۔ وہ روم کی گذشتہ عظمت کا خواب دیکھا کرتا تھا اور کلیسا

نے اس تمام عظمت کو اس کے خیال میں برباد کرڈالا تھا۔ اس لئے وہ اس کا دشمن تھا۔ وہ کلیسا کی طرح عام انسانی حکومت کا قائل نہ تھا بلکہ قومی بنیادوں پر حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک سیاست داں تھا اور سیاست کی اصلی جان قوت کو سمجھتا تھا۔ یہ قوت خواہ کسی طرح حاصل ہو اُس کے نزدیک قابل ستائش تھی۔ حاکم کے لئے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنی حکومت کے لئے ہر ذریعہ استعمال کرنا چاہیئے۔ میکاولی علم اخلاق نہ تھا بلکہ ماہر نفسیات۔ اُس نے نفس انسانی کا مطالعہ کیا اور دیکھا کہ نفس پرستی خود غرضی اور حصول طاقت کا جذبہ ہر جگہ کام کر رہا ہے۔ اسی نفسیاتی مطالعہ کی بنا پر اُس نے اپنی مشہور کتاب "پرنس" میں وہ تمام اصول بتادئے، جو ایک حاکم کی کامیابی کے لئے ضروری ہیں۔ یہ نفس پرستی اور علیحدہ قومی زندگی کی تعلیم بعد کی مغربی اقوام کے لئے مثال کا کام دینے لگی اور تقریباً تمام اقوام کا اُس پر عمل ہو گیا۔ میکاولی کے نزدیک سیاسی ادارے مذہب کے ماتحت نہیں رہ سکتے بلکہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مذہب کو آلہ کار ہونا چاہیئے۔ یہ ایک خالص رومی تصور تھا، جس کو جدید مغربی زندگی میں میکاولی نے دوبارہ زندہ کر دیا۔

۶۔ تحریک عقل | علمی تحریکات کے رہبروں کا امام ایراسمس ہے۔ یہ یونانی علوم و فنون کا ماہر تھا۔ اس نے یونانی کتب کے بہت سے تراجم مغربی زبانوں میں کئے۔ اُس کے پیش نظر سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مغربی اقوام کو کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلائے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک کہ مغربی اقوام ایسے تمدن سے واقف نہ ہو جائیں جو خود آزادی دلائے اور عقل پر مبنی ہو۔ اس قسم کا تمدن صرف یونان کا تھا۔ اس تمدن سے واقفیت پیدا کرا کے علمی تحریکات کے رہبر مغربی اقوام کی ذہنی پیاس کو بجھانا چاہتے تھے اور اُس پر ایک نئے تمدن کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے۔ یونانی علوم و فنون اور یونانی ادب اور ڈرامہ سے اس زمانہ میں بعید دلچسپی پیدا ہو گئی۔ زمانہ متوسط کی مقفیٰ و مسجع عبارت کی جگہ ادب میں آزادانہ اور بے ساختہ طرز ادا کا رواج ہو گیا۔ مذہبی گیتوں اور نظموں کی بجائے فطری مناظر اور انسانی اعمال بھی نظم کئے جانے لگے۔ مصوری و نقاشی پر بھی اس تحریک نے اپنا اثر دکھایا۔ زمانہ متوسط میں تمام مصوری کا منتہائے کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی تصاویر کو روحانی جامہ پہنا کر پیش کیا جائے

کیا جائے۔ مگر اب اس کے پہلو بہ پہلو حسین فطری مناظر اور انسانی افعال کے مرقع بھی کھینچے جانے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کا وسیع تر مذہبی تصور آرٹ کے ذریعہ اپنا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب خدا کو محدود صرف ایک ہستی ہی میں نہیں دیکھنا چاہتا بلکہ فطرت کے ہر منظر اور انسان کے ہر اخلاقی فعل میں اب اس کو خدا کا جلوہ دکھائی دیتا تھا؎

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ؎ ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یہ مذہبی تصور اس زمانہ کی علمی اور ادبی تحریکات سے وابستہ تھا۔ اس لئے اُس میں بہت رواداری تھی وہ عیسیٰ اور موسیٰ کے برابر ارسطو۔ افلاطون اور سقراط کو بھی جگہ دیتا تھا اور ان سب کو خدا کے محبوب اور نیک بندے تصور کرتا تھا۔ لیکن یہ تصور اس زمانہ کی تعلیم یافتہ جماعتوں تک محدود تھا گو عوام میں بھی کسی قدر مذہبی بیداری ضرور پیدا ہو چکی تھی۔ کلیسا کے قیود اور خشک مذہبیت سے وہ بھی بیزار تھے۔ لیکن وہ صرف ایک ایسے ہی مذہبی تصور سے مطمئن ہو سکتے تھے جو کسی قدر محسوس چیز پر مبنی ہو۔ عوام کی اس مذہبی ضرورت کو لوتھر نے پورا کیا۔ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد کلیسا کی مخالفت اور انجیل کی لفظی پیروی پر رکھی۔

۷۔ تحریک محبت | لوتھر عیسوی محبت کا علمبردار تھا۔ اُس نے حقیقتاً مغرب کے مذہبی تصور کو بالکل ہی بدل دیا۔ جرمن قوم کی زندہ اور نامی روح کی روم کے مردہ نظام کلیسا کے خلاف یہ ایک بغاوت تھی۔ رومن کلیسا کبھی بھی خود کو عہد قدیم کی اصنام پرستی سے آزاد نہ کر سکا تھا۔ اُس کا مذہبی تصور ہمیشہ محسوسات کا پابند رہا۔ یونانی دیوتاؤں کے بجائے عیسائی گرجے مسیحؑ مریم اور روح القدس کے بتوں سے مزین کرلئے گئے تھے۔ یونانی کلیسا کا تخیل تثلیث پر مبنی تھا جو یونان کا ایک قدیم تصور تھا۔ رومی کلیسا کا نظام فوجی وضع کا مرتب کیا گیا تھا۔ لوتھر نے پہلی مرتبہ عیسائیت کو ان قدیم عناصر سے پاک کیا اور اُس کو ایک خالص روحانی رنگ دیدیا۔ لوتھر نے یہ تعلیم دی کہ انسانی نجات کے لئے کلیسا کا واسطہ ضروری نہیں ہے بلکہ انسان خود بلا واسطہ خدا سے قرب حاصل کر سکتا ہے اس تعلیم میں مسیحی عیسائیت اور تصوف کے عناصر کام کر رہے تھے جس کے تحت میں خود لوتھر کی زندگی کی تشکیل ہوئی تھی۔ لوتھر نے کلیسا کی رہبانیت، اُس کے رہنماؤں کی ظاہری

شان وشوکت، اس کی خشک اور بے روح اخلاقی تعلیم کی مخالفت کی اور اس کے بجائے انسانی ضمیر اور زندگی کی اہمیت پر زور دیا۔ دنیا میں رہ کر اپنے انسانی فرائض کو حسن و خوبی انجام دینا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ لوتھر کی تعلیم پر سیاست کا بھی بہت اثر تھا۔ اس نے کلیسا کی عالمگیر حکومت کی مخالفت کی اور اس کی بجائے اپنے مذہب کو قومی بنیادوں پر قائم کیا۔

وسیع مذہبی تصور، اعلیٰ اخلاقی تعلیمات اور مغربی اقوام کے جذبۂ قومیت کی تائید کے باعث لوتھر کے جدید مذہب کو یورپ کی شمالی اقوام نے قبول کر لیا اور عیسائیت ہمیشہ کے لئے دو زبردست فرقوں میں منقسم ہو گئی۔ لوتھر کی تعلیمات کا اثر اس قدر ہمہ گیر مرتب ہوا کہ اس کے بعد سے لیکر اس وقت تک شمالی اقوام کی کوئی تحریک خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی، فلسفیانہ ہو یا ادبی اس کے اثرات سے آزاد نہ ہو سکی۔ ہم شمالی مغربی اقوام کے جذبات اور خیالات اور ان کے خارجی اعمال سے کچھ بھی واقفیت نہیں حاصل کر سکتے جب تک ہم اس زبردست عنصر کو ہمہ وقت اپنے پیش نظر نہ رکھیں جس نے مغربی زندگی میں ایک زبردست انقلاب ہمیشہ کے لئے پیدا کر دیا۔

پہلے عموماً خیال کیا جاتا تھا کہ جرمنی، انگلستان اور فرانس وغیرہ کی علمی اور فلسفیانہ تحریکات وغیرہ مذہب کی مخالفت میں پیدا ہوئیں یا کم از کم اس سے بے تعلق رہیں۔ ڈلتھائی کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ ان تحریکات کی نشو ونما میں بھی مذہبی تصور زبردست کام کرتا رہا اور مغرب کی جدید روح وسیع مذہبی تصور کا نتیجہ ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کی علمی اور فلسفیانہ تحریکات میں بھی یہی مذہبی روح کام کر رہی تھی ہم کوشش کریں گے کہ اس تعلق کو یہاں واضح کریں تاکہ اس زمانہ کی زبردست شخصیتوں کو سمجھ سکیں جو کہ اس صدی کی نفسی زندگی کی علمبردار ہیں۔

اٹھارھویں صدی کے نفسی عوامل

اٹھارھویں صدی کی نفسی زندگی سمجھنے کے لئے ہم کو تین اصطلاحات کے مفہوم کو بہت ہی واضح کر لینا

چاہیئے۔ فطری مذہبؒ۔ انسانیتؒ اور تصوفؒ۔

۸۔ فطری مذہب | فطرت کو لوتھر بھی ادنیٰ خیال کرتا تھا مگر شوپنہار کی طرح نہیں۔ شوپنہار کا خیال تھا کہ فطرت ایک ادنیٰ چیز ہے اور اُس سے انسان کو نفرت کرنا چاہیئے لوتھر کے نزدیک بھی وہ ادنیٰ ضرور ہے مگر اس کا استعمال اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے۔ وہ ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا تھا بلکہ دنیا میں رہ کر نیک اعمال کرنے کی۔ لیکن اٹھارھویں صدی میں فطرت کا مفہوم بالکل ہی بدل گیا۔ اب وہ ادنیٰ کی بجائے اعلیٰ تصور ہونے لگی۔ روسو کہتا ہے کہ "انسان کو جماعت خراب کر دیتی ہے ورنہ وہ اپنی فطرت سے نیک ہے" روسو کا مقصد یہ تھا کہ جب "انسان کو اُس کے خالق نے پیدا کیا تو وہ دراصل نیک تھا لیکن اس کی زندگی میں جو انسان پائے جاتے ہیں وہ بد ہیں"

فطرت کے اس اعلیٰ تخیل کے تحت میں فطری مذہب کا مسئلہ چھڑ گیا۔ مذہب کی اہمیت اور ضرورت پر روسو نے بہت کچھ لکھا۔ اُس نے اٹھارھویں صدی کی عقلیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا اور ایمان اور ایقان کی تلقین کی۔ کانٹ نے عقل کی قوت پر تنقید کی اور اس کے حدود متعین کئے تاکہ وہ اعتقاد کے لئے جگہ پیدا کر سکے۔

فطری مذہب کے پیرو مظاہر فطرت کے ذریعہ خدا تک پہونچنا چاہتے تھے وہ نوامیس فطرت میں خدا کا جلوہ دیکھتے تھے بلکہ بعض تو فطرت اور خدا میں بہ مشکل فرق کرتے تھے مثلاً ہیگل۔ فطری مذہب کے قوانین کا علم انسان کو اسی طرح ہو سکتا ہے جس طرح انسان تجربہ کے ذریعہ خارجی فطرت کے قوانین معلوم کر سکتا ہے۔ فطری مذہب کا تخیل کلیتاً عقل پر مبنی ہے۔

فطری مذہب کی تعلیمات نے بہت کچھ رواقیت کے قدیم فلسفہ کے ماتحت نشو و نما پائی ہے۔ سولہویں اور سترھویں صدی میں رواقیت کے اثرات خاص طور پر بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ڈلتھائی کا میلنشتون کے متعلق جو لوتھر کا ایک زبردست ساتھی تھا خیال ہے کہ اُس نے فطری مذہب کا تصور کلیتاً رواقیت سے لیا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں جرمن عقلیین اور انگریز الہیئین کے یہاں بھی اس فلسفہ کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ رواقیت ایک خالص اخلاقی نظام تھا جو انسانی جذبات اور خواہشات

پامال کرنا چاہتا تھا اور اسی بنا پر وہ ترک دنیا کی تعلیم دیتا تھا۔ رواقیت کے زیر اثر جدید تحریکات اور قدیم رواقیت میں یہ فرق ہے کہ اوّل الذکر میں ترک دنیا کی تعلیم نہیں ہے البتہ عقل کی اہمیت میں دونوں متفق ہیں۔

عقل کا مفہوم عہد جدید اور عہد قدیم میں مختلف ہے۔ ہر زمانہ کے فلسفیانہ اصطلاحات اُس زمانہ کے تمدن سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اس زمانہ کی ذہنی، سیاسی، مذہبی، غرض کہ کل نفسی زندگی کے مظہر ہوتے ہیں۔ عقل کو یونانی میں RATIO کہتے ہیں جس کا صحیح مفہوم کسی زبان کے ترجمہ میں ادا نہیں ہو سکتا۔ یونانی اصطلاح میں تناسب اور ہم آہنگی پر زور دیا گیا ہے۔ عقل کے جدید مفہوم میں مذہبی عناصر بھی کام کرتے ہیں جو عیسائیت کے باعث جدید فلسفیانہ فکر میں داخل ہوئے ہیں۔ یونان کی قدیم عقلیت میں ان مذہبی عناصر کا وجود تک بھی نہ تھا۔ اسی بنا پر قدیم و جدید عقلیت میں بھی بہت فرق ہے جدید مغربی اقوام کا گذشتہ یونانی اثرات کو قبول کرنا صرف نقالی نہ تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ اُس زمانہ کی اور اپنی نفسی زندگی میں مشابہت پاتے تھے۔ اس لئے اُس طرف رجوع ہوتے تھے۔ جدید مغربی اقوام نے یونانی تمدن سے متاثر ہوتے ہوئے بھی اپنی مخصوص نفسی کیفیت کو کبھی ترک نہیں کیا۔ مختصر یہ کہ رواقیت کے زیر اثر اٹھارھویں صدی عیسوی میں مغربی زندگی میں عقلیت کے عناصر شامل ہو گئے اور اُس کے ماتحت فطری مذہب اور مساوات انسانی کے تصورات نے پرورش پائی۔

۹۔ تحریک انسانیت کے سب سے بڑے علمبردار لاک، روسو، اور کانٹ گذرے ہیں۔ روسو نے جہاں اُس زمانہ کے کلیسا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی وہاں فرانس کی استبدادی حکومت کی بھی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔ اپنی مشہور عالم کتاب "معاہدہ عمرانی" میں اس نے انسانیت کا تخیل پیش کیا۔ آزادی اُس کے نزدیک انسان کا فطری حق ہے۔ "انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن ہر جگہ پا بہ زنجیر ہے" اس کی کتاب کا یہ پہلا جملہ ہے جس نے فرانس میں آتش انقلاب بھڑکا دی۔ آزادی، مساوات اور اخوت کے علم کے نیچے بالآخر فرانس کا خونی انقلاب رونما ہوا۔ جس کے ذریعہ استبدادی شخصی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ قدیم شخصی جابرانہ روح گو کہ متعدد مرتبہ اپنا اثر دکھاتی رہی مگر آزادی اور حریت کے خیالات بالآخر تمام

یورپ میں پھیل گئے۔ کانٹ بھی انسانیت کی تحریک کا زبردست علمبردار تھا۔ وہ اقوام کی مساوات کا قائل تھا اور آن کی ایک ریاست عہدی قائم کرنا چاہتا تھا۔ جہاں انصاف اور آزادی کا دور دورہ ہو اور تمام اقوام امن و امان کے ساتھ زندگی گذار سکیں۔

ان تعلیمات کے زیر اثر یورپ کی تمام شخصی سلطنتوں کا تدریجاً خاتمہ ہوگیا اور قومیت کی بنیادوں پر جدید ریاستیں قائم ہوگئیں۔ زمانہ متوسط کا قدیم نظام جو قوم کی سہ گونہ یعنی جمہور، روسا اور کلیسا کی تقسیم پر مبنی تھا درہم برہم ہوگیا۔ روسا اور اہل کلیسا یا تو فنا کر دئے گئے یا آن کا اثر بہت ہی کم ہوگیا۔ مذہبی ادارے قومی حکومت کے ماتحت کر دئے گئے اور حکومت جمہور کو جواب دہ قرار دی گئی۔

انسانیت کے متعلق رواقیت کے قدیم عقلی تصور نے اس روح کے پیدا کرنے میں بہت مدد پہونچائی۔ پھر جدید زمانہ کی سائنٹفک تحقیقات اور جدید نظام معاشی نے جو انفرادیت پر مبنی تھا ان خیالات کو اور بھی ترقی دی۔ دولت اب صرف چند روساء کے پاس ہی نہ تھی بلکہ صنعت و تجارت کے باعث سوسائٹی کے دوسرے افراد بھی امیر ہوگئے۔ دولت کے ساتھ انھوں نے سماجی اور سیاسی حقوق کا بھی مطالبہ کیا اور انسانی حقوق کی تحریکات ہر قوم میں زور پکڑتی گئیں۔

۱۰۔ تحریک تصوف | عہد جدید پر تصوف کے اثرات سب سے زیادہ ہمہ گیر مرتب ہوئے۔ نوفلاطونیت نے جو کلیتاً ایک نظام تصوف ہے مغربی زندگی میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔ رواقیت عقل پر مبنی تھی۔ نوفلاطونیت وجدان پر۔ عقل اور وجدان یہی دونوں عناصر ہیں جن کے باہمی امتزاج سے اٹھارھویں صدی کی نفسی زندگی کی تشکیل ہوئی ہے۔ جس میں موخر الذکر عنصر کا اثر زیادہ پایا جاتا ہے۔ اکثر مذہبی تحریکات تصوف کے زیر اثر پیدا ہوئیں۔ ارنسٹ ٹروِلش نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جدید تمدنی روح کے پیدا کرنے میں مذہبی تحریکات کا بہت زیادہ اثر ہے۔ جدید زمانہ کی تمدنی اصلاحات مثلاً "آزادی" "انفرادیت" "ناسوتیت" وغیرہ سب مذہبی روح کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ آزادی کا خیال اس طرح شروع ہوا کہ انسانی عقل خود کو زمانہ متوسط کے کلیسا کی ذہنی غلامی سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ مذہبی آزادی کے اس تصور نے بعد میں ایک سیاسی صورت اختیار کر لی۔ ہابس مذہبی معاملات میں کلیسا کا مخالف نہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ

. ب. نیا کے معاملات صرف عقل کے ذریعہ حل کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری دنیا کے معاملات کے متعلق عقل کوئی فیصلہ نہیں صادر کر سکتی لیکن یہی مذہبی آزادی کے خیالات فرانس میں پہونچے تو انھوں نے ایک مادی شکل اختیار کرلی۔ چنانچہ والتیئر اور دائرت العلوم کے مرتب کرنے والوں کا فلسفہ اسی کا مظہر ہے۔ آزادی کے خیالات نے شروع میں کلیسا کے زیر سایہ تربیت پائی مگر بعد میں یہ خیالات خود کلیسا کے خلاف کام کرنے لگے۔

انگلستان میں اس زمانے میں ایک اور تحریک جاری تھی جو ہابس کے عقلی فلسفہ کے خلاف تھی۔ اس کے علمبردار شافٹسبری اور کیمبرج کے افلاطونی تھے۔ وہ مذہب کی بنیاد عقل پر نہیں بلکہ دل پر رکھتے تھے۔ شافٹسبری کا مذہبی تصور جمالی تھا۔ اس کے نزدیک خدا کے زیر اطاعت کائنات کا نظام اسی طرح ہم آہنگ و متناسب ہے جس طرح ایک حسین بت، ایک دلکش نغمہ یا ایک مکمل مرقع ہوتا ہے۔ یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ عقل انسانی زندگی میں جوش و خلوص پیدا نہیں کر سکتی اور نہ وہ انسان میں نیکی پیدا کر سکتی ہے جو کہ مذہب کی اصل جان ہے۔

۱۱۔ تصوف و سیاست | آزادی کے تصور کے تحت میں انفرادیت کا تصور پیدا ہوا۔ آزادی کی ضرورت اسی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے جب کہ فرد کی اس طرح نشوونما ہو کہ وہ مکمل ہو جائے۔ یہی مفہوم انفرادیت کا ہے۔ روسو نے جو آزادی کی تعلیم دی تھی۔ اس کو لوگوں نے غلط سمجھا۔ آزادی سے اس کا یہ مفہوم نہ تھا کہ جماعت کے مفاد کو قربان کر کے فرد اپنی نشوونما کرے حقیقتاً ناممکن ہے۔ اس کے پیش نظر آزادی کا ہمیشہ ثبوتی پہلو تھا جس میں فرد اور جماعت کا مفاد ہم آہنگ ہے۔

سترھویں صدی میں آزادی اور انفرادیت کے جو خیالات انگلستان میں مروج تھے وہ اٹھارھویں صدی میں فرانس میں پہونچے اور انیسویں صدی میں فرانس سے جرمنی میں۔ لیکن ہر قوم نے ان تصورات کو ایک مخصوص قومی رنگ دیدیا۔

یہ آزادی اور انفرادیت کے خیالات نتیجہ تھے تصوف کے جس کی ابتدا لوتھر کے زمانہ سے ہو چکی تھی۔ کوئی مذہب بغیر ناسوتیت کے قائم نہیں رہ سکتا۔ مغرب کا انسان بھی خدا کا بلاواسطہ مشاہدہ

کرنا چاہتا تھا۔ اسی بنا پر اس نے فطرت کے مطالعہ کی طرف توجہ کی۔ چنانچہ علوم میں وہ تجربیت کا قائل ہوگیا۔ استقرا کے بجائے استخراج پر زیادہ زور دیا جانے لگا۔ سیاست میں وہ اپنا نظام خود بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اُس نے پرانے ریاستی نظام کو مسمار کر ڈالا اور حریت و مساوات کی بنا پر نئی قومی سلطنتوں کی تشکیل کی۔ یہ تمام باتیں ایک ہی کیفیت نفسی کے مختلف مظاہر ہیں۔ عیسائیت کا ہمیشہ سے خیال رہا کہ خدا کے متعلق سب کچھ معلوم نہیں ہو سکتا اور نہ اس کا احساس کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں یہ مذہبی تصور بالکل بدل گیا۔ اس کی جگہ یہ خیال رائج ہوگیا کہ انسان اپنے ضمیر اور اعمال کے ذریعہ بلا واسطہ خدا تک پہونچ سکتا ہے۔ تمام زندگی اور تمام کائنات میں خدا کو دیکھا جا سکتا ہے۔ اُسے کہیں عقل، کہیں فطرت، کہیں جوہر، کہیں روح کل، کے ناموں سے نامزد کیا گیا ہے۔ وحدت الوجود کی تحریک نے اس زمانہ میں بہت اہمیت اختیار کر لی۔ اسپنوزا، گوئٹے، ہیگل وغیرہ سب اسی تحریک سے متاثر نظر آتے ہیں۔ گو کہ اُنھوں نے اظہار خیال کے لئے مختلف فلسفیانہ اصطلاحات استعمال کیں۔

نوفلاطونیت، تصوف، یا وحدت الوجود کی یہ تحریک عہد قدیم سے برابر چلی آرہی تھی۔ عربوں نے اس چیز کو زندہ رکھا اور بعض اسلامی حکمار کے یہاں اس تحریک نے اسلامی تعلیمات کے تحت میں رہ کر ایک منظم شکل اختیار کر لی تھی۔ عہد متوسط میں بھی یہ دھارا برابر بہتا رہا۔ رومی تصوف فرانس کے اعلیٰ طبقوں میں عام طور پر رائج تھا۔ اندلس کے عربوں اور یہودیوں میں بھی یہ چیز موجود تھی۔ جہاں سے یہ فرانس میں داخل ہوئی۔ فرانس میں یہ کیتھولک کلیسا کے خلاف سمجھی گئی اس لئے اس کی مخالفت کی گئی۔ یہ روح وہاں سے ہالینڈ پہونچی جہاں اصول رواداری کے تحت میں اُس کو نشو و نما پانے کا موقع مل گیا۔ ہالینڈ سے وہ انگلستان گئی جہاں تحریک آزادی کے پیدا کرنے کا باعث ہوئی۔ انگریز مہاجرین اس کو اپنے ساتھ امریکہ لے گئے نئی دنیا سے یہ آزادی اور سیاسی حقوق کا جامہ پہن کر پھر فرانس واپس آئی جہاں انقلاب فرانس کا باعث ہوئی۔ اس تعلیم کی جان یہ ہے کہ صرف انسان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا مقدس ہے اور جلوۂ ایزدی کی مظہر ہے۔

ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں ؎ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

(غالب)

فطرت میں سوائے روح کے کوئی دوسری چیز کار فرما نہیں ہے۔ تمام اشیاء میں 'روح کل' موجود ہے۔ تمام نفسی اور تاریخی زندگی میں خدا ہے۔ انسان چاہے جو کچھ سوچے اور کرے مگر وہ فطرت اور خدائی نظام (قسمت) سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ خدا انقلابات، جنگوں، تباہیوں اور مصیبتوں کے ذریعہ انسان کو حقیقی صداقت تک پہنچاتا ہے ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا۔ (غالب)

تاریخ کا صحیح مطالعہ انسان کو خدا تک پہونچا دیتا ہے۔ انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ بربادیاں انسان کی بحیثیت مجموعی ترقی کے لئے از بس ضروری ہیں۔ تعمیر کے لئے تخریب شرط اولین ہے ؎

ہر بنائے کہنہ کآباداں کنند
اوّل آن تعمیر را ویراں کنند۔ (رومیؒ)

ہم آہنگ و دلکش موسیقی کے لئے مدھم اور زوردار سروں کی ضرورت ہے۔ سیاہ رات کی ہیبت ناکی صبح کی دلفریبی کے لئے شرط لازمی ہے۔

اسپنوزا کے فلسفہ وحدت الوجود میں تصوف کا اثر واضح طور پر نمایاں ہے۔ اُس کے یہاں فطرت سے مفہوم تصوف کا 'جوہر' اور 'حقیقت' ہے۔ فطرت اُس کے یہاں عقل کی طرح صاف اور واضح نہیں ہے بلکہ زندہ اور نامی ہے۔

۱۲۔ <u>تصوف و فلسفہ تاریخ</u> فلسفہ تاریخ کی بنیادیں بھی تصوف پر استوار ہیں۔ ہرڈر کے "فلسفہ انسانیت پر خیالات" میں بھی یہی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس فلسفہ کا بنیادی خیال یہ ہے کہ انسان اہلیت میں تمام نظام کائنات سے مربوط ہے۔ ہرڈر کے خیالات پر یونانی تصوف کا اثر پڑا ہے اور یونانیوں نے یہ خیالات اہل ایران سے لئے تھے۔ انسان کی جسمانی اور نفسانی عناصر، کائنات کے عناصر کے مشابہ ہیں۔ اس لئے انسانیت کا اصل ارتقا یہی ہوگا کہ انفرادی انسانی عناصر کل نظام کائنات کے عناصر میں کلیتاً شامل ہو جائیں۔

نظریہ ارتقا جس نے بہ ظاہر مذہب عیسوی کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں وہ بھی عمیق مذہبی تصور پر قائم ہے۔ اس نظریہ میں مابعد الطبعیاتی عوامل بھی کام کر رہے ہیں۔ رجائیت اور امید کا خیال نظریہ ارتقا کی جان ہے۔ ادنیٰ مادہ سے ترقی کرتا ہوا انسان اعلیٰ مدارج کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ارتقا چونکہ اعلیٰ منازل کی طرف ہے اس لئے یہ صرف ایک مکمل ہستی یعنی خدا ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کا دوسرا بنیادی مسئلہ نیکی اور بدی کا ہے۔ تعمیر و تخریب کو ایک منضبط نظام میں پیش کرنے کی کوشش اس عہد کے اکثر فلاسفہ نے کی ہے۔ بالآخر ہیگل نے اس کو ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں پیش کیا اور اس کو اپنے فلسفہ کے تین تصورات سے حل کرنے کی کوشش کی۔ ہیگل کے نظریہ کے مطابق دنیا میں ہر چیز کا ایک "وجود" ہوتا ہے جو لازما ایک اپنا "وجود مخالف" پیدا کر لیتا ہے "وجود" اور "وجود مخالف" دونوں پر حاوی ہو کر "وجود ترتیبی" بالآخر ان میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔

غرضیکہ اٹھارھویں صدی کے مذہبی تصور میں عقل اور وجدان کے عناصر ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں۔ اس تصور کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ عام طور پر اقوام میں ایک اجتماعی احساس پیدا ہو گیا۔ جذباتی عناصر زندگی پر حاوی ہو گئے۔ فطری مذہب کا یہ تصور صرف ذہنی تفکرات کا نتیجہ نہ تھا اور نہ رواقیت کی اندھی تقلید تھی بلکہ حقیقت اعلیٰ کا احساس اس زمانہ کی زندگی کا جزو اعظم ہو گیا تھا۔

۱۴۔ تصوف و نظریہ علم | نظریہ علم و تصوف میں بھی قریب کا تعلق پایا جاتا ہے۔ مغرب کے علوم جدیدہ میں نظریہ علم کو خاص طور پر اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ فلسفیانہ نظام سے پہلے نظریہ علم کے مسائل سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کا مبحث یہ ہے کہ انسان کو اپنے نفس اور خارجی اشیاء کا کس حد تک علم ہو سکتا ہے۔ علم کی ماہیت اصلی کیا ہے۔ نفس بالذات کیا چیز ہے۔ پھر نفس انسانی کی ایک زبردست قوت یعنی عقل کس حد تک اشیاء کی حقیقت معلوم کر سکتی ہے۔ کائنات کی گتھیاں سلجھانے میں کس حد تک عقل کو دسترس حاصل ہے۔ وہ کہاں عاجز ہے۔ انھیں مسائل سے جرمنی کے مشہور ترین فلسفی کانٹ نے اپنی کتاب "تنقید عقل" میں بحث کی ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ عقل صرف ایک حد تک انسان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ مابعد الطبعیاتی مسائل مثلاً سزا و جزا، بقائے روح اور خدا کو

مسائل کے متعلق وہ کوئی حتمی فیصلہ پیش نہیں کرسکتی۔ یہ مسائل عقل کے حدود سے باہر ہیں اور یہاں صرف ایمان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ نظریہ علم سب سے پہلے نفس کے وجود اور اس کی ماہیت سے بحث کرتا ہے جس طرح کہ فلسفہ جدید کے بانی ڈیکارٹ نے کیا تھا۔ ڈیکارٹ کا خیال ہے کہ انسان ہر چیز پر شک کرسکتا ہے لیکن اس پر شک نہیں کرسکتا کہ وہ خود شک کر رہا ہے۔ خود پر شک کرنے سے خود نفس انسانی کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ لیکن شک کرنا نفس انسانی کا صرف عقلی پہلو ہے۔ انسانی نفس کے عقلی پہلو سے نظریہ علم بحث کرتا ہے۔ مگر نفس انسانی کے دیگر پہلو بھی ہیں مثلاً جذبہ، حس، خواہش وغیرہ۔ نفس انسانی بہ حیثیت مجموعی بھی عمل کرتا ہے۔ انسانی نفس کے اس مجموعی فعل سے تصوف بحث کرتا ہے۔ اس جامع فعل میں انسان کا علم، اس کے جذبات اور حسیات وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہوتے ہیں۔ فلسفہ صرف عقل اور ان علوم سے بحث کرتا ہے جس میں عقل کی دست رس ہو برخلاف اس کے تصوف نفس انسان کی مجموعی کیفیت سے۔ اسی باعث وہ تمام علوم کے لئے بنیاد کا کام دیتا ہے۔

اٹھارھویں صدی عیسوی میں میڈم ڈی گایان ایک زبردست صوفی گذری ہے۔ اس کا قول ہے کہ اس کی روح ایک آئینہ کے مانند ہے جس میں حقیقت کا جلوہ صاف دکھائی دے سکتا ہے۔ اس فعل کو مختلف ناموں سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً 'داخلی روشنی'، 'مقدس روح'، 'محبت'، 'جذبہ'، 'احساس'، 'وجدان' وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی کا یہ مجموعی فعل غیر منقسم ہے جس میں علم، محبت، ارادہ اور جذبہ وغیرہ سب ہی کچھ شامل ہیں۔ جس طرح کہ خوشبو پھولوں میں بسی ہوئی ہوتی ہے اسی طرح خدائی روشنی اور ایزدی محبت سے تمام انسانیت معمور ہے۔ یہی فعل تمام گہرے علم کی بنیاد ہے اور اسی پر مذہبی فکر استادہ ہے۔ مالیبرانش کی عقل، اسپینوزا کی ذہنی محبت، کانٹ کا مافوق الطبعی ادراک، روسو کا جذبہ سب اسی بنیادی فعل کی مختلف شکلیں ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان اصطلاحات میں کچھ فرق نہیں ہے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ان کی اصل ضرور تصوف کے اسی بنیادی فعل "وجدان" پر استادہ ہے۔ نیکی کا تصور لازمی طور پر اس کے ساتھ وابستہ ہے۔ زندگی کے تمام شعبے نفس انسانی کے

اس بنیادی فعل میں آکر مجتمع ہو جاتے ہیں۔ یہاں مذہب اور اخلاق، نظریہ اور عمل ایک دوسرے سے متحد ہوتے ہیں اسی باعث حقیقت اعلیٰ کے حصول میں نفس انسانی کی تمام قوتوں کا باہم مربوط ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ لیکن نفس انسانی میں ہمیشہ یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ کائنات کے عقلی حل کی طرف مائل ہو۔ یہی کیفیت ڈیکارٹ کی ہوئی۔ سقراط اور افلاطون عہد قدیم میں عقلیت کی طرف مائل ہوئے۔ یہاں سے فلسفہ شروع ہوتا ہے اور مذہبی وجدان پر ختم۔ لیکن غیر شعوری طور پر مذہبی احساس ضرور کام کرتا رہتا ہے۔ ڈیکارٹ کہتا ہے کہ "ہر فرد" بلا واسطہ خدا سے تعلق رکھتا ہے۔" مالیبرانش کا قول ہے کہ تمام اشیار کا وجود خدا میں ہے۔ غرض کہ ہم نے دیکھا کہ مغربی ذہن صدیوں تک نظریہ علم کے خشک مباحث میں بیکار مصروف نہ رہا بلکہ وہ اپنے نفس اور خارجی دنیا کی جستجو میں حقیقت اعلیٰ کی تلاش کرتا رہا اور ہنوز کر رہا ہے۔

۱۴۲۔ تصوف وعلم الاخلاق | تصوف اور اُس نظریہ اخلاق میں جو عینیت پر مبنی ہے بہت گہرا تعلق ہے نفس انسانی کی اصلیت اور سادگی کو ترک کر دینے سے ہر قسم کی بدی پیدا ہوتی ہے۔ نفس انسانی کا اپنی اصلیت پر برقرار رہنا ہی اصل نیکی ہے۔ مختلف احساسات انسانی روح کو برباد کر ڈالتے ہیں لیکن انسانی روح میں خدا کے وجود کا احساس دوسرے تمام احساسات پر غالب آجائے تو وہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ دوزخ اور جنت کی امید میں نیکی کے خیال کو میڈیم دی گایان نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ صرف خدا کی محبت اصل چیز ہے۔ خدا اگر تکلیف بھی پہونچائے تو اُس سے محبت کرنا چاہئے۔ رکابی کا پانی جس طرح اپنے اردگرد کے پانی کے قطروں کو کھینچ لیتا ہے اسی طرح خدا کی محبت اہل علم کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ علمار کو علم کی محبت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ اس طرح خدا کی ایک صفت کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ علم روح انسانی کو ایک اندرونی تسکین دیتا ہے۔ اہل علم کو مادی قیود سے اپنی آزادی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ روحانیت کی بلند فضاؤں میں پرواز کرتے ہیں۔ انسان کو اپنی آزادی کا صحیح احساس اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ جان بوجھ کر خود کو خدا کی مرضی کے حوالہ کر دے اور اس طرح خود اپنی فطرت اصلی کو پائے۔ قوانین آزادی درحقیقت تمام دنیا میں جاری ہیں۔ روحانی آزادی میں انسان دنیا کی تمام چیزوں کو

حقیر اور ادنی خیال کرتا ہے۔ گناہوں میں اس کے لئے کوئی لذت باقی نہیں رہتی۔ نفس انسانی کو حقیقت اعلیٰ کی بلندیوں تک پہونچا دینا ایک نہایت ہی انفرادیت پسند اخلاقی تعلیم ہے۔ لیکن انسان جب خدا کے ساتھ نظام کائنات میں شریک ہو جاتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس نظام کائنات کے دوسرے اراکین کا بھی خیال رکھے۔ چنانچہ اجتماعیت کا خیال خود بخود پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ اس تعلیم کی بنا پر انسان کو کلیسا کے خیال کے مطابق بد نہیں خیال کیا جا سکتا بلکہ انسان اور اس کی نیکی کی قوتوں پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔ شافٹسبری ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جزا اور سزا کا ہمیشہ ذکر انسان کو ذلیل کرتا ہے۔

خوشی جو اخلاقی اعمال کا نتیجہ ہے خارجی اشیار کا حصول نہیں ہے بلکہ نفس کی داخلی ہم آہنگی کا نام ہے۔ وہ ہم آہنگی جو اصلیت سے تعلق کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کے باعث اپنی اور غیر کی محبت ہم معنی الفاظ ہو جاتے ہیں۔ اس تعلیم کا لازمی نتیجہ قسمت پر یقین ہے یعنی یہ کہ نظام کائنات کی زنجیریں باہم ازل سے مربوط ہیں۔ قسمت پر اعتقاد کے باعث دنیا میں عظیم الشان ہستیاں پیدا ہوئی ہیں لوتھر قسمت کا بہت قائل تھا۔

۱۵۔ تصوف و مذہب | صوفیا کا یہ گروہ اس زمانہ کے کلیسا کا سخت مخالف تھا اور اس پر نکتہ چینی کیا کرتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ کلیسا کو مذہب کی حقیقت کا بالکل علم نہیں ہے وہ عیسائیت کے مفہوم تک سے ناآشنا ہے لیکن اس گروہ کے اثرات اعلیٰ طبقوں ہی تک رہے کیونکہ عوام الناس کے ذہن کی رسائی ان تعلیمات تک نہ ہو سکتی تھی سب سے پہلے روسو نے یہ مسائل جمہور کے سامنے چھیڑے۔

روسو ایک جذباتی انسان تھا اور اس میں عمیق مذہبی احساس پایا جاتا تھا۔ اٹھارویں صدی کی زندگی کے تضاد کو جو عقلیت اور تصوف کے باعث پیدا ہو گیا تھا اس نے شدت سے محسوس کیا اور جمہور کو اس طرف توجہ دلائی۔ اس زمانہ کے دو متضاد پہلو مادی اور روحانی تھے۔ ایک طرف تو اس صدی میں تجربیت اور علوم عقلیہ کا دور دورہ تھا دوسری طرف عینیت اور تصوف پر مبنی اخلاقی نصب العین کا اثر بھی موجود تھا۔ اس زمانہ کا انسان اس کشمکش میں مبتلا تھا۔ روسو کے نزدیک اس تضاد کو دور کرنا اخلاق اور تعلیم کا فریضہ قرار پایا۔

اُس زمانہ کا عام تمدن انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ کلیسا کی زندگی بہت تنگ ہو گئی تھی جو اخلاقی ضروریات کے لئے ناکافی تھی۔ تجربیت اور مادیت انسانیت کو ہلاکت کے قریب لئے جا رہی تھی۔ ایسے پر آشوب زمانہ میں انسان کو صرف تعلیم ہی کے ذریعہ ہلاکت سے بچایا جا سکتا تھا۔ تعلیم کا مفہوم یہ ہے کہ انسان بالارادہ بچوں اور نوجوانوں کو ایک تمدنی مقصد کے لئے تیار کرے۔ اسی باعث روسو کی توجہ تعلیم کی طرف ہوئی اور اُس نے اپنی کتاب "ایمل" مرتب کی جس میں جماعت سے علٰحدہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا تخیل پیش کیا گیا ہے۔ تعلیمی دنیا میں اس کتاب نے اسی طرح انقلاب پیدا کر دیا جس طرح "معاہدہ عمرانی" نے سیاسی دنیا میں کر دیا تھا۔ جماعت چونکہ انسان کو خراب کر دیتی ہے اس لئے صحیح تربیت کے لئے اس سے علٰحدگی ضروری ہے۔ پھر تعلیم ایک فطری نامی فعل ہے لاک کے تعلیمی نظریہ کے مطابق اشیاء کا علم نفس انسانی میں باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا بلکہ انسان کے جسمانی، ذہنی اور اخلاقی قویٰ کی فطری نشو و نما کا نام تعلیم ہے۔ روسو کے نزدیک تعلیم ایک ثبوتی نہیں بلکہ منفی فعل ہے یعنی خراب اثرات سے بچوں اور نوجوانوں کو محفوظ رکھنا تعلیم کا اوّل ترین فریضہ ہے روسو کی جوانی گینیف میں گذری جو اُس زمانہ میں مذہبی صوفیانہ تحریکات کا مرکز تھا۔ روسو کو یہ باتیں خاندانی ورثہ میں ملی تھیں۔ روسو میں جو خوبی کی تنقید، بلندی تخیل، محبت، درد کا احساس وغیرہ پایا جاتا ہے یہ سب اسی شدید مذہبی احساس کا نتیجہ ہے۔ وہ اس زمانہ کے تمدن کا ناقد تھا اور اس سے بہتر وہ کوئی دوسرا فریضہ اخلاقی ادا بھی نہیں کر سکتا تھا۔

مغربی تمدنی تحریکات کے اس سرسری مطالعہ سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ جدید مغربی تمدن صرف مادیت پر مبنی ہے کس قدر سطحی خیال ہے۔ یہ سطحی خیال بدقسمتی سے عام طور پر ہندوستان میں رائج ہے جو مشرق و مغرب کی مفاہمت میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے! افراد اور جماعتیں مغرب میں بھی ضرور مادہ پرست اور متشکک گذری ہیں لیکن مغرب کی ہمہ گیر عظیم الشان تحریکات کی اصل بنا ہمیشہ مذہبی جذبہ ہی رہا۔ کوئی پانی کا دھارا جب تک اُس کا تعلق اپنے سرچشمہ حقیقی سے نہ ہو صحیح معنوں میں طاقتور نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی انسانی تحریک جب تک اُس کا تعلق انسانی زندگی کی اصل ایزدی بنیادوں سے نہ ہو موثر نہیں ہو سکتی۔ ✻

ہندی کے منتخب دوہے

(۱)

آسکر وائلڈ کا ایک مقولہ ہے کہ" انسان جس بدترین گناہ کا سزاوار ہو سکتا ہے وہ بیوقوفی ہے" کئی مشرقی زبانوں میں یہ مقولہ ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے کہ" بیوقوف دوست سے عاقل دشمن بہتر" واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بیوقوفوں کی کثرت نے عاقل کی زندگی حرام کر رکھی ہے۔ عاقل ان بیوقوفوں کا نہ کچھ بگاڑ سکتے ہیں، نہ ان سے بدلہ لے سکتے ہیں اور نہ انھیں صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر سکتے ہیں مجبوراً بھگتتے ہیں اور ان کے کرتوتوں سے جو رنج پہنچتا ہے اسے دور یا کم کرنے کے لئے نظم و نثر میں بیوقوفوں کا مذاق اڑاتے ہیں یا ان پر نظری نقطہ نظر سے تنقید کرتے ہیں۔

اسی قسم کے دو تنقیدی دوہے سن لیجئے۔

ज्ञानी से ज्ञानी लड़े ज्ञान सवाया होय ।
ज्ञानी से मूरख लड़े तुर्त लड़ाई होय ॥

ज्ञान (گیان) - علم   ज्ञानी (گیانی) - عالم، عقلمند
मूरख (مورکھ) - بیوقوف   तुर्त (ترت) - فوراً

گیانی سے گیانی لڑے گیان سیوایا ہوئے
گیانی سے مورکھ لڑے ترت لڑائی ہوئے

"جب کسی عالم کی بحث کسی عقلمند سے ہوتی ہے تو دونوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے مگر جب عالم اور بیوقوف میں بحث ہوتی ہے تو فوراً لڑائی ہو جاتی ہے"

دوہے کا یہ ٹکڑا" گیان سیوایا ہوئے" بالکل حقیقت پر مبنی ہے۔ دو عاقلوں کے درمیان جب کبھی بحث ہوتی ہے تو ہمیشہ طرفین ہی کا فائدہ نہیں بلکہ عاقل سامعین کا بھی ہوتا ہے۔

(۲)

قرونِ وسطیٰ کے مشہور درویش کبیر صاحب سچ کہتے ہیں کہ " بیوقوفوں کے منہ لگنا ہی بے کار ہے " اس معمولی نصیحت کو پُر اثر بنانے کے لئے دیکھئے کبیر نے کیسی عمدہ تشبیہ دی ہے۔

मूरख से कहिये कहा कहत कबीर लजाय।
अंधे आगे नाचते कला अकारत जाय ॥

मूरख (مُورکھ) - بیوقوف　　लजाय (لجاے) - شرم آئے
कला (کلا) - فن۔ کمال　　अकारत (اکارت) - بیکار

مورکھ سے کہئے کہا ؟ کہت کبیر لجائے
اندھے آگے ناچتے کلا اکارت جائے　　(کبیر)

" بیوقوف سے انسان کہے تو کیا کہے ؟ اے کبیر کچھ کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ اندھوں کے آگے ناچنے سے فن رقاصی بیکار جاتا ہے "

اُردو میں ایک مثل مشہور ہے کہ " اندھے آگے روئے اپنی آنکھیں کھوئے " کبیر صاحب کی تشبیہ اُردو کی ضرب المثل سے بدرجہا بہتر ہے کیونکہ اندھوں کے آگے رونے سے اندھوں کو بھی یقیناً رونے کا احساس ہوتا ہے۔ رونے میں آواز کی قدرتی تبدیلی یا ہچکیوں ہی سے نابینا اشخاص بآسانی رونے کا احساس کرسکتے ہیں مگر رقاصی کے کمال کو وہ کسی طرح محسوس نہیں کرسکتے لہذا " اندھے آگے ناچتے کلا اکارت جائے " میں جو بلاغت ہے وہ اُردو ضرب المثل میں کہاں ؟

(۳)

ہندی شاعری کے مخصوص انداز سوال و جواب میں ایک ہندی شاعر شرافت کا معیار قائم کرتا ہے تمثیل کے پردے میں نہ صرف انسانی فطرت کی یہ خوبی ظاہر کی گئی ہے بلکہ شاعرانہ انداز میں ایک درسِ اخلاق دیا گیا ہے اور انسانیت کی تلقین بھی کی گئی ہے۔

जल काठै बोरै नहीं कहो कहां की प्रीति।

अपनो सींचा जान कें यही बड़ित की रीति ॥

काठ (کاٹھ)۔ لکڑی — बोरे (بورے)۔ ڈبوے

प्रीत (پریت)۔ محبت — रीति (ریت)۔ طریقہ

جل کاٹھے بورے نہیں کہو، کہاں کی پریت
اپنو، سینچو جان کے یہی بڑن کی ریت

"پانی لکڑی کو ڈبوتا نہیں ہے! بتاؤ یہ کہاں کی محبت ہے؟ اپنا ہی سینچا ہوا جان کر (پانی لکڑی کو نہیں ڈبوتا) یہی بڑے آدمیوں کا شعار ہے۔"

نازک خیالی اور معنی آفرینی تو کمال کی ہے مگر شاعری کے پردے میں جس عمدگی سے نصیحت کی گئی ہے وہ کمال ہے۔ ایک ہی دوہے میں ایک بیان واقعہ (جل کاٹھے بورے نہیں) ایک سوال (کہو کہاں کی پریت) ایک شاعرانہ توجیہہ (اپنو سینچو جان کے) اور ایک نصیحت (یہی بڑن کی ریت) جس پُرلطف طور پر جمع کئے گئے ہیں وہ داد کے مستحق ہیں۔

(۴)

دنیا کا حقیقی دستور دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مساوی حالات اور یکساں صورتوں میں بھی انسان کا رویہ بالکل مختلف رہتا ہے۔ عزیز داری کا خیال، پیر و مرشد کا پاس، حکام بالا کی چاپلوسی، امیروں کی خوشامد، تمغوں اور انعاموں کی ہوس سے متاثر ہو کر انسان اوروں کی قدر کرتا ہے اور ہر شخص کی قدر و منزلت اس کے رنگ و روپ، خاندان و قومیت، ملت و مذہب، تعلقات اور اثرات کے مطابق ہوتی ہے۔ کوئی مشہور عالم فلسفی یا مدبر کسی علمی انجمن یا جلسے میں تقریر کرنیوالا ہوتا ہے تو لوگ سینکڑوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں۔ یہ علم کی قدردانی یا علم پروری نہیں ہے بلکہ محض ایک مشہور ہستی کو دیکھنے کا شوق، محض ایک نیکنام یا بدنام آدمی کو سن لینے کی تمنا تاکہ بعد میں یار دوستوں کی صحبت میں شناساوں کی محفل میں یہ کہنے کو ہو سکے کہ ہم نے فلاں فلسفی کو علمی مسائل کی تشریح و توضیح کرتے سنا ہے۔ کوئی مشہور شاعر کسی مشاعرے میں نظمیں پڑھنے والا ہے تو مشاعرہ بھرا رہتا ہے مگر شرکت کی غرض ادبی ذوق یا شعر و شاعری کا مذاق، یا زبان

سے دلچسپی نہیں بلکہ " سیر و تفریح " " مشہور شعرا کو سننے کی تمنا ' انھیں دیکھ لینے کی آرزو۔ اس وقت کا کچھ اور ہی عالم ہوتا ہے جبکہ ہوا و ہوس کے ساتھ ساتھ غرض و مصلحت بھی نیہاں ہوں۔ حاکم وقت کی تقریر ہو' لاٹ صاحب تقریر کرنے والے ہوں' محکمہ کا اعلیٰ ترین افسر گل افشانی کرنے والا ہو' مقتدر اعلیٰ " " اسپیچ " دینے والا ہو تو پھر کیا ہے۔ وقت سے پہلے ہی " ہال " ہوکہ " پنڈال " غرضمندوں کا ہجوم ہوتا ہے' مصلحتی کارکنوں کا انبوہ کثیر ہوتا ہے' واعظ یا مقرر کی معمولی سے معمولی تقریر پر داد دیجاتی ہے۔ اس کی ثنا خوانی ہوتی ہے اور تالیوں کی آواز سے فضا گونج جاتی ہے۔

یہ حقیقی طرز عمل دنیا میں عوام و خواص کا ہے مگر سچے علم دوست اور حقیقی ادب شناس اُن کی داد نہیں دیتے جو صرف مشہور ہو یا خاندانی رئیس ہو یا امیر ہو یا حاکم وقت ہو یا مقتدر اعلیٰ ہو۔ وہ اس کی ثنا خوانی نہیں کرتے جو غرضمندوں کی احتیاج پوری کرسکتا ہو۔ بلکہ وہ اسی کا دل بڑھاتے اور اسی کی تعریف و توصیف کرتے ہیں جو تحسین کا مستحق ہو۔ قطع نظر اس کے کہ وہ مشہور ہے کہ گمنام' نیک نام ہے کہ بدنام' کسی بڑے خاندان کا فرد ہے یا معمولی گھرانے کا' حاکم وقت کا عزیز ہے یا کسی مفلوک الحال' ستم رسیدہ' بے بس ولاچار' مظلوم و محکوم کا۔ ان کی دانست میں تعریف و توصیف کا معیار صرف ایک ہی ہے یعنی " ذاتی جوہر " شخصی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا' مصلحت کو مد نظر رکھتے ہوئے توصیف یا تنقیص کرنا ذاتیات کی بنا پر قدر یا تحقیر کرنا انھیں نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے نیک نفس' شریف الطبع' علم دوست' با مذاق' حقیقی نقاد دنیا کے ہر ملک میں بہت کم ہیں مگر انسانوں کو عبرت دلانے کے لئے دیکھئے گوسائیں تلسی داس جی نے کیا انمول دوہا کہا ہے اور کیسی لاجواب تشبیہہ دی ہے ا۔

उत्तम और चंडाल घर एक दीप उजायार।
तुलसी मते पतंग को सभी जोत एकसार॥

उत्तम (اُتم) - اعلیٰ　　दीप (دیپ) - دیا - چراغ

मते (متے) - محبت، شوق　पतंग (پتنگ) پروانہ　जोत (جوت) - روشنی　एकसार (ایکسار) یکساں

اُتم اور چنڈال گھر ایک دیپ اُجیار
تلسی ستے پتنگ کے سبھی جوت یکسار (تلسی)

" اعلیٰ اور ادنیٰ کے گھر ایک ہی چراغ کا اُجالا رہتا ہے - اے تلسی ! پروانے کی محویت کیلئے سبھی روشنی یکساں ہوتی ہے" پروانہ نور کا شیدائی ہے، روشنی پر مرتا ہے، جہاں روشنی ہوتی ہی پہنچتا ہے، تصدق ہوتا ہے، جلتا ہے، مرتا ہے - وہ یہ نہیں دیکھتا کہ روشنی کس کے گھر ہے ؟ اعلیٰ کے گھر یا ادنیٰ کے گھر، امیر کے گھر یا غریب کے گھر، رئیس کی محفل میں یا فقیر کی جھونپڑی میں !

کس قدر نصیحت خیز، سبق آموز اور عبرت انگیز دوہا ہے ! اگر کوئی ہندی بھاشا کی (بہترین نظموں اور اشعار کی) ست سئی مرتب کرے تو یہ دوہا زرین حروف میں لکھے جانے کا مستحق ہوگا۔

(۵)

جب کبھی شاعری میں متضاد خصوصیات بیان کی جاتی ہیں اور اُن سے نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے تو شعر بڑا لطف دیتا ہے۔ اُردو میں غالب اس قسم کی شاعری کے بہترین استاد ہیں۔ متضاد خصوصیات سے نتیجہ اخذ کرنے سے میرا کیا مطلب ہے وہ ان دو اشعار سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے :-

رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے ☆ بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے غالب
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم ☆ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں غالب

ان اشعار میں شاعرانہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کے علاوہ حقائق زندگی اور فلسفۂ حیات کے اسرار بیان کئے گئے ہیں - اسی طرح ہندی کے ایک دوہے میں متضاد خصوصیات بیان کرکے جو درس اخلاق دیا گیا ہے وہ داد کے قابل ہے۔

दया धर्म हिरदे बसे बोले अमृत बैन।
ते ई ऊंचे जानिये जिनके नीचे नैन॥

दया (دَیا) - رحم　　धर्म (دہرم) - ایمان
अमृत (امرت) - میٹھی　बैन (بین) - بات　हिरदय (ہردے) - دل

دَیا دہرم ہردے بسے بولئے امرت بین
تیَ اونچے جانیے جن کے نیچے نین

"رحم اور ایمان (جس کے) دل میں بسے ہوں اور (جو) میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہو (اور جس کی) آنکھیں (حیادار اور غیرت مند یا شرمیلی ہونے کی وجہ سے) نیچی ہوں اسی کو اونچا (اعلیٰ یا شریف) سمجھیے۔"

(۶)

مارواڑ کے ایک نامعلوم شاعر کا دوہا ہے :-

सज्जन ऐसा कीजिये ढाल सरीखा होय।
सुख में तो पाछे रहे दुख में आगे होय॥

سجن ایسا کیجیے ڈھال سریکھا ہوے
سکھ میں تو پاچھے رہے دکھ میں آگے ہوے

"ایسے انسان کو اپنا دوست بنانا چاہیے جو مثل ڈھال کے ہو۔ سکھ میں تو پیچھے رہے مگر دکھ میں آگے ہو جائے" تمثیل کی خوبی نے جو لطف پیدا کر دیا وہ ظاہر ہے۔ نصیحت کی خوبی کے متعلق کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے۔

(۷)

عہد جہانگیری میں عبدالرحیم خانخاناں پر عتاب شاہی ہوا تھا اور عین کبیر سنی میں زمانہ کی ناموافقت نے انھیں کئی سالوں تک چین نہ لینے دیا۔ مگر دربار اکبری کے اس انمول جوہر نے اپنی آن بان ہر طرح قائم رکھی اور زمانے کے تھپیڑوں کو صبر و تحمل سے سہنے میں اپنی خودداری کا بہترین ثبوت دیا۔ اس دوہے میں خانخاناں نے ایک نتیجہ خیز آپ بیتی ایک نہایت موزوں مثال دیکر سنائی ہے :-

दुरदिन परे रहीम कहि दुरथल जैयत भाग।
ठाढ़े हूजत घूर पर जब घर लागत आग॥

दुरदिन (دُردِن) - بُرے دن   दुरथल (دُرتھل) - بُرا مقام

دُردِن پرے رحیم کہہ، دُرتھل جئیت بھاگ

ٹھاٹرے ہوجت گھورپر، جب گھر لاگت آگ

"اے رحیم اگر بُرے دن آئیں (اور بُرا وقت پڑے) تو برے مقام پر ہی بھاگ جا (برے بھلے ہی گذر کرلے) جب گھر کو آگ لگتی ہے تو لوگ (مجبوراً) گھورے پر ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

(۸)

غالب کا ایک شعر ہے :-

بسکہ مشکل ہے ہر اک کام کا آساں ہونا ؎ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

"آدمی اور انسان میں غالب نے جو تفریق کی ہے وہ محض ایک شاعرانہ تخیل نہیں ہے بلکہ صداقت اور حقیقت پر مبنی ہے تاہم ثبوت پیش کرنے میں کسی قدر دشواری ضرور ہوتی ہے۔ کم از کم غالب نے کوئی ثبوت نہیں پیش کیا اور نہ انسان و آدمی میں امتیاز کے لئے معیار مقرر کرنے کی کوشش کی مگر دیکھئے رسندہ نامی ہندی شاعر نے اس دوہے میں انسانوں کی امتیازی خصوصیت کو کن چبھتے ہوئے الفاظ میں بیان کیا ہے :-

पसु पच्छी हू जानहीं अपनी अपनी पीर।
तब सुजान जानौं तुम्हें जब जानो पर पीर॥

पसु (پسو) جانور - جاندار पच्छी (پچھی) - پرندہ

पीर (پیر) - درد पर पीर (پر پیر) دوسرے کا درد सुजान (سجان) انسان

پسو پچھی ہو جانہیں اپنی اپنی پیر
تب سجان جانوں تمہیں جب جانو پر پیر۔

"(نہ صرف آدمی بلکہ) مویشی اور پرندے بھی اپنے اپنے درد کو محسوس کرتے ہیں (اگر تم نے اپنے درد کو محسوس کیا تو کیا کمال ہے) انسان تو میں تمہیں اس وقت سمجھوں جبکہ تم دوسروں کے درد کو محسوس کرو۔"

ہمدردی کو "آدمی" اور "انسان" کی امتیازی خصوصیت قرار دیکر اور جانوروں اور پرندوں کی مثال سے رسندہ نے بڑا اچھوتا خیال باندھا ہے۔ دوہا کیا ہے انسانیت کی بہترین تمثیل، بے غرضانہ محبت

کی اعلیٰ ترین تعلیم اور ہمدردی کی سب سے زیادہ موثر مثال ہے۔ یہ اس پایہ کا دوہا ہے کہ اگر اسے ہندی کے بہترین سو دوہوں میں شمار کیا جائے تو بالکل بجا ہوگا۔ رسند ھ کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے یہ ایک دوہا کافی ہے۔

(عاشقانہ جذبات اور عشقیہ دوہے)

(۹)

ہندی کے ایک غیر معروف مسلمان شاعر شاہ عبدالعلیم آسی کا ایک دوہا ہے۔

काजर दूं तो किरकिराय सुरमा दिया न जाय ।
जिन नैनन मां पिय बसे दूजा कौन समाय ॥

کاجر دوں تو کرکرائے سرما دیا نہ جائے
جن نینن ماں پیا بسیں دوجا کون سمائے

"کاجل لگاؤں تو کرکرا (معلوم ہوتا ہے) اور سُرمہ لگایا نہیں جاتا۔ جن آنکھوں میں پیا ہوں (عاشق کا تصور ہو) دوسرا کون سما سکتا ہے۔"

(۱۰)

آسی سے تقریباً ڈھائی سو سال پہلے ہندی شاعری کے مسلم الثبوت استاد عبدالرحیم خانخاناں نے آنکھوں میں حسنِ یار کے سمانے کے متعلق کیسا انمول دوہا کہا ہے:-

प्रीतम छब नैनन बसी पर छब कहां समाय ।
भरी सराय रहीम लखि आप पथिक फिर जाय ॥

प्रीतम (پریتم)۔ معشوق   छब (چھب) چھبی

पर (پر)۔ دوسرا۔ غیر   लखि (لکھ) دیکھ

(پتھک)۔ مسافر

پرتیم چھب نینن بسی، پر چھب کہاں سمائے
بھری سرائے رحیم لکھہ، آپ تھِک پھر جائے

"معشوق کا حسن آنکھوں میں سمایا ہوا ہے، غیروں کا حسن (اب) کہاں سما سکتا ہے؟ اے رحیم سرائے کو بھرا دیکھ کر مسافر خود ہی واپس چلا جاتا ہے" سرائے جب بھری ہوتی ہے اور قدم جانے کا بھی امکان نہیں ہوتا تو مسافر خود ہی لوٹ جاتا ہے۔ اپنے محبوب کے عشق میں رحیم کو محو دیکھ کر حسینانِ جہاں میں سے کوئی بھی ان پر ملتفت نہیں ہوتا۔

"آپ تھِک پھر جائے" اس دوہے کی جان ہے۔ عالم محویت کا یہ بے نظیر منظر خود شاعر کے عشق و وفا کی بہترین تعریف و توصیف بھی ہے انتہائی عشق کے اظہار کا یہ بلیغ طریقہ داد طلب ہے۔

(۱۱)

ہندی کے ایک اور مسلمان شاعر سید غلام نبی رسلین بلگرامی آنکھوں کی تعریف میں کہتے ہیں:-

रे मन रीत विचित्र यह तियनैनन के चेत ।
विष काजर निज खाय के जियऔरन के लेत ॥

रीत (ریت)۔ طریقہ विचित्र (وچتر)۔ رنگ برنگ (یہاں معنی عجیب) तिय (تیا)۔ عورت
चेत (چیت)۔ نگاہ विष (وش)۔ زہر निज (نج)۔ خود जिय (جیا)۔ جان

رے من ریت وچتر یہہ تیا نینن کے چیت
وش کاجر نج کھائے کے جیا اورن کی لیت

"اے دل عورت کی آنکھوں کا یہ عجیب طریق ہے کہ خود کاجل کا زہر کھا کر دوسروں کی جان لیتی ہے۔" مطلب یہ کہ یوں بھی عورت کی آنکھوں کا حسن بہت دلفریب ہوتا ہے مگر ان میں جب کاجل لگایا جاتا ہے تو ان کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور انھیں جو دیکھ لیتا ہے ان آنکھوں پر فریفتہ ہو کر مٹ جاتا ہے —— خود زہر کھا کر دوسروں کی جان لینا بالکل نیا تخیل ہے۔

(۱۲)

जो मैं होती बादली आभै जाय अड़ंत।
पंथ बहंता साजनां ऊपर छाह करंत॥

جو میں ہوتی باولی آبھئے جائے اڑنت
پنتھ بہنتا ساجناں اوپر چھاہ کرنت

"اگر میں بادل ہوتی تو آسمان پر جاکر (مرے) پاپیادہ مسافر شوہر پر سایہ فگن ہوتی" درد ہجر میں بھی اپنے درد سے زیادہ پریتم کے آرام و آسائش کا خیال صرف نیک نفس عورتوں میں پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ مارواڑ کا دوہا ہے اور بہت پاکیزہ ہے۔

(۱۳)

مسلمانوں میں سب سے پہلے امیر خسرو نے ہندی میں شعر کہنا شروع کیا۔ دیکھئے بارھویں صدی عیسوی کی زبان بھی کیسی سادہ ہو سکتی تھی۔ خسرو کا ایک دوہا ہے:۔

जाओ वेद घर आपने तुम क्या जानों सार।
आशिक चंगे किन किये सु बिन देखे दीदार॥

جاؤ وید گھر آپنے تم کیا جانو سار
عاشق چنگے کن کئے سو بن دیکھے دیدار

"اے وید (حکیم) اپنے گھر جاؤ تم (میری) تکلیف کیا پہچان سکو گے؟ بغیر (معشوق کا) دیدار کئے مجھے کون اچھا کر سکتا ہے؟"

بعینہٖ اسی مطلب کو خسرو نے ایک فارسی شعر میں بھی ادا کیا ہے:۔

از سر بالین من برخیز اے ناداں طبیب
دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

(۱۴)

ایک اور موقعہ پر خسرو نے یہ دوہا کتنا پیارا کہا ہے۔ یہ خیال رکھئے کہ یہ آج سے تقریباً ساڑھے چھ سو سال پہلے کا شعر ہے جبکہ ہندی شاعری کا عالم طفولیت تھا۔

गोरी सोवै सेज पर मुख पर डारे केस।
चल खुसरो घर आपने सांझ भई चहुं देस॥

केस (کیس)۔ بال — सेज (سیج)۔ بستر

گوری سووے سیج پر مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چھوں دیس (امیر خسرو)

"ایک گوری لڑکی منہ پر سیاہ بال ڈالے ہوئے سو رہی ہے۔ خسرو اپنے گھر چل چو طرف اندھیرا ہو گیا۔ (اس منظر نے آنکھوں کو خیرہ کر دیا اب چل بیٹھنے ہی میں بھلائی ہے)"

(۱۵)

امیر خسرو کا یہ دوہا بھی بہت مقبول ہوا۔

प्रेम न जाने कैसी मसजिद कैसा ठाकुरद्वारा।
हम तो उहें सीस नवावें जित थे अपना प्यारा॥

(ٹھاکردوارا) در بتخانہ — (سیس)۔ سر

پریم نہ جانے کیسی مسجد کیسا ٹھاکر دوارا
ہم تو اُنھیں سیس نوائیں جت تھے اپنا پیارا (امیر خسرو)

"محبت نہیں جانتی کہ کیسی مسجد اور کیسا در بتخانہ (محبت میں انسان ان میں امتیاز نہیں کرتا اور نہ ان ظاہری چیزوں کی پرواکرتا ہے) ہم تو اسی طرف سر خم کر دیتے ہیں جہاں اپنا پیارا ہو" اسی مطلب کو خسرو نے اس فارسی شعر میں ادا کیا ہے:۔

بندۂ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست ٭ ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست (امیر خسرو)

(۱۶)

ہندی بھاشا میں یوں تو برہ کے دوہے ایک سے ایک بہتر ہیں مگر جس نزاکت اور خوبی سے اس دوہے میں دردِ ہجر کا اظہار کیا ہے وہ اپنی آپ نظیر ہے۔ لفظوں کی صوتیاتی مناسبت اور درد بھرے الفاظ نے اس دوہے کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ یہ دوہا بھی ایک مسلمان ہندی شاعر شاہ عبدالعلیم آسی کا ہے:۔

ओस ओस सब कोई कहें आंसू कहे न कोय
मोहि बिरहिन के सोग में रैन रही ह रोय

मोही बिरहिन (موہی برہن) ۔ مجھ مفارقت زدہ — रैन (رین) رات

اوس اوس سب کوئی کہیں آنسو کہے نہ کوئے
موہی برہن کے سوگ میں رین رہی ہے روئے

"سب (لوگ شبنم کو دیکھ کر) اوس اوس (ہی) کہتے ہیں۔ آنسو کوئی نہیں کہتا۔ (میں تو سمجھتی ہوں کہ مجھ مفارقت زدہ کے سوگ میں رات رو رہی ہے"

نہایت لطیف اور درد انگیز دوہا ہے جسے اگر راگ میں گایا جائے تو ناممکن ہے کہ سامعین متاثر نہ ہوں گے۔

محکومیتِ نسواں

دعویٰ: عورت اور مرد کے حقوق میں مساوات ہونی چاہئے عورت اور مرد کے موجودہ معاشرتی تعلقات اس اصول پر قائم ہیں کہ مرد قانوناً عورت پر مسلط رہے۔ مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ قانوناً ایک جنس کا دوسری جنس کے زیرِ حکومت ہونا ہرگز درست نہیں۔ اور دونوں جنسوں میں پوری مساوات قائم ہونی چاہئے۔ یہاں تک کہ مرد کو عورت پر نہ تو کوئی قدرت یا اختیار حاصل ہو نہ عورت کی بابت قانون میں کوئی نااہلیت فرض کی جائے۔ عورتوں کی موجودہ محکومیت بجائے خود بھی قابلِ نفرین ہے اور موجودہ زمانہ میں نوعِ انسان کی فلاح میں بہت کچھ مخل ہے۔ میں شروع سے اسی رائے پر قائم ہوں۔ بلکہ جہاں تک میں اس پر غور کرتا ہوں اور اپنے تجربہ کی بنا پر رائے قائم کرنا چاہتا ہوں میرا یہ عقیدہ اور بھی مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ جن دلائل کی بنا پر میں نے اپنی رائے قائم کی ہے وہ اس رسالہ میں وضاحت کے ساتھ پیش کروں گا۔

بارِ ثبوت ظاہر ہے کہ اس دعوے کی حمایت آسان نہیں۔ کیونکہ دنیا میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینے میں جو عذرات پیش کئے جاتے ہیں وہ عقلی دلیلوں پر نہیں بلکہ پرانی عادتوں اور دیرینہ جذبات پر مبنی ہوتے ہیں۔ صاف بات یہ ہے کہ لوگ جذبات کے آگے عقل سے کام لینا نہیں چاہتے۔ بلکہ جب انکو قائل کیجئے تو اور بھی جہالت اور ضد سے کام لینے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے رسم و رواج کے خلاف جب کوئی بات زبان سے نکلتی ہے تو اس سے لوگوں کو خواہ مخواہ اشتعال ہوتا ہے۔ کوئی یہ غور نہیں کرتا کہ ہزاروں پرانے رواج ایسے ہیں جنھیں ہم خود چھوڑ چکے ہیں۔ بلکہ میرا قول تو یہ ہے کہ جو رواجات اب منسوخ مانے جاتے ہیں بعض ان سے بھی زیادہ وحشیانہ رواج ابھی تک باقی ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ انھیں ترک کیا جائے۔ دنیا میں دشواری اُسی کے لئے ہے جو کسی عام رواج کے خلاف زبان کھولنا چاہے۔ عورتوں کی محکومیت ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ اور ایک پرانے دستور کے طور پر دنیا بھر میں قائم ہے۔ یہی بات ہے کہ لوگ

اس صورت حال کو بالکل معمولی اور فطری سمجھنے لگے ہیں۔ یہ تو سب مانتے ہیں کہ آزادی اور انصاف اچھی چیزیں ہیں۔ اور قانون میں کسی کے ساتھ کوئی رعایت یا کسی پر کوئی جبر نہ ہونا چاہئے۔ بجز اس کے کہ وہ رعایت یا جبر خود عامۃ الناس کی بہبودی اور انصاف کے لئے ہو۔ لیکن جب کبھی عورتوں کی محکومیت کا مسئلہ پیش ہوتا ہے تو میرے ہم خیال لوگوں کے مقابلہ میں کہا یہ جاتا ہے کہ اپنا قول تم ثابت کرو۔ حالانکہ ہمارا قول تو اسی بات سے ثابت ہے کہ سب کے ساتھ انصاف ہونا چاہئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عورتیں مردوں کی برابری کے لائق نہیں ہیں اور مردوں کو ان پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ انھیں چاہئے کہ اپنا قول وہ ثابت کریں۔ بار ثبوت میرے ہم خیالوں کے ذمہ نہیں ہے۔ میں اُن کے دلائل کا جواب تو دونگا مگر اس بنا پر نہیں کہ اس کے خلاف ثابت کرنا میرا فرض ہے۔

فطرت انسانی اور عورت کی محکومیت

اس مسئلہ پر بحث کرنے کی جو دشواریاں میں نے بیان کیں اس سے ان لوگوں کا گلہ مقصود نہیں جو کسی رواج کو محض اس وجہ سے اچھا کہتے ہیں کہ اس پر ساری دنیا کاربند ہے۔ وہ لوگ تو ایسے رواجوں کو جبلت اور فطرت کے مطابق بتاتے ہیں۔ اور کچھ اسی مسئلہ پر منحصر نہیں بلکہ جس غیر معقول بات کو درست قرار دینا چاہتے ہیں اُسے عام طور پر انسان کی طبیعت اور فطرت کا مقتضا بتانے لگتے ہیں۔ بلکہ اُسے خدا کا حکم قرار دیکر خدا کو بھی بدنام کرتے ہیں۔ اب میں تھوڑی دیر کے لئے مان لیتا ہوں کہ اپنے دعوے کے ثبوت کا بار مجھ ہی پر ہے۔ بلکہ یہاں تک کہے دیتا ہوں کہ اگر میں یہ نہ دکھا سکوں کہ عورت کی محکومیت اخلاقِ بشری اور فطرت انسانی کے بدترین پہلوؤں سے پیدا ہوئی ہے، تو میرا کل دعوے باطل قرار دیدیا جائے۔ اور میں اس دلیل کے آگے خاموش ہو جاؤں گا کہ عورت کا محکوم ہی رہنا مناسب ہے، کیونکہ دنیا کا رواج ہی یہی ہے۔

عورت کی محکومیت دستور غلامی کی یادگار ہے

واضح رہے کہ تاریخی حیثیت سے عورت پر مرد کا قانونی اقتدار کچھ اس بنا پر جائز نہیں رکھا گیا تھا کہ لوگوں نے پہلے اپنے تجربہ سے عورت کی نااہلیت دریافت کرلی ہو یا نوع انسان کی بہبودی کا نصب العین پیش نظر رکھنے کے بعد پھر عورت کو محکوم بنانا طے کیا ہو۔ اختیارات کی تقسیم میں سوسائٹی کو یہ سوجھا ہی نہیں کہ دونوں جنسوں کے افراد ایک دوسرے

کے دوش بدوش بھی کھڑے ہو سکتے ہیں۔ واقعہ صرف یہ ہے کہ مرد اتفاق سے قوی تر ہستی رکھتا تھا اور اُس کی طاقت کو عورت کی طرح معاشرت نے بھی تسلیم کر لیا۔ مرد کی قوت آزمائی کے ہر موقع پہ جائز سمجھے جانے کا راز صرف اسی قدر ہے۔ کیا عجب ہے کہ کسی عہد ماضی میں حالات گردوپیش کے لحاظ سے یہ صورت مناسب بھی قرار دی جا سکتی ہو لیکن وہ زمانہ بھی آ ہی گیا کہ انسان کی نظر اس نکتہ پر پڑی کہ زبردست کو قانوناً یا اخلاقاً بھی زبردست ہی بنا رہنے دینا درست نہیں۔ جب کبھی عورت کے ساتھ غیر مساویانہ برتاؤ شروع کیا گیا تھا اُس وقت تک کسی قسم کی دنیاوی مصلحتوں پر غور کرنے کی نوبت نوع انسان کو آئی ہی نہیں تھی۔ کیونکہ توانا مرد کے نزدیک ناتوان عورت کی وقعت جو کچھ بھی ہو سکتی تھی تو صرف اس لحاظ سے کہ وہ مرد کے لئے کس حد تک کارآمد ہو سکتی تھی۔ دنیا میں قوانین اور نظام معاشرت کی تدوین شروع ہی اس طرح ہوئی کہ جیسے حالات پائے گئے ویسے ہی مان بھی لئے گئے۔ اور وہی حالات ضابطہ بن گئے۔ گویا ہر امر واقعی حق پر مبنی تھا۔ اسی کو رواج کا قانون کی شکل اختیار کرنا کہتے ہیں۔ معاشری دنیا میں اصلاح بعد کی چیز ہے۔ جو عدل اور مساوات کے خیال کی ترقی کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی ہے۔ دستورِ غلامی کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ پرانے زمانہ میں عورتوں کے علاوہ دنیا کی مردانہ آبادی کا بھی اکثر حصہ غلامی کے مراحل طے کر رہا تھا۔ یعنی عورتیں سب غلامی میں تھیں۔ اور مردوں میں بھی اکثر کسی نہ کسی کے مطیع ہوتے تھے۔ جوں جوں آزاد خیال لوگوں کی جرأت بڑھتی گئی غلامی کا رواج کسی نہ کسی معنی میں کم ہوتا گیا۔ حتےٰ کہ یورپ کی عیسائی قوموں میں مردوں کی غلامی معدوم ہو گئی اور عورتوں کی غلامی رفتہ رفتہ کم ہو کر ایک معتدل صورت کی حلقہ بگوشی رہ گئی جسے محض محکومیت کہہ سکتے ہیں۔ غرضکہ یہ محکومیت کسی نئے رواج کے طور پر نہیں ہے۔ جس کی ابتدا اب کی جاری ہو اور جس کی بنا ضروریات معاشرت یا انصاف کے رو سے قائم ہو رہی ہو۔ ہے یہ وہی غلامی جو اگلے زمانہ سے چلی آ رہی ہے۔ اس کی شدت اگلی سی نہیں رہی لیکن اس سے اب بھی زمانۂ جاہلیت کی بو آتی ہے۔ اور اس دستور کی زاید از زائد خوبی بس یہی ہے کہ یہ اب تک باقی ہے۔

زبردست کے آگے مذہب اور اخلاق کوئی چیز نہیں

ایک بڑی قباحت یہ ہے کہ نئے زمانہ کے لوگوں کو کوئی اندازہ نہیں ہے کہ پرانے زمانوں میں انسانی معاشرت کا کیا حال تھا۔ جن لوگوں نے دنیا

کا سفر کر کے ادنیٰ اقوام کے حالات دیکھے ہیں یا جو تاریخ عالم کا صحیح مطالعہ کر چکے ہیں وہ جان سکتے ہیں کہ معاشرتی دنیا کا ابتدائی قانون یہی تھا کہ "جس کی لاٹھی اُس کی بھینس"۔ اس اصول کو برا سمجھنا کیسا لوگ اپنی معاشرت کے اس کلیہ پر علی الاعلان ناز کرتے تھے - اور یہ کچھ ان کی بے حیائی یا حماقت نہ تھی - بلکہ اس کے اعلان میں اُن لوگوں کو کوئی اخلاقی قباحت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ ظلم و تعدی جبر و تشدد یہی اُن کے لئے تمغہائے امتیاز تھے بلکہ اس زمانہ میں پرستش بھی ظالم اور زور آوری کی ہوتی تھی - ادنیٰ ہستیاں مانی بھی نہ جاتی تھیں - اور اگر مانی جاتی تھیں تو فقط اُس حد تک جہاں تک کہ بڑی ہستیوں کو اُن سے فائدہ پہونچ سکتا تھا - اسی ضمن میں اعلیٰ نے ادنیٰ سے محض اپنے مفاد کے لئے وعدے کرنا شروع کئے - اور ایفائے وعدہ کی ضرورت اگر انھیں محسوس ہوئی تو محض اپنے فائدے کے خیال سے - چنانچہ آقاؤں کے مقابلہ میں غلاموں کے حقوق اس لئے مانے جانے لگے کہ اس سے خود آقاؤں کا بھلا ہوتا تھا - اور رفتہ رفتہ معاشرت غلاموں کے حقوق تسلیم کرنے لگی - یہودیوں کے قوانین میں غلاموں کے حقوق کافی تسلیم کئے گئے ہیں اور یونان کے بعض مدرسین اخلاق نے حضرت عیسیٰ کی ولادت سے صدیوں پیشتر غلاموں کے بعض حقوق کا اعتراف کیا ہے - اہل روما میں بھی ان حقوق کا تصور رفتہ رفتہ آیا اور ترقی پذیر ہوا - بالآخر دین عیسوی نے مظلوموں کو ظالموں کے پنجہ سے نجات دلانے کا دعویٰ کیا -

لیکن حضرت انسان بھلا ایسی بدعت ماننے والے کیا تھے ؟ بہرکیف مسیحیت ناکام رہی - اس کی وجہ ہرگز یہ نہ تھی کہ مسیحیت کا اثر اور اقتدار کم تھا - یورپ میں مسیحیت کا یہ اثر تھا کہ مذہب کے نام پر لاکھوں نے گلے کٹوائے بڑے بڑے تاجدار اپنے تخت و تاج سے محض ارباب مذہب کے ادنیٰ اشارہ پر محروم کر دئے گئے - بڑے بڑے ضدی اور خود سر فرمانروا اپنی محبوب ترین ازدواج سے مسیحیت کے محض ایک فتوے پر جدا ہو گئے لیکن مسیحیت اگر ناکام رہی تو اسی بارہ میں - بادشاہوں کی باہمی خونریز نبرد آزمائیاں مسیحیت کے روکے نہ رکیں - جب تک ایک فریق نے اپنی خونخوارانہ فوقیت دوسرے فریق پر ثابت نہ کر دی جنگ و جدال کا خاتمہ نہ ہو سکا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے با اثر اور با اقتدار لوگ جو ادنیٰ رعایا اور محکوم طبقوں پر آئے دن ستم توڑا کرتے تھے ، اُن کا تشدد اور ظلم اُس وقت تک کم نہیں ہوا جب تک کہ اُن کی سرکوبی کے لئے کوئی زبردست طاقت پیدا نہیں ہوئی - زبردست اپنے ظلم سے اُس وقت تک باز نہیں آتا جب تک کہ خود اُس پر اس سے بڑھ کر ظلم کرنے

والانہ پیدا ہو جائے۔ بادشاہوں میں آپس کی جنگ اُس وقت تک نہیں رُکتی جب تک ان میں سے کوئی ایک غالب نہ آجائے۔ پرانے زمانہ میں جب سارا یورپ باہمی نزاعات میں مبتلا تھا ہر جگہ یہی دیکھنے میں آتا تھا۔ اسی طرح خود مختار شہر اور قصبے آئے دن شریف لٹیروں اور جاگیرداروں کے مظالم کا شکار ہوا کرتے تھے۔ اور جب تک وہاں کے دولتمند شہریوں اور عام باشندوں نے خود اپنی حفاظت کی قابلیت نہیں پیدا کی انھیں اس قسم کی تباہیوں سے نجات نہیں ملی۔ یہی حال مفلس کاشتکاروں کا تھا جو اُس زمانہ کے جاگیرداروں کے بے پناہ ظلم و ستم سے تباہ رہا کرتے تھے اُنھیں بھی اگر پناہ ملی تو اُسی وقت جب اُنھوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی حفاظت خود کر سکتے ہیں۔ غرضکہ تاریخ شاہد ہے کہ جب تک مظلوموں میں موثر انتقام کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی اور وہ خود قوی بننے پر مجبور نہیں ہو گئے اُس وقت تک ان کی شنوائی کہیں نہ تھی۔

رواج ظلم کو جائز کئے ہوئے ہے۔

باوجود موجودہ زمانہ کی ترقی کے نہ معلوم کتنے رواج اب بھی باقی ہیں جن کی بنا درحقیقت زبردستی کے اُصول پر ہے۔ ان رواجوں کی ظاہری شکل بدلی ہوئی ہے لیکن ان کی ابتدا زبردستی ہی سے ہوئی تھی۔ چونکہ لوگ اُن باتوں کے شدت سے عادی ہو رہے ہیں اس لئے اس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی۔ البتہ اگر اس قسم کی کوئی نئی بات آج شروع کی جائے تو وہ اس قدر بیہودہ سمجھی جائے گی کہ لوگ اُسے ہرگز نہ مانیں گے۔ سب جانتے ہیں کہ انسان نے اپنے ہم جنسوں کو قابل انتقال جائداد کی طرح مدتوں استعمال کیا ہے۔ ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ انگریز قوم بھی غلامی کو قانوناً جائز سمجھتی تھی۔ اور یہ بھی حال ہی کی بات ہے کہ امریکہ کی اکثر ریاستوں میں بردہ فروشی اور غلاموں کا پالنا عین قانون تھا۔ حالانکہ اُس زمانہ میں بھی بجز اُن لوگوں کے جن کی ذاتی منفعت اُس رواج سے وابستہ تھی کوئی فرد (کم از کم انگلستان میں) ایسا نہ تھا جو غلامی کے رواج کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے نہ دیکھتا۔ اور اس جذبۂ نفرت کی ابتدا کو بھی مدتیں گذر چکی تھیں جس کے باوجود اس رواج کا سدباب آسانی سے ممکن نہ ہوا۔ اس سے بڑھ کر شخصی حکومتوں کا حال ہے جن کی ابتدا مسلمہ طور پر آدمی زبردستی کے اصول سے ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی یورپ کے مختلف گوشوں میں مطلق العنان بادشاہ

اب تک نظر آتے ہیں[۱]۔ اور جن ممالک میں دستوری حکومت قائم ہو چکی ہے وہاں بھی مطلق العنانی کے حامی ان
مالک کے با اثر طبقوں میں سب کہیں پائے جاتے ہیں۔ غرضکہ ایسے رواج جن کی بنا جور و جبر پر ہے انہیں
لوگ گوارہ کئے ہوئے ہیں۔ اور نہ معلوم کب تک گوارہ کرتے رہیں گے۔ اُن کے لئے کسی چیز کا رواج کی
شکل میں ہونا اوس کے جواز کے لئے کافی ہے۔ اور یہی وجہ ایسے رواجوں کے دیرپا ہونے کی ہے۔

مردوں کا اقتدار ایک عالمگیر مسئلہ ہے

خواہ وہ پرانے زمانہ کی شخصی حکومت ہو یا غلامی کا رواج لیکن ان چیزوں کی تہہ
میں بجز ذاتی اقتدار کی بقا کی خواہش اور معدودے چند کی خود پسندی کے اور کیا
چیز مضمر ہے؟ یہ اس قسم کی خود غرضی ہے کہ جنپر نہ تو کبھی پردہ ڈالنے کی ضرورت ہوئی نہ صدیوں تک
کسی نے کوئی اعتراض کیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر حاوی رہنے کی جو ہوس ہے یہ ویسی
ہی ہوس ہے یا نہیں جس کی مثال شخصی حکومتوں میں اب بھی پائی جاتی ہے۔ اور جو جواز غلامی کے زمانہ
میں آقاؤں کو دامنگیر تھی۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ مردوں کا اقتدار عورتوں پر اور بھی دیرپا ثابت ہوگا۔ کیونکہ
تمام دنیا کی جنس ذکور کے اثرات کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے بادشاہ یا آقا کا حلقہ اثر ظاہر ہے کہ کس
قدر محدود ہے۔ یہ ایک ایسا عالمگیر سوال ہے جس سے تمامی جنس ذکور کا مفاد متعلق ہے۔ اس امر میں قریب
قریب دنیا بھر کے مرد ایک دوسرے کے اگر شریک حال نہیں تو ہم خیال ضرور ہیں۔ بادشاہوں کو تو بعض
اوقات شورش اور بغاوتوں کا بھی کھٹکا پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بے بس طبقۂ اناث سے اس کا بھی خوف
نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ زن و مرد ہر صورت میں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح متعلق اور وابستہ ہیں کہ کوئی
مظلومہ اپنی مظلوم بہنوں سے کافی طور پر مانوس ہونے اور اتحاد عمل کرنے کا موقع نہیں پاتی۔

زبردست دوسرے کے قانون تسلیم نہیں کرتا۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ شخصی حکومتوں کو سراہنا یا دستور غلامی کی حمایت کرنا تو اس
وجہ سے ناروا ہے کہ ان چیزوں کی بنا فقط ہوا و ہوس پر ہے۔ لیکن مرد کا عورت

---

[۱] جنگ عظیم سے قبل ہی یورپ میں یہ صورت حال ختم ہو چکی تھی۔ لیکن مطلق العنانی دوسری صورتوں میں اب
بھی باقی ہے۔ بلکہ بہت کچھ کارفرما ہے۔
مترجم

پر حاوی ہونا بالکل دوسری چیز ہے کیونکہ یہ ایک قدرتی بات ہے اور بالکل جائز بلکہ مناسب ہے۔ اس کا جواب صاف یہ ہے کہ صاحب اقتدار کو اپنا اقتدار ہمیشہ قدرتی ہی نظر آتا ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ انسان صرف دو طبقوں میں تقسیم تھے۔ یعنی ایک طبقہ آقاؤں کا تھا دوسرا غلاموں کا۔ قلیل التعداد آقاؤں کا طبقہ کثیر التعداد غلاموں پر حکومت کرتا تھا اور یہی صورت حال بالکل قدرتی بھی جاتی تھی حتیٰ کہ ارسطو کے سے عقلا بھی اس صورت کے قدرتی ہونے میں کوئی شک نہیں رکھتے تھے۔ اور غلامی کے جواز کی وہی دلیلیں پیش کی جاتی تھیں جو آج عورتوں کو محکوم رکھنے کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ خیر ارسطو کا زمانہ پھر بھی پرانا زمانہ ہے۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے جنوبی علاقوں کو دیکھئے جہاں ابتک اسی قسم کی ذہنیت باقی ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ گوری اقوام کو کالے آدمیوں پر حکومت کرنے کا قدرتی حق حاصل ہے وہاں لوگوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اُن کا قول اب بھی یہی ہے کہ کالے لوگ قدرتاً محکوم پیدا ہوئے ہیں۔ گویا اُن میں آزادی کی صلاحیت ہی نہیں۔ اسی قسم کے دلائل مطلق العنان حکمراں اپنے اقتدار کو جائز قرار دینے کے لئے ہمیشہ سے پیش کرتے آئے ہیں۔ فاتح اقوام نے مفتوحوں کے مقابلہ میں ہمیشہ یہی کیا کہ ہماری تلوار کے آگے تمہارا سر خم کئے رہنا ہی قرین انصاف ہے اور یہی مقتضائے فطرت ہے۔ یورپ کے دور وسطیٰ میں طاقتور جاگیردار ادنیٰ طبقوں پر اسی خیال کی بموجب حکومت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ یہ محکوم بھی جب کبھی بغاوت کرتے تھے تو یہ نہیں کہتے تھے کہ ہم اپنے حقوق مانگتے ہیں وہ اسی کو غنیمت جانتے تھے کہ ان ظالم جاگیرداروں کے اختیار محدود ہو جائیں۔ غرضکہ عورتوں کی محکومیت ایک ایسے دیرینہ اور عالمگیر رواج پر مبنی ہے کہ انکی موجودہ حالت کے علاوہ عورتوں کی کوئی اور حالت گویا کسی کے سمجھ ہی میں نہیں آتی۔ اور لوگ اسی کو قدرتی حالت خیال کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو خواب میں بھی نہیں دیکھنا چاہتے کہ عورتیں پارلیمنٹ میں جاکر بیٹھیں یا عام طور پر میدان جنگ میں فوجی کاموں کی انجام دہی کے لئے مقرر ہوں۔ اگرچہ عورتوں کے سپاہیانہ کارنامے اکثر اقوام میں ابتک سراہے جاتے ہیں، بلکہ اسپارٹا میں صنف نازک نے جو مردانگی کے جوہر دکھائے اس سے افلاطون تو یہاں تک متاثر ہوا کہ اس نے عورتوں اور مردوں کو اپنے نظام سیاست میں ہم پلہ مان لیا۔

عورتیں حقوق مانگنے سے بھی مجبور ہیں اور پھر بھی کوشاں ہیں

کہا جاتا ہے کہ عورتیں تو خود اپنی نااہلیت اور کمزوریاں تسلیم کرتی ہیں اور انھیں کوئی وجہ شکایت نہیں محسوس ہوتی۔ اس کے جواب میں اس بات کا اظہار بہت شد و مد سے کر دینا چاہیئے کہ اول تو سب عورتیں ایسی نہیں ہیں جو اپنی یا اپنے جنس کی نااہلیت کا اقرار کرتی ہوں۔ بہت سی عورتیں موجود ہیں جو نہایت شاکی ہیں۔ اور باقی عورتیں یعنی جو شاکی نہیں ہیں اگر ان کی عادت یہ نہ ڈالی گئی ہوتی کہ وہ شکوہ زبان پر نہ لائیں تو وہ بھی یقیناً شاکی ہوتیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی محکوم طبقہ سے آزادی کی آواز ہم آہنگی سے یکایک نہیں بلند ہوتی۔ ان میں بہرکیف اب یہ روح پیدا ہوگئی ہے کہ اگر انھیں تقریر کا موقع نہیں ملتا تو اپنے جذبات کا اظہار تحریر سے کرتی ہیں۔ اُن میں تعلیم کی خواہش روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بلکہ انگلستان میں سیاسی حقوق مثلاً حق رائے دہندگی کیلئے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اور یورپ اور امریکہ میں مختلف مقامات پر انجمنیں قائم ہیں جو حقوق نسوان پر طرح طرح سے زور دے رہی ہیں۔ جو عورتیں بے زبان ہیں وہ بھی جب عاجز آ جاتی ہیں تو اُن کی زبان سے "اُف" ضرور نکل جاتی ہے۔ کونسا گھرانا ہے جس میں عورتیں اپنے شوہروں سے وقتاً فوقتاً اون رواجوں کے متعلق شاکی نہ ہوئی ہوں جو ان کو اب کسی طرح گوارہ نہیں ہیں۔ ان رواجوں کی بدولت بعض اوقات اُنکو دم مارنا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ان سخت رسوم کی کوئی باقاعدہ مخالفت کریں تو انھیں خوف ہے کہ اُن رسوم پر اور بھی سختی سے عمل ہونے لگے گا۔ مثلاً جو لوگ اپنی عورتوں کو تھوڑی دیر کے لئے تفریح کی اجازت دیدیتے ہیں وہ انھیں بالکل ہی مُقفل کر دیں۔ اور اپنے رواجی اختیارات کو بدترین صورتوں سے کام میں لانا شروع کر دیں۔ عورتوں کی حفاظت کے لئے جو برائے نام قوانین بنائے گئے ہیں وہ عورتوں کی رسائی سے باہر ہیں۔ اور اگر کوئی عورت اُن قوانین سے کام لیتی بھی ہے تو یہ اُس کا بدترین قصور سمجھا جاتا ہے۔ جب مظلوم عورت کو بالآخر اپنے اُسی ظالم شوہر کے قبضہ میں جانا پڑتا ہے جس کے انتقام کی اکثر کوئی حد نہیں ہوتی تو اس کے لئے دو ہی باتیں ہیں یا تو وہ اپنے ظالم شوہر کے انتقام کا شکار بنے یا پیشتر سے بھی زیادہ مطیع اور محکوم بن کر اپنے مالک کو خوش کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائے۔

عورت کی دل کشی کا راز

یہ ایک عجیب بات کہی جاتی ہے کہ بحالت موجودہ عورتوں کے حقوق محفوظ کر دئے

گئے ہیں جنھیں وہ قانوناً حاصل کر سکتی ہیں اور کرتی ہیں پھر سب عورتیں وہ تمام حقوق کیوں نہیں حاصل کر لیتیں؟ صورت تو یہ ہے کہ ہر عورت اپنے شریک زندگی سے اس قدر دبی ہوئی ہے کہ اپنے ادنیٰ حقوق بھی خوف کی وجہ سے نہیں مانگتی ۔ کیونکہ اگر وہ ان ادنیٰ حقوق پر ضد کرتی ہے تو مرد دوسری حیثیتوں سے اُس پر جبر کر سکتا ہے ۔ اس بیچاری کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ ان معمولی حقوق سے بھی دستکش ہو جائے اور اپنے شوہر کے دست کرم ہی سے اپنی اُمیدیں وابستہ رکھے ۔ مردوں کا قانوناً غیر محدود طریقہ پر قوی اور ذی اقتدار ہونا ہی تو غضب ہے کہ عورتیں متحد ہو کر کوئی شورش بھی برپا نہیں کر سکتیں ۔ چنانچہ نہ تو اُن میں حقوق شناسی کی روح پیدا ہوتی ہے نہ حقوق تلف کرنے والوں کو اُن سے کوئی خوف لاحق ہوتا ہے ۔ اُنکی تربیت بچپن سے یونہی ہوئی ہے کہ وہ صبر وضبط کی عادی بنیں اور اپنے کو غلامی کے لئے تیار کریں ۔ اون کے لئے خوبی یہ ہے کہ مردوں کو خوش رکھنے کے لئے اپنے کو جہاں تک ہو سکے دلکش بنائیں کیونکہ مرد عورت کو فقط اپنی لونڈی ہی نہیں بنانا چاہتا بلکہ منھ لگی لونڈی بنانا چاہتا ہے ۔ اور مرد کے لئے کوئی عورت دلکش ہو ہی نہیں سکتی تاوقتیکہ وہ اُس کی کفش برداری کے لئے تیار نہ رہے ۔ اس خاص قسم کی دلکشی میں بھی بہت درجے ہیں اور گویا ایک حد مقرر ہے جس سے کم "دلکش" ہونا آپس کے نفاق کا پیش خیمہ ہوا کرتا ہے ۔ کوئی محکوم اپنے حاکم سے اُتنا قریب نہیں رہتا جتنا کہ عورت مرد سے ۔ یہی وہ مخلوق ہے جسے ہر آن اپنے آقا کی بے پایاں توقعات پوری کرنا ہوتی ہیں ۔ مرد عورت کے دل و دماغ پر بھی اپنا قبضہ چاہتا ہے، اور جس قدر منفعت اس قبضہ سے حاصل کرنا چاہتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں حاصل کر سکتا ۔ آقا تو فی الجملہ اپنے غلاموں پر اپنا تسلط سزا کا خوف دلا کر یا مذہبی احکام سے ڈرا کر قائم رکھتا ہے ۔ لیکن مرد نے عورت پر اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کے وسیع ترین ذرائع بھی اختیار کئے ہیں ۔ صنف نازک کے ایک ایک فرد کو ایسی تربیت دیجاتی ہے کہ وہ بہترین محکوم بنے ۔ یعنی بجائے اپنے ارادہ اور اپنی میلان طبع سے کام لینے کے دوسرے کے اشاروں پر چلنا بچپن سے سیکھے ۔ اُس کے آگے جو دستور اخلاق پیش کیا جاتا ہے وہ یہی بتاتا ہے کہ عورت کو مرد کے تابع فرمان رہنا چاہئے ۔ کیونکہ عورت ایثار ہی کے لئے پیدا ہوئی ہے ۔ گویا یہ وہ تربیت ہے جو عورت کے حسن جنسی کا ایک اہم جزو قرار پا گئی ہے ۔ اوّل تو عورت کا مرد کی طرف

جنسی میلان، دوسرے زوجہ کا اپنے تمامی حوائج کے لئے شوہر کا محتاج ہونا، تیسرے یہ امر کہ اگر خود وہ کوئی چیز حاصل کرنا چاہے تو بغیر شوہر کی مرضی اور ذریعہ کے نہ حاصل کر سکے۔ یہ تینوں باتیں خود پتہ دیتی ہیں کہ عورت کی تربیت اور اس کی سیرت کی پرداخت اسی بات کو پیش نظر رکھ کر کی جاتی ہے کہ وہ ہر طرح مرد کے لئے دلکش بنے۔ اگر اسی نصب العین کے لحاظ سے پرانے زمانے کے ہر ہر غلام کی تربیت ہوا کرتی یا دوسرے محکوم طبقوں میں اسی شدت کے ساتھ حاکموں کی پرستش کرنا ہر فرد کو سکھایا جاتا، اور حاکم و محکوم کا تعلق اسی قدر گہرا ہوا کرتا جس سے ہر آن تربیت متاثر ہوا کرتی تو بلا شبہہ پرانے زمانہ کی غلامانہ محکومیت بھی آج تک اُسی طرح موجود ہوتی۔ اور بجز معدودے چند ضمیر پرست افراد کے ساری دنیا آج بھی اُس کو جائز بلکہ مستحسن قرار دے رہی ہوتی۔

محکومیت کا دستور دنیا سے اُٹھ رہا ہے

یہ اُمور ثابت کرتے ہیں کہ یہ رواج خواہ کتنا ہی عام کیوں نہ ہو، نہ تو اس کی موافقت میں کوئی قیاس قائم کرنا چاہیئے، نہ اس رواج کی بناپر دل میں کبھی تعصب کو جگہ دینا چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ کے بعد اور انسان کی معاشرتی ترقیوں کی رفتار دیکھتے ہوئے لامحالہ یہی رائے قائم ہوتی ہے کہ دوسرے مذموم رواجوں کی طرح عورتوں کی محکومیت کا دستور بھی رفتہ رفتہ مٹتا جائے گا۔ یہ چیز باقی رہنے والی نہیں ہے۔

دورِ جدید کا نقطۂ نظر

موجودہ دور میں دنیا کا نصب العین یہ ہے کہ انسان جس چیز میں اپنی بہبودی پائے اُسے اختیار کرنے میں اُس کے لئے کوئی پرانا دستور یا رواج مانع نہ ہونا چاہیئے۔ اس کو پوری آزادی حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ جس امر کو چاہے اختیار کرے خواہ مخالف اُسے کچھ ہی کہیں۔ وہ زمانہ گیا کہ ہر شخص جس حیثیت کے لوگوں میں پیدا ہوتا تھا اسی حیثیت پر ہمیشہ قائم رکھا جاتا تھا اور اگر وہ اپنی حالت بدلنا چاہتا تھا تو اُس کو سزا کا مستوجب سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے نئے خیالات اس زمانہ کے خواص سے ہیں جن کی بناپر ترقی یافتہ ممالک میں روزمرہ تغیرات ہو رہے ہیں۔ ہر شخص اپنے فعل کا مختار سمجھا جاتا ہے اور ہر شخص آزادی عمل کو اپنا پیدائشی حق گردانتا ہے۔ اگر دنیائے عمل میں اس حق کو آپ تسلیم نہ کیجیے گا تو زمانہ کی رفتار اور دنیا کا دستور زندگی خود بتا دے گا کہ کونسا اُصول باقی رہنے کے

لائق ہے اور کونسا فقط مٹ جانے کے لئے باقی ہے۔ پرانے زمانہ میں معاشرت دوسرے ہی اُصول پر قائم تھی۔ جیسے آدمیوں میں کوئی کالا پیدا ہوتا ہے کوئی گورا اسی طرح یورپ کے جملہ ممالک میں محکوم اور رذیل طبقہ کے لوگ پیدائشی غلام اور کمینے سمجھے جاتے تھے اور جو آزاد ہوتا تھا وہ شہریت کے پیدائشی حقوق رکھتا تھا۔ کسی کی ذاتی حیثیت کچھ نہ تھی۔ غرضکہ آزادوں اور محکوموں کی یہ تفریق قانون کے ذریعہ سے باقی رکھی جاتی تھی۔ بلکہ بعض صورتوں میں مختلف پیشے خاص خاص خاندانوں اور گروہوں کے ساتھ مخصوص کر دئے گئے تھے۔ یورپ میں پندرھویں صدی کے آخر تک عام طور پر یہی حالت باقی رہی۔ اب وہی یورپ ہے جس کے نظام معاشرت کے اُصول بالکل دوسرے ہو گئے ہیں۔ ہر شخص اپنے پیشے اور اپنے مشاغل میں آزاد ہے۔ اب ایک ایسی انفرادیت کا دور دورہ ہے جو ایک ہزار سال کے مسلسل تجربوں کے بعد رونما ہوئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر فرد ہر کام کے لئے یکساں موزوں سمجھا جانے لگا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا پیشہ اور مشغلہ انتخاب کرنے کا پورا موقع دیدیا گیا ہے۔ جو جس کام کا اہل ہے وہ خود اُس کام کو ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اس سے کس کو انکار ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں کہ جنھیں انجام دینے کی اہلیت عورتوں میں نہیں ہے؟ مگر کبھی اس پر غور نہیں کیا گیا کہ آخر عورتوں کی اس نا اہلیت کا سبب کیا ہے؟ ابتدائے آفرینش سے عورتوں کے لئے دنیاوی مشاغل کی تقریباً تمام راہیں بند رکھی گئی ہیں مگر باوجودیکہ اُن کو ہر طرح اُبھرنے سے روکا جاتا ہے پھر بھی بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ بعض عورتیں ایسی موجود ہیں جو بعض مردوں کے مقابلہ میں بہت سے کام نہایت خوبی سے انجام دے سکتی ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اُن کے ساتھ تعصب نہ برتا جائے اور اُنھیں برابر کا موقع دیا جائے۔ ہر ترقی پسند گروہ کا نظام عمل تو یہ ہونا چاہیئے کہ اُس کا جو فرد جس کام کی زیادہ لیاقت رکھتا ہو وہ اس کام میں لگا دیا جائے۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ ہم ایک ناشدنی اور ناکارہ مرد کو ایک لائق اور عقلمند عورت پر محض اس وجہ سے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ مرد ہے۔ حق تلفی سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ اس سے ہمارے کتنے معاشرتی نقصانات ہو رہے ہیں جو ہماری تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے ہم کو محسوس بھی نہیں ہوتے۔ اس ابلہ پروری اور متعصبانہ ناقدری سے ایک طرف تو کاہلی اور سستی کو فروغ ہو رہا ہے اور دوسری طرف

ہماری صنعت اور دستکاری وغیرہ میں بلکہ ہر قسم کی عملی راہوں میں ہم اس قدر ترقی نہیں کر سکتے جتنی کہ وہ ممکن ہے۔

عورتوں کی حالت پر حیرت بھی نہیں !

ترقی یافتہ ملکوں میں اب عورت کی معاشری کم حیثیتی ہی ایک چیز رہ گئی ہے جس میں قانون اور رواج دونوں کا برتاؤ فقط اس متعصبانہ لحاظ پر مبنی ہے کہ عورت عورت کیوں پیدا ہوئی ! باقی اُمور میں اب پیدائش کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ البتہ بعض مہذب ممالک میں ایک استثنائی صورت اور چلی آتی ہے۔ وہ یہ کہ جو شخص شاہی خاندان سے نہ ہو وہ بادشاہ نہیں ہو سکتا۔ ورنہ ہر پیشہ اور ہر منصب ہر ایک کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ صرف اہلیت کی شرط ہے۔ تخت شاہی کا ہر شخص کی رسائی سے بالاتر ہونا پھر بھی ایک غیر معمولی استثنائی صورت کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس رواج کے جواز کو بہت سی مجبوریوں اور معذوریوں پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن عورتوں کی مردودیت کا سا اہم مسئلہ جس کا تعلق دنیا کی نصف آبادی سے ہے ذرا بھی قابل لحاظ نہیں سمجھا جاتا، نہ اُن کی موجودہ حالت کو حیرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے !

ایام جاہلیت کی ایک یادگار

غرضکہ اس آزادی کے دور میں عورتوں کی محکومیت ہی ایام جاہلیت کی ایک اکیلی یادگار باقی رہ گئی ہے۔ نئی روشنی کے ارباب حل وعقد نے جو اصولی قواعد معاشری بہبودی کے لئے تسلیم کئے ہیں اُن سے مستثنیٰ ہونا کیا عورتوں ہی کے حصہ میں آیا ہے ؟ نئی دنیا آج جن ترقیوں پر ناز کر رہی ہے اگر عورتوں کی موجودہ پستی کو منجملہ اُس قسم کی لغو اور غیر منصفانہ رسوم کے نہیں خیال کرتی جن کے نیست و نابود کر دینے کے لئے کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا، تو بہر کیف ہر روشن ضمیر صاحب نظر کے لئے یہ مسئلہ کافی توجہ کے لائق ہے۔

نوع انسان کی ترقی کے ساتھ حقوق نسواں کی ترقی

ہر صاحب فہم سے کم از کم مطالبہ تو ضرور کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر ایک غائر نظر ڈالے۔ اور اس امر سے قطع نظر کر کے کہ موجودہ زمانہ میں عام رائے اس مسئلہ میں کیا ہے اور صورت موجودہ کس امر کی مقتضی ہے، اس سوال کو محض نوع انسان کی بہبودی اور انصاف کے نقطۂ نظر سے حل کرنے کی کوشش کرے۔ اس مسئلہ پر جو بحث ہو وہ محض نقلی اور سطحی نہ ہو۔ کیونکہ

سرسری اعتراضات اور مبہم دلیلوں سے کبھی کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ سوال یہ درپیش ہے کہ جب صرف دو راہیں سامنے ہوں تو عقلاً یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جس راہ کا تجربہ ہو چکا ہے وہ اس راہ سے لازمی طور پر اچھی ہی ہے جس کا تجربہ ابھی نہیں ہوا ہے۔ اگر کہا جائے کہ عورتوں کی مساوات ایک ایسی چیز ہے جس کا ہم کوئی تجربہ نہیں رکھتے اور ابھی تک یہ محض ایک نظری اور قیاسی چیز ہے تو واضح رہے کہ اس کے خلاف یعنی مردوں کی موافقت میں جو رائے ظاہر کی جائے گی وہ بھی قیاسی ہی ہوگی۔ کیونکہ تجربہ نے اب تک جس بات کی تصدیق کی ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ کل نوع انسان موجودہ موافق و ناموافق حالات کے ہوتے ہوئے بھی اب تک باقی رہنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور ترقی کی خوگر تھی۔ تجربہ اس کی بابتہ ابھی تک یہ نہیں کہتا کہ اگر عورتوں کو مساوی حقوق دیدیئے گئے ہوتے تو ترقی کی رفتار تیز تر ہوتی یا نہ ہوتی۔ البتہ تجربہ یہ ضرور کہتا ہے کہ نوع انسان کی ترقی کے ہر ہر قدم پر صنف نسواں کی معاشری حیثیت نے بھی ترقی کی ہے۔ بلکہ مؤرخین اور فلاسفہ تو یہاں تک دعوے رکھتے ہیں کہ اگر کسی قوم یا کسی دور کی تہذیب اور ترقی کا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو اوس قوم اور اُس زمانہ کی عورتوں کی معاشری حیثیت ہم کو بتادو اور ہم تمھیں اس تہذیب اور ترقی کا صحیح اندازہ بتادیں گے۔ نوع انسان کی ترقی کے ساتھ ساتھ زن و مرد میں مساوات بڑھتی آئی ہے۔ اور اس بنا پر یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ بالآخر عورت کو پوری مساوات حاصل ہو کر رہے گی۔

کیا عورت کی موجودہ حیثیت فطرت نے مقرر کی ہے ؟

ایک حجت یہ ہے کہ جس جنس کی جو فطرت ہے اُسی کے لحاظ سے اُس کے مشاغل بھی مقرر ہیں اور معاشری حیثیت بھی۔ یعنی جو جس لائق ہے فطرت نے اس کے لئے معاشری دنیا میں مناسب جگہ بھی وضع کر دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ مرد جب اور جہاں کہیں پائے گئے زبردست پائے گئے۔ لہذا ان حالات میں کسی جنس کی حقیقی فطرت کے بارہ میں کوئی رائے قائم ہی نہیں کی جا سکتی۔ اگر عورت کبھی موجودہ معاشری حالات سے علیحدہ پائی گئی ہوتی تب اُسکی بے لوث فطرت اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوئی ہوتی۔ صدیوں کی روایات غلامی اور بچپن کی ناقص تربیت نے عورت کی سرشت کو جس قدر مسخ کیا ہے اُس کی مثال ارزل ترین غلاموں اور پست ترین مفتوح قوموں کے عادات و اطوار کے مطالعہ سے بھی دستیاب نہیں ہوتی۔ درخت کی ایک شاخ کی ایک باڑھ کو طرح طرح سے

رو کئے اور دوسری شاخ کو پھیلنے اور بڑھنے کے لئے آزاد چھوڑ دیجئے اور پھر کہئے کہ جس شاخ کی جو فطرت سبے وہ اُس حد کو پہونچ رہی ہے' یا یہ کہ بغیر اس تدبیر کے درخت باقی نہیں رہ سکتا تو یہ استدلال کیسے کام دے سکتا ہے ؟

لوگوں کا دھیان اس طرف بالکل نہیں ہے کہ انسان کی سیرت پر کن چیزوں کا اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معاشری زندگی پر نہ کسی کی غائر نظر پڑتی ہے نہ کوئی مدلل رائے قائم ہونے پاتی ہے۔ عورتیں خود چونکہ سیاست کی طرف سے بے پروا بنائی گئی ہیں اس لئے عام رائے یہ ہوگئی ہے کہ وہ رفاہ عام کے مسائل سے بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتیں اور تنگ نظر مشہور کی جارہی ہیں۔

عورت اور مرد میں کس قسم کا اصلی فرق ہے

زن و مرد میں قدرتی فرق کیا ہے ؟ یہ ایک زبردست علمی سوال ہے جو دونوں جنسوں کے مزاج اور طبیعت کے مطالعہ اور امتحان سے حل ہو سکتا ہے۔ اس بارہ میں عوام بہت سی باتیں پہلے سے فرض کئے ہوئے ہیں تحقیق کا مادہ اُن میں نہیں ہے۔ نہ وہ جانتے ہیں کہ انسان کی سیرت پر درحقیقت کن چیزوں کا اثر پڑتا ہے اور کیونکر پڑتا ہے۔ اور کسی جنس کی اصلی فطرت یا دو جنسوں کا فطری فرق واقعی کس طرح دریافت کیا جا سکتا ہے۔ خواہ یہ فرق دماغی ہو یا اخلاقی لیکن جو بھی فرق پایا جاتا ہے وہ ہمیشہ سے اُسی طرح پایا جارہا ہے جیسے کوئی قدرتی فرق پایا جاتا ہو۔ اب قدرتی اور مصنوعی میں وجہ تمیز بہت کم باقی رہتی ہے۔ خاصکر جہاں تک کہ عورت کی نااہلیت کا سوال ہے یہ تمیز کرنا ہی بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ عورت اگر نوع انسان کا جزو ہے تو اُس کا شمار ذی عقل ہستیوں میں ضرور ہے۔ جو چیزیں مرد کی سیرت پر اثر ڈالتی ہیں وہ اُس کی سیرت پر بھی اثر ڈالتی ہیں۔ اور سچ پوچھئے تو اگر تربیت کے تمام اُصول پوری طرح دریافت ہو جائیں تب بھی بحالت موجودہ کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ مرد اور عورت میں اخلاق اور عقل کے لحاظ سے جو فرق پایا جاتا ہے وہ کس حد تک حقیقی اور واقعی ہے اور کس قدر مصنوعی۔ عورت کی سیرت پر خاص قسم کے اثرات ہمیشہ سے ڈالے جاتے رہے۔ اور مردوں کی توقعات ایک خاص صورت سے قائم ہوتی چلی آتی ہیں۔ قیاس آرائی کی تو بات ہی دوسری ہے۔ لیکن تجربہ کا ابھی تک کوئی موقع نہیں آیا جس کی بنا پر کوئی ایک بات پورے طور پر طے ہو سکے۔ لیکن تجسس کے ساتھ حالات کا مطالعہ کیجئے

تو تجربہ یہی ثابت کرتا ہے کہ عورتیں ترقی کی صلاحیت سے قدرتاً محروم نہیں ہیں۔ جب کبھی اُنھیں موقع ملیگا وہ ضرور اپنی اہلیت میں ترقی کریں گی۔

عورت کی بابتہ مردوں کی رائے کیا وقعت رکھتی ہے

سائنس نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ مرد و زن کے اصلی فرق پر کچھ بھی روشنی ڈال سکے۔ جسمانی فرق تو طبیبوں اور سائنس والوں کو ضرور معلوم ہیں لیکن مزاج شناسی دوسری ہی چیز ہے۔ ان سائنس والوں سے بڑھ کر مزاجوں کے مبصر تو جاہلوں میں مل سکتے ہیں۔ مگر اتنا مزاج داں کوئی نہیں ہو سکتا جو دونوں کے مزاج میں حقیقی اور پیدائشی فرق صاف طور پر بتا سکے۔ یا دعوے سے یہی کہدے کہ عورت کا مزاج مرد کے مزاج سے واقعی مختلف ہے۔ عورت کو لوگوں نے احمق پایا اور احمق سمجھ لیا۔ عورت اگر احمق ہے تو اُس سے واقف ہونا بہت آسان ہے کیونکہ حماقت دنیا میں ایک ہی طرح کی ہوا کرتی ہے۔ احمق شخص کے خیالات اور جذبات اس طبقہ اور اُس صحبت کے خیالات اور جذبات کا آئینہ ہوتے ہیں جس میں وہ اُٹھتا بیٹھتا ہے۔ اگر کسی احمق شخص کے خیالات اور جذبات کا اندازہ کرنا ہو تو اُن کے ہمنشینوں کے خیالات اور جذبات معلوم کر لیجئے اور پھر آپ صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ عقلاً آزاد ہیں اور اون کے جذبات وغیرہ اُنہی کی سرشت سے پیدا ہیں اون کی صورت دوسری ہے۔ بہت سے مرد مدعی ہیں کہ وہ عورت کی رگ ریشہ سے واقف ہیں اور عورت کے مزاج کی تہہ تک پہونچ چکے ہیں۔ لیکن اون کا یہ دعوے محض سطحی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص خاصکر چند عورتوں کی طبیعت کا اندازہ کچھ نہ کچھ رکھتا ہو۔ لیکن واضح رہے کہ بحالات موجودہ عورت سے بڑھ کر اپنی حالت کا چھپانے والا بھی کوئی نہ ملیگا۔ اور عورت کی طبیعت کے بہت سے پہلو ایسے بھی ہیں جنھیں اگر وہ چاہے بھی تو ظاہر نہ کر سکے گی۔ فی الجملہ مردوں کو اس مطالعہ کا موقع اپنے گھر میں ملتا ہے۔ اور گھر کی چند مثالوں سے وہ دنیا بھر کی عورتوں پر قیاس دوڑانا چاہتے ہیں۔ مگر یہ اندازہ کرنے کا موقع یوں بھی لائق اعتبار نہیں کہ آدمی عموماً کبھی کوئی قیاس قائم کرتا ہے تو وہ محبت اور یگانگت ورنہ نفرت اور عداوت کے جذبات دل میں لئے ہوئے ہوتا ہے۔ اور مرد کی جو شان رعونت عورت کے مقابلہ میں ہے اُس سے اُس کی کوئی منصفانہ رائے قائم ہونا مشکل ہے۔ محبت اور نفرت یہ دونوں چیزیں انسان کو اندھا بنائے رکھتی ہیں۔ دنیا میں کتنے مرد ہیں جن کے دل

جنسی تعصب سے خالی ہیں؟ باپ اپنے بیٹے کی سیرت سے اتنی آسانی کے ساتھ نہیں واقف ہو سکتا جتنی آسانی سے کہ ایک برابر کا دوست اپنے دوست کی سیرت سے واقف ہو سکتا ہے۔ حالانکہ باپ اور دوست میں فرق یہی ہے کہ باپ بیٹے پر حاوی ہوتا ہے اور دوست برابری کا دعویٰ رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے مزاج سے واقف ہو گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ہر عورت کے مزاج سے واقف ہو گیا پھر ہر طبقہ کی عورتیں یکساں نہیں ہوتیں نہ ہر ملک کی عورتوں کی طبیعت ایک سی ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سب یکساں بھی ہوں تو وہ ایک ہی زمانہ کی ہوں گی۔ ماضی اور مستقبل کی عورتوں پر قیاس کیا معنی؟ غرضکہ فی الجملہ ان کی سرشت کی بابت کوئی مختتم رائے قائم کر لینا ایک لغو بات ہے۔ اور جب تک عورتیں اپنی کہانی خود کہنے کی اہل نہ بنیں ہم کو محض اپنے قیاس پر بھروسہ کر کے مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔

عورتوں کے اقوال آزادانہ نہیں ہیں۔

ابھی تک تو عورتیں زبان بندی کے مزے لے رہی ہیں۔ مجمع عام میں منہ کھولنا کیسا بعض مضامین پر قلم فرسائی تک ان کے لئے معیوب ہے۔ اگر عورت نسوانی دنیا کے معاملہ پر کچھ لکھ کر شائع کرتی ہے تو وہ بھی غیر مستحسن قرار پاتا ہے۔ اور کسی بن بیاہی کے ادبی میدان میں رونما ہونے کا منشا یہ سمجھا جاتا ہے کہ اوسے شوہر کی تلاش کا یہی ایک ذریعہ باقی رہ گیا ہے۔ پھر مرد اس کے خیالات کو عجیب دلچسپی سے پڑھتے ہیں اس لئے لڑکیوں کی خامہ فرسائی اور بھی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ لکھنے والیاں لکھتی تو ہیں مگر چھپ چھپ کر۔ اور جو لکھتی ہیں اس میں آپ بیتی کا شائبہ بھی نہیں آنے پاتا۔ بلکہ وہ زیادہ تر نقالی ہوتی ہے یا اپنے طبقہ کے عام خیالات کا خاکہ اڑانا ہوتا ہے۔ ہم کو انتظار اس وقت کا ہے جب ان کا قلم معاشری دباؤ سے آزاد ہو جائے۔ اس سے پہلے ان کے شائع کئے ہوئے اقوال بھروسہ کے لائق نہیں ہوں گے۔

عورتوں کا اپنی نااہلیت تسلیم کرنا کوئی دلیل نہیں

اب یہ اعتراض ہوگا کہ جب مرد ان کی سرشت سے واقف ہی نہیں ہیں تو ان کی خامیوں کا بھی پورا اندازہ نہیں رکھتے لہذا ان کو برابر کا شریک بنانا ایک مخدوش بات ہے۔ مگر میں یہ کہوں گا کہ جہاں تک عورتوں کو مساوات دیگئی انھوں نے خود کو اس کا

اہل ثابت کیا۔ اور اب وہ بقیہ اُموروں میں بھی موقع پانے کی ضرور اہل ہیں۔ جہاں تک عملی ضروریات متعلق ہیں اور اُنکی معاشری مساوات مدنظر ہے اُنکی سرشت کی علمی تحقیقات سردست غیرضروری ہے تا وقتیکہ آزادانہ تجربہ اور مشاقی کی کوشش کے بعد وہ خود اپنی نااہلیت کی قائل نہو جائیں اُن کو خود انکی رائے کے بموجب نااہل مان لینا درست نہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنی فلاح اور بہبودی اور اپنی صلاحیت کی بابت بغیر آزادی حاصل کئے ہوئے کوئی شخص خود بھی صحیح رائے نہیں قائم کر سکتا۔ پھر دوسروں کا کوئی مختتم رائے قائم کر لینا یہ بہت زیادتی ہے۔

عورتوں کو بلا رو رعایت مقابلہ کرنا ہوگا

کم از کم اتنا تو یقینی ہے کہ مساوات حاصل کرنے کے بعد اگر کوئی مشغلہ عورتوں کی فطرت کے واقعی خلاف پڑے گا تو لامحالہ وہ اُس سے الگ ہو جائیں گی۔ جو چیز عورتیں فطرتاً قبول نہیں کر سکتیں اُن سے اُنھیں روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہر مشغلہ میں اُنھیں مردوں سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ یہ منشا تو کسی کا نہیں کہ اُن کے ساتھ کوئی رعایت کی جائے یا اُنھیں فائدہ پہونچانے کے لئے مردوں کی صنعت اور تجارت پر کوئی محصول لگا دیا جائے! تجارت اور کاروباری دنیا کا یہ اُصول اُن کے لئے بھی ہے کہ جو جس چیز کا زیادہ اہل ہے۔ وہ اس میں ترقی کریگا۔ اگر اس اُصول کی بنا پر عورتوں کو فائدہ پہونچ جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ اور اگر آزادانہ مقابلہ میں مرد ہی بازی لے جائیں تو عورتوں کو کوئی وجہ شکایت نہیں۔ انصاف سب کی زبان بند کر دیگا۔ جو جس کام کا اہل ہوگا اُسی میں مشغول رہیگا جس کا نتیجہ نوع انسان کی بہبودی ہے۔

یہ اندیشہ کہ عورتیں شادی سے گریز کرنے لگیں گی۔

مردوں کی رائے یہ فرض کر لی گئی ہے کہ عورت قدرتاً زوجہ اور ماں بننے کے لئے ہے۔ "فرض" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ اگر مردوں کے افعال اور معاشرت کے موجودہ نظام پر نظر رکھ کر رائے قائم کیجئے تو کم از کم اس زمانہ میں مردوں کی رائے کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ تاہم میں کہتا ہوں کہ اگر عورتوں پر سے ہر قسم کی قید اُٹھا دی جائے تو بہت سی ایسی عورتیں پیدا ہو جائیں گی جو ثابت کر دیں گی کہ اونکی فطرت پر یہ الزام نہ صرف غلط ہے بلکہ صورت حال اس الزام کے بالکل منافی ہے۔ اگر مردوں کی رائے فی الواقع یہی ہے تو کاش مجھے ایک شخص

بھی ایسا ہی جائے جو بالاعلان یہ دعوے کرے کہ " معاشرت کا مقتضا ہی یہ ہے کہ عورت شادی کرے اور بچے جنا کرے ۔ لیکن کوئی عورت جب تک مجبور نہ ہوگی ایسا کرنے پر تیار نہ ہوگی۔ لہٰذا عورت کو اس پر مجبور کرنا ضروری ہے "۔ جب یہ دعوے ان الفاظ کے ذریعہ سے معین ہوگیا تو اس کا مقابلہ جنوبی کارولینا اور لوئیسیانا کے غلام نواز آقاؤں کے استدلال سے کیجئے جو کہتے ہیں کہ " کپاس اور شکر کی کاشت ضروری چیز ہے ۔ گوری قوم کے لوگ یہ کاشت نہیں کر سکتے اور سیاہ فام لوگ اُس شرحِ اُجرت پر کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے جو ہم دینا چاہتے ہیں ۔ لہٰذا سیاہ فاموں کو کام پر مجبور کرنا ضروری ہے "۔ جن لوگوں کی رائے حقیقتاً یہی ہے کہ عورت شادی پر مجبور نہ ہوگی تاوقتیکہ دوسرے مشاغل سے وہ محروم نہ کردی جائے تو وہ لوگ گویا تسلیم کر رہے ہیں کہ عورت کی بیاہی زندگی واقعی کوئی ایسی چیز نہیں جسے وہ اپنے دل سے پسند کرتی ہو۔ یعنی وہ اس کے لئے ایک کرب کی حالت ہے جس سے اُس کے بھاگنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے ۔ خود اسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو در اصل خوف محض اس بات کا نہیں کہ عورتیں شادی سے انکار کریں گی ۔ بلکہ خدشہ یہ ہے کہ جب وہ شادی کریں گی تو بغیر برابری کے دعوے کے نہ کریں گی ۔ میرے خیال میں اول تو مردوں کو عورتوں کے شادی سے گریز کرنے کا فی الواقع کوئی خدشہ نہیں اور یہ سب بناوٹ کی باتیں ہیں ۔ اگر انھیں خطرہ ہے تو اپنے اختیارات کے زائل ہونے کا ہے ۔ جب تک عورت کے لئے شادی کرنا اپنے کو کسی کی غلامی میں دیدینے کے مرادف ہے اُس وقت تک اگر عورتیں شادی سے بھاگیں بھی تو اُس کا الزام انصافاً مردوں کے اقتدار پسندی پر ہے نہ کہ عورتوں کی آزاد مزاجی پر ۔ ان حالات میں اگر مردوں کو یہ اندیشہ بالفرض لاحق بھی ہو تو میرے خیال میں اس کا لاحق رہنا ہی اچھا ہے ۔ کیونکہ عورتوں کے لئے اگر دنیاوی مشاغل کی راہیں کھل جائیں اور انھیں مساوات کا درجہ حاصل ہو جائے تو ان کے لئے اس سے بڑھ کر حماقت بھی نہیں کہ وہ زمانہ موجودہ کی سی محکوم زوجہ بنکر اپنی عزت کو بٹہ لگائیں اور مرد کی غلامی کریں ۔ اگر شادی سے عورت کی محکومیت نہ لازم آئیگی تو عورت کو شادی سے نفرت کی کوئی وجہ بھی نہ ہوگی ۔ مردوں کے نزدیک اگر قوانین ازدواج کا دارو مدار مرد کی مطلق العنانی پر رکھنا درست ہی ہے تو واقعی مردوں کے لئے اس سے بڑھ کر مفید مطلب کچھ نہیں ہو سکتا کہ

عورت کو ہر طرف سے گھیر کر شادی پر مجبور کیا جایا کرے۔ ظاہر ہے کہ اُس غریب کے لئے اگر یہی ایک رستہ رہیگا تو اور کسی طرف قدم بڑھانے کی کوشش ہی نہ کریگی۔ لیکن مردوں کی اگر یہ خواہش جائز ہے تو اب تک عورتوں کو جو تعلیم دی گئی اور جو کچھ آزادی سکھائی گئی یہ بھی بہت بُرا ہوا اُنھیں تو سوائے خانہ داری اور خانہ نشینی سیکھنے کے کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جو کچھ اب تک ہوا وہی مردوں کیلئے کافی وبال جان ہے!

بازپرس

کئی سال ہوئے میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ کہاں سے آ رہا تھا۔ کہاں جا رہا تھا اس کے بتانے کی ضرورت نہیں میں دوسرے درجہ میں تھا۔ سفر بہت دیر سے جاری تھا اور ابھی کچھ اور فاصلہ باقی تھا کہ ایک شام غیر متوقع طور پر ہماری گاڑی کو اسٹیشن کی ایک بغلی لائن پر ڈال دیا گیا۔ گارڈ نے دروازے کھولے اور ہم سے کہا کہ اب آگے نہیں جا سکتے آپ لوگوں کو اُتر جانا چاہیئے۔ مسافر بہت سے تھے ہر طبقہ اور نوعیت کے۔ تیسرا درجہ بھی تھا، دوسرا بھی اور پہلا بھی۔ بڑے آدمیوں کے لئے کئی سیلون بھی لگے تھے۔ کچھ وزیر تھے۔ کچھ جج جو دورہ کر رہے تھے۔ کچھ کمپنیوں کے ڈائرکٹر، کچھ ممتاز تاجر، کچھ اونچے خاندانوں کے بیکار نوجوان جو سیر و تفریح کے لئے نکلے تھے۔ ایک لاٹ پادری تھے۔ کئی معزز خواتین تھیں اور ایک نواب اور اُن کی بیگم صاحبہ اپنے تمام مصاحبوں اور ملازموں وغیرہ کے ساتھ۔ ان معزز مسافروں کے ڈبے مخصوص تھے اور ان میں سے ہر ایک اتنی جگہ پر قبضہ کئے ہوئے تھا جو بیس معمولی آدمیوں کے لئے کافی سمجھی جاتی ہے۔ میں کئی دن سے عیش کے ان تمام سامانوں کو جو ان بڑے مسافروں کو ہر طرح کی بے آرامی سے بچانے کے لئے فراہم کئے گئے تھے دیکھ دیکھ کر تفریح حاصل کر رہا تھا۔ موٹے نرم نرم تکئے، گرم لبادے، مٹھائیوں اور پھلوں کی ٹوکریاں، وقت گذاری کے لئے ناول اور رسالے موجود تھے۔ ان کے ذرا سے اشارہ پر ٹکٹ چیکر اور اسٹیشن ماسٹر ہمہ تن توجہ نظر آتے تھے۔ میرے درجہ کے لوگ متفرق قسم کے تھے۔ کچھ کاروباری تھے۔ کچھ وکیل۔ کچھ ادیب۔ کچھ آرٹسٹ۔ کچھ سیاح جو یا تو تفریحاً یا اس لئے گھوم رہے تھے کہ اُن کے پاس کوئی دوسرا کام کرنے کو نہ تھا۔ تیسرے درجہ میں کاریگر اور مزدور تھے جو روزگار کی تلاش میں نکلے تھے۔ عورتیں تھیں جنھیں اپنے شوہروں کی تلاش تھی یا ملازمت کی۔ فقیر تھے جنھوں نے فاقہ سے تنگ آکر دنیا کے ایک حصہ کو چھوڑا تھا لیکن جنھیں یہ خبر نہ تھی کہ جہاں کہیں بھی جائیں گے فاقہ سایہ کی طرح اُن کے پیچھے لگا رہے گا۔ یہ سب ایک ساتھ کاندھے سے کاندھا جوڑے بیٹھے تھے۔ جو کچھ روکھا سوکھا ملتا تھا

یا تو اُسے کھا لیتے تھے یا اسٹیشن پر جو چیزیں میسر آسکتی تھیں اُن سے پیٹ بھر لیتے تھے۔ جیسی چوپایوں کی زندگی ہوتی ہے اور جتنا اُن کا خیال رکھا جاتا ہے بس اتنا ہی اُن کا بھی رکھا جا رہا تھا۔

تاہم اُن کی کھڑکیوں سے گانے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں لیکن باوجود ہر قسم کی آسائشوں اور سہولتوں کے اونچے درجوں میں جو اعلیٰ طبقہ کے لوگ تھے اُن کے چہروں سے افسردگی ظاہر ہوتی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے غریب ہم سفروں کے مقابلہ میں وہ بہت کم لطف اُٹھا رہے ہیں۔ غریب لوگ سخت جان تھے۔ ہچکولوں اور دھکوں کی اُنھیں بہت کم پروا ہوتی تھی۔ یہ خوش مزاج بھی زیادہ تھے اور باہم دگر مہربان بھی۔ جہاں کہیں بھی رہ گئے تھے زندگی کو اُنھوں نے اپنے لئے سخت پایا تھا اور چونکہ اپنی تمناؤں کے مطابق چیزیں کبھی میسر نہ آسکی تھیں اس لئے ان کی عادتیں بگڑنے نہ پائی تھیں۔ وہ خودغرض کم تھے اور دوسروں کا خیال زیادہ رکھتے تھے۔

ہم میں سے بیشتر لوگوں کو اس اطلاع کے دفعتہً ملنے سے کہ فی الحال ہمارا سفر ختم ہوگیا بڑی ناگواری ہوئی۔ معزز لوگ بڑے غصہ سے باہر نکلے۔ اُنھوں نے اپنے ملازموں کو آوازدی اُن کے ملازموں نے یا تو اُن کی آواز سنی نہیں یا ہنستے ہوئے اُن کے پاس سے گذر گئے۔ ٹھٹ جیکہ ادب وتمیز بھول گئے پلیٹ فارم پر سب طبقوں کے آدمی یکبارگی ایک سطح پر آگئے۔ ایک بیگم صاحب سے جو اس بات پر حیرت زدہ کھڑی تھیں کہ اُن کی خادمہ اُنھیں چھوڑ کر چلی گئی ہے اور اب اپنا بیگ اُنھیں کو اُٹھانا پڑے گا ایک بیکارن شانہ رگڑتی ہوئی گذر گئی۔ امرا عوام میں اسی طرح دھکّے کھاتے پھر رہے تھے گویا وہ بھی ایک معمولی فانی انسان ہیں۔ اُنھوں نے زور زور سے مطالبہ شروع کیا کہ ہم اسٹیشن ماسٹر سے ملنا چاہتے ہیں۔ وزیر صاحب اس توقف پر سخت برافروختہ تھے اور کہہ رہے تھے کہ اس تاخیر سے ایک اہم معاملہ خطرے میں پڑ جائے گا اور وکیل دسے رہے تھے کہ یہ امر میرے مؤکل کی ناخوشنودی کا باعث ہوگا جس کا خمیازہ کمپنی کو بھگتنا پڑے گا۔ ایک امیر لڑکا جسے اپنے بڑے بھائی کے مرنے کی اطلاع ابھی ملی تھی اپنے ترکہ پر قبضہ کرنے جا رہا تھا۔ ایک محترم خاتون نے اپنی دانست میں اپنی بیٹی کے لئے ایک نہایت مناسب بر حاصل کیا تھا۔ اب چونکہ اُن کا کام ختم ہوگیا تھا اس لئے اس موسم کی تمام ہنگامہ خیز تقریبوں کی تھکن اُتارنے کے لئے وہ صحت بخش

چشموں پر غسل کے لئے جارہی تھیں۔ لیکن اس معاملہ میں غیر متوقع طور پر ایک دشواری پیدا ہوگئی تھی اور اگر وہاں کے ازالہ کے لئے جلد قریب ہی موجود نہ ہوئیں تو نتائج کے خراب صورت اختیار کرنے کا اندیشہ تھا۔ ایک ساہوکار نے کہا کہ ایک بڑی کوٹھی کا کاروبار بالکل بیٹھ جائے گا اگر مقررہ دن پر میں وہاں نہ پہنچ سکوں گا۔ نجات صرف میرے ہاتھ میں ہے۔ ایک مختار کے ہینڈ بیگ میں ایسی شہادت تھی جس سے ایک قدیم خاندان کے خطاب اور زمینوں کی وراثت کا تعین کیا جا سکتا تھا۔ ایک سن رسیدہ شوہر اپنی نوجوان بیوی کی طرف سے جسے وہ گھر چھوڑ آیا تھا مایوس ہو رہا تھا۔ اُس نے ایک دستاویز مرتب کی تھی جس کی رو سے اگر اُس کے مرنے کے بعد وہ کسی دوسرے شخص سے شادی کرے گی تو اُسے اپنے تمام ترکہ سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ دستاویز ڈسک میں پڑی رہ گئی تھی اور اس پر دستخط نہ ہو سکے تھے۔ لاٹ پادری اُس مشاورتی جلسہ میں شرکت کے لئے جارہے تھے جہاں اس مسئلہ کے متعلق فیصلہ ہونے والا تھا کہ آیا قربان گاہ میں موم بتیوں کی جگہ گیس کی روشنی سے کام لیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ قربان گاہ کی بتیوں میں رحمت و برکت پہلے ہی سے پائی جاتی ہے لیکن گیس کو بابرکت قرار دینا مشتبہ تھا۔ اسقف اعظم کی رائے یہ تھی کہ اگر گیس کی نلکیوں کو موم بتیوں کی شکل دے دی جائے تو یہ مشکل حل ہو جائے۔ لیکن انھیں خدشہ یہ تھا کہ اگر اپنی موجودگی سے اُنھوں نے اعتدال کی فضا پیدا نہ کی تو اکثریت جلد بازی سے نامناسب فیصلہ کر بیٹھے گی۔ یہ تمام لوگ نہایت سادہ لوحی اور صاف گوئی سے اپنی پریشانیوں کو بیان کر رہے تھے اور جو بات حق تھی اُس کا اظہار بے باکی سے کیا جارہا تھا۔ البتہ ماتمی لباس میں ملبوس ایک ممتاز خاتون جس کے نرم دل چہرے سے حزن و ملال کی کیفیت ٹپک رہی تھی راضی بہ رضا اور اُمید سے معمور تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا شوہر اسی اسٹیشن پر زیادہ عرصہ نہیں ہوا روک لیا گیا تھا۔ اُسے یہ خیال ہو رہا تھا کہ ممکن ہے یہاں اس کو دوبارہ ملاقات ہو جائے۔

اسٹیشن ماسٹر نے سب کی شکایتوں کو اطمینان اور لاپروائی سے سنا۔ جن کی آوازیں بہت بلند تھیں اُنھیں اُس نے سمجھایا کہ اس قدر اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وزیر سے اُس نے کہا کہ حکومت تمھاری عدم موجودگی میں بھی چلتی رہیگی۔ تمھارے پیش نظر ریاست کی بھلائی اتنی نہ تھی جتنی خود اپنی پارٹی کی

کامیابی۔ اس سلسلہ میں تم اپنے لئے سر کا خطاب بھی حاصل کرنا چاہتے تھے جو یہاں تمھارے بالکل کام نہ آئے گا۔ نوجوان سے اُس نے کہا کہ تمھارا دوسرا بھائی موجود ہے جو تمھاری بجائے جایداد کا مالک ہوگا اور کاشتکاروں کو اسی تبدیلی سے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ محترم خاتون سے اُس نے کہا کہ تمھاری لڑکی تمھاری مرضی کی بجائے اب خود اپنی مرضی سے شادی کرلیگی اور پہلے سے زیادہ خوش رہیگی۔ ساہوکار سے کہا کہ کوٹھی کا پہلے ہی سے دیوالہ نکل چکا ہے۔ جتنی زیادہ دیر وہ قائم رہتی اُتنے ہی زیادہ معصوم لوگ اُس کی وجہ سے تباہ ہوتے۔ وکیل سے کہا کہ تم جس لڑکے کو نوابی دلانا چاہتے ہو وہ مدرسہ میں محنت سے پڑھ رہا ہے اور چند دنوں میں نہایت مفید آدمی بن جائے گا۔ اگر بڑی جایداد اُس کے ہاتھ لگتی تو وہ نکما اور بدمعاش ہوجاتا۔ سن رسیدہ آدمی سے کہا کہ تمھیں خوش ہونا چاہئے کہ جس مصیبت میں گرفتار تھے اُس سے جلد چھٹکارا ملا۔ تمھاری بیوی ایک واہی تباہی سے شادی کرلیگی اور تمھارا ترکہ اس کے لئے اور زیادہ مصیبت کا باعث ہوگا۔ لاٹ پادری کی پریشانی کی اسٹیشن ماسٹر نے تعریف کی۔ موم بتی کے مسئلہ کا جو حل آپ نے تجویز کیا ہے وہ واقعی نہایت معقول ہے لیکن اس مسئلہ کی وجہ سے پادریوں کو ایک بے ضرر موضوع پر جھگڑا کرنیکا موقع ملا ہوا ہے۔ اگر آپ کی تجویز اختیار کرلی جاتی تو وہ کسی اور جھگڑے میں پڑتے جس کا نتیجہ زیادہ ضرر رساں ہوتا۔

وزیر نے بگڑ کر دریافت کیا "تو کیا اس تمام گفتگو سے تمھارا مطلب یہ ہے کہ تم اب ہمیں آگے بھیجنا ہی نہیں چاہتے"

اسٹیشن ماسٹر نے ایک عجیب انداز سے خفیف مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "گھبرائیے نہیں۔ رفتہ رفتہ آپ کو سب باتیں خود ہی معلوم ہو جائیں گی"

میں نے دیکھا کہ وہ اُس خاتون کی طرف جو ماتمی لباس پہنے تھی نرمی کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اُس کے دل میں کیا ہے اور ہرچند اُس نے الفاظ کے ذریعہ سے کوئی امید نہیں دلائی لیکن وہ رنجیدگی کے ساتھ مسکرایا اور تھوڑی دیر کے لئے ابتدائی کیفیت زہرخند اُس کے چہرے سے بالکل زائل ہوگئی۔

اسی اثنا میں عوام پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر کھڑے سیٹیاں بجا رہے تھے اور اپنے معزز ساتھیوں

کی پریشانی سے بدطینتی سے نہیں بلکہ معصومیت کے ساتھ تفریح حاصل کر رہے تھے۔ ہر چند ایک بڑا سانحہ پیش آیا تھا۔ لیکن زمانہ کے اونچ نیچ کا انھیں اس قدر تجربہ تھا کہ قسمت کو جو کچھ اُن کے لئے منظور تھا اس کے لئے وہ بالکل تیار تھے۔ جس جگہ وہ جا رہے تھے وہاں کسی بہشت کے ملنے کی انھیں کوئی توقع نہ تھی۔ ان کے لئے ایک جگہ ویسی ہی اچھی تھی جیسی دوسری۔ اُن کے پاس سوائے اُن کپڑوں کے جنھیں وہ پہنے کھڑے تھے اور اُس معمولی مہارت کے جو اپنے مختلف پیشوں میں انھیں حاصل تھی اور کوئی چیز اپنی نہ تھی۔ آدمی جہاں بھی ہوں گے وہاں انھیں موچیوں، درزیوں، لوہاروں اور بڑھیوں کی ضرورت ہوگی۔ اگر یہ بھی نہ ہوگا تو جو کام ملے گا وہی کریں گے۔

فوراً ہی ایک گھنٹی بجی۔ ایک دروازہ دفعتہً کھلا اور ہمیں ویٹنگ روم میں جانے کا حکم دیا گیا جہاں ہم سے کہا گیا کہ آپ کا سامان سفر دیکھا جائے گا۔ یہ ایک بڑا خالی کمرہ تھا جیسے بڑے اسٹیشنوں پر تیسرے درجہ کے ویٹنگ روم عموماً ہوا کرتے ہیں۔ ایک کٹہرہ سامنے لگا تھا جس کے پیچھے مویشیوں کی طرح ہم سب بند کر دیئے گئے۔ ہمارے مقابل ایک بڑی میز تھی جس پر صندوق، بیگ اور دستی صندوق رکھے تھے ان کے پیچھے کچھ افسر قطار باندھے کھڑے تھے۔ اُن کی وردیاں سادہ تھیں۔ ٹوپیوں میں سادہ سنہری لیس لگی تھی۔ اُن کا لہجہ خشک اور تحکمانہ تھا جو اُن مسافروں کے لئے جن کے ساتھ ہمیشہ ادب و تمیز سے بات کی جاتی تھی سخت ناگوار تھا۔ ان کی پشت پر ایک پردہ تھا جو کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا تھا اور چھت کی نصف اونچائی تک بلند تھا۔ اس کے عقب میں بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا تھا دفتر ہے ہم میں سے ہر شخص تجسس کی نظر سے یہ دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اُس کا سامان بھی محفوظ ہے یا نہیں۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ہم ان میں سے کسی چیز کو بھی شناخت نہ کر سکتے تھے۔ بنڈل تو بہت سے تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ ان ہی مسافروں کے ہیں جو اس گاڑی سے آئے ہیں ان کو تین درجوں میں تقسیم کیا گیا تھا پہلا دوسرا اور تیسرا۔ لیکن تناسب اُلٹا ہو گیا تھا۔ اس میں سے بیشتر پر اُن مسافروں کا لیبل لگا تھا جنھوں نے تیسرے درجہ کے بدبودار اور تکلیف دہ ڈبوں میں سفر کیا تھا اور جن کے پاس سوائے اس سامان کے جو وہ اپنے ہاتھ میں لئے تھے اور کچھ نہ تھا۔ جہاں دوسرے درجہ اور کچھ اس سے بلند درجے

مسافروں کا سامان ہونا چاہئے تھا وہاں سامان کا ایک متوسط سا انبار لگا تھا۔ لیکن ہم میں سے کوئی شخص بھی اپنے صندوقوں کی شکل نہ پہچان سکتا تھا۔ رہے عالی مرتبت امرا اور معزز بیگمیں سو وہ بے شمار اشیاء جو اُن کے ڈبوں میں اُن کی کہ کر رکھی گئی تھیں اُن کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ شال اور لبادے تختوں پہ پڑے تھے اور بس۔ اس پر ایک بڑا شور و غوغا ہوا۔ لیکن افسر اس کے عادی معلوم ہوتے تھے اور اُنھوں نے اس کی بالکل پروانہ کی۔ اسٹیشن ماسٹر نے جو ابھی تک ہماری نگرانی پر مقرر تھا مختصر طور پہ کہا کہ سیلونوں کا سامان دوسری ریل گاڑی پر روانہ کیا جائے گا۔ ان کے سابق مالکوں کو اب ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے اب یہ ان کے دوستوں کو دے دیا جائے گا۔

سابق مالک؟ تو کیا اب ہم حقیقی مالک نہ رہے تھے؟ میرا ذاتی نقصان تو زیادہ نہ تھا۔ پھر مجھے اس کی تلافی کی بھی توقع تھی کیونکہ میں اپنا نام ایک عجیب سے صندوق پر لکھا ہوا دیکھ رہا تھا جو میز پر میرے سامنے رکھا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ میری طبیعت جستجو پسند واقع ہوئی ہے اس لئے اس تجربہ کی ندرت نے میری دلچسپی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ لیکن بقیہ لوگوں کی سراسیمگی ناقابل بیان تھی۔ مزید یہ کو خیال ہوا کہ وہ بالشوکوں کے درمیان پہنچ گیا ہے جو ملکیت ذاتی کے قائل نہیں ہیں اور جماعتی زندگی کی ابتدائی شرائط پر تقریر کرنے ہی والا تھا کہ " خاموش! خاموش!! " کی صدا بلند ہوئی اور تیسرے درجے کے مسافروں کو آگے بڑھنے کے لئے کہا گیا تاکہ اُن کا سامان کھولا جاسکے ہر آدمی کے سامان پر نہایت اہتمام سے یادداشت کی پرچی لگی ہوئی تھی۔ ڈھکنے خود بخود ایک دم کھل گئے۔ اندر دیکھا تو کپڑے، جوتے پہننے کا اور سامان، روپیہ زیور وغیرہ تو نظر نہ آیا۔ البتہ زندگی میں جو جو کام اُنھوں نے کئے تھے اُن کے نمونے رکھے ہوئے تھے۔ ایک آمد و خرچ کے حساب کا رجسٹر بھی رکھا تھا جس میں اُن ایام کی تعداد درج تھی جن میں وہ مصروف محنت رہے۔ اُن کھیتوں کے نمبر اور رقبہ وغیرہ تھا جن میں اُنھوں نے ہل چلایا تھا، سنچائی اور زراعت کی تھی۔ جن فصلوں کو کاٹا تھا، جن دیواروں کی تعمیر کی تھی، جن دھاتوں کو کھود کر نکالا اور پگھلایا تھا اور اُن کی انسانوں کے لئے مفید اشیاء بنائی تھیں، جس چمڑے کی دباغت کی تھی جن کپڑوں کو سیا تھا۔ ان سب کا نہایت ٹھیک ٹھیک اندراج تھا۔ اور آمدنی کے صفحہ پہ وہ اجرتیں

اور اُس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی اشیاء کے وہ حصے لکھے ہوئے تھے جو اُنھیں ملے۔ ان کے آمد و خرچ کے رجسٹر میں اُن چیزوں کے علاوہ جس پر لفظ "کام" کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے، اُن کے دوسرے افعال و اعمال کا بھی اندراج تھا مثلاً والدین اور بیوی بچوں سے محبت، خلوص و ایثار، خیر خیرات، پاکبازی، سچائی اور دیانت یا پھر وہ بدنما فہرست تھی جس میں گناہوں، گالیوں، شراب خواری، ظلم و بے رحمی اور دوسرے خراب اعمال کا اندراج کیا گیا تھا۔ لیکن ان اعمال کے متعلق مفصل تحقیقات عالم بالادست کی عدالت کے لئے محفوظ کر دی گئی تھی۔ ابتدائی تحقیقات صرف اس بات تک محدود رکھی گئی تھی کہ ایک شخص نے عام منفعت کے لئے کیا کام کیا ہے۔ کس قدر اُس نے خدمت کی۔ اور جماعت نے اُس کے معاوضہ میں اُسے کیا دیا۔ جب تک اس امتحان میں ایک شخص قابل اطمینان طریقہ پر کامیاب نہ ہوتا تھا اُسے آگے بڑھنے کی اجازت نہ تھی۔ اکثر مزدوروں کے حساب میں بقایا جماعت کے ذمہ نکلتا تھا۔ معاملہ اس قدر صاف تھا کہ جانچ کا کام بہت جلد ختم ہو گیا اور وہ اور ان کا سامان عدالت بالادست کی طرف منتقل کر دیئے گئے۔ کچھ ایسے بھی تھے جن کے صندوق خالی تھے جنھوں نے عمر بھر کوئی مفید کام نہ کیا تھا اور پوری زندگی چوری یا خیرات پر بسر کی تھی۔ انھیں حکم دیا گیا کہ وہ اسوقت تک علیحدہ کھڑے رہیں جب تک اور باقی ماندہ لوگوں کا مسئلہ طے نہ ہو جائے۔

اس کے بعد سیلونی کے مسافروں کی باری آئی۔ ان میں اکثر جن کے پاس دکھلانے کو کچھ بھی نہیں تھا ایک ساتھ بلائے گئے اور اُن سے دریافت کیا گیا کہ اُنھیں اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے۔ ایک خوش پوشاک امیر نے سب کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمام تحقیقات ہمارے لئے ایک معمہ ہے۔ میں اور میرے رفیق دولتمند گھروں میں پیدا ہوئے اور ہم نے زندگی میں داخل ہو کر اپنے آپ کو ہر قسم کی جاہ و ثروت کا مالک پایا۔ ہمیں کبھی نہیں بتایا گیا کہ ہم سے کسی دماغی یا جسمانی یا کسی قسم کی محنت کی توقع کی جاتی ہے غریبوں کے لئے کام کرنا تو بلاشبہہ مناسب تھا کیونکہ کام کئے بغیر وہ دیانت داری سے زندگی نہ گذار سکتے تھے۔ لیکن ہم تو اپنا وقت تفریحوں میں جو عموماً بے ضرر ہوتی تھیں صرف کرتے تھے۔ جس قدر چیزیں ہمارے صرف میں آتی تھیں اُن کے ہم دام ادا کرتے تھے۔ ہم نے کبھی کوئی چیز نہیں چرائی۔ کبھی فریب و ستم سے کسی چیز پر

قبضہ نہیں کیا۔ ہم نے خداوند یسوع مسیح کے وسول احکامات کی جب سے ہمارے اندر اُن کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہوئی پوری پابندی کی۔ مقرر نے کہا کہ کم از کم اپنے متعلق میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کسی ایک حکم کی بھی سرتابی نہیں کی اور مجھے یقین ہے کہ یہی بات میرے ہمراہیوں کی بابت بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہم سب شریف تھے لوگ ہماری تعریف کرتے تھے اور ہماری نیک چلنی سے سبق حاصل کرتے تھے۔ ہم سے یہ دریافت کرنا کہ ہمارے اعمال کیا ہیں عقل و انصاف دونوں کے خلاف ہے۔

افسر اعلیٰ نے جواب دیا "حضرات! اس قسم کی باتیں ہم نے اکثر سنی ہیں۔ لیکن جواب کی اس یکسانیت سے ہماری حیرت کی تازگی میں ابھی تک کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ آپ لوگ ایسی دنیا میں تھے جہاں زندگی کی پہلی شرط محنت و عمل ہے۔ کسی شخص کو اُس وقت تک ایک وقت کا کھانا بھی میسر نہیں آسکتا جب تک اُس کے حاصل کرنے کے لئے محنت نہ کی جائے۔ جو لوگ محنت کرتے ہیں وہ کھانے کے مستحق ہیں جو محنت نہیں کرتے انھیں فاقہ کرنا چاہیے۔ زندگی کی ممکن صورتیں صرف تین ہو سکتی ہیں :۔ محنت، چوری یا خیرات۔ جن لوگوں نے زندگی گذارنے کے لئے پہلی صورت اختیار نہیں کی اُنھوں نے لازماً بقیہ دو صورتوں میں سے کسی ایک کو اختیار کیا۔ اپنے آپ کو آپ چاہے کتنا ہی ارفع و بلند کیوں نہ سمجھیں لیکن یہاں سے آپ اُس وقت تک نہیں گذر سکتے جب تک اپنی پیدا کی ہوئی کوئی چیز پیش نہ کریں آپ کو آپ کی اُجرت پہلے ہی مل چکی تھی اور اُجرت بھی کافی سے زیادہ جس کا آپ سب کو خود اعتراف ہے۔ اب بتلائیے آپ کے پاس دکھلانے کے لئے کچھ ہے؟

"اجرت" مقرر نے کہا "ہم کسی کے تنخواہ دار ملازم نہیں ہیں۔ ہمیں کسی قسم کی کوئی اجرت کبھی نہیں ملی۔ جو کچھ ہم نے خرچ کیا وہ ہمارا تھا۔ احکام ہمیں صرف یہ ملے تھے کہ ہمیں برائی سے پرہیز کرنا چاہیے چنانچہ ہم نے بُرائی نہیں کی۔ میں عدالت بالا دست سے اپیل کرتا ہوں"

لیکن اپیل منظور نہیں کی گئی۔ تمام اُن لوگوں کے لئے جن کے صندوق خالی تھے اُن کے جاہ و منصب کا خیال کئے بغیر اور بلا اس بات کا لحاظ کئے ہوئے کہ آپس میں انھیں ایک دوسرے کی سیرت کتنی پاکیزہ نظر آتی ہے صرف ایک قطعی جواب تھا "داخلہ اُس وقت تک بند ہے جب تک آپ اس سے بہتر

سامان نہیں دکھلا سکیں گے" تمام وہ لوگ جو اس حالت میں مبتلا تھے ۔ ان میں نواب بھی تھے اور بیگم بھی سب کو چوروں کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا۔ بیگم نے کہا کہ میری دعوتیں تو اس موسم میں سب سے بہتر رہیں اور چونکہ یہ بات عام طور پر تسلیم کی گئی کہ ان میں شریک ہونے سے لوگوں کو سخت کوفت ہوتی تھی تو تھوڑی دیر کے لئے اس بات کے متعلق شبہ پیدا ہوا کہ ممکن ہے ان کے سبب سے اس قسم کی تفریحی تقریبوں کی طرف سے لوگوں کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوئی ہو اور اس طرح نادانستگی میں بھلائی کا ایک پہلو پیدا ہو گیا ہو۔ لیکن اس کی بھی کوئی شہادت فراہم نہ ہو سکی۔ دنیا ان تقریبوں میں اس لئے شریک ہوتی رہی کہ اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مشغلہ نہ تھا اور بیگم اور اس کے تمام مہمانوں سے جماعت کو کوئی نفع نہ پہنچ سکا۔ سیلونوں کے اکثر مسافروں کے معاملات کا یوں تصفیہ ہوا۔ وزیر، لاٹ پادری، وکیل ساہوکار اور دوسرے لوگ جن کے پاس ہر چند کوئی مادی خدمت تو دکھلانے کے لئے نہ تھی لیکن پھر بھی چونکہ اپنے مختلف پیشوں میں یہ محنت کے ساتھ مصروف رہے تھے اس لئے ان کا معاملہ عدالت بالادست کو منتقل کیا گیا۔

اس کے بعد ہماری باری آئی یعنی دوسرے درجے والوں کی اور ہم لوگ بہت متفرق قسم کے تھے۔ مصروف تو ہم سب رہے تھے جیسا اُن بیشمار اشیا سے ظاہر تھا جن پر ہمارے نام لکھے ہوئے تھے آجروں کے ساتھ اُن کی مصنوعات تھیں، مختاروں کے ساتھ اُن کے مقدمے تھے۔ ڈاکٹروں اور پادریوں کے ساتھ وہ اجسام اور روحیں تھیں جنھیں اُنھوں نے بچایا یا کھویا مصنفوں کے ساتھ ان کی کتابیں تھیں صناعوں اور بت سازوں کے ساتھ اُن کی تصویریں اور مجسمے تھے۔ لیکن جو کچھ ہم نے پیدا کیا تھا اُس کی جانچ سختی کے ساتھ کی جا رہی تھی۔ ایک طرف تو اُن اجرتوں کو رکھا جاتا تھا جو ہمیں ملیں اور دوسری طرف یہ دیکھا جاتا تھا کہ ہماری محنت سے بنی نوع انسان کو کیا فائدہ پہنچا اور ہر چند ہمارا سامان سامنے رکھا ہوا بہت وقیع نظر آتا تھا۔ لیکن جانچنے سے معلوم ہوا کہ ہم میں سے اکثر لوگوں کو اجرت اپنے واقعی استحقاق کی نسبت بہت زیادہ ملی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے پیرس کی نمائش کا ایک بڑا کمرہ یاد آ گیا جہاں ایک محنتی آدمی نے انگریزی ادب کی موجودہ حالت دکھانے کے لئے ایک سال میں جس قدر کتابیں رسالے اور اخبارات شائع ہوئے تھے اُن

۱۰۔ سب کی ایک ایک جلد جمع کر رکھی تھی۔ اس سے کتابوں کا ایک انبار لگ گیا تھا جو لوگوں کے مرعوب کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن فائدہ کی اعتبار سے کتابوں کی اہمیت کا اظہار پورے اعداد میں نہیں بلکہ اعشاریوں میں کیا جا سکتا تھا اور مستقل قدر و قیمت کے اعتبار سے تو یہ تمام انبار صفر سے بس کچھ یونہیں ایک ادنیٰ ترین کسر کے برابر زیادہ تھا۔ ہم میں سے کچھ جو بظاہر خاصے معزز معلوم ہوتے تھے فوراً چوروں کے زمرہ میں شامل کر دیئے گئے مثلاً صراف اور دلال جن کا کام سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ روپیہ ایک سے لے کر دوسرے کو دے دیں اور درمیان میں کچھ رقم خود ہضم کر لیں۔ پادری جنھوں نے وہ اخلاقی تعلیمیں دیں جن پر خود عمل نہ کرتے تھے۔ خوش بیان مقرر جنھوں نے ایسی تقریریں کیں جنھیں وہ جانتے تھے کہ محض ابلہ فریبی ہے۔ فلسفی جنھوں نے نظام کائنات کے متعلق مکڑی کی طرح عجیب عجیب جالے بنا ڈالے۔ ممتاز وکلا جنھوں نے قانونی موشگافیوں میں انصاف کا خون کر ڈالا۔ مصنف جنھوں نے ایسے موضوع پر کتابیں لکھیں جن کی نسبت ان کا مبلغ علم بس اسقدر تھا کہ دوسروں کو گمراہ کر سکیں۔ سامان تعیش کے فروخت کرنے والے جن کے مال سے انسانی صحت و توانائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ طبیب اور دوا فروش جنھوں نے اُن چیزوں سے واقفیت کا دہوکہ دیا جن کی بابت وہ خوب جانتے تھے۔ کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے۔ یہ سب کے سب اپنے صندوقوں کی مخالف شہادت کے بعد غیر مقبول گروہ میں دھکیل دیئے گئے۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کا حساب نسبتاً بہتر تھا جنھوں نے کم از کم حقیقی قدر و قیمت کی چیزیں تو پیدا کی تھیں۔ لیکن اُجرت کے مسئلہ پر یہ بھی خارج کئے گئے۔ جن اچھے لوگوں نے انکسار سے کام لیا وہ نقصان میں رہے اور جو بے اصولے اور بظاہر معقول معلوم ہوئے اُن کی خوب عزت و توقیر ہوئی اور وہ مالدار ہو گئے۔ وہ منظر سخت دردناک تھا اور اسے دیکھ کر ہم میں سے اکثر کو تعجب بھی ہوا جب ہمیں دکھلایا گیا کہ ہم نے کس قدر دغابازی سے کام کیا تھا۔ اپنی شکر میں کتنی ریت، اپنے دودھ میں کتنا پانی ملایا اور اپنے بڑھئی اور راج کے کام میں لفظاً اور استعارۃً کتنا فریب کیا تھا۔ کس طرح تمام کاموں میں ہم اچھی چیز بنانے کا کم اور نفع کا زیادہ خیال کرتے تھے کس طرح ہم محض اس لئے کہ پبلک جھوٹ سے خوش ہوتی اور سچ کو گراں اور تکلیف دہ پاتی تھی ہم اپنے آپ کو دروغ بیانی اور ریاکاری کے لئے فروخت کیا کرتے تھے۔

ہم میں سے بعض لوگوں کی بد معاملگی جنھوں نے سستا خریدا اور مہنگا بیچا۔ جھوٹے وزن اور پیمانے استعمال کئے۔ روئی کو اون، سن کو ریشم، ٹین کو چاندی کہکر بیچا، بالکل واضح اور ظاہر تھی۔ ان سب کی جانچ پڑتال جلد ہی ہوگئی اور انھیں اپنے رفیقوں کے پاس پہنچا دیا گیا۔ صرف اُن ہی لوگوں کو سرٹیفکٹ دیا گیا جن کی مجموعی خدمات اُس معاوضے سے زیادہ تھیں جو اُنھیں ملا تھا۔ جب میرا صندوق کھولا گیا تو میں نے دیکھا کہ ہرچند میری اُجرت کم تھی لیکن میرا کام اُس سے بھی زیادہ کم تھا مگر مجھے سند مل گئی جسے دیکھ کر مجھے تعجب ہوا۔

اسی وقت ایک ریل کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ریل مین لائن پر آئی اور آدھے گھنٹے ٹھیر کر روانہ ہونے والی تھی۔ جن لوگوں کو خارج کر دیا گیا تھا اُن سے کہا گیا کہ وہ اس گاڑی پر اُس جگہ بھیج دیئے جائیں گے جہاں وہ ابتداءً جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انھیں اس خبر سے بڑی تسکین ہوئی۔ لیکن روانگی سے پیشتر اُن سے کچھ سوال اور کئے گئے اور کچھ ایسی تبدیلیاں کی گئیں جن سے اُن کی مستقبل کی زندگی اثر پذیر ہوسکتی تھی۔

اُن سے پوچھا گیا کہ تم ایسے نکمے کیسے ہوگئے۔ اُنھوں نے جواب بہت سے دیئے لیکن نتیجہ کے لحاظ سے سب یکساں تھے۔ حالات اُن کے خلاف تھے تمام خرابیاں حالات کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوئیں۔ اُن کی تربیت ناقص ہوئی۔ وہ ایسے ماحول میں تھے جہاں اس سے بہتر وہ کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ امیر لوگوں نے اپنے ابتدائی جواب کو دوہرایا کہ ہم سے کبھی کسی نے نہیں کہا کہ تم سے بھی کام کی توقع کی جاتی ہے۔ ہماری تمام احتیاجات کی تکمیل کا انتظام تھا۔ ایسی حالت میں جب ہمیں کام کی طرف مائل کرنے کے لئے کوئی محرک موجود نہ تھا یہ توقع کرنا کہ ہم ازخود کام کریں گے سخت ناانصافی ہے۔ اگر ہم غریب پیدا ہوتے تو معاملہ سب ٹھیک رہتا دہوکہ باز تاجروں نے کہا کہ ایک دوکاندار کا پہلا فرض تمام رائج الوقت اصول تجارت کے مطابق یہ تھا کہ وہ روپیہ پیدا کرے اور اپنی حالت کو بہتر بناتا رہے۔ اشیاء کی اچھائی اور بُرائی کو جانچنا خریداروں کا کام تھا۔ دوکانداروں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنی اشیاء مہنگے سے مہنگے داموں فروخت کریں۔ اس موضوع پر جتنے مستند لکھنے والے ہیں سب کا یہی اعتقاد تھا اور اسی کی وہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ مقرروں، واعظوں، اخبار نویسوں، ناول نگاروں وغیرہ وغیرہ نے جن کی تعداد کثیر تھی کہا کہ ہم عوام کے اُن گروہوں سے اپیل کرتے تھے جو ہماری باتیں سننے آتے تھے یا ہماری کتابیں خرید کر پڑھا کرتے تھے۔ "جس چیز کی طلب ہو وہ مہیا کرو" یہ

اصول تمام اصولوں سے زیادہ قیمتی سمجھا جاتا تھا۔ ہم نے دنیا کو وہی دیا جس کی اسے طلب تھی اور جسے وہ پسند کرتی تھی ہم نے اپنی پوری اہلیت اور طاقت اسی کوشش میں صرف کردی اب ہمیں یہ الزام دینا کہ ہم دنیا کی رائے پر کیوں چلے بہت سخت ہے۔ چوروں اور بدمعاشوں نے کہا کہ ہم دنیا میں بغیر اپنے ایما اور مرضی کے پیدا ہوئے۔ ہم نے کبھی اس کی تمنا نہیں کی تھی۔ اس میں شک نہیں جب ہمیں موقع ملتا تھا۔ تفریح کیا کرتے تھے لیکن زندگی کو بصورت مجموعی ہم اپنے لئے ایک وبال سمجھتے تھے اور اس سے نجات پانے کے لئے ہم بہ خوشی تیار تھے۔ لیکن جب زندہ رکھے جاتے تھے تو زندہ رہتے تھے اور جہاں تک ہماری عقل وفہم کی رسائی تھی ہم یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں دنیا کی اچھی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا اگر وہ ہمیں مل سکیں ایسا ہی حق حاصل ہے جیسا کسی اور شخص کو ہو سکتا ہے۔ ہمیں چور کہا جاتا تھا۔ قانون اور زبان دولتمند لوگوں نے بنائی تھیں جو ہمارے فطری دشمن تھے۔ اگر جماعت نے ہمیں ایمانداری سے زندگی گذارنے کے وسائل فراہم کئے ہوتے تو ہمارے لئے ایماندار بننا سہل ہوتا۔ جماعت نے ہمارے لئے کچھ نہیں کیا ہم جماعت کے لئے کیوں کچھ کرتے ؟

یوں یہ ناکام لوگ اپنے اپنے مختلف انداز میں مدافعت کرتے رہے۔ سب کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ انھیں ایک موقع اور دیا جائے گا اور یہ دیکھ کر میری تفریح ہوئی کہ ہر چند کچھ لوگوں نے بہانہ کیا تھا کہ ہم پیدا ہونا نہ چاہتے تھے اور اگر ہمیں انتخاب کا موقع دیا جاتا تو ہم پیدا نہ ہوتے لیکن جب واپس بھیجے جانے لگے تو کسی نے احتجاج نہیں کیا۔ جس بات کی انھوں نے خواہش کی وہ صرف اس قدر تھی کہ انھیں نئی حیثیت دی جائے اور غیر موافق اثرات سے آزاد کیا جائے۔ مجھے توقع یہ تھی کہ ان غیر موافق اثرات کے ضمن میں وہ اپنی طبیعت کے نقایص کا بھی تذکرہ کریں گے۔ میری ذاتی رائے یہ تھی کہ آدمیوں کی نصف بداعمالیوں کا سبب سیرت کی موروثی خرابیاں ہوتی ہیں جنھیں لوگ دنیا میں اپنے ساتھ لاتے ہیں اخلاقی جرأت، سلامت روی اور عملی استعداد کو جس قدر "عطیہ فطرت وحالات" کہنا ٹھیک ہے اسی قدر اتفاق و خوبی قسمت سے منسوب کرنا بھی درست ہے۔ تمام دوسری تبدیلیوں کے مقابلہ میں طبیعت کی تبدیلی کے نتیجہ خیز ثابت ہونے کے زیادہ امکانات تھے۔ لیکن ان لوگوں کو اپنی طبیعت سے کوئی

شکایت نہ تھی وہ صرف اپنے ماحول میں تبدیلی چاہتے تھے ۔ یہ تبدیلیاں فوراً کر دی گئیں ۔ بیگم کو ایک مزدور کے جھونپڑے میں زندگی شروع کرنے کے لئے بھیجا گیا اور دیہاتی مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع دیا گیا تاکہ اس میں ایک اچھی خادمہ بننے کی صلاحیت پیدا ہو سکے ۔ معزز شریف آدمی کو ہل چلانے کا کام سپرد کیا گیا ۔ مصنف اور واعظ کو کاریگر بنایا گیا اور بڑھئی اور لوہار کے ساتھ کام کرنے کے لئے لگا دیا گیا ۔ ایک فلسفی جو دولتمند اور تندرست تھا اور اس لئے اس بات پر اصرار کیا کرتا تھا کہ دنیا کو جس قدر اچھا ہونا چاہئے اتنی ہی اچھی ہے ۔ اس سے زیادہ اچھے ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ اُسے اندھا اور مفلوج بنا کر بھیجا گیا تاکہ وہ ان نئے حالات میں زندگی کے فلسفہ پر غور کر سکے چور اور دھوکہ باز جو یہ بہانہ کر رہے تھے کہ اُن کی بُرائیاں غربت کی وجہ سے ہیں اُنھیں موقع دیا گیا کہ وہ جب دنیا میں پہنچیں تو اپنے آپ کو محلوں میں تعیشات کی آغوش میں پائیں ۔ جام فراموشی سب کو پلا دیا گیا ۔ ماضی مٹ گیا ۔ سب لوگ ریل گاڑی میں جلدی جلدی بٹھائے گئے ۔ انجن نے سیٹی دی اور ریل انھیں لے کر روانہ ہو گئی ۔

اسٹیشن ماسٹر نے کہا " چند سال بعد یہ لوگ پھر یہاں آئیں گے اور اسی قصہ کو پھر دوہرائیں گے ۔ یہی لوگ بیسیوں دفعہ میرے پاس آ چکے ہیں ۔ اُنھیں آزمائش کے لئے مختلف مواقع دیئے جا چکے ہیں اور ابھی تک کچھ بھی حاصل نہیں کر سکے ہیں اور جب آتے ہیں حالات و واقعات کی شکایت کرتے ہیں ۔ میں اپنی طرف سے تو اس جھگڑے کو بالکل ختم کر دینا چاہتا ہوں "

میں نے دریافت کیا " یہ سلسلہ کب تک جاری رہیگا "

اُس نے کہا " اسے میں نہیں بتلا سکتا ۔ یہاں سے کوئی شخص گذرنے نہیں پاتا جب تک وہ یہ ثابت نہ کر دے کہ اس کی زندگی نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہے ۔ جو بہت زیادہ خراب ہیں انھیں میں نے مینڈھے اور بطخ بنتے دیکھا ہے تاکہ ان پر چربی چڑھا کر چڑھا کر بعد میں کھایا جائے اور اس طرح مفید بنایا جائے ۔ کچھ گدھے بنا دیئے جاتے ہیں تاکہ سامان ڈھوتے اور مار کھاتے رہیں اور سینکڑوں نسلوں تک اپنے ہی قسم کے گدھے پیدا کرتے رہیں ۔ تمام زندہ مخلوق آخر میں وہی صورت اختیار کر لیتی ہے جو اُس کی سیرت کے مطابق ہوتی ہے "

گاڑی نگاہ سے اوجھل بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک دوسری گھنٹی بجی۔ منظر بالکل اس طرح بدلا جیسے تھیٹر میں بدلتا ہے۔ پردہ ہٹایا گیا اور ہم میں سے جو باقی رہ گئے تھے اُنھوں نے اپنے آپ کو چار متین صورت آدمیوں کے سامنے پایا جو بالکل ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کالجوں میں ممتحنین کا بورڈ ہوتا ہے۔ ہمیں ایک ایک کرکے باری باری سے بلایا گیا۔ جو کام پہلی دفعہ جانچا جا چکا تھا اُسے دوبارہ دیکھا گیا اور اس کی نوعیت کا مقابلہ صانع کی اہلیت اور قابلیت سے یہ معلوم کرنے کے لئے کیا گیا کہ کس حد تک اس نے کام کو اپنی پوری قوت سے کیا ہے۔ آیا جیسا وہ کرسکتا تھا یا کرنا جانتا تھا اُس سے خراب کیا ہے یا بہتر۔ پھر اس کے علاوہ دوسری طرف اس کے ساتھ ساتھ بُرائیوں، گناہوں، خودغرضیوں، بدمزاجیوں کا موازنہ فرض شناسی، محبت، مروت، مہربانی اور خیرات کے اُن اعمال و افعال سے کیا جارہا تھا جن سے اس کے احباب کی خوشیوں میں اضافہ اور رنجوں میں کمی ہوئی۔ آخرالذکر کو میں نے دیکھا کہ اُن کے مالک فراموش کرچکے تھے اور تعجب سے دیکھ رہے تھے اور اپنے کو مستحق نہ سمجھ کر اُن کے قبول کرنے سے انکار کرنا چاہتے تھے۔ پھر نوعیت اور خوبی کے لحاظ سے مادی اور اخلاقی کاموں کے مختلف مدارج تھے۔ بالکل بے کار تو کوئی چیز نہ تھی لیکن کوئی چیز بھی حتیٰ کہ بڑے سے بڑے صناع اور پیرِ طریقت کی کارگزاریاں بھی تکمیل مطلق کے معیار پر پوری نہ اُترتی تھیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنے نتیجہ لئے عمل پر ابتدائی جاہلانہ کوششوں سے انتہا کے اُن آخری نمونوں تک جنھیں ہم اپنی اعلیٰ ترین کامیابی باور کرتے تھے نظر ڈال رہا تھا۔ اس بات کا پتہ چلانا سہل تھا کہ کتنے نقائص ہماری قدرتی خامیوں کی وجہ سے تھے اور کتنے خودسری، زعم باطل اور سہل انگاری کی بنا پر۔ کچھ آمیزش کمینے پن کی بھی تھی۔ کچھ نفع کا لالچ، تعریف، شہرت اور دولت کی خواہش بھی تھی اُن حالتوں میں جہاں تسکین کا کوئی موقع نہ تھا کچھ نادانی کا جذبۂ تسکین بھی تھا۔ اور بعض نہایت خوبصورت اشیا محض اِن اسباب کی وجہ سے داغدار نظر آتی تھیں۔

یہ بات اس قدر واضح اور صاف تھی کہ ایک مخلص اور متین صورت شخص نے جس کا کام جانچنے سے ہم میں سے اکثر کے مقابلہ میں بہتر ثابت ہوا تھا تاثر کی حالت میں چلاکر کہا "جہاں تک میرا تعلق ہے ممتحنین کو زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابتدائی سالوں میں ہی مجھے اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے،

لیکن کبھی بھی مجھ سے اس کام کی تکمیل نہ ہو سکی ۔ میں نے کوشش جاری رکھی ۔ اپنی موٹی موٹی خرابیوں کو رفع کیا لیکن جتنا میں آگے بڑھتا رہا اور زیادہ بہتر طریقہ پر کام کو انجام دیتا رہا اتنا ہی میرا علم اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرتا رہا ۔ اور جتنے میرے زندگی کے ایام بڑھتے رہے میری خامیاں مجھ پر زیادہ بدبختی کے ساتھ ظاہر ہوتی رہیں ۔ اگر مجھے آخر میں کمال حاصل بھی ہو جاتا تو بھی ماضی کی یاد کو تو میں اپنے دل سے نہ مٹا سکتا تھا نوجوانی کی خطائیں میرے خلاف برابر شہادت دیتی رہتیں اور مجھے مطعون کرتیں ۔ اسی بنا پر مجھے اپنی ذات سے نفرت ہے ۔ میرا کوئی ہنر ایسا نہیں ہے جس کے معاوضہ میں مجھے رعایت کی توقع ہو ۔ میں نے آخر وقت تک محنت کی ہے، لیکن اس علم کے ساتھ کہ میں جو بہترین چیز بھی پیش کرنا چاہوں گا وہ قبول کئے جانے کے لائق نہ ہوگی ۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا اور مجھے اس بات پر اعتقاد تھا کہ ایک اعلیٰ روح جو خطا اور عیب سے پاک تھی میری خاطر میرا کام انجام دے چکی ہے اور اس کا کام مکمل تھا ۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں اپنے ذاتی حساب کے سب مطالبے ترک کر دوں تو جو کچھ وہ دوسری روح کر گئی ہے اس کے واسطے سے میرا شمار بھی مقبول لوگوں میں ہو جائے گا ۔ مجھے اعتماد تھا کہ یہ سچ ہے اور یہی میرا واحد سہارا تھا ۔ جو اچھے اعمال مجھ سے منسوب کئے گئے ہیں اُن میں اچھا در اصل کوئی بھی نہیں ہے ۔ ایک بھی بالکل ویسا نہیں ہے جیسا اُسے ہونا چاہیئے تھا ۔"

وہ یہ سب باتیں خلوص کے ساتھ کہہ رہا تھا اور جو کچھ وہ کہتا تھا بلا شبہہ صحیح تھا اس کے لئے بھی صحیح تھا اور تمام دوسرے آدمیوں کے لئے بھی ۔ لیکن اس سپردگی میں بھی ایک شائبہ اُس آمیزش کا پایا جاتا تھا جس کا وہ اعتراف کر رہا تھا ۔ وہ مناظر تھا اور اُس کی تمام عمر اسی قسم کی بحثوں میں صرف ہوئی تھی اور اس عقیدہ کی حمایت سے ہی اُسے شہرت حاصل ہوئی تھی ۔ وہ اس بات پر اعتقاد رکھتا تھا لیکن اس بات کو ابھی تک نہ بھول سکا تھا کہ وہ خود ہی اس عقیدہ کا علمبردار بھی ہے ۔

محسن نے مہربانی سے اُس کی طرف دیکھا ۔ لیکن اس طرح جواب دیا " ہم ناممکنات کی توقع نہیں کرتے اور جو کام تمہاری طاقت سے زیادہ تھا اُس کے نہ کرنے پر تمہیں الزام نہ دیں گے ۔ کام تکمیل کے ساتھ وہی انجام دے سکتے ہیں جو خود مکمل ہوتے ہیں ۔ انسان عاجز اور جاہل پیدا ہوتا ہے ۔ وہ دنیا میں خوشگوار چیزوں کے

حاصل کرنے کا رجحان لے کر آتا ہے لیکن جتنی چیزیں خوشگوار ہوتی ہیں وہ ہمیشہ اچھی نہیں ہوتیں ۔ انسان جیسے اور سبق سیکھتا ہے ایسے ہی زندہ رہنے کے طریقوں کو بھی سیکھتا ہے ۔ ابتدا میں وہ ایک بھی نیک عمل نہیں کرسکتا ۔ لیکن تعلیم اور مشق سے وہ ترقی کرتا ہے جو بہترین لوگ ہوتے ہیں وہ بھی درجہ کمال تک نہیں پہنچ پاتے ۔ اُن کی رسائی بھی محدود ہوتی ہے ۔ لیکن ہم ایک نقاش کی تنقیص اُس کی ابتدائی تصویروں کو دیکھ کر اگر وہ تصویریں اتنی ہی اچھی ہوتی ہیں جتنی کہ اُس کے ہم عمر لوگوں سے توقع کی جاتی ہے نہیں کرتے ۔ ہر صناع آہستہ آہستہ مہارت پیدا کرتا ہے ابتدا خراب ہوتی ہے اور اس پر اُسے اختیار نہیں ہوتا ۔ یہی حال زندگی کا ہے ۔ چلنا گر کر ہی سیکھا جاتا ہے ۔ زندہ رہنا بھی گمراہی اور اُس کے نتائج برداشت کرکے سیکھا جاتا ہے ۔ ایک شخص کے خلاف ہم اُس کی نوجوانی کے گناہوں کا اندراج نہیں کرتے اگر وہ ایمانداری سے ترقی کی کوشش کو جاری رکھتا ہے ۔ ضبط نفس کا اتنا مطالبہ ہم بچے سے نہیں کرتے جتنا جوان آدمی سے کرتے ہیں ۔ سب لوگوں سے ہم یہ نہیں چاہتے کہ وہ ایک ہی طرح کی عادتیں حاصل کریں ۔ کچھ لوگوں کی تعلیم اچھی ہوتی ہے بعض کی بری ہوتی ہے بعض کی بالکل نہیں ہوتی ۔ کچھ لوگ فطرتاً نیک سرشت ہوتے ہیں کچھ بدسرشت ۔ کوئی بھی مکمل طریقہ پر احکام کی بجا آوری نہیں کرسکتا ۔ اس لئے ناکام رہنا کوئی جرم نہیں ہے خطاؤں میں اُنھیں چیزوں کا شمار کیا جاتا ہے جو ارادتاً ، کاہلی ، خودغرضی اور جان بوجھ کر نیکی کی جگہ بدی کو اختیار کرکے کی جائیں ۔ ہر شخص کے متعلق فیصلہ اس کی استعداد کے مطابق کیا جاتا ہے ۔"

میری بڑی تفریح ہوئی جب میں نے دیکھا کہ لاٹ پادری ممتحن کی اس گفتگو سے بڑے خوش نظر آ رہے تھے ۔ ایک آدمی کی بخشش میں اعمال نیک کا جو حصہ ہے اس کے متعلق وہ اسی معزز آدمی سے خود بھی بحث کرچکے تھے ۔ ممتحن نے اپنے تبصرہ میں ہر چند ان کی طرفداری تو نہ کی تھی لیکن ان کے مخالف کا ہر حال قلع قمع کردیا تھا ۔ لاٹ پادری نے بحث کا جو طریقہ اختیار کیا تھا اس میں معلوم ہوتا ہے بڑی بے توجہی اور لاپرواہی سے کام لیا تھا کیونکہ ہر چند ان کی کتابیں بہت ضخیم تھیں اور کئی جلدوں میں تھیں لیکن پھر بھی ان کا وزن بہت کم تھا ۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر اُنھوں نے اپنی ابتدائی زندگی میں چند اچھے کام نہ کئے ہوتے مثلاً کالج میں اپنی بیوہ ماں کو اپنے خرچ کے بار سے بچانے کے لئے فاقے نہ کئے ہوتے تو میرا یہ

خیال ہے یہ دنیا میں دوبارہ گرجا کے منشی بنا کر بھیجے جاتے۔

اس تمام دوران میں میرے دل میں چند سوالات پیدا ہو رہے تھے جن کا جواب میں دریافت کرنا چاہتا تھا اور بولنے کی بار بار ہمت کر رہا تھا۔ میں یہ بات خصوصیت کے ساتھ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ "فطری سرشت" سے متعلق کی کیا مراد تھی۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ ایک شخص تو فطرتاً ولی اور پیر و مرشد بننے کی اہلیت لے کر پیدا ہوتا ہے اور دوسرا نقاش یا ماہر موسیقی کی۔ نیز یہ کہ جس شخص میں طبعاً جتنی اہلیت نشوونما کی ہوتی ہے اتنی ہی وہ ترقی کرتا ہے۔ پھر یہ کہ کاہلی، خودسری، خودغرضی وغیرہ وغیرہ بھی کیا فطرتاً سرشت میں داخل ہوتی ہیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہے تو ——— لیکن اسی وقت گھنٹی بجی اور میرا نام پکارا گیا۔ میں کون تھا اس کے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی ہر شخص کا حلیہ، اُس کی تاریخ، مختصر یا طویل اور جو کچھ اُس نے کہا اور کیا عدالت کے سامنے اس قدر واضح شکل میں موجود ہوتا تھا کہ کسی سے زبردستی اقرار کرانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فہرست سامنے رکھی تھی اور اُس کے ایک تکلیف دہ حد تک طویل خانہ میں نہایت بے دردانہ غیر جانب داری کے ساتھ میرے تمام بُرے اعمال درج کئے ہوئے تھے۔ جو چند اچھے اعمال تھے ان میں ذاتی غرض کی آمیزش تھی جس سے بہترین اعمال بھی داغدار ہو گئے تھے۔ کام کے نمونوں میں کتابوں اور دوسری تحریروں کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ انھیں جانچنے کے لئے پھیلا یا گیا صفحات پر ایک سیال شے ڈالی گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے غلط بیانات تھے وہ یک قلم محو ہو گئے اور جتنے آدھے صحیح اور آدھے غلط تھے اُن کے نقوش غلط بیانی کی نسبت سے دھندلے ہو گئے۔ افسوس! باب کے باب اس طرح غائب ہو گئے۔ اوراق بالکل سادہ ہو گئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کمپوزیٹروں نے ان پر چھاپنے کے لئے کبھی ٹائپ کو ترتیب ہی نہ دیا تھا جن پیراگرافوں پر میں اپنے دل میں ناز کیا کرتا تھا وہ پھیکے اور ناقابل مطالعہ ہو گئے۔ لیکن عبارت کے کچھ ٹکڑے طویل فاصلوں پر کہیں کہیں باقی رہ گئے تھے۔ یہ وہ تھے جن پر میں نے بہت کم محنت کی تھی اور جنھیں میں تقریباً بھلا چکا تھا یا وہ تھے جن کو ہفتہ وار اخباروں نے خصوصیت کے ساتھ ملامت کیلئے منتخب کیا تھا جہالت، تعصب، لاپروائی، عدم استقامت (جو ہر چند قابل گرفت تھی لیکن انتہائی حد تک قابل گرفت نہ تھی) سیاہی میں پانی کی آمیزش یعنی معمولی غیر اہم باتیں اور پامال جذبات ——— بس یہی

میرے بدترین گناہ تھے اور مجھے یہ معلوم کر کے ایک ناقابل بیان اطمینان ہوا۔ اگر نالائق مطلق کا الزام مجھ پر عاید کیا جاتا تو جس شدت کے ساتھ ذلت کا احساس اُس وقت مجھ پر طاری تھا اُس کی بنا پر میں فوراً جرم کا اقرار کر لیتا۔ لیکن معاملات جتنے ہونے چاہئیں تھے اُتنے خراب نہ تھے۔ میں دل میں خوش ہو رہا تھا کہ جب اجرت کا سوال آئے گا تو نتیجا میرے حق میں نکلے گا۔ اتنے سالوں کی محنت اور ناشر کے پاس سے صرف فلاں فلاں چیک ——— کم از کم اس جگہ میں محفوظ تھا اور مجھے پوری اُمید تھی کہ یہاں سے ضرور بچ نکلوں گا۔ ممتحن اپنے انداز و طریقہ سے خوش طینت معلوم ہوتا تھا۔ ایک نقاد جو میری سزا سننے کا منتظر تھا تلخ کامی کے ساتھ مایوس ہو چکا تھا کہ یکبارگی عدالت کی ایک دیوار بالکل شفاف ہو گئی اور جانوروں کا ایک غیر مختتم انبوہ نظر آنے لگا۔ یہ خاکی اور آبی دونوں قسم کے تھے اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سب وہ جانور تھے جنھیں میں نے اپنے زمانہ حیات میں اپنی ناکارہ لاش کو برقرار رکھنے کے لئے ہضم کیا تھا۔ وہ قطار در قطار کھڑے تھے۔ اُن کے چہروں سے سنجیدگی اور ملامت ظاہر ہو رہی تھی بیل، بچھڑے، بھیڑیں، مینمنے، ہرن، خرگوش، بیرو، بطخ، چوزے، تیتر، مولے، بٹیر، حتےٰ کہ چینڈول گوریا اور کلچڑی بھی جنھیں میں نے بچپن میں مار کر ہنڈکلیا پکائی تھی ——— ہر ایک اپنے قاتل کے خلاف شہادت دینے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ دریا اور سمندر سے رہو، بام، سنگھاڑا، ڈولی، سول، لوچی، مور، مہا شیر، جھینگا وغیرہ آئی تھیں۔ یہ سب جانور لاکھوں کی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ ان سب کو میں نے کھایا تھا۔ اجرت پر گفتگو کرنے کا اب کیا موقع رہا تھا۔ یہی میری اجرت تھی۔ اتنی بڑی لاگت لگا کر میرا وجود قائم رکھا گیا تھا۔ ایک بارہ سنگھے نے سب کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا "ہم سب کو اس بلانوش کا دوزخ بھرنے کے لئے قربان کیا گیا تاکہ وہ کاغذوں کے اُن نکمے ٹکڑوں کو لکھ سکے جو اس کی کل کائنات ہیں۔ اپنی زندگی ہمیں عزیز تھی۔ مرغزاروں اور چراگاہوں میں، ہوا اور پانی میں، ہم معصوم اور بے ضرر طریقہ پر گھومتے پھرتے تھے۔ خوشگوار دھوپ کا آسمانی نور اور چمکدار لہروں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ ہماری قیمت زیادہ نہ تھی نہیں اس بات کا گھمنڈ ہے کہ ہماری جنس اعلیٰ تھی۔ اگر یہ شخص جو یہاں جواب دینے کے لئے کھڑا ہے اس بات کو ثابت کر دے

کہ کائنات میں اس کی قیمت آن تمام مخلوقات کے برابر تھی جو اس کے زندہ رکھنے کے لئے قربان کی گئیں تو ہم اپنی فریاد واپس لے لیں گے۔ اس قسم کا اعلان ہو جائے۔ ہم اپنی تعداد کو دیکھیں گے اور اس فیصلہ پر تعجب کریں گے اور اپنی شکایت واپس لے لیں گے۔ لیکن ہم اپنی طرف سے اتنی بات ضرور آزادی کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اسے اور اس کے ہم جنسوں کو دیکھا ہے اور ہماری فہم اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہے کہ انسان کی افضلیت اور برتری کا کیا سبب ہے۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ یہ سب سے زیادہ مکار، سب سے زیادہ تباہ کار اور بدقسمتی سے گوشت خوار جانوروں میں سب سے زیادہ زندہ رہنے والا حیوان ہے۔ اُسے جان لینے میں لطف آتا ہے۔ جب اُس کی اشتہا سیر ہو جاتی ہے اس وقت بھی یہ تفریحاً ہمیں مارتا رہتا ہے"۔

بیل، بھیڑ، چڑیا اور مچھلی سب نے اپنی اپنی زبان میں اس تقریر پر اظہار پسندیدگی کیا۔ میری حالت یہ تھی کہ گونگا اور مجرم بنا کھڑا تھا۔ سوائے ایک جواب کے اور دوسرا کیا ہو سکتا تھا۔ اگر عدالت کی کرسی پر میں ہوتا تو مجھے بھی فیصلہ میں تامل نہ ہوتا۔ مہلک سزا کا اعلان ہونے ہی والا تھا کہ تمام منظر دھندلا ہو گیا، ایک ناقابل فہم شور سنائی دیا۔ حالت میں تبدیلی ہوئی۔ قدموں کی چاپ اور بہت سی آوازیں سنائی دیں میری آنکھ کھل گئی۔ میں ریل کے ڈبہ میں تھا۔ دروازہ کھلا۔ قلی سامان نکالنے کیلئے داخل ہوئے تک پلیٹ فارم پر اترے۔ ابتداً جس جگہ جانیکا ہمارا ارادہ تھا ہم وہاں پہنچ گئے تھے۔ گاڑیاں اور تانگے انتظار کر رہے تھے۔ چپراسی نواب اور بیگم کی امداد کے لئے بڑھے۔ اسٹیشن ماسٹر ہاتھ میں ٹوپی لئے مؤدبانہ سلام کر رہے تھے۔ وزیر کا معتمد خاص اپنے معزز سردار کے خیر مقدم کے لئے موجود تھا اور یہ سوچ کر کہ ڈاک کے مطالعہ کے لئے وزیر کس درجہ مضطرب ہوگا ڈاک کا سرخ ڈبہ اپنے ہمراہ لے آیا تھا۔ اپنی گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے نواب نے لاٹ پادری سے مصافحہ کیا اور کہا "کل ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے۔ آپ سے اس کی تعبیر پوچھنا چاہتا ہوں"۔ لاٹ پادری نے کہا "میں بہت بہت معافی چاہتا ہوں کہ اس اعزاز کے قبول کرنے سے معذور ہوں۔ کانفرنس میں میری موجودگی بہت ضروری ہے۔ خواب میں نے بھی دیکھا ہے۔ لیکن حضور والا کے لئے اور میرے لئے دنیا کے حقائق کو اتنی اہمیت حاصل کہ ہمیں خیال کی ان عجوبہ آفرینیوں پر غور کرنے کی کہاں مہلت و فرصت ہے"۔ ✿

جرمنی میں عسکری قوت کا احیاء

سنہ ۱۹۱۸ء کی التوائے جنگ سے جرمنی کی عسکری قوت کو شدید نقصان پہنچا۔ معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اب دوبارہ یہ کبھی نہ سنبھل سکے گی۔ فوجیں جب اپنے فلاکت زدہ ملکوں کو واپس آئیں۔ اور دیکھا کہ ان کے ہموطنوں کے دلوں سے لڑائی کے تمام فریب زائل ہو چکے ہیں۔ تو ان کی ہمتیں اور بھی پست ہوگئیں پھر ایک طرف سیاسی اختلافات اور بدامنی نے دوسری طرف مالی اور صنعتی دشواریوں نے رہی سہی امیدوں کو بھی ختم کر دیا۔ اس کے بعد معاہدہ ورسائی ہوا۔ اس کی شرائط کی رو سے آئندہ کے لئے جرمنی فوج کی تعداد صرف ایک لاکھ مقرر کی گئی۔ اور ان کو بارہ سال کی طویل مدت کے لئے پابند کیا گیا اس کے علاوہ اور دوسری سخت شرائط[۱] کے ذریعہ سے اس نئی فوج کی جنگی قوت کو بہت محدود کر دیا گیا۔ سخت قسم کے انتہا پسندوں کو چھوڑ کر باقی سب نے اس تخفیف کو نہایت ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ لیکن اندرونی فسادات کی وجہ سے انھیں یہ سب کچھ گوارا کرنا پڑا۔

مگر اس کے بعد جو واقعات رونما ہوئے۔ انھوں نے جرمنی کے دل میں ایک طرف تو اپنی گذشتہ ذلتوں کے احساس کو تیز کر دیا۔ اور دوسری طرف مستقبل کے متعلق بہت سے پُر فریب اور خوش آیند منصوبے

لہ فوجی طاقت کا تعین مندرجہ ذیل طریقہ پر کیا گیا:- ۷ پیادہ فوج کی ڈویژنیں اور تین رسالوں کی یا ۴۲ بٹالین۔ ۶۹ سکواڈرن۔ ۶۵ گھوڑوں کے اور ۷ ٹرکیٹروں کے توپ خانے۔ اور کچھ مشین کا کام جاننے والی فوج۔

ہوابازوں، گیس اندازوں، ریل بنانے والوں، بھاری توپ خانے اور ٹینکوں کے دستوں کے رکھنے کی سخت ممانعت کر دی گئی۔ ہتھیاروں اور گولی بارود کے ذخیروں کی تعداد کا تعین بھی سختی کے ساتھ کر دیا گیا۔

کی پرورش کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی میں عسکری احیا کی خواہش روز بروز ترقی کرتی رہی۔ معاہدہ کے مطابق ملک کے اسلحہ میں تخفیف کے لئے دولِ متحدہ نے جس نگرانی کے کمیشن کا تقرر کیا تھا۔ اور جو برلن میں متیم تھا اس کے خلاف ایک شدید قومی نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ اس بات کے باور کرنے کے لئے قوی دلائل موجود ہیں کہ جرمنی کے اربابِ حل وعقد نے ابتدا ہی سے اس کمیشن کی راہ میں دشواریاں حائل کرنا شروع کیں اور رسائی کی پابندیوں کے خلاف حیلہ جوئی سے کام لینا تو روز کا مشغلہ ہوگیا تھا۔ ہتھیاروں اور ہوائی بیڑہ کے معاملہ میں تو کمیشن کو بیوقوف بنانے کا موقع نہ تھا۔ لیکن فوج کی تعداد اور عسکری روح کے متعلق جو قوانین بنائے گئے تھے اُن کا نفاذ ممکن نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی عسکری خصوصیات فنا نہ ہوسکیں بلکہ محض تھوڑے عرصہ کے لئے دب گئیں۔ چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ قیصر کے زمانہ کی قدیم کریگز اکادمی یعنی فوجی تعلیم گاہ بھی ایک منتشر اور پُرفریب طریقہ پر محفوظ رکھی گئی۔ ہرلوسک نے پُرانی رجمنٹوں کے ان سابق سپاہیوں کی جو رضا کارانہ حیثیت سے اپنی انجمنیں بنانا چاہتے تھے خوب حوصلہ افزائی کی۔ ان طریقوں سے جرمنی کی فوجی روایات کو مذہبی احترام کے ساتھ قائم رکھا گیا۔

جنگ کے بعد جرمن افواج کی شکل جس طرح تبدیل ہوئی اس کا مطالعہ دو پہلوؤں سے کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو ان پبلک اعلانات سے جن سے سرکاری پالیسی کا اظہار ہوتا تھا اور دوسرے اُن پوشیدہ کارروائیوں سے جن کے ذریعہ سے نئی فوج کی فنی اہلیت اور تنظیم میں سہولت اور رفتہ رفتہ تکمیل ہوتی رہی۔ پہلا پہلو حقیقتاً زیادہ اہم تھا کیونکہ اس سے کل قوم میں ایک عسکری روح پیدا ہوگئی اور یہی وہ چیز ہے جو اس وقت کی فوجی تیاریوں میں سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ مختصراً یہ کہنا کافی ہے کہ جرمنی کی نئی نسل کے دل و دماغ میں یہ بات نہایت راسخ طور پر جانشین کردی گئی ہے کہ جرمنی کے لئے جنگ کی فتوحات مذہبی فرزندی کا مرتبہ رکھتی ہیں اور جرمنوں کی شہامت اور دلیری کو ایک آسمانی رحمت و برکت سے تعبیر کرنا ہر لحاظ سے صحیح و درست ہے۔

لیکن ابتدا میں ان جذبات کے اظہار میں ضبط اور اعتدال سے کام لیا گیا اور یہ چیز ۱۹۱۹ء کی جرمن فوج کی تخلیق میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ سپاہیوں نے اس وقت جو کچھ بھی کیا اس کو اگرچہ ہر

حیثیت سے پسندیدہ نہیں تو کم از کم ہمدردی کے ساتھ تعریف کا مستحق ضرور خیال کیا جا سکتا ہے۔ نئی جرمن فوج کی تخلیق کے لئے سب سے پہلے ۱۹۱۹ء میں جنرل والتھر کا تقرر کیا گیا۔ ان کو اس نئی فوج کا کمانڈر بنایا گیا جس سے جدید رائخس ویر (یعنی مستقل فوج) کا آغاز ہوا برلن کے قریب ڈوبرٹیز کے پڑاؤ میں جنرل والتھر نے اپنا کام شروع کیا اور آہستہ آہستہ طویل مدت کی ملازمت والے رنگروٹ بھرتی کئے جانے لگے جن میں سے ہر ایک اپنی جسمانی اور اخلاقی حیثیت سے چیدہ اور منتخب تھا۔ ان لوگوں کی امداد سے رائخ ہارڈ نے نہایت جلد ایک عمدہ اور ہر اعتبار سے اہل فوج کی بنیاد ڈالنا شروع کی۔ آج بھی جرمنی میں ایسے بوڑھے سپاہی پائے جاتے ہیں جو فخریہ یہ بات بیان کرتے ہیں کہ ہم نے بھی ڈوبرٹیز کے بریگیڈ میں کام کیا ہے۔ لیکن نئی فوج کی تنظیم سے زیادہ اہم وہ روح تھی جس سے ہر سپاہی معمور معلوم ہوتا تھا اور اس سے بھی زیادہ قابل لحاظ یہ بات ہے کہ اس وقت کے حالات کے اقتضا کو صحیح طور پر سمجھ کر رائخ ہارڈ نے مصلحت اندیشی سے فوج کو اس طرح تنظیم دی کہ اس کے دل میں تمام متحدہ جرمن قوم کی طرف سے ایک جذبہ وفاداری پیدا ہو گیا۔ اس کے بعد سے جرمنی کی مستقل فوج کی وابستگی کسی خاص ریاست سے زیادہ نہ رہی بلکہ وہ جرمنی کی فوج ہو گئی اور مرکزی حکومت کی ماتحتی میں کام کرنے لگی۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں رائخ ہارڈ نے اپنی کمانڈ جنرل وان سیکٹ کو سپرد کی جو ایک اچھا سپاہی تھا اور بہت اعلیٰ انتظامی قابلیت رکھتا تھا۔ رائخ ہارڈ ہر چند پرشیا کا رہنے والا نہ تھا مگر پھر بھی اس نے اپنی تمام قوت سپاہیوں کی ان خصوصیات کو ابھارنے میں صرف کی جو پرشیا کی فوج میں خاص طور پر پائی جاتی تھیں اور جن کی وجہ سے جرمن فوج تمام یورپ والوں کے لئے ایک نمونہ بن گئی تھی۔ سیکٹ نے بھی اپنا کام جاری رکھا تا آنکہ جنوری ۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر گیزلر وزیر مدافعت نے یہ اعلان کیا کہ جرمنی کی نئی فوج مکمل ہو گئی ہے۔ وان سیکٹ نے اس میں اتنا اضافہ اور کیا کہ "آج جرمنی کی عسکری تاریخ کے ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا ہے"۔ دشواریوں کے باوجود سیکٹ کی تعمیر کی ہوئی فوج نہایت نمایاں طور پر کامیاب ثابت ہوئی۔ اس کے بعد سے جرمن مستقل فوج کی اعلیٰ اہلیت میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ لوگ

س قدر کثیر تعداد میں بھرتی کے خواہش مند رہتے تھے کہ افسروں نے چن چن کر آدمیوں کا انتخاب کیا چنانچہ س وقت فوج میں قوم کے بہترین افراد پائے جاتے ہیں۔ سب سے نمایاں خصوصیت سیکٹ کی فوج ا یہ تھی کہ وہ صاف اور واضح طور پر وقتی سیاسی مسائل سے علیحدہ رہتی تھی۔ اس میں اس حد تک حزم و حتیاط سے کام لیا گیا تھا کہ ۱۹۳۳ء کی ابتدا میں جو سیاسی انتشار کی کیفیت تھی اس وقت بھی فوج قطعاً یر جانب دار رہی۔

دس سال تک جرمنی کی مستقل فوج نے اپنا کام جاری رکھا۔ اور اپنی تربیت کو مکمل کرتی رہی اور ا دوہرے مقصد کے لئے اپنے آپ کو تیار کرتی رہی جس کو سیکٹ نے پہلے ہی سے سمجھ لیا تھا۔ پہلا قصد تو یہ تھا کہ یہ فوج منتخب سپاہیوں کی ایک جماعت ہو اور اپنی اہلیت پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے سے بہت زیادہ تعداد کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کر سکے۔ دوسرا مقصد اس کا یہ تھا کہ ایسے مشکل وقت ا جب قوم کو ایک بڑی فوج کو بھرتی کرنے کی ضرورت پیش آئے یہ فوج رہنماؤں اور کمانڈروں کی ج کا کام دے۔ جتنا وقت گذرتا رہا اتنی ہی اس کی تعلیم بہتر ہوتی رہی۔ جن اسلحہ اور مشینوں کا استعمال دع تھا۔ مثلاً گیس ٹینک۔ ہوائی بیڑہ وغیرہ ان کی فرضی تصویر ذہن میں قائم کرلی گئی اور جب کبھی ممکن ان کے نقلی اور نمائشی نمونے بنا لئے گئے۔ جرمنی کے مفکرین نے مستقبل کی جنگ کے متعلق مطالعہ شروع کیا اور اس سلسلہ میں ان تمام اصلاحوں اور نئے ہتھیاروں کو معلوم کیا جو ان قوموں میں رائج تھے جو معاہدہ کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہ تھیں۔

فوج سے باہر بھی جرمنی کے لوگ عسکری حوصلوں سے متاثر ہو رہے تھے۔ جاپان سویٹ روس اور اٹلی کی طرح جرمنی میں بھی نئی نسل کی تعلیم کی طرف بہت توجہ کی جانے لگی۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کی ذہنیت بدلنے کے لئے یہی ذریعہ سب سے زیادہ موثر ہے۔ اس لئے جرمنی میں بھی نوجوانوں کے تنظیم کو بہت اہمیت دی گئی۔ کچھ لوگوں نے اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی کہ یہ "معاشری رتقا" کا اچھا ذریعہ ہے اور اس کے وسیلہ سے بالشوزم کو روکا جا سکے گا۔ لیکن آبادی کی اکثریت نے سا کو عسکری اور قومی احیاء کی شاہراہ سمجھ کر اختیار کیا۔ ایک جرمن مصنف اس تحریک کے متعلق اپنی

رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ " یہ معاہدۂ ورسائی کی زنجیر کو آہستہ آہستہ ڈھیلا کرنے کے لئے پہلی کوشش ہے " یہ خیال تیزی سے پھیلتا رہا اور ۱۹۳۲ء میں قوم پر اس طرح حاوی ہو گیا کہ پریسیڈنٹ کو ایک اعلان شائع کرنا پڑا جس سے ایک بورڈ کا تقرر کیا گیا کہ وہ " جسمانی ورزش کے طریقوں کا ایک معیار اور نصاب مقرر کرے تاکہ جرمنی کے نوجوانوں کی جسمانی تربیت کی نگرانی مجموعی طور پر کی جاسکے ۔ پریسیڈنٹ نے کہا " جرمنی کے نوجوان ہماری نسلوں کے مستقبل کے مالک ہیں ۔ ان کے جسم کی سختی، ضبط، تنظیم، باقاعدگی، باہمی رفاقت، قوم کی خاطر ایثار کے لئے آمادگی ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی تربیت کی ذمہ داری حکومت کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہیئے " اس اعلان سے جرمنی کے اس حصہ آبادی کو بہت اطمینان ہوا، جو سیاسی رجحانات اور موجودہ نااتفاقیوں سے بیزار ہو کر ہمہ گیر لازمی فوجی خدمت کو ہی قوم کے تمام معاشری اور دوسرے امراض کا واحد علاج سمجھنے لگا تھا ۔

نوجوانوں کی تربیت کا یہ تخیل نیا نہیں ہے ۔ فلسفیوں نے ہمیشہ جستجو کی ہے کہ جنگ کے دوران میں جو اعلیٰ اخلاقی صفات بروئے کار آتی ہیں انھیں زمانہ امن میں بھی پیدا کریں اور جاری رکھیں ۔ اور عموماً مشترکہ معاشری خدمت کو کسی نہ کسی شکل میں اس غرض کے لئے منتخب کیا ہے لیکن اس مقصد کیلئے جو سپاہیانہ تعلیم ہوتی ہے اس میں اور خالص عسکری تربیت میں جو فرق ہے وہ جرمنی میں برابر دھندلا ہوتا گیا ۔ یہاں کے بچوں کی تمام ورزشوں اور مدافعت کے کھیلوں میں جو فوجی میلان پایا جاتا ہے وہ چھپائے نہیں چھپتا اگرچہ معاہدہ ورسائی کی خاطر اس کو پوشیدہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے ۔ جرمنی میں نوجوانوں کو اس طرح تربیت دینے کے لئے جیسے لوائے اسکاؤٹوں کو تمام دنیا میں دیجاتی ہے بے شمار انجمنیں پہلے سے موجود تھیں ۔ ان میں خاص طور پر نمایاں وہ انجمن تھی جسے بالدور ون شیراک نے قائم کیا تھا ۔ یہ شخص ایک پُرجوش آدمی تھا جو اپنی مادر وطن کے احیاء کا خواہشمند تھا ۔ یہ تمام انجمنیں بڑھتی اور ترقی کرتی رہیں تاآنکہ نازیوں کے زمانہ میں انھیں متحد کر کے ہٹلر جوگنڈ کا نام دیدیا گیا ۔ نوجوانوں کی تربیت کے لئے جو نصاب مقرر کیا گیا تھا ۔ وہ مدافعتی کھیلوں سے بہت ملتا جلتا تھا ۔ یہ کھیل متعدد اعتبارات سے بالکل ان ورزشوں سے مشابہ ہیں جو سپاہیوں کو کرائی جاتی ہیں ۔ ان

مدافعتی کھیلوں کا رواج رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ جہاں کہیں بھی نوجوان ورزش کے لئے جمع ہوتے تھے وہاں ان کی ضرور مشق کرتے تھے ۔

دوسرا قدم جو اسی سمت میں اٹھایا گیا وہ یہ تھا کہ تمام ہائی اسکولوں میں " مدافعت کا علم " نصاب میں داخل کر دیا گیا ۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ کے دوران میں یہ خرابی ظاہر ہوئی تھی کہ مدبر اور سپاہی باہم ایک دوسرے کے نقطۂ نگاہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے اور اس بات سے ناواقف ہوتے ہیں کہ جنگ کے مشترکہ کام میں ان کے اپنے اپنے فرائض کیا ہیں ۔ ۱۹۱۸ء میں سپاہیوں اور سیاسی لیڈروں میں اس قسم کی عدم مفاہمت اور بھی زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور جرمنی کی شکست کا ایک بڑا سبب اس بات کو بھی قرار دیا جاتا ہے ۔ نصاب میں اس نئے مضمون کے داخل کرنے سے یہ امید کی گئی کہ اس خرابی کا ازالہ ہو سکے گا ۔ جہاں تک نظری حیثیت کا تعلق ہے اس نصاب پر اعتراض کرنے کا کسی کو کوئی موقع نہیں ہے مگر اس کا اعتراف جرمنوں کو بھی ہے کہ معاہدہ ورسائی کے فقرہ نمبر ۱۷۷ کی اس سے خلاف ورزی ہوتی ہے ۔ لیکن وہ اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیتے ہیں کہ یہ مضمون محض سیاسی اور نظری حیثیت سے پڑھایا جاتا ہے اور اس میں کسی فوجی مشق کے کرانے کی اجازت نہیں ہے ۔ بہرحال اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ نصاب میں اس بات کی گنجائش ہے کہ اگر برنسوک کے پروفیسر بانسے جیسے انتہا پسند آدمی چاہیں تو وہ تقریر اور تحریر کے ذریعہ سے معاہدہ کے فقرہ نمبر ۱۷۷ کی پابندیوں سے متجاوز ہو سکتے ہیں ۔ یہ چیزیں ممکن ہے واقعی مستثنیٰ کئے جانے کے لائق ہوں لیکن سائنس کی تعلیم کا جو عام رجحان ہے اور ورزش ، پریڈ اور تقریروں سے جس طرح جرمنی کے نوجوانوں کو علی الاعلان جنگ کی طرف مائل کیا جاتا ہے اُس سے کسی شخص کے دل میں بھی یہ اثر کبھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ جرمنی کے نوجوانوں کی تربیت امن پسند ماحول میں کی جا رہی ہے ۔ پھر جب اس لٹریچر پر نظر ڈالی جاتی ہے جو شروع سے آخر تک خالص عسکری روح سے لبریز نظر آتا ہے تو اس قسم کی رائے میں اور زیادہ استحکام پیدا ہو جاتا ہے ۔

اس دوران میں مستقل فوج کی کمی تعداد کی طرف سے جو بے اطمینانی کی کیفیت باوثوق حلقوں میں پائی جاتی تھی وہ برابر بڑھتی رہی اور جنیوا میں تخفیف اسلحہ کے بارے میں جو مباحثے ہوتے تھے اُن سے لے

اور ترقی ہوتی رہی ۔ ۱۹۳۲ء میں فرانس کی طرف سے ایم ۔ برائینڈ نے مدافعت کے معاملات میں جرمنی کے مرتبے کے متعلق جو اعلانات کئے اُن سے جرمنوں کی بے صبری کو کچھ تسکین ہوئی لیکن بعد کی مایوسیوں سے مجبور ہوکر جرمنی نے جو طریقے اختیار کئے اُن کی صرف ایک ہی تعبیر ممکن تھی اور وہ یہ کہ جرمنی دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنے عسکری مرتبہ کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے ۔ مدافعت کے لئے نوجوانوں کی تربیت کا اصول تسلیم کرانے کے بعد اس بات کا مطالبہ کہ تمام بالغوں کو عام طور پر فوجی تعلیم کی ازسرِ نو اجازت دی جائے کچھ بہت بڑا مطالبہ نہ معلوم ہوتا تھا ۔ پھر یہ مطالبہ یکبارگی نہیں کیا گیا بلکہ ابتداءً صرف یہ کہا گیا کہ چونکہ فاتح اقوام معاہدہ ورسائی کے مطابق اسلحہ کی تخفیف کے لئے تیار نہیں ہیں اس لئے جرمنی کو بھی زیادہ فوج رکھنے کی اجازت ملنی چاہیئے ۔ اس غرض کے لئے تعداد کا تعین اس طرح کیا گیا کہ مستقل فوج میں ایک لاکھ سپاہیوں کی جگہ تین لاکھ سپاہی بھرتی کرنے کی اجازت مانگی گئی ۔ ملازمت کی شرائط کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا اور نہ مجوزہ تنظیم کے متعلق کچھ کہا گیا جسے فوجی نقطہ نگاہ سے ایک سخت فردگذاشت سمجھنا چاہیئے ۔

جرمنی کے پیش نظر جو مسئلہ تھا اس کا حل آسان نہ تھا کیونکہ جنگ سے پہلے فوج کا جو انتظام تھا اس میں دو سال تک فوج میں رہ کر ملازمت کرنا پڑتی تھی اور بھرتی تمام قوم کے لئے لازمی تھی ۔ یہ چیز اس وقت کچھ تو غیر ملکی مخالفت اور کچھ مالی دشواریوں کی وجہ سے خارج از بحث سمجھی جاتی تھی ۔ تاہم ایک ایسی کثیر جماعت بھی تھی جس کا خیال تھا کہ بے روزگاروں کی جو کثیر جماعت جرمنی میں پائی جاتی ہے اُسے آسانی سے فوج میں بھرتی کیا جا سکتا ہے اس کی تائید میں ایک مزید دلیل یہ لائی جاتی تھی کہ ان لوگوں کو اخلاقی اور جسمانی خرابیوں سے صرف فوجی تعلیم کے وسیلہ سے ہی بچایا جا سکتا ہے ۔ کچھ عرصہ یہ چیز جاری رہی ۔ لیکن بعد میں تقریروں اور تحریروں کا ایک اور سلسلہ شروع ہوا جس میں ہمہ گیر فوجی تعلیم کے ازسرِ نو جاری کئے جانے کا نہایت شدومد سے مطالبہ کیا جانے لگا ۔ اس ضمن میں پرانے تجربات اور مشاہدات کے حوالے دئے گئے ۔ کیا ۱۸۱۳ء میں اسی چیز سے جرمنی کو نجات حاصل نہ ہوئی تھی ؟ کیا ۱۸۷۰ء کی فتح کا سہرا اسی کے سر نہ تھا ؟ فوجی طاقت ہی وہ ذریعہ ہے جس سے جرمن قوم دوبارہ دوسری اقوام میں اپنا کھویا ہوا مرتبہ لے

دنیا کی نگاہ میں عزت و وقار حاصل کر سکتی ہے۔

آخر میں جرمنی نے اس حق کا مطالبہ کیا کہ اُسے جو رعایتیں مل چکی ہیں اُن سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُسے موقع دیا جائے کہ وہ اپنی مستقل فوج کی تعداد میں اضافہ کر سکے اور شرط صرف یہ ہو کہ جس قدر نئی فوج بھرتی ہو وہ سب قلیل مدت کے لئے ہو اس کے مقابلہ میں جرمنی اس بات کا اعتراف کرنے کے لئے آمادہ تھی کہ "وزنی اسلحہ کی جو پابندیاں اس پر عاید کی گئی ہیں اُنھیں گوارا کرتی رہے۔ نیز یہ کہ طویل مدت کی جو مستقل فوج ہے اس کی تعداد میں کچھ کمی کر دی جائے۔ اسی لئے کف باسر کی فوجی انجمن کا افتتاح کرتے ہوئے جب ۵ر جنوری ۱۹۳۳ء کو برلن میں پریسیڈنٹ ہنڈنبرگ نے اپنی تقریر کے دوران میں مندرجہ ذیل باتیں کہیں تو کسی کو تعجب نہ ہوا۔

"میں ایک دفعہ پھر اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ ہم صرف اتنی ضمانت امن چاہتے ہیں جتنی اور دوسرے ملکوں کو حاصل ہے میرے نزدیک ہمہ گیر فوجی خدمت کا نصب العین ہماری قوم کا ایک نہایت مستحسن مقصد ہے مگر چونکہ مختلف حالات میں مختلف کارروائیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے موجودہ حالات میں جو چیز میرے پیش نظر ہے وہ ایک بے قاعدہ فوج ہے لیکن آپ کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ہماری مستقبل کی مدافعتی فوج کی ظاہری شکل چاہے کچھ ہی ہو لیکن اس کی روح وہی رہے گی جو ہمیشہ ہماری فوج میں پائی گئی ہے اور آج بھی پائی جاتی ہے۔ ہماری فوجی روایات نہ تعداد کی پابند ہیں نہ ظاہری شکل و صورت کی"

اس تقریر کے مطالعہ کے بعد کسی شخص کو بھی اس کے تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ "بے قاعدہ فوج" کی اصطلاح محض سابق اتحادی حکومتوں، انجمن اقوام اور تمام دنیا کی حامی امن آبادی کی اشک شوئی کے لئے استعمال کی گئی تھی ورنہ یہ مجوزہ بے قاعدہ فوج اپنے نظم و ڈسپلن کے اعتبار سے کسی حیثیت سے مستقل فوج سے کم نہ ہو سکتی تھی۔

وان ہنڈنبرگ نے اپنی اسکیم پیش کرتے وقت جو بات کہی وہ وہی تھی جو اس سے پہلے متعدد بار کہی جا چکی تھی۔ حتیٰ کہ جون ۱۹۳۱ء میں بھی وان سیکٹ نے میونک میں طلباء کے ایک اجتماع کے سامنے نہایت واضح الفاظ میں مستقبل کی جرمن فوج کے متعلق اپنا تخیل اس طرح پیش کیا تھا۔

ہماری مستقبل کی فوج کی ظاہری شکل کے متعلق کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی نہ کسی شکل میں ہمہ گیر لازمی خدمت کے اصول پر ضرور عمل کیا جائے گا۔ اس طریقہ خدمت کے علاوہ کوئی دوسری صورت اختیار ہی نہیں کی جاسکتی پہلے ہمیں ایک فوج تیار کرنا چاہئے اگر ضرورت ہو تو مختصر لیکن نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اس کے ساتھ وہ دوسری منظم جماعت ہوگی جو بے قاعدہ فوج سے مشابہ ہوگی۔"

اگست ۱۹۳۲ء میں وان شلیشر نے حکومت فرانس کو اسلحہ کی مساوات پر ایک تحریری یادداشت اسی مضمون کی لکھی تھی۔ افواج کی دو نمایاں قسموں میں تقسیم سیکٹ کے لئے عرصہ سے ایک محبوب موضوع گفتگو تھی۔ افواج کی ترقی کے بارے میں اس کا جو نظریہ تھا اس کی بنا پر وہ یہ ضروری سمجھتا تھا کہ ایک طرف تو ان اعلیٰ تربیت یافتہ طویل مدت کی افواج کو ترقی دی جائے جو جنگ کے تمام سائنٹیفک طریقوں سے واقف ہوں اور زیادہ سے زیادہ جسمانی محنت برداشت کرسکیں اور دوسری طرف وہ ایک عوام کی فوج رکھنا چاہتا تھا جو فوری اطلاع پر جمع ہوسکے اور میدان جنگ میں کم محنت اور مہارت کے کاموں کو آسانی سے انجام دے سکے۔ اس کا بنیادی اصول یہ تھا کہ تربیت کی مدت اور نوعیت میں ان غیر مساوی کاموں کے اعتبار سے تفریق کی جاسکے جن کی بجا آوری ایک جدید فوج کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ لیکن بے قاعدہ فوج کے تخیل کو عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ اس موضوع پر جرمنی میں بہت کچھ لکھا گیا کہ ایک بے قاعدہ فوج اپنا کام ٹھیک طریقہ پر انجام دینے سے قاصر رہے گی۔ اس کے ثبوت میں ۱۷۹۲ء کے انقلابی دور سے ۱۹۱۸ء تک جتنی تاریخی شہادتیں فراہم ہوسکتی تھیں پیش کی گئیں۔

طویل مدت کی ایک مختصر فوج کی ضرورت پر اس وجہ سے بہت زور دیا جاتا تھا کہ اس سے قلیل مدت کی فوج کی جو خامیاں ہیں وہ رفع ہوسکیں گی نیز جدید جنگ کے جن مشاغل میں نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کی ضرورت ہے وہ فراہم ہوسکے گی۔ اس کے علاوہ یہ مطالبات تھے کہ فوجی تعلیم گاہ کو دوبارہ قائم کیا جائے۔ اسلحہ جات ممنوعہ پر جو پابندی عاید ہے اسے اٹھایا جائے۔ اپنے حدود پر قلعہ سازی کی آزادی اور رائن لینڈ کے غیر فوجی علاقہ کی منسوخی حاصل کی جائے۔ ایک لاکھ کی ایک مستقل فوج اور تین لاکھ کی ایک بے قاعدہ فوج کا متوازی قیام فوجی افسروں کے نزدیک ضروری اور ممکن العمل تھا جرمنی کی مسلح نوجوانوں کی امداد اور تکمیل کیلئے

مزدوروں کی ایک قومی فوج کا قیام بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا۔

دسمبر ۱۹۳۲ء میں سابق اتحادی حکومتوں نے جو اعلان کیا اُس سے جرمنی کو مساوی مرتبہ اور اپنی مستقل فوج میں اضافہ کا حق حاصل ہو گیا اور اسے جرمنی نے فوجی توسیع کے لئے ایک پروانہ سمجھا۔ سابق اتحادیوں کی یہ سخت غلطی تھی انھیں معاملہ کا تصفیہ اُسی موقع پر کر دینا چاہئے۔ جرمن سیاست نے تیزی سے رنگ بدلنا شروع کیا۔ سیاسی شکایات کو معاشری اور معاشی بے چینی تقویت پہنچا رہی تھی۔ جرمنی کی حالت بہت خطرناک تھی اور وہاں ہر انفرادی مسئلہ نہایت آسانی سے قومی مسئلہ کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔

یہ موقع تھا جب ۱۹۳۳ء میں نازیوں نے اچانک حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اور ہٹلر کے آتے ہی جرمنی کے مسئلہ مدافعت نے ایک نئی صورت اختیار کر لی۔ مجلس قانون ساز کے انتخاب کے بعد جو سیاسی ہلچل ہوئی اُس نے معاملہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔ نازی تحریک کے سیاہ قمیص والے رضا کاروں کی موجودگی میں کسی حریف فوج کو قائم کرنا گویا اُن کی توہین تھی۔ اسی طرح بھورے قمیص والے رضا کاروں کو بھی اُن کی تعداد اور اثارہ کو دیکھتے ہوئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہی جماعتیں جرمنی کی بے قاعدہ فوج بن جائیں گی۔ بھورے قمیص والوں کے رہنماؤں کے نزدیک تو یہ ایک طے شدہ مسئلہ تھا جس میں شک و شبہہ کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن مستقل فوج کے ارباب حل و عقد کے نزدیک یہ چیز قابل قبول نہ تھی۔ اُن کی فوج میں نہایت اعلیٰ قسم کے آدمی تھے اور وہ یہ نہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں میں بھی وہی زہر پھیلے جو بھورے قمیص والی جماعتوں میں خوب ترقی پا چکا تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ ان آوارہ منش بے روزگار لوگوں کے مقابلہ میں جو سیاسی جوش میں شہر کے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں کھیت اور فیکٹری کے مزدوروں کو بھرتی کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔ جرمنی کی فوجی اخباروں نے "انقلاب" کی خوب تعریف کی اور ایسا کرنے کے لئے وہ مجبور تھے کیونکہ نئی حکومت نے قومی احیاء اور دنیا کی اقوام میں جرمنی کے مرتبہ کو بلند کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ پھر ہٹلر کی حکومت نے اپنے سن پریسیڈنٹ کی قیادت میں مستقل فوج اور عام عسکری طبقہ کو اپنی دوستی اور ہمدردی کا پورا پورا یقین

نئی فوج کا افسر بہت زیادہ فرقہ پرست واقع ہوا ہے۔ اس لئے وزیر مدافعت جنرل وان بلومبرگ کے اعلانات اعتماد کے باوجود مستقل فوج کے دل میں بھورے قمیص والے رضا کاروں کی طرف سے عام طور پر جو بے اعتمادی پائی جاتی تھی وہ رفع نہیں ہوئی۔ اس مسئلہ کے متعلق علانیہ طور پر ہر چند بہت کم اظہار رائے کیا گیا اور اخباروں نے تو اس کے متعلق بالکل ہی کبھی اشارہ نہیں کیا۔ لیکن گمان غالب یہ ہے کہ نازیوں اور نیم عسکری جماعت کے عروج کی وجہ سے جن کی مدد سے ہٹلر کو اقتدار حاصل ہوا تھا جرمنی میں بے قاعدہ فوج کا تخیل زوال پذیر ہو گیا۔

۱۹۳۳ء میں جرمنی انجمن اقوام سے علیحدہ ہو گئی۔ اس کے بعد سے جرمنی میں عسکری احیار کی تجاویز کے متعلق جو تھوڑا بہت تذبذب باقی تھا وہ بھی جاتا رہا بلکہ جینوا کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے بعد تو جرمنی کے لئے بہت آسان ہو گیا کہ وہ اپنی عسکری ترقی کے لئے پوری کوشش کرے ۱۸۰۶ء تا ۱۸۱۳ء کے کامیاب تجربہ کی پیروی کرنے میں اب تو کوئی رکاوٹ بھی حائل نہ تھی۔ اگر تھوڑا خوف تھا تو اس قدر کہ اگر زیادہ تیزی کے ساتھ قدم بڑھایا گیا تو ممکن ہے مغربی یورپ کو یہ چیز ناگوار خاطر ہو اس لئے ابتدا میں یہ ضروری سمجھا گیا کہ مستقل فوج سے مشابہ ایک فوج کو منظم کیا جائے اور وسیع تر فوجی خدمت کو دوبارہ رائج کیا جائے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح لوگوں کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی گئیں کہ ایک پیشہ ور سپاہی اپنے پیشہ اور قوم دونوں کی عزت کا مستحق نہیں ہے۔ تنخواہ دار سپاہی کی حیثیت بالکل ایک جلاد کی سی ہوتی ہے۔ وہی مصنف جو فریڈرک کی تنخواہ دار فوج کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے اب "کرایہ کی" فوج کا مذاق اڑانے لگے۔ ہمہ گیر خدمت کے دوبارہ جاری کرنے کا مطالبہ نہایت زور شور سے کیا جانے لگا۔ فوجی اخبار ایک نئی فوج کے متعلق پیشین گوئی کرنے لگے۔ قدیم عسکری نظام کے احیار نے ایک مذہبی عقیدہ کی شکل اختیار کر لی۔

بے قاعدہ فوج کا تخیل جب ختم ہو گیا تو تین لاکھ آدمیوں کی فوج کا مطالبہ ان شرائط پر کیا جانے لگا جنھیں جرمنی کا دعوے تھے کہ فرانس منظور کر چکا ہے۔ اس بات میں کس قدر کامیابی ہوئی اس کا علی الاعلان اظہار کبھی نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اپریل ۱۹۳۴ء میں رنگروٹوں کے پہلا گروہ کا انتخاب

کیا گیا تاکہ مستقل فوج کی تعداد کو تین لاکھ تک پہنچایا جا سکے ۔ باقاعدہ فوج میں ملازم رہنے کی مدت اٹھارہ مہینہ طے پائی لیکن نئی حکومت کے آیندہ عزایم کے متعلق کوئی واضح بیان شایع نہیں کیا گیا ۔ فی الحال یہ امر کہ مستقل فوج میں کسی قسم کی تخفیف کی جائے گی یا اسے تربیت دینے والے دستوں میں منقسم کر دیا جائے گا بالکل مشتبہ معلوم ہوتا ہے ۔

لیکن مستقل فوج کی توسیع سے بھورے قمیص والے رضاکاروں میں جو اس بات پر بے چینی تھی کہ انھیں اس نئی فوج میں کیوں بھرتی نہیں کیا گیا وہ انتہا کو پہنچ گئی ۔ اور ہٹلر کے خلاف سازش کا یہی ایک بڑا سبب ہوا ۔ یہ سازش ناکام رہی اور ۳۰ر جون کو اس کے سب رہنما گولی سے اڑا دیئے گئے ۔ اس کے بعد سے بھورے قمیص والی انجمنوں کو اجازت نہ رہی کہ وہ "سیاسی فوج" کی حیثیت سے کام کریں ۔

ہٹلر کی حکومت میں ابتدا سے ہی مستقل فوج کو وسعت دینے کا رجحان پایا جاتا تھا ۔ جرمنی میں صرف رسائی کا معاہدہ ہی عسکری اصلاح کے حامیوں کا نشانۂ ملامت نہ تھا بلکہ مختلف دوسری غیر اہم سمتوں سے قدیم شہنشاہی عسکری نظام کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوششیں کی جانے لگی تھیں ۔ تمغوں، نشانوں، جھنڈیوں طروں اور خطابات کو پھر پہلے جیسا رواج ہوا ۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی دستور ویمر کی دفعہ نمبر ۱۰۶ کی منسوخی کو بھی سمجھنا چاہیئے جس کی بنیاد پر فوجی عدالتوں کی تمام اپیلیں براہ راست پریسیڈنٹ کے پاس جانے لگیں اور اس طرح قانون قبل از جنگ کی طرف واپسی ہوئی اور فوجی عدالتیں دوبارہ سول عدالتوں کی محکوم نہ رہیں ۔

اسی قسم کی مزید ترقیوں کو ظاہر کرنے کے لئے شہادتوں کی کمی نہیں ہے ۔ سنہ ۱۹۳۴-۳۵ء کے بجٹ میں مدافعت کے خرچ کا تخمینہ نوے کروڑ مارکس (یعنی ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ پونڈ) کیا گیا تھا ۔ بحری بیڑہ کو اس رقم میں سے ۲۲ کروڑ مارکس دیئے گئے تھے ۔ مستقل فوج کو ۵۷ کروڑ (یعنی سنہ ۱۹۳۳ء کے مقابلہ میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ) ۔ وزیر فضا کو دوسرے ذرایع سے ۴ کروڑ کی رقم دی گئی (یعنی سنہ ۱۹۳۳ء کے مقابلہ میں ۷۰ فی صدی اضافہ کیا گیا) ۔ ان کے علاوہ دوسرے اور مدات تھے (مثلاً پولس، طوفانی افواج،

مدافعتی کھیل وغیرہ) جن کو عسکری سمجھنا غالباً غلط نہیں ہے ۔ ان کا مجموعی تخمینہ ۴۵ کروڑ تھا۔ ان مختلف مدات کا جب زیادہ تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بحری محکمہ نئی تعمیر پر بہت زیادہ روپیہ خرچ کرنا چاہتا تھا، بری محکمہ اپنی اہمیت میں اضافہ اور اسلحہ جات مصنوعہ کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور وزیر فضا ایک بڑی قومی ہوائی سروس کو تنظیم دینا چاہتا تھا ۔

ہٹلر کی حکومت کا ایک اور نیا کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے قومی خدمت کے سلسلہ میں کسی نہ کسی قسم کی محنت کو لازمی قرار دے دیا ہے ۔ خالص عسکری نقطۂ نگاہ سے ممکن ہے اس کی اہمیت کو بہت مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ جرمنوں کے ذہن میں اس کا ایک دوسرا مفہوم پایا جاتا تھا جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اول تو اس سے کاہلی کی ان عادات کی اصلاح منظور تھی جو لازمی فوجی خدمت کے ختم ہو جانے اور بے روزگاری کے اضافہ سے جرمنی میں پیدا ہو گئی تھیں ۔ دوسرے اس کی بنیاد پر جنگ کی حالت میں نہایت سہولت سے صنعتی مزدوروں کی بھرتی کی جا سکتی تھی ۔ اول الذکر مقصد سے ہر شخص کو ہمدردی کا اظہار کرنا چاہیئے ۔ اسی طرح دوسرے مقصد پر بھی اُن کارروائیوں کو دیکھتے ہوئے جو امریکہ فرانس اور اٹلی نے اپنے ممالک میں اسی مقصد کے لئے جائز رکھی ہیں کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب ان مختلف چیزوں پر ایک بڑی تحریک کے منتشر اجزا کی حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے تو ان کی طرف سے ضرور بدظنی پیدا ہوتی ہے ۔

اپریل میں فوج میں جو نئی بھرتی کی گئی تھی اُن کی تعلیم نہایت پوشیدہ طریقوں پر کی جا رہی تھی ۔ ان آدمیوں کو علیحدہ علیحدہ تربیت پانے والے گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور انھیں کام کرتے ہوئے دیکھنے کی کسی ایسے شخص کو اجازت نہ تھی جس کے متعلق ذرا سا بھی یہ شبہ کیا جاتا تھا کہ یہ جرمنی یا نازیوں کا مخالف ہے ۔

جرمنی کے عسکری احیا کے متعلق مندرجہ بالا اور ان کے علاوہ دوسری اسی قسم کی شہادتوں کی موجودگی میں مسٹر ونسٹن چرچل کے اس سوال کے جواب میں کہ آیا برطانیہ کی مدافعتی کارروائیاں کافی ہیں یا نہیں اگر مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں ۲۸ نومبر کو اپنا مشہور عام بیان دیا تو اس پر تعجب کی کوئی وجہ

نہیں ہے۔ اس بیان میں جرمنی کی فوجی تیاریوں کا حال بالکل اسی انداز میں مختصر طور پر بیان کیا گیا تھا جیسا ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ اس بیان کو جسے حکومت برطانیہ کا نہایت مدبرانہ تبصرہ سمجھنا چاہئے شایع کرنے سے پہلے برطانوی سفیر نے اسے ہٹلر کے سامنے پیش کیا تھا اس سلسلہ میں یہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب ہٹلر نے اسے دیکھا تو نہایت برہمی کا اظہار کیا۔ اس بیان کے بعد برطانوی حکومت کی طرف سے ایک وائٹ پیپر شایع ہوا اور پھر دارالعوام میں مدافعت کے خرچ کا نیا تخمینہ پیش کیا گیا اور جرمنی کو ایک ایسے سمجھوتے کی دعوت دی گئی جس میں تمام مغربی حکومتیں شریک ہو کر اس کا عہد کریں کہ ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ایک دوسرے پر حملہ نہ کریں گی۔

سنہ ۱۹۳۴ء میں سیاہ قمیص والے رضاکاروں کی باری آئی۔ ان کے ہتھیار چھین لئے گئے۔ ان کی قوت بالکل کمزور کردی گئی اور ان میں جو اچھے عناصر تھے انھیں مستقل فوج میں شامل کرلیا گیا۔ مستقل فوج کی قیادت اب ہٹلر کے ہاتھ میں تھی اس لئے جرمنی کی قسمت کا فیصلہ بلا شرکت غیرے اسی کے قبضہ میں تھا۔ جرمنی کے لئے اب وقت آگیا تھا کہ اپنے مقاصد کا علی الاعلان اظہار کردے۔ عسکری طاقت کے اختیار کے متعلق اپنے آیندہ عزایم کو چھپانا اب بے کار ہوگیا تھا۔ اس لئے اس نے مطالبہ کرنا شروع کیا کہ جو مرتبہ بین الاقوامی معاملات میں دوسرے دول کو ملا ہوا ہے وہی جرمنی کو بھی دیا جائے۔ فرانس کی مجلس قانون ساز میں دو سالہ جبریہ خدمت کی قرارداد پر مباحثہ اور فیصلہ ہوجانے کے بعد ہٹلر نے اعلان کیا کہ جرمنی نے یکم مارچ سے ہوائی فوج کی بھرتی شروع کردی ہے۔ اس اعلان کے بعد ۱۶ مارچ کو ایک دوسرا اعلان شایع کیا گیا کہ چونکہ وہ دول جنھوں نے سنہ ۱۹۱۹ء میں معاہدہ ورسائی کی بنیاد پر جرمنی کے اسلحہ میں تخفیف کرائی تھی خود اپنے وعدوں کو پورا نہیں کر رہے ہیں اس لئے جرمنی بھی جبریہ بھرتی دوبارہ جاری کرنے کیلئے مجبور ہے اور ۵ لاکھ کی فوج تیار کرنا چاہتی ہے جو ۳۶ ڈویژنوں کی بارہ افواج میں منقسم کی جائیگی۔

یہ سب تو جرمنی کی بری افواج کے بارے میں لکھا گیا۔ اب ہوائی فوج کا حال سنیے۔ چونکہ ورسائی کے معاہدہ کی رو سے جرمنی کو فوجی ہوائی جہاز رکھنے کی اجازت نہ تھی اس لئے جرمنی کی جدید ہوائی فوج کے متعلق کوئی مسلسل داستان ترقی بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ کام انتہائی رازداری کے ساتھ انجام کو پہنچایا گیا۔

لیکن یہ بات ہر شخص تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے کہ اس قسم کی تیاری گذشتہ متعدد سالوں سے جاری تھی۔
جرمنی کی حکومت اور وہاں کے جہاز بنانے والے صناعوں نے جتنے جہاز پچھلے چند سالوں میں بنائے ہیں اور ۱۷ مارچ کو برلن میں ہوائی جہازوں کی جو پریڈ ہوئی اُن کی ظاہری شکل اس بات کی ایک بہت بڑی شہادت ہیں کہ جرمنی نے اپنی اہلیت کو کس حد تک ترقی دے لی ہے۔ اس ضمن میں جرمنی کے ان بے شمار ہوائی کلبوں اور اسکولوں کی طرف توجہ منعطف کرانا بھی بے محل نہ ہوگا جن کی تنظیم بالکل نیم عسکری معلوم ہوتی ہے۔ ان کے ممبر وردیاں پہنتے ہیں اور فوجی خصوصیات کا اظہار کرتے ہیں۔ جرمنی میں غیر ملکی گاہکوں کو لڑائی میں کام آنے والے ہوائی انجن فروخت کئے گئے اور اسی قسم کے انجن جرمنی نے خود باہر سے خریدے۔ پھر تمام جرمنی میں ہوائی دفتروں کا ایک جال بچھا ہوا ہے جس کی نوعیت بالکل فوجی ہے۔ علاوہ ازیں تمام ملک میں ہوائی مدافعت کے جوش کی ایک لہرسی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے اور اس سلسلہ میں ہوائی جنگ میں جو مدافعتی تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں اُن کی جزئی تفصیلات کی لوگوں کو تعلیم دی جارہی ہے۔

اس موضوع پر جرمنی حکومت کے سرکاری بیانات شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں جنرل گورنگ نے وزیر فضا نے ایک فرانسیسی صحافی سے انٹرویو کے دوران میں کہا تھا۔

"میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہمیں زمین اور پانی کی طرح ہوا میں بھی کمترین مدافعتی اسلحہ کی ضرورت ہے۔ میں ایسے ہوائی جہازوں کا ایک مختصر بیڑہ چاہتا ہوں جو اتنے ہلکے ہوں کہ بم اندازی ان سے ممکن ہی نہ ہو۔ اگر ضرورت ہو تو میں اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ ہمیں صرف کم ایندھن والے ہوائی جہاز رکھنے کی اجازت دی جائے تاکہ ہم زیادہ فاصلہ تک اُڑ ہی نہ سکیں۔ یہ چھوٹے تعقب کرنے والے جہاز جو حملہ کے لئے بیکار ہوں گے ہمیں حملہ کرنے والوں سے محفوظ رکھ سکیں گے۔" آرنولڈ بوئلک مشہور جرمن ہوا باز کی یادگار میں جو تقریب منائی گئی اُس میں بھی جنرل گورنگ نے اپنے اسی مطالبہ کو پھر دوہرایا جس کی بابت اُس نے کہا یہ تو قبول ہی کرلینا چاہئے۔ گورنگ کا مطالبہ بظاہر کس قدر معتدل اور معصوم معلوم ہوتا ہے! مگر جنرل نیسل نے فرانس میں ۱۹۲۸ء میں ہی لوگوں کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی تھی کہ جرمنی کی بری افواج کو اُن کے افسروں کی طرف سے جو ہدایات دی گئیں اُن میں یہ بات فرض کرلی گئی ہے کہ جنگ کی حالت

میں ہوائی بیڑہ بھی فوج کی امداد کے لئے موجود ہوگا ۔ نیل کے بیان کے بموجب افواج کو پہلے سے ہی ہوائی جنگ کے مختلف قسم کے جہازوں مثلاً خبر گیری کرنے والے، بم انداز وغیرہ کے نام اور صحیح تعداد سے آگاہ کر دیا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں جنرل آرمن گاڈ نے ریویو ڈومنڈیز میں اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جرمنی کا شمار ان اقوام میں کرنا چاہیئے جو مستقبل میں بہت بڑی ہوائی فوج کی مالک ہوں گی ۔ اس نے بیان کیا کہ جرمنی کی ہوائی فوج کے پاس اس وقت بھی سو مشینیں موجود ہیں ۔ ۲۸ نومبر سنہ ۱۹۳۴ء کو مسٹر بالڈون نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ جرمنی کے پاس چھ سو سے ایک ہزار تک اڑنے والے ہوائی جہاز ہیں ۔

اب آئیے اس مسئلہ کا ایک دوسرے پہلو سے مطالعہ کریں ۔ ورسائی کے معاہدہ نے جرمنی کو ہوائی فوج کے معاملہ میں سب سے زیادہ پابند کیا تھا۔ صلح کے بعد جتنے جہاز بچ گئے تھے وہ سب تباہ کر دیئے گئے تھے ۔ جرمنی کو اپنی مدافعت کے لئے جن افواج کے رکھنے کی اجازت دی گئی تھی ان میں ہوائی فوج شامل نہ تھی ۔ ان پابندیوں کے باوجود جب جرمنی نے نئے غیر فوجی ہوائی جہاز بنانا شروع کئے تو اس کی راہ میں مزید دشواریاں پیدا کی گئیں جن میں سب سے زیادہ سخت یہ تھی کہ آیندہ سے نئے ڈزائنوں کو بھی آزادی سے اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے ۔ سفیروں کی کاؤنسل نے یہ شرائط سنہ ۱۹۲۲ء میں جرمن حکومت کے سامنے رکھے اور سنہ ۱۹۲۶ء تک ان پر سختی سے پابندی کرائی گئی ۔ اس کے بعد جب یہ محسوس کیا گیا کہ اب حالت ناقابل عمل ہوتی جارہی ہے تو ایک نیا معاہدہ کیا گیا جس سے جرمنی کو ہوائی جہاز رانی اور ہوائی بیڑے کی تعمیر کی اجازت مل گئی ۔ لیکن اس بات کی پوری احتیاط کی گئی کہ جرمنی کے سول ہوائی جہاز، ہوا بازی کے اسکول اور کلب فوجی اغراض کے لئے استعمال نہ کئے جاسکیں ۔ جرمنی کی ہوا بازی پر سنہ ۱۹۲۲ء میں جو پابندیاں عاید کی گئیں ان سے جرمن قوم کے دل میں ظاہر ہے سخت تلخی اور ناگواری پیدا ہوئی ۔ لیکن اس کا جواب دینے کی ان میں بالکل طاقت نہ تھی مجبوراً انھوں نے اپنے دل کو تسکین دینے کے لئے دوسرے طریقے سوچے ۔ ان میں سے ایک طریقہ تو ہوائی تیراکی اور ہوائی بادبانی کی مشق کا تھا اور دوسرا چھوٹے ہلکے ہوائی جہازوں کی ترقی اور ان کے رواج کا ۔ ان دونوں میں اپنے شوق تکمیل اور اختراع پسندی کی بنا پر انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ۔

ہوائی تیرائی جرمنی میں سنہ ۱۹۱۰ء سے رائج ہے جب ہرللیین فیلڈ نے جو بعد کو تجربہ کرتے ہوئے ہلاک ہوا پہلے پہل تیرنے والی ہوائی کشتی کا استعمال کیا تھا۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں ہوائی تیراکی کو لوگوں نے شوقیہ اختیار کرنا شروع کیا اور اس وقت سے اس کا رواج نہایت تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ اس کے علاوہ ایسے ہوائی جہازوں سے بھی جن میں انجن نہیں ہوتے تفریحی مشغلہ کے طور پر جہازرانی کی جاتی ہے[۱]۔ یہ تحریکیں تمام جرمنی میں پھیل گئی ہیں حتیٰ کہ آج ہوائی تیراکی اور ہوائی بادبانی کے بے شمار کلب تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور لوگ ان کی نہایت جوش کے ساتھ امداد کرتے ہیں۔ خالص فوجی نقطہ نگاہ سے اس قسم کی تفریحوں کی اہمیت بہت زیادہ ہے کیونکہ جو ہواباز ہوائی پیراکی اور ہوائی بادبانی میں مشق حاصل کر لیتے ہیں وہ مشین کے ذریعہ ہوائی جہازرانی کو نہایت جلدی اور آسانی سے سیکھ لیتے ہیں۔ درحقیقت کہا یہ جاتا ہے کہ بعض ماہر ہوائی پیراکوں کو معمولی ہواباز بنانے کے لئے صرف ایک گھنٹہ کی تعلیم کافی ہوتی ہے۔ غرضکہ مندرجہ بالا بیان سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ہوائی پیراکی اور ہلکے ہوائی جہازوں کے رواج سے جرمنی میں ایک "فضائی ذہنیت" پیدا ہو گئی ہے اور ایک ایسی جماعت تیار ہو رہی ہے جسے جنگ کے وقت نہایت آسانی سے جنگی ہوابازی کے کام سکھائے جا سکتے ہیں۔

پابندیوں کی کمی اور خلاف ورزیوں پر سزا نہ ملنے سے جرمنی کے اخباروں کے حوصلے بڑھے اور انھوں نے غیر منصفانہ معاہدہ اور سابق دشمن اقوام کے حسد و کینہ کے خلاف ایک زبردست پروپگنڈا شروع کیا اور کہا کہ ان کی وجہ سے جرمنی کی قوت مدافعت بالکل سلب ہو گئی ہے۔ پھر ان صناعوں کی خوب تعریفیں کی گئیں جنھوں نے ہوائی جہازوں کے بنانے میں بڑی ہمت اور حوصلہ سے کام لیا تھا۔ جرمنی کی ہوائی بندرگاہوں کے قیام سے ہوائی آمد و رفت اور تجارتی پرواز میں جو ترقی ہوئی تھی اسے سراہا گیا اور جرمن ہوابازوں کی مہارت کی خوب مدح سرائی کی گئی۔ پھر فرانس، اٹلی، پولینڈ اور زیکوسلواکیا

---

[۱] اس قسم کی ہوائی جہازرانی کا انحصار ہوا کے اُن دھاروں پر ہوتا ہے جو اوپر کے رخ بہتے ہیں۔ عموماً سورج کی گرمی اور طوفان کی آمد کے وقت ہوا میں اس قسم کی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں۔

میں ہوائی بیڑہ کی تعمیر کے لئے جو سرگرمی سے کوشش کی جا رہی تھی اس کی مفصل اطلاعیں حاصل کی گئیں اور اُن کی بنیاد پر جرمنی کے ہوائی بیڑہ کی تعمیر کے لئے پروپگنڈا اور زیادہ زور و شور کے ساتھ کئے جانے لگا۔

اسی دوران میں تجارتی ہوا بازی کو خوب ترقی ہوتی رہی۔ اس ترقی کا ایک سبب ممکن ہے یہ ہو کہ بحری جہازوں کی ضبطی اور نوآبادیوں کے نقصان کی وجہ سے جرمنی کو اپنی بحری قوت کی ترقی کی طرف سے مایوسی ہو گئی تھی اور اب اُسے اپنے حوصلوں کے لئے میدان صرف ہوائی ترقی میں نظر آتا تھا۔ اس کا سبب جو کچھ بھی ہو لیکن جرمنی نے ہوائی سروسوں کے قائم کرنے میں جس بلند خیالی اور اعلیٰ حوصلگی سے کام لیا ہے وہ یقیناً لائق تعریف ہے۔ جرمنی کی تجارتی ہوائی لائنیں صرف اپنے ملک کے رقبہ کے اندر محدود نہیں ہیں بلکہ تمام ہمسایہ ممالک میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سوویٹ روس سے اس کے جو تعلقات ہوائی لائنوں کے ذریعہ سے قائم ہیں وہ بہت وسیع اور مکمل ہیں۔ ۱۹۳۲ء میں ڈیوٹش لفتھانسا جو جرمنی کی سب سے بڑی ہوائی کمپنی ہے ۴۵ سروسوں کو چلا رہی تھی جن میں سے سات سروسیں صرف ڈاک اور کرایہ پر سامان منتقل کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھیں۔ لفتھانسا کے جہاز روزمرہ ۲۲ ہزار میل کا سفر کرتے تھے۔ اس وقت جرمنی میں بارہ بڑی ہوائی بندرگاہیں پائی جاتی ہیں اور یہ سب جدید نمونہ پر بنائی گئی ہیں اور ان کے انتظام و انصرام میں خاص اہلیت و قابلیت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ۶۵ جگہیں ہوائی جہازوں کے اُترنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ ان میں بحیرۂ شمالی اور بحیرۂ بالٹک کے سمندری ہوائی جہازوں کے اسٹیشن بھی شامل ہیں۔ ان سروسوں میں جس قسم کی مشینیں استعمال کی جاتی ہیں اُن کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کیونکہ ان میں یقینی طور پر ایسے نمونوں کی مشینیں بھی ہیں جو تعمیر کے طریقوں میں ذراسی تبدیلی کرنے سے آسانی کے ساتھ جنگ کے اغراض کے لئے بھی مفید بنائی جا سکتی ہیں۔ مسافروں کے وزنی جہازوں کے ضمن میں سب سے پہلے ژونکرس جے نمبر ۳۸ کا تذکرہ ضروری ہے۔ پھر ایک چھوٹا دو انجنوں والا نمونہ ہے جس میں ۶ مسافر ڈیڑھ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چار سو میل تک سفر کر سکتے ہیں۔ پھر ایک تین انجن والے مانوپلین کا

نمونہ ہے جس کی رفتار ایک سو ستر میل فی گھنٹہ، بلند پروازی ۱۹ ہزار فیٹ اور قوت سفر پانچ سو میل ہے۔ پھر جدید ایچ۔ ای۔ نمبر ۷۰ کا نمونہ ہے جس کی رفتار ۲۴۰ میل، بلند پروازی ۱۹ ہزار فیٹ ہے اور چھ آدمی اس میں سفر کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاک کے کئی تیز رفتار نمونے ہیں جو طویل سفر پر مسلسل ۱۶۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جا سکتے ہیں ان آخر الذکر نمونوں میں بعض ایسے ہیں جو اپنی خصوصیات میں بم باز ہوائی جہازوں سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ جرمنی نے اپنا سب کام اس دور اندیشی کے ساتھ کیا ہے کہ سول ہوائی جہازوں کو نہایت تیزی اور آسانی سے نظام میں بلا کسی غیر معمولی ابتری کے پیدا کئے ہوئے فوجی ہوائی جہازوں میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ یہ بات بھی اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ ایک بڑی فوج بنانے میں ابھی غالباً چند سال صرف کرنے کی ضرورت ہے۔

جرمنی کی ان تیاریوں کو دکھانے کے بعد اب سوال یہ باقی رہا کہ عسکری قوت کے اس احیاء سے جرمنی کا منشا کیا ہے۔ جرمنوں کی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس بات کو تسلیم کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہونا چاہئے کہ جنگ میں اپنی طرف سے پیش قدمی وہ اُس وقت تک نہیں کریں گے جب تک یا تو ایسا کرنے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں گے یا اس کے لئے پوری طرح تیار نہ ہوں گے۔ ان میں خواہش تکمیل اور کام کو اصول اور طریقہ سے کرنے کا جذبہ بہت زیادہ ہے۔ جرمن سپاہی کے دل میں ٹھوس طاقت اور کثیر تعداد کا احترام اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر یقینی خطروں میں جیسے موجودہ حالات میں جنگ ہے کبھی نہ ڈالے گا۔ وہ اس وقت جنگ کے لئے اپنے آپ کو تیار نہیں پا رہا ہے۔ سرکاری اعلانات اور فوجی مظاہروں میں جو آج کل بعد پایا جاتا ہے وہ اس کا صاف ثبوت ہے کہ جرمنی اس وقت بات کو ٹالنا چاہتا ہے۔

موجودہ مسائل کے حل میں اگر جرمنی کی فوجی دنیا کی تصانیف کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے تو یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ جرمنی کے با اثر فوجی حلقوں کی ذہنیت میں جنگ کے متعلق کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ جرمنوں کے دل میں طبعاً، روایتاً اور مشق کی بنا پر قوت پر اس قدر شدید اعتقاد ہے کہ اس میں کوئی فوری تغیر کا امکان ہی نہیں ہے۔ جرمنی کے وہ مصنف جنہیں فن جنگ سے واقفیت ہے جدید جنگ کے حالات کے

مطالعہ کے بعد بھی اُسی فلسفہ قوت پر قائم ہیں جس کی تعلیم کلاز وٹز، مولٹکے اور شلیفین کی تصانیف میں پائی جاتی ہے۔ وہ ابھی تک کلاز وٹز کے ان بیانوں کو جو اُس نے "قوم کی فوجی تیاری" اور "اقتدار کی شرائط" کے موضوع پر دیئے تھے یہ ثابت کرنے کے لئے سند کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ فوجی جنگ عظیم ہی وہ شاہراہ ہے جس سے جنگ میں فتح اور اقوام کے باہمی تصادم میں کامیابی حاصل کی جاتی ہے۔ یہ بات اگر جرمنی اور فرانس کے مابین جنگ ہو شاید ایک حد تک صحیح ثابت ہو مگر جرمنی اور برطانیہ کے درمیان جنگ کی صورت میں اس کی صحت مشتبہ ہے۔ بہر حال اس خیال کو اہمیت اس حیثیت سے حاصل ہے کہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمنوں کے دل میں ابھی تک اُن مسلح افواج کا اعتقاد باقی ہے جن کی وجہ سے انیسویں صدی میں اُس نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں اور اپنے اقتدار کو نہایت تیزی سے ترقی دی۔ لیکن جنگ عظیم کے تجربہ سے سبق حاصل کر کے آئندہ کے لئے وہ ایک ایسی فوج بنانا چاہتے ہیں جو جدید سائنس و ایجاد کے اختراع کئے ہوئے تمام آلہ جات سے آراستہ ہو۔ اُن کی خواہش ہے کہ ان کی فوج کے پاس گیس، ٹینک، ہوائی جہاز۔ اور تمام وہ دوسری سہولتیں ہوں جن سے فوجی ہتھیاروں کی قوت بڑھتی ہے۔ ان ہتھیاروں کے پیچھے فتح و تسخیر کا قومی جذبہ کام کر رہا ہے۔ قسمت اور تقدیر اس وقت جرمنی میں جن پالیسیوں اور اعمال کی تشکیل کر رہی ہیں ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فتح و تسخیر کا یہ جذبہ چند سالوں سے جرمنی میں اپنا کام کر رہا ہے۔ اسی کے زیر اثر ہتھیار بنائے جا رہے ہیں۔ حالات کے اس ارتقا سے یورپ کا امن خطرے میں ہے یا نہیں یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا تعلق عسکری مسائل سے نہیں ہے اس لئے یہاں خارج از بحث ہے۔

تنقید و تبصرہ

کتب :-

حیاتِ مسعودی | از جناب مولوی محمد عباس خاں صاحب شروانی بی اے ڈپٹی کلکٹر۔ تقطیع چھوٹی۔ ضخامت ۲۶۴ صفحات لکھائی چھپائی اور کاغذ نفیس ہے قیمت اور ملنے کا پتہ کتاب پر درج نہیں۔

سپہ سالار حضرت مسعود غازی شہید جو عوام میں بالے میاں کے نام سے مشہور ہیں ہندوستان خصوصاً یوپی میں بہت احترام و عقیدت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اُن کا عُرس یا میلہ یوپی کے اکثر شہروں میں ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں ان کے کرامات و خوارق کی عجیب و غریب روایتیں مشہور ہیں۔ جو اکثر حقیقت سے خالی یا مبالغہ آمیز ہیں۔ اسی لئے بعض لوگ ان بے سروپا روایتوں ہی کو نہیں خود حضرت سالار غازی کے وجود کو بھی شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے اُردو کی دو ایک کتابیں ہماری نظر سے گذری ہیں لیکن وہ بھی اسی قسم کے افسانوں سے پُر ہیں بڑی مشکل یہ ہے کہ صحیح حالات کی جستجو کے لئے کوئی مستند ماخذ بھی نہیں ہے جس کی طرف رجوع کیا جائے۔ ایسی حالت میں جناب محمد عباس خاں شروانی شکریے کے مستحق ہیں جنھوں نے بڑی جد و جہد اور عرق ریزی کے بعد اس مسئلے پر بہت اچھی معلومات فراہم کردی ہیں کتب کے شروع میں مقدمہ و تمہید کے بعد جناب مولف نے اُن ماخذوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ جن سے اس کتاب کا مصالحہ فراہم کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں آنھوں نے چار ماخذ بتائے ہیں۔ (۱) عام کتب تاریخ و سیر (۲) سپہ سالار مسعود غازی کی مخصوص تاریخ یعنی مرأت مسعودی (۳) کتبہ جات سنگی و سی (۴) مقامی روایات۔

جناب مولف نے اپنے ماخذوں سے فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کوشش کے مقابلے میں انھیں کامیابی بہت کم حاصل ہوئی۔ جس کا انھیں خود بھی اعتراف ہے۔ اکثر مقامات پر انھیں ظن و تخمین اور قیاس آرائی سے کام لینا پڑا ہے۔ تاہم اس سلسلے میں بہت سے تحقیق طلب تاریخی امور پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے بحیثیت مجموعی کتاب تاریخ کے طالب علم کے لئے مفید ہے۔ کتاب میں جناب مولف کی اور درگاہ کی مختلف عمارتوں کے متعدد فوٹو بھی ہیں۔ م۔

صحیفۂ ادب | از جناب شیخ عبدالرحمٰن طارق صاحب منشی فاضل تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۲ صفحے طباعت و کتابت اور کاغذ اوسط درجے کا قیمت عہ مجلد و مطلا عاا ملنے کا پتہ دارالتالیف ہندیجی دروازہ لاہور۔

شیخ عبدالرحمٰن طارق صاحب نے لاہور میں دارالتالیف ہند کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے۔ اور اس ادارے کی طرف سے انھوں نے خود اپنی پہلی تصنیف شائع کی ہے۔ کتاب کے شروع میں لاہور کے چند مشہور لوگوں کی تقریظیں ہیں پھر جناب شاداں بلگرامی کا دیباچہ ہے پھر جناب مصنف کا عرض حال ہے۔ اس میں انھوں نے اردو کی کس مپرسی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس زبان کی طرف سے بے توجہی پر رنج و غم کے آنسو بہائے ہیں واعظوں اور ایڈیٹروں کی بھی خبر لی ہے اسی ضمن میں انھوں نے دارالتالیف ہند کے قیام کا ذکر کیا اور اپنی تصنیف کو ناظرین سے روشناس کرایا ہے۔ اس تمام تحریر میں "ادعا" کا رنگ نمایاں معلوم ہوتا ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے اسے انھوں نے دو بابوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں انھوں نے شعر و شاعری پر بحث کی ہے اور اس کے لوازم کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ دوسرے باب میں مرزا غالب کی شاعری پر تفصیلی بحث ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے متعدد عنوان تعین کئے ہیں۔ مثلاً عشقیہ، صوفیانہ، بہاریہ، فلسفیانہ، اخلاقیات وغیرہ، اور ہر ایک عنوان کے تحت اشعار نقل کرکے ان کی تشریح کی ہے اشعار کی مزید وضاحت کے لئے مشرق و مغرب کے شعراء و علمائے فن کے مثالیہ اشعار اور اقوال بھی نقل کئے ہیں کتاب محنت سے لکھی گئی ہے اور اس خیال سے کہ مصنف کی پہلی کوشش ہے۔ قابل ستائش ہے۔

سلسبیل | یہ جناب آل احمد صدیقی سرور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے شروع میں فردوس نظر کے نام سے سفر کشمیر کے تاثرات ہیں سرور صاحب خود اس کے متعلق فرماتے ہیں۔" ۔۔۔۔۔۔۔ اگرچہ تماشا کامیاب تھا لیکن تمنا بے قرار ہی رہی صنعت آئینہ میں یہی بے قراری جا بجا منتشر ہے" دوسرے باب میں نقش ہائے رنگ رنگ کے زیر عنوان۔ اس سفر کے بعد کی نظمیں ہیں تیسرے باب میں لالۂ صحرا کے عنوان سے شہید ملت مولانا محمد علی مرحوم کا پُردرد مرثیہ ہے۔ چوتھے باب میں غزلیں اور متفرق اشعار ہیں جناب سرور نوجوان اور ہونہار شاعر ہیں کلام میں ایک خاص رنگ اور کیف ہے۔ بعض بعض نظمیں بہت پرندور ہیں اللہ کرے حسن قلم اور زیادہ۔

حضرت رشید احمد صدیقی کا تعارف اور خود جناب سرور کی تمہید بھی پڑھنے کے قابل ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی بہت نفیس ہے شروع میں حضرت سرور کا فوٹو بھی ہے قیمت عہ ملنے کا پتہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔

روح الاسلام | از جناب عبیداللہ خاں صاحب قدسی ایچ پی ایچ اے پرشین پروفیسر سناتن دھرم ہائی کالج بیاور۔ ضخامت ۱۱۲ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ متوسط۔ قیمت عہ ملنے کا پتہ مولوی فضل اللہ خاں بیاور (راجپوتانہ)۔

یہ کتاب انگریزی پڑھنے والے طالب علموں میں صحیح دینی و اسلامی جذبہ پیدا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے۔ مولف نے کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اعتقادات، تصوف، شہدا، اخلاق۔

جناب مولف نے آخری تین باب محنت اور توجہ سے لکھے ہیں عبارت آسان اور طرزِ بیان سلجھا ہوا اور موثر ہے۔ البتہ اعتقادات کے بیان میں آسانی اور شگفتگی پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ اسی لئے طلبا مشکل ہی سے اس کے پڑھنے کی طرف مائل ہوں گے۔ بحیثیت مجموعی کتاب اچھی ہے۔

مصری افسانے | از جناب قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ ضخامت ۲۱۱ صفحات کتابت و طباعت اور کاغذ اوسط قیمت ۸ر ملنے کا پتہ نیرنگ خیال بک ڈپو لاہور۔

یہ کتاب مصر کے مشہور انشا پرداز مصطفےٰ لطفی منفلوطی کے پانچ اخلاقی افسانوں کا ترجمہ ہے۔ مصطفےٰ لطفی منفلوطی کی انشا پردازی و نثر نگاری نے مصر میں بہت مقبولیت حاصل کی ہے اس کی کتابیں مصر ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا کے عربی جاننے والے طبقے میں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ وہ قدیم مشرقی طرز اخلاق کا حامی ہو اور جدید مغربی تمدن کا سخت مخالف ہے اس نے اپنی تحریرسے ہمیشہ اصلاح اخلاق اور مغربی تہذیب کے نقائص و عیوب نمایاں کرنے کا کام لیا ہو اس کے افسانے یا ناول طبعزاد یا ترجمے سب میں یہ مقصد مشترک ہے اس کے قلم میں جذبات نگاری کی قدرت کے ساتھ بلا کی تیزی، حدت اور شدت ہے جس کا اندازہ اس کے افسانوں کے پڑھنے سے ہو سکتا ہے جناب مترجم نے ترجمہ بھی بہت صاف سلیس اور شگفتہ انداز میں کیا ہے۔

کائنات قبل اسلام | جلد اول از جناب مولانا سید مجتبیٰ حسن صاحب موہوی ضخامت ۵۰ صفحے کتابت و طباعت اور کاغذ معمولی قیمت ۵ر ملنے کا پتہ گولڈن پریس۔ کانپور

جناب مولوی صاحب نے اسلام سے پہلے کی دنیا کے حالات کا خاکہ کھینچا ہے۔ اور مختلف ممالک کی قدیم مذہبی و تمدنی حالت دکھائی ہے۔

رسائل :-

مولوی دہلی رسول نمبر | رسالہ مولوی کا رسول نمبر اس مرتبہ خاص طور سے شاندار ہے۔ اچھے مضمون اچھی نظمیں۔ تقریباً ۳۰ تصویریں۔ ضخامت ۱۴۰ صفحات بڑی تقطیع اور باریک کتابت اور قابل تعجب یہ امر ہے کہ یہ ضخیم نمبر بھی ایک روپیہ سالانہ چندہ میں ملتا ہے۔

شذرات

پچھلے مہینے میں ہم نے لکھا تھا کہ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب جامعہ کی عمارتوں کے لئے چندہ فراہم کرنے کے واسطے روہیلکھنڈ کے مشرقی اضلاع کا دورہ کریں گے ۔ ابھی اس ارادے کے پورا کرنے کا وقت نہ آیا تھا کہ کوئٹہ کی تباہی کی اطلاعیں آنے لگیں ۔ یہ سانحہ جس قدر دردناک اور حسرت انگیز ہے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ۔ ہمدردی و انسانیت کا تقاضا ہے کہ اس وقت ہر قسم کے دوسرے چندے بند کرکے کوئٹہ کے مصیبت زدہ بھائیوں کی یکسوئی کے ساتھ امداد کی جائے اُن کے گھر برباد ہو گئے ہیں ۔ ہزاروں عورتیں بیوہ، بچے یتیم اور بوڑھے بے اولاد ہو گئے ہیں ۔ سینکڑوں کے جسم زخموں سے چور اور ہزاروں کے دل فگار ہیں ۔ لاکھوں روپیہ کی پونجی غارت ہوئی ہے اور ہزاروں کے روزگار مارے گئے ہیں ۔ ان ستم زدہ عزیزوں کے سوا ہمارے ذہن میں اس وقت کوئی دوسرا خیال نہ آنا چاہیئے ۔ باقی تمام کام رک سکتے ہیں لیکن یہ کام ہماری اولین توجہ کا مستحق ہے ۔

جامعہ نے اپنے آیندہ تعلیمی سال سے فیصلہ کیا ہے کہ دس یتیم اور لاوارث بچوں کی مکمل تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے ۔ ایسے بچوں کے لئے جو انتظامات فی الحال موجود ہیں وہ پوری طرح قابل اطمینان نہیں ہے ۔ ان میں سب سے بڑی خرابی تو یہ ہے کہ بچہ ہر وقت اپنی یتیمی سے باخبر رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے اُس کی نشو و نما پر اچھا اثر نہیں پڑتا اور اس کی سیرت میں محرومیوں کے احساس کی تیزی سے نقائص کے پیدا ہو جانے کا برابر احتمال رہتا ہے ۔ جامعہ کے وسائل چونکہ محدود ہیں اس لئے دس طالبعلموں سے زیادہ کا انتظام اس وقت نہیں کیا جا سکتا ۔ ان دس طالب علموں میں پانچ کوئٹہ کے یتیم اور لاوارث بچے ہوں گے ۔ ان سب کے لئے ہر طرح کی سہولت بہم کرنے کا بندوبست کیا جائے گا ۔ ان میں سے ہر بچہ کسی ایک استاد سے خاص طور پر وابستہ کر دیا جائے گا تاکہ بیرونی سرپرست کی حیثیت سے دارالاقامہ

میں وہ اس کی دیکھ بھال کرتے رہیں اور چھٹیوں کے زمانہ میں جب دوسرے مقیم طلبار اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں یہ بچے بھی اپنے سرپرست کے پاس رہ سکیں ۔

جامعہ کی تعطیلات شروع ہو گئی ہیں ۔ کچھ بورڈنگ بدلے جا رہے ہیں اور ان میں طلبار کی آسائش اور تفریح کے انتظامات کئے جا رہے ہیں ۔ گذشتہ سال نئے طلبار کی صحیح تعداد کا چونکہ ابتدا سے علم نہ تھا اس لئے ان کے قیام و تعلیم کا زاید بند و بست نہ کیا جا سکا تھا اور حسب قدر رعایت ممکن تھی اس کے بعد داخلہ کی بہت سی درخواستیں نامنظور کرنا پڑی تھیں جس کی وجہ سے بعض صورتوں میں والدین اور سرپرستوں کو بڑی زحمت برداشت کرنا پڑی تھی ۔ لہٰذا اس سال جو لوگ اپنے بچے یا خود اپنا داخلہ یقینی کرانا چاہتے ہیں انھیں پہلے سے درخواست بھیج دینا چاہیئے تاکہ اس عرصہ میں ان کے لئے بند و بست کیا جا سکے اور عین وقت پر یہاں آنے سے انھیں مایوسی نہ ہو ۔ تعطیلات کلاں کے بعد جامعہ یکم اگست سے کھل رہا ہے ۔ درخواستیں مستجل صاحب جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے پتہ سے روانہ کرنا چاہئیں ۔

جون ۱۹۳۶ء

جامعہ دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۰۷۶

پتہ درست کر لیجیے!

جب آپ یا آپکے عزیز بیمار ہوتے ہیں تب آپکو حکیم اجمل خاں کے دواخانہ کی تلاش ہوتی ہے، دھوکہ باز عطار اپنی فہرستوں اور اشتہاروں میں حکیم اجمل خاں کا نام بڑی خوبصورتی سے طرح طرح استعمال کرتے ہیں تاکہ وہ آپ کو دھوکا دے سکیں آپ دھوکا کھا جاتے ہیں اور آپکے پاس دھوکہ باز عطاروں کے کارخانوں سے غلط دوائیں بھی پہنچ جاتی ہیں اور جب آپ کو ان سے بجائے فائدہ کے نقصان پہنچتا ہے تو آپ حکیم اجمل خاں کے دواخانے کو بدنام کرتے ہیں اس لیے آپ پتہ نوٹ کر لیجیے اور یاد رکھیے کہ حکیم صاحب مرحوم نے اپنے نام سے کوئی دواخانہ اپنی زندگی میں نہیں کھولا بلکہ جو دواخانہ عطائی اور جاہل عطاروں کے دھوکہ سے بچانے کیلئے ۱۹۰۳ء میں جاری کیا اسکا نام

ہے ہندوستانی دواخانہ دہلی نمبر ۲۲ دہلی

رکھا جس کی کل آمدنی سالانہ دو لاکھ روپیہ کے قریب ہے اور جس میں ڈیڑھ سو آدمی فرمائشات کی تعمیل کرتے ہیں اور جس کا کل نفع آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج دہلی پر صرف ہوتا ہے۔ طبیہ کالج کا خرچ تخمیناً دس ہزار روپیہ ماہوار ہے جو ہندوستانی دواخانہ برداشت کرتا ہے گویا

ہم آپ سے ایک ہاتھ سے لیتے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے آپ پر صرف کر دیتے ہیں

حکیم صاحب کا مشن صحیح دوا بہم پہنچانا اور مستند حکیم پیدا کرنا تھا زندگی میں انھوں نے اس مقصد کو پورا کیا اور اب ان کے جانشین ہندوستانی دواخانہ کے سرپرست مالجناب مسیح الملک حکیم محمد احمد خاں صاحب بالقابہ تنہا ان کے مشن کو پورا کر رہے ہیں۔

نوٹ: (۱) باہر سے جو مریض اپنے حالات مرض لکھ کر روانہ کرتے ہیں ان کو حکیم صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا جاتا ہے اور حکیم صاحب کے مشورہ کے بعد حسب ضرورت دوائیں روانہ کر دیجاتی ہیں یا ان کو تجویز دوا سے مطلع کر دیا جاتا ہے (۲) پانچ سیر کا پارسل بذریعہ ڈاک روانہ ہو سکتا ہے پانچ سیر سے زیادہ وزن کا پارسل بذریعہ سواری گاڑی روانہ ہوگا لیکن اس کیلئے نصف رقم پیشگی آنا ضروری ہے (۳) کارخانہ میں ہر زبان کی فہرستیں تیار رہتی ہیں اردو، ہندی، انگریزی، گجراتی اور بنگالی میں سے جس زبان کی فہرست مطلوب ہو مفت طلب کیجیے، پتہ صاف اور خوشخط لکھیے۔

چند مفید دوائیں

مصفی

خون کی ہر قسم کی خرابی دور کرنے میں اکسیر ہے گرمی دانے، مہاسے، جھائیں، پھوڑے، پھنسیاں، داد، چھاجن، برص، سوزاک، آتشک سب میں یکساں مفید ہے، صرف جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اسلیے حفظ ماتقدم کے لیے حالت تندرستی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں اور بچوں کو بھی دے سکتے ہیں۔ ترکیب استعمال: ایک ایک خوراک تھوڑے پانی میں ملا کر صبح دوپہر اور شام پی جاتی ہے قیمت بیس خوراک [illegible]

اکسیر سوزاک

نئے اور پرانے سوزاک میں اسکی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے سوزش، جلن اور پیپ کا آنا موقوف ہو جاتا ہے پرانے سوزاک کے رفع کو اس شیشی استعمال کرنے کے بعد مصفی ایک دو مہینے استعمال کر لینی چاہیے کہ اس مرض کی خطرناک سمیت اور اثرات سے خون پاک و صاف ہو جائے اور پھر یہ موذی مرض عود نہ کرے۔ ترکیب استعمال: ایک ایک کیپسول پانی کے گھونٹ سے صبح دوپہر اور شام کو نگل لیا کریں قیمت ۲۴ کیپسول [illegible]

اکسیر نسواں

رحم سے رطوبت آنے (لیکوریا) اور حیض کی بے قاعدگی میں نہایت مفید ہے۔ حمل نہ ٹھہرنا یا بار بار اسقاط ہو جانا۔ حیض کا درد سے آنا، کمر اور پنڈلیوں کا درد، رحم کا ضعف اور ورم ان سب شکایتوں میں حیرت انگیز نفع پہنچاتی ہے ہسٹریا میں بھی مفید ہے حاملہ کیلئے اس کا استعمال ممنوع ہے۔ قیمت فی شیشی ۱۲؎

ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس نمبر ۲۲ دہلی